شوکت صدیقی
خدا کی بستی
PDFBOOKSFREE.PK

خدا کی بستی

(مشاہیر کی نظر میں)

میں نے کل آپ کی ناول "خدا کی بستی" ختم کی، اب تک دل و دماغ کے تار جھنجھنا رہے ہیں۔ اسے پڑھ کر مجھے اردو پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں انتہا پسند ہوں، مگر شاید، یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہوں کہ آپ کی ناول ہر زبان کی ناول سے ٹکر لے سکتی ہے۔

عصمت چغتائی

(خط سے اقتباس)

مصنف نے بڑے کینوس پر ناکارہ ریاستی نظم و نسق، حکمراں طبقے کی مکروہ بدعنوانی اور دیانت دار اور محب وطن عناصر پر نااہل اور بد اطوار لوگوں کی بالادستی کی نہایت اعلیٰ تصویر کشی کی ہے، جہاں امیر، امیر ترین اور غریب، غربت اور تنگدستی کی مزید گہرائی میں گرتے جا رہے ہیں۔

"خدا کی بستی" بدعنوان پاکستانی معاشرے پر بڑا بھرپور طنز ہے۔

خشونت سنگھ

(روزنامہ "انڈین ایکسپریس" دہلی)

"خدا کی بستی" میں اپنے دور کی زندگی بڑی صداقت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ شہری تمدن کے نقوش، جن میں سماجی مرتبے کی خواہش، دولت کے حصول کی اندھی طلب، مستقبل کا خوف، بیروزگاری، بھوک، بے راہ روی، جنس، ہنگامہ اور تصنع نمایاں عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس ناول میں فن کارانہ طنز کے ساتھ ابھارے گئے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق

(تنقیدی تجزیہ "خدا کی بستی اور ناول نگاری")

شوکت صدیقی

(مختصر تعارف)

1923ء 20مارچ، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

1930ء گورنمنٹ جوبلی کالج میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا۔ ساتویں جماعت تک اسی اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ بڑے بھائی حامد حسین صدیقی کے پاس کانپور چلے گئے اور وہاں نواب گنج ہائی اسکول میں آٹھویں میں داخلہ لیا۔ لیکن ایک سال بعد ہی لکھنؤ واپس آگئے۔

1938ء امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول، لکھنؤ، سے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

1940ء پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایف اے کیا۔

1944ء پرائیویٹ ہی بی اے کیا۔

1946ء ایم اے (سیاسیات) کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

1950ء ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔

1952ء مکتبہ اُردو، لاہور، سے افسانوں کا پہلا مجموعہ "تیسرا آدمی" شائع ہوا۔ اسی سال اگست میں ڈاکٹر محمد سعید خاں کی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔ نیز اسی سال روزنامہ "پاکستان اسٹینڈرڈ" سے بحیثیت سب ایڈیٹر وابستہ ہو گئے۔ "پاکستان اسٹینڈرڈ" سے وابستگی دو سال رہی۔

1954ء روزنامہ "ٹائمز آف کراچی" میں ملازمت اختیار کی۔

1955ء جولائی میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ "اندھیرا اور اندھیرا" شائع ہوا۔

1956ء تیسرا افسانوی مجموعہ "راتوں کا شہر" منظر عام پر آیا۔

1958ء آپ کا پہلا ناول "خدا کی بستی" شائع ہوا۔ جسے اردو ادب کا عظیم شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ اس ناول کی عالمی سطح پر بہت پذیرائی ہوئی۔ انگریزی کے علاوہ اب تک دنیا کی 26 ترقی یافتہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن سے پانچ مرتبہ ٹیلی کاسٹ کیا جا چکا ہے اور اس وقت تک اس کے صرف اردو میں 46 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور موجودہ ایڈیشن 47 واں ہے۔

1960ء روزنامہ "مارننگ نیوز" کراچی میں ملازمت اختیار کی۔ اسی سال آدم جی ادبی انعام حاصل کیا۔

1963ء انگریزی صحافت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اردو صحافت کے ساتھ وابستگی کا آغاز کیا۔ روزنامہ "انجام" کراچی، میں بطور نیوز ایڈیٹر فرائض سنبھالے اور چیف ایڈیٹر کے عہدہ تک پہنچے۔

1966ء پاکستانی ادیبوں کے ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس منعقدہ پیکنگ میں شرکت کی۔

1967ء افریشیائی ادیبوں کے وفد کے ہمراہ پاکستانی نمائندے کے طور پر شام، لبنان، عراق، فرانس، الجزائر، سیریالیون اور افریقہ کے مختلف ملکوں کا دورہ کیا۔

1969ء ہفت روزہ "الفتح" کے نگران اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔

1972ء روزنامہ "مشرق" کراچی، لاہور، میں بطور کالم نگار شمولیت اختیار کی۔

1973ء پاکستان پیپلز پارٹی نے پارٹی ترجمان کے طور پر کراچی سے روزنامہ "مساوات" کا اجراء کیا تو اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

1974ء روزنامہ "مساوات"، کراچی، لاہور، لائل پور کے چیف ایڈیٹر کا منصب سنبھالا اور اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے تمام غیر ملکی دوروں میں ان کے ہمراہ گئے۔

1976ء روزنامہ "مساوات" سے بطور چیف ایڈیٹر کنارہ کشی اختیار کی۔ مگر 1980 تک مستقل

کالم نگار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

1984ء چوتھا افسانوی مجموعہ "راتوں کا شہر" شائع ہوا۔ مارشل لا حکومت کی جانب سے اخبارات پر بدترین سنسر شپ اور آزادی تحریر و تقریر پر طرح طرح کی ناروا پابندیوں سے دل برداشتہ ہو کر صحافت کو خیرباد کہا اور پوری توجہ اور لگن کے ساتھ تخلیق ادب کو نصب العین قرار دیا۔

1985ء انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی میں کنوینسنگ کمیٹی کے چیئرمین اور مجلسِ استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔

1987ء عالمی امن کانفرنس، ماسکو، میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔

1988ء دوسرا ناول "جانگلوس" شائع ہوا۔ اس ناول کو بھی پاکستان ٹیلی وژن سے تین بار ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔

1990ء تیسرا ناول "چار دیواری" شائع ہوا۔ دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی کُل ہند کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت کی اور کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کا اعزاز حاصل کیا۔

1997ء حکومتِ پاکستان نے ادب میں اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر صدارتی ایوارڈ، "تمغہ حسنِ کارکردگی"، عطا کیا۔

فن اور شخصیت کے بارے میں تحقیقی کام

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے طالب علم، غلام نبی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کی طالبہ، ناصرہ ملک اور اسی یونیورسٹی کے طالب علم عبدالغفار اعوان، پنجاب یونیورسٹی کی طالبہ فضیلہ احمد، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد، کے طالب علم محمد علی نظر، پشاور یونیورسٹی کے طالب علم، عرفان محمد خاں ایم اے (اردو) کے امتحانات میں شوکت صدیقی کے فن اور شخصیت پر تحقیقی مقالات لکھ کر کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔

کراچی یونیورسٹی سے مریم حسین، گزشتہ چار برس سے معروف نقاد ڈاکٹر حنیف فوق کی نگرانی میں شوکت صدیقی پر بطور ادیب پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالے پر کام کر رہی ہیں جو تکمیل کے مرحلے میں ہے۔

فصل اول

(۱)

گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین روشن تھی۔

لالٹین کی روشنی میں محلے کے کچھ نوعمر لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ وضع قطع سے وہ آوارہ گرد اور لفنگا نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے بال، پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص اور گلے میں بندھا ہوا میلا کچیلا ریشمی رومال۔ ملی جلی آوازوں کے شور میں وہ بار بار چیخ کر کہتا۔

"کہو استاد! کیسا بیمہ کیا؟"

"ابے یہ رہی بیگی۔ واہ میری جان، میں تیرے قربان۔"

"سالو! آج تم کو پدا ماروں گا۔"

وہ برابر جیت رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں شامی تھا۔ وہ دبلا پتلا تھا اور قد بھی ذرا دبتا ہوا تھا۔ آنکھوں سے شوخی جھلکتی تھی۔ مزاج کا بھی تیز تھا۔ ایک بار جب راجہ نے سب کی نظریں بچا کر، پیر کے نیچے چھپا ہوا تاش کا پتا نکالا تو شامی نے تاڑ لیا۔ فوراً چلایا۔

"دیکھ لیا۔ دیکھ لیا۔ سالے! یہ بے ایمانیاں کرتے ہو۔"

راجہ اس کے احتجاج پر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ "ابے کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

وضع قطع: طور طریقہ، شکل وصورت۔ پدا ماروں گا: مراد کنگال کر دوں گا، حقیر کر دوں گا۔ دبتا ہوا قد: چھوٹا قد۔ کھسیانی ہنسی: ایسی ہنسی جس میں شرمندگی بھی شامل ہو۔ ڈھٹائی: بے حیائی۔

شامی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "تم نے ابھی پیر کے نیچے سے پتا نکالا ہے۔"

راجہ نے دھاندلی کرنا چاہی۔ شامی نے جل کر ہاتھ میں دبے ہوئے تاش کے سارے پتے پھینک دیے اور روٹھ کر بیٹھ گیا۔

راجہ اسے چھیڑنے لگا۔ "سالا ہارنے لگا تو رونے بیٹھ گیا۔"

شامی بگڑ کر بولا۔ "تم ایک نمبر بے ایمان ہو۔ اب تمہارے ساتھ کبھی نہیں کھیلوں گا۔"

راجہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "کھیلو گے کیوں نہیں؟ داؤں دے کر جانا پڑے گا۔"

شامی اکڑ کر بولا۔ "دیکھیں کون مائی کا لال داؤں لیتا ہے۔"

راجہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے دبلے پتلے شامی کو دیکھا۔ کڑک کر بولا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔" اور جھپٹ کر شامی کا گریبان پکڑ لیا۔ شامی نے جھٹکا دے کر گریبان چھڑانا چاہا۔ کھینچا تانی میں گریبان چھر سے پھٹ گیا۔ شامی کو تاؤ آ گیا۔ اس نے منہ بسور کر راجہ کی جانب دیکھا اور تڑسے زناٹے کا ایک ہاتھ راجہ کے گال پر رسید کیا۔ راجہ کے کان جھنجھنا اٹھے۔ وہ تلملا کر شامی پر جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لڑکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اب وہ دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی راجہ کی حمایت میں تھی۔ دوسری للکار للکار کر شامی کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ شامی تھا تو مریل سا مگر اس کے جسم میں بڑا کس بل تھا۔ پہلے راجہ نے ٹنگڑی لگا کر پٹخنی دی۔ شامی کو گرایا اور اوپر سے دبا کر بیٹھ گیا۔

لیکن ایک بار شامی نے نیچے سے کچکچا کر زور لگایا تو راجہ سے سنبھلا نہ گیا۔ دھڑام سے نیچے آ گیا۔ شامی جھٹ سے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ گردن پر گھٹنا رکھ کر دو تین گھسے جو دیے تو راجہ چیں بول گیا۔ لگا غیں غیں کرنے۔

اسی وقت گلی میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ جب روشنی میں آیا تو لڑکوں نے دیکھا وہ کالے صاحب تھا۔ اس کی کمر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ قدم بوجھل پڑ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی لڑکوں نے نعرہ لگایا۔

جل کر: غصے میں آکر۔ تیوری پر بل ڈالنا: غصے میں آنا۔ قہر آلود: غصے سے بھری ہوئی۔ تاؤ: غصہ۔ کھلبلی پڑنا: ہنگامہ برپا ہونا۔ بڑھاوا دینا: ہمت بڑھانا، شاباش دے کر لڑانا۔ کس بل: قوت، طاقت۔ ٹنگڑی لگا کر پٹخنی دینا: کشتی کا ایک داؤ۔ گھسے دینا: رگڑا دینا۔ چیں بولنا: ہار ماننا۔

"کالے صاحب!"

اس نے تیکھی نظروں سے ان کو دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ راجہ اور شامی ابھی تک گتھم گتھا تھے۔ کالے صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر دونوں کو کسی نہ کسی طرح علیحدہ کیا۔ ان کی قیمیں جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں۔ چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ دھندلی روشنی میں دونوں کا حلیہ بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ کالے صاحب نے آنکھیں نکال کر غصے سے دیکھا اور دھمکانے کے لیے ان پر جھپٹا۔ انہوں نے کالے صاحب کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کالے صاحب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس نے بغل میں دبا ہوا چمڑے کا بیگ سنبھالا اور آگے بڑھ گیا۔

لڑکے تالیاں بجا بجا کر چیخنے چلانے لگے۔

"کالے صاحب! ٹوٹ گئی بوتل، اڑ گیا کاگ۔"

"کالے صاحب۔۔۔"

وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتا۔ بار بار لڑکوں کو ڈانٹتا۔ کبھی ڈرانے دھمکانے کے لیے جھپٹتا۔ لڑکے اسے پلٹتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ پھر اکٹھا ہوتے اور تالیاں بجا بجا کر چھیڑتے۔ وہ دور تک اس کے پیچھے شور مچاتے چلے گئے۔

لالٹین کے نیچے اب صرف راجہ، شامی اور نوشا رہ گئے تھے۔ راجہ کھسیانا کھسیانا لگ رہا تھا۔ وہ محلے کے سارے لڑکوں کا سرغنہ تھا اور اس وقت شامی کے ہاتھوں سب کے سامنے اس کی بڑی کرکری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال درست کیے۔ جیب سے ایک مڑی تڑی سگریٹ نکالی، سلگائی۔ دو تین لمبے لمبے کش لگائے اور ایک روپیہ نکال کر نوشا سے بولا۔

"ابے سنیما چلتا ہے؟"

نوشا کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ "کون سی پکچر دیکھو گے؟"

راجہ نے شامی کی جانب دیکھ کر کہا۔ "آج تو یار لوگ 'بغداد کا چور' دیکھیں گے۔ باپ قسم ایسی فسٹ کلاس پکچر ہے۔ لطف آ جائے گا۔"

نوشا نے شامی کی سفارش کی۔ "اور شامی کو نہیں لے چلو گے؟"

لتھڑے ہوئے: لت پت، گندے۔ دھونکنی کی طرح: مراد تیز تیز۔ کاگ: ڈاٹ۔ کھسیانا: شرمندہ۔ سرغنہ: لیڈر۔ کرکری: بے عزتی۔

راجہ بگڑ کر بولا۔ "دیکھ بے چلنا ہے تو دیسی بات کر۔ ورنہ جا اپنی ایسی کی تیسی میں۔"

شامی غرانے لگا۔ "دیکھو جی! تم کو سنیما جانا ہو تو جاؤ۔ میرا نام مت لو۔ میں تو گھر جاؤں گا۔ تمہاری طرح میں رات رات بھر آوارہ گردی نہیں کرتا۔" اتنا کہہ کر وہ تو وہاں سے چل دیا۔ نوشا نے اسے روکنا چاہا۔ "ابے بات تو سن۔"

راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "جانے دے سالے کو۔ دیکھ لینا اب کبھی اسے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ ایک نمبر حرامی ہے۔ سالے نے گردن چھیل ڈالی۔" وہ آہستہ آہستہ اپنی گردن سہلانے لگا جس پر خراش پڑ گئی تھی۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے سنیما ہاؤس کی طرف چل دیے۔

آدھی رات کے قریب جب وہ "بغداد کا چور" دیکھ کر لوٹے تو گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف گھپ سناٹا تھا۔ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے ایک خارش زدہ کتا بیٹھا اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا۔ دونوں اس کے قریب سے گزرے تو راجہ کو خرمستی سوجھی۔ اس نے ایسی زوردار لات ماری کہ وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا بھاگا۔ اس کی چیخوں سے ساری گلی گونج اٹھی۔ نوشا پہلے ہی سہا ہوا تھا۔ اس شور سے اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔ مگر راجہ لاابالی پن کی ترنگ میں تھا۔ فلم اسے پسند آئی تھی۔ بار بار کہتا۔

"یار بڑی زوردار پکچر تھی۔ سالا کیا اسٹائل سے مکا مارتا تھا۔"

راجہ نے پینترا بدلا۔ مٹھی بھینچ کر ہاتھ ہوا میں لہرایا اور حلق سے آواز نکالی۔ "ڈھم"۔ ساتھ ہی اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نوشا کی پیٹھ پر دھپ مار کر بولا۔ "باپ قسم مجا آگیا آج۔"

نوشا جل کر بولا۔ "ابے تجھے تو مجا آرہا ہے۔ کہیں اپنا سنیما نہ ہو جائے۔"

راجہ اسے چھیڑنے لگا۔ "جب اتنا ہی ڈر ہے تو سالے خان پھر سنیما کیوں جاتے ہو؟"

"یار اب نہیں جاؤں گا۔ بہت رات ہو جاتی ہے۔"

"ابے تو روز یونہی کہتا ہے۔ کل پھر جائے گا۔ دیکھ لینا۔"

دونوں باتیں کرتے سنسان گلی میں چلتے رہے۔ نوشا کا گھر قریب آگیا تو اس نے راجہ کو ٹھہرا لیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر گیا۔ کان لگا کر اندر کی سن گن لی۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے کواڑوں کو آہستہ سے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ نوشا الٹے قدموں راجہ کے پاس

ڈپٹ کر: ڈانٹ کر۔ بھائیں بھائیں کرنا: لوگوں کے نہ ہونے کی وجہ سے خوفناک معلوم ہونا، بالکل سنسان ہونا۔ خرمستی: شرارت۔ لاابالی پن: بے پروائی، بے فکری۔ ترنگ: جوش، لہر۔ دھپ: تھپڑ۔ سُن گن لینا: چھپ کر سننا۔

واپس پہنچا۔

راجہ نے پوچھا۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

نوشا نے جواب دیا۔ "دروازہ تو بند ہے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

"ابے تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔" راجہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے گھر کی چار دیواری کے نیچے پہنچ گئے۔

نوشا کا گھر بھی محلے کے عام مکانوں کی طرح پرانا اور معمولی وضع کا تھا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ راجہ بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر گھوڑا بن گیا اور ہاتھ ہلا کر بولا۔

"آجا میرے شیر۔"

نوشا چپ چاپ اس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار مضبوطی سے پکڑی اور بندر کی طرح اچک کر اوپر پہنچ گیا۔ نیچے سے راجہ نے سرگوشی کی۔ "یار میں تو اب چلا۔"

نوشا نے دبی زبان سے کہا۔ "اچھا۔"

راجہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ لیکن نوشا دیوار پر خاموش بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کوئی آواز نہ سنائی دی تو وہ دھم سے صحن میں کود گیا۔ وہیں ٹین کا ایک ڈبا پڑا تھا۔ ڈبا اس کے پیروں کے نیچے آکر زور سے کھڑکھڑایا۔ اسی وقت کمرے کے اندر ماں کی آواز ابھری۔

"کون؟"

نوشا دیوار سے چپٹ کر بیٹھ گیا اور منہ سے بلّی کی طرح آوازیں نکالنے لگا۔ "میاؤں میاؤں۔"

ماں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پھر ابھری۔ "ہش بل بل بل، ہش!"

نوشا دیوار کے قریب سہا ہوا بیٹھا تھا۔ دھڑکتے دل سے سوچتا تھا۔ اگر ماں نے باہر آکر کہیں اسے دیکھ لیا تو اچھی خاصی مرمت ہو جائے گی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ ہوا سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ سردی کے مارے نوشا کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ سارا بدن برف کی مانند سرد پڑ گیا تھا۔ مگر وہ دبکا ہوا جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کمرے کے اندر کوئی آہٹ نہ ہوئی تو اس نے احتیاط کے طور پر دو تین بار بلی کی آواز نکالی۔ مگر کوئی نہ بولا۔

وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس نے گردن بڑھا کر اندر دیکھا۔ کونے میں لیمپ جل رہا تھا۔ دھندلی روشنی میں سامنے فرش پر اس کا

چھوٹا بھائی انور سو رہا تھا جسے پیار سے انّو کہا جاتا تھا۔ ذرا فاصلے پر ماں لیٹی تھی اور اس کے قریب ہی سلطانہ لحاف میں دبکی پڑی تھی۔ وہ انّو اور نوشا سے بڑی تھی۔

نوشا چوروں کی طرح چپکے سے کمرے کے اندر گیا اور انّو کے برابر لیٹ گیا۔ اسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ ڈر کے مارے نوشا نے انو کی رضائی کو ہاتھ بھی نہ لگایا جسے اوڑھ کر دونوں سویا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ نیند میں ذرا بھی انّو کے ہاتھ لگتا تو گھبرا کر اس بری طرح چیختا کہ سوتوں کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ سردی سے کانپتا سکڑا سکڑایا لیٹا رہا۔

ذرا دیر بعد سلطانہ نے کھنکار کر گردن اونچی کی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مڑ کر نوشا کی جانب دیکھا جو آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ وہ اٹھ کر نوشا کے پاس گئی۔ رضائی اس کے جسم پر ڈال کر سرگوشی کی۔

"ادموئے بلے! رضائی تو اوڑھ لے۔ تجھے تو سردی بھی نہیں لگتی۔"

نوشا نے آنکھیں کھول دیں اور غصے سے گھورنے لگا وہ اسے جھڑنے لگی۔ "آنکھیں نکالیں تو ابھی جگاتی ہوں اماں کو۔"

نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ اس کی کمر میں زور سے بکوٹا بھرا۔ وہ بلبلا کر بولی۔ "ہائے اماں۔ ایک تو کمبخت کے ساتھ نیکی کرو۔ اوپر سے چٹکیاں بھر رہا ہے۔"

اس دفعہ سلطانہ کی آواز کسی قدر اونچی تھی۔ مگر ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے کروٹ بھی نہ لی۔ نوشا نے ڈر کے مارے چوں بھی نہ کی۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ جب سلطانہ اٹھ کر جانے لگی تو وہ جل کر بڑبڑایا۔

"حرامزادی۔"

سلطانہ نے اس کی گالی سن لی تھی مگر اب وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ خاموشی سے جا کر اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ نوشا ذرا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر گہری نیند سو گیا اور دن چڑھے تک سوتا رہا۔

❁ ❁ ❁

نوشا اس روز ڈیوٹی پر پہنچا تو دیر ہو گئی تھی۔ پھاٹک پر ورکشاپ کا چوکیدار گل خان بیٹھا ناک میں ہلاس چڑھا رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔ "خوتم اتنی دیری سے آتا ہے۔ سیٹھ بوت گرم ہوتا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ نیں تو۔" فوراً ہی اسے چھینک آ گئی۔ پھر کئی چھینکیں آئیں۔ اس کی بقیہ بات چھینکوں کی

ادموا: مرنے کے قریب۔ بکوٹا بھرنا: چٹکی بھرنا۔ ہلاس: نسوار، پسا ہوا خشک تمباکو۔

نذر ہو گئی۔

نوشا جھپاک سے احاطے میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچتے ہی اس نے چوکنا نظروں سے عبداللہ مستری کو تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ عبداللہ مستری کاروں کی مرمت کرنے والے ورکشاپ کا مالک تھا۔ کاریگروں کو سزا دینے کے معاملے میں دور دور تک اس کا شہرہ تھا۔ نوشا اِدھر اُدھر دیکھتا بھالتا، شیڈ کے نیچے پہنچ گیا جہاں دوسرے کاریگر کام کر رہے تھے۔ اس کے پہنچتے ہی ایک کاریگر زور سے کھنکار کر بولا۔

"ابے دیر سے آنا تھا تو سر سے تولا باندھ کر آتا۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ارے یار، یہ تو بڑا پکا ہے۔ ابے رات کونسی فلم دیکھی تھی؟"

"سالا روز سینما جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی شوقین سے ٹکر گیا۔"

"ارے اس کی کیا پوچھتے ہو۔ اس پر تو چاچا تو چلتے ہیں چاقو۔"

نوشا بگڑ کر بولا۔ "دیکھو جی! مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔"

ابھی اس پر ایک آدھ فقرہ اور چست ہوتا اسی اثنا میں عبداللہ مستری کی آواز سنائی دی۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ نوشا نے جلدی سے ایک پانا اٹھایا اور قریب کھڑی ہوئی کار کے نیچے گھس گیا اور خواہ مخواہ کھٹر پٹر کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عبداللہ مستری وہاں آ گیا۔ کاریگروں کی روح فنا ہو گئی۔ سب کے ہاتھ جلدی جلدی چلنے لگے۔ نوشا کار کے نیچے گھسا ہوا کھٹر پٹر کرتا رہا۔ اس کا نچلا دھڑ باہر نکلا تھا اور برابر جنبش کر رہا تھا۔ وہ تو صاف بچ گیا۔ ساری آئی گئی ایک اور کاریگر کے سر گئی۔ وہ بھی دیر سے پہنچا تھا۔ اس کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔

عبداللہ نے پہلی ہی نظر میں اسے بھانپ لیا۔ گردن ہلا کر بولا۔ "کیوں بے دیر سے آیا ہے؟"

ڈر کے مارے لڑکے کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ اس دفعہ عبداللہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "ابے کیا منہ پھوٹ گیا۔ بولتا کیوں نہیں؟"

وہ گھبرا کر بولا۔ "اماں نے روک لیا تھا۔"

عبداللہ نے ٹیڑھی سی گالی دے کر کہا۔ "اماں نے کیا اپنے کسی یار کے پاس بھیجا تھا؟"

اس سوال کا وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ صرف عبداللہ کا منہ ٹکر ٹکر تکنے لگا۔

جھپاک سے: فوراً، جلدی سے۔ روح فنا ہونا: انتہائی خوفزدہ ہونا۔ ٹکر ٹکر تکنے لگا: آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

عبداللہ غضب ناک ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ "سالوں کو کام بھی سکھاؤ۔ اوپر سے تنخواہ بھی دو اور یہ حرام کے تخم اس کا صلہ یہ دیتے ہیں کہ گھر سے نواب بن کر نکلتے ہیں۔"

اس نے ایک کاریگر کے ہاتھ سے پلاس چھینا اور لڑکے کی ناک اس میں رکھ کر زور سے بھینچ دی۔ وہ بلبلا کر چیخا۔

"ہائے مر گیا مستری جی!"

"تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"اب کبھی دیر سے نہیں آؤں گا۔"

وہ برابر چیختا رہا۔ فریاد کرتا رہا۔ مگر عبداللہ نے اس کی ناک نہ چھوڑی۔ جب وہ تکلیف سے بے قابو ہو کر فرش پر ہاتھ پاؤں پٹخنے لگا تو عبداللہ نے ڈانٹا۔

"سالے! یہ ایکٹنگ ہو رہا ہے۔"

وہ تڑپ کر چیخا۔ "ارے مر گیا مستری جی۔ اب کبھی نہیں کروں گا۔"

مستری زور سے گرجا۔ "سیدھا بیٹھ۔" لڑکا ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد عبداللہ نے پلاس کے شکنجے سے اس کی ناک آزاد کر دی۔ اب ناک ٹماٹر کی طرح سرخ نظر آ رہی تھی۔ لڑکا بار بار ناک چھوتا اور زور زور سے سسکیاں بھرتا۔

عبداللہ نے اس کی تکلیف پر توجہ دیئے بغیر اونچی آواز سے پکارا "منشی جی! اے منشی جی۔ ذرا یہاں تو آؤ۔"

فوراً ہی ایک سوکھا پتلا ادھیڑ آدمی ناک کی پھنگی پر عینک درست کرتا ہوا پہنچا۔

عبداللہ نے لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جی، آج کی اس حرام کے جنے کی تنخواہ نہیں لگے گی۔ سمجھ گئے؟"

منشی جی فوراً سمجھ گئے۔ جھٹ جواب دیا۔ "بہت بہتر، بہت بہتر۔ میں ابھی جا کر رجسٹر میں اس کی غیر حاضری لگائے دیتا ہوں۔"

لڑکے نے اطمینان کی سانس لی۔ سوچا اب تو جان بچ گئی۔ لیکن عبداللہ مستری اتنی آسانی سے کاریگروں کی خطا معاف کر دیتا تو پھر اس کا اس قدر شہرہ کیوں ہوتا۔ کہنے لگا۔

حرام کے تخم: ایک گالی۔ بھینچنا: دبانا۔ پٹخنا: زور زور سے مارنا۔ پھنگی: ناک کا سرا۔

"اچھا جی! اب تم کپڑے اتارو اور نلکے کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔ فی الحال تمھاری یہی سزا ہے۔"

کاریگر لڑکا گڑگڑانے لگا۔ مگر عبداللہ ایسی خوشامد سے کہاں پسیجنے والا تھا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔ "ابے اتارتا ہے کپڑے یا پھر دکھاؤں کال کوٹھری کا راستہ۔"

کال کوٹھری کا نام سنتے ہی لڑکے کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے گھبرا کر جلدی جلدی سارے کپڑے اتارے اور مادر زاد برہنہ ہو گیا۔

آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ہوا بھی بپھری ہوئی تھی۔ مہاوٹوں کی سردی تھی۔ خود عبداللہ موٹے اونی کپڑے کا اوور کوٹ پہنے تھا۔ سر اور کانوں کو مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لڑکے کا برہنہ جسم سردی سے کپکپانے لگا۔

عبداللہ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "ابے اس طرح کب تک چوتڑ کھولے کھڑا رہے گا۔ نلکے تلے جاتا ہے کہ نہیں۔"

نوعمر کاریگر نے بے بسی سے عبداللہ کی جانب دیکھا اور نظریں شرم سے نیچی کیے پائپ کے نیچے جا کر بیٹھ گیا جس کی ٹونٹی کھلی تھی اور پانی دھار بن کر گر رہا تھا۔

عبداللہ چلا گیا تو نوشا نے چوہے کی طرح موٹر کار کے نیچے سے گردن نکالی اور باہر آ گیا۔ اس کے کپڑے گرد سے اٹ گئے تھے۔ چہرے پر سیاہی کے جگہ جگہ دھبّے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک کاریگر نے جو عمر میں دو تین سال بڑا ہو گا اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔

"استاد اب رشوت میں ایک پیار دلواؤ۔ نہیں تو ابھی تم کو بھی نلکے کے نیچے بھجواتا ہوں۔"

نوشا اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے چپ چاپ چہرہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کاریگر نے اس کے گالوں کا ایک بوسہ لیا۔ پھر برا سا منہ بنا کر فرش پر تھوک دیا۔

"سالے نے منہ کڑوا کر دیا۔ ابے یہ موبل آئل کہاں سے چپڑ لیا۔"

سب کاریگر کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسنے لگے۔

❁ ❁ ❁

لیمپ کی دھندلی روشنی میں سلطانہ گردن جھکائے قینچی سے بیڑی کے پتے کاٹ رہی تھی۔

پسیجنا: رحم کرنا۔ اوسان خطا ہو جانا: حواس درست نہ رہنا۔ مادر زاد برہنہ: بالکل ننگا۔ مہاوٹ: بارش جو سردیوں کے مہینوں میں ہوتی ہے۔ چپڑ لیا: لگایا۔

قریب ہی ماں بیٹھی تھی جو کٹے ہوئے پتوں میں تمباکو بھر بھر کر بیڑیاں بنا رہی تھی۔ دونوں سے ذرا ہٹ کر انّو کاپی پر جھکا ہوا لکھنے میں منہمک تھا۔ نوشا سب سے الگ تھلگ کونے میں لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔

کمرے میں دیر سے خاموشی چھائی تھی۔

آخر ماں نے سکوت توڑا۔ انّو کو مخاطب کیا۔ "انّو! دیکھ کل سویرے ہی سویرے اٹھ کر کارخانے جانا۔ ملک جی سے کہنا سارا پچھلا حساب صاف کر دو۔"

انّو نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے جواب دیا۔ "اچھا اچھا۔"

ماں نے پھر کہا۔ "بھولنا مت۔ پورا حساب لے کر آنا۔ نہیں تو گھر میں فاقہ پڑ جائے گا۔ میرے پاس اب ایک پیسہ نہیں رہا۔ اور ہاں ان سے یہ بھی کہہ دینا۔ شام تک ہزار بیڑیاں پہنچ جائیں گی۔ سمجھ گیا نا؟"

اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ وہ رک رک کر اپنی بات کہتی رہی۔ ذرا دیر خاموش رہی پھر نہ جانے کیا سوچ کر بولی۔

"آ بیڑیوں کے بنڈل بنا بنا کر تاگا لپیٹتا جا۔"

انّو نے احتجاج کیا۔ "میں اسکول کا کام کر رہا ہوں۔ کام پورا نہیں ہوا تو کل ماسٹر صاحب بنچ پر کھڑا کر دیں گے۔"

مگر ماں نے اس کی ایک نہ سنی۔ ڈپٹ کر بولی۔ "چل باتیں نہ بنا۔ بڑا آیا پڑھنے والا۔ بہت ہو چکی پڑھائی۔ پہلے پیٹ کا دھندا کر۔ کھانے کو نہیں ہوگا تو سب سے زیادہ تو ہی فیل مچائے گا۔"

انّو بادل ناخواستہ اٹھا اور ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بیڑیوں کے بنڈل تیار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد گلی میں گیدڑ کے بولنے کی آواز ابھری۔ نوشا جو آٹو ورکشاپ سے واپس آنے کے بعد ابھی تک تھکا ہوا سا لیٹا تھا، جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سلطانہ نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا اور ماں کو مخاطب کیا۔

"اماں آج تو سر شام ہی گیدڑ بولنے لگے۔"

ماں لاپرواہی سے بولی۔ "توبہ کرو بیٹی! اس وقت کہاں سے گیدڑ آ گئے۔"

نوشا فوراً بیچ میں بول اٹھا۔ "نہیں اماں! آواز تو گیدڑ کی معلوم پڑتی ہے۔ جا کر بھگا آؤں۔"

منہمک: مصروف۔ سکوت: خاموشی۔ بے نیازی: لاپروائی۔ ڈپٹ کر: ڈانٹ کر۔ پیٹ کا دھندا: محنت مزدوری۔ فیل مچانا: شور ڈالنا۔

"چل بیٹھ۔ بڑا آیا گیدڑ بھگانے والا"۔ ماں نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیوں نہیں کہتا۔ وہ تیرا سگا باہر کھڑا ابلا رہا ہے۔ دیکھ میں تجھ سے ہزار بار کہہ چکی ہوں۔ اس حرامی راجہ کی صحبت چھوڑ دے۔ نہیں تو سر پر ہاتھ دھر کر روئے گا۔"

نوشا کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ دیر تک پڑا سلطانہ کو کوستا رہا جو شوخی سے بار بار اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ نوشا کا بس چلتا تو اس کے منہ پر ایسا زناٹے کا تھپڑ رسید کرتا کہ ساری ہنسی نکل جاتی۔

(۲)

گلی کی دھندلی دھندلی روشنی میں راجہ بار بار حلق سے گیدڑ کی آواز نکالتا رہا۔ ہر بار وہ دروازے کی جانب دیکھتا۔ مگر اس روز دروازہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ وہ دیر تک نوشا کا انتظار کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

راجہ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے پہنچا۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ محلّے کے کسی لڑکے کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ دن بھر بادل چھائے رہے۔ شام کو بوندا باندی بھی ہوئی۔ اب ہوا کے جھکّڑ چل رہے تھے۔ راجہ کے پاس اس روز پیسے بھی زیادہ نہ تھے۔ ورنہ سنیما ہی چلا جاتا۔ سوچا تھا کہ نوشا مل جائے گا تو دونوں مسلم ہوٹل میں ایک ایک کڑک چائے پئیں گے اور ریڈیو سے فلمی گانے سنیں گے۔

راجہ نے لالٹین کے نیچے کھڑے ہو کر زور زور سے گیدڑ کی آواز نکالی۔

"ہُکّا ہوا، ہُکّا ہوا۔"

گہری خاموشی میں دیر تک اس کی آواز گونجتی رہی۔ مگر کوئی دروازہ نہ کھلا۔ کوئی باہر نہ نکلا۔ وہ جل کر بڑبڑانے لگا۔ "آج سب سالے مر گئے۔" اسی جھنجلاہٹ کے عالم میں وہ مسلم ہوٹل کی طرف چل دیا مگر اس وقت ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا جب تک خبریں چلیں اتنی دیر کیوں نہ چمپی کرا لی جائے؟ سر میں کچھ درد بھی تھا۔ چمپی کرنے والا ایک نوجوان مالشیا مسلم

صحبت: ساتھ، دوستی۔ زناٹے کا: زوردار۔ ہُو کا عالم: ویرانہ، خوفناک جگہ۔ چمپی: مراد سر کی مالش۔

ہوٹل کے باہر ہی بیٹھا تھا۔

راجہ نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "ابے ہوتی ہے کچھ چمپی ومپی؟"

وہ جھٹ بولا۔ "ابھی لو!" اور تیل کی شیشیاں سنبھال کر سامنے آ کھڑا ہوا۔

راجہ نے پوچھا۔ "مگر یہ تو بتا۔ لے گا کیا؟"

"یار جو جی چاہے دے دینا۔"

"میرے پاس ایک دوّنی ہے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

اس نے لحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ "چل یار تو بھی کیا یاد کرے گا؟"

راجہ وہیں چائے خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ چمپی کرنے والے نے شیشی سے تیل نکال کر راجہ کے سر میں ڈالا اور مالش شروع کر دی۔ اس کی انگلیاں نرم تھیں اور ہاتھ پھرتی سے چل رہے تھے۔ راجہ نے چمپی کراتے کراتے بے نیازی سے پوچھا۔ "کیوں جی! روزانہ تم کو کیا مل جاتا ہوگا؟"

"بس یار! یہ نہ پوچھ کیا مل جاتا ہے۔"

راجہ اصرار کرنے لگا۔ "پھر بھی؟"

"یہی روپیہ ڈیڑھ روپیہ روز پیٹ لیتا ہوں۔"

"ابے تو یہ کچھ کم ہے۔" راجہ نے حیرت سے کہا۔ "کسی کا گھر لوٹنے کا ارادہ ہے؟"

"کم تو نہیں، پر محنت بڑی ہے۔"

راجہ بولا "ابے کیا محنت ہے۔ میں سیکھوں تو سکھا دے گا؟" واقعی وہ اس کے لیے آمادہ بھی تھا۔

"یار کیا کرے گا سیکھ کر۔ سالا بڑا واہیات دھندا ہے۔"

"واہیات کی اس میں کونسی بات ہے؟"

وہ بے زاری سے بولا۔ "بس کہہ دیا کہ ہے۔"

راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے صاف صاف بتا۔ آخر بات کیا ہے؟"

وہ مسکرانے لگا۔ "تو پھر اس آدمی سے پوچھ لو۔"

راجہ نے اس آدمی کی جانب دیکھا جو برابر کی دکان کے تھڑے پر بیٹھا اپنی ران کھجا رہا تھا۔ راجہ نے اس سے تو کوئی بات نہیں کی۔ البتہ چمپی کرنے والے سے دریافت کیا۔

توقف: انتظار، وقفہ۔ پیٹ لیتا ہوں: کما لیتا ہوں۔

"ابے اس سے کیوں پوچھوں۔ تو کیوں نہیں بتاتا؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "وہ بالکل ٹھیک بتا سکتا ہے۔" اس نے اس شخص کو مخاطب کیا۔ "اماں خان صاحب! یہ راجہ تم کو پوچھ رہا ہے۔"

خاں صاحب نے ران کھجاتے کھجاتے راجہ کی طرف دیکھا۔ ہنس کر بولا۔ "روپیہ ایک عدد کلدار ملے گا۔ بول چلتا ہے؟"

راجہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کہاں؟"

اس نے بد معاشی سے آنکھ مار کر کہا۔ "واہ جان من! اب یہ بھی سمجھانا پڑے گا۔" اور راجہ کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اس نے غضب ناک ہو کر موٹی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"سالے حرامی پن کرتا ہے۔ ابھی ساری بد معاشی نکال کر رکھ دوں گا۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "ابے میں نے تجھ سے کہا بھی کیا ہے۔"

راجہ نے اسی طرح کڑک کر کہا۔ "سالے یہاں لونڈوں کو پٹانے آتے ہو۔"

"ابے جائے گا یا کچھ لے گا۔ خواہ مخواہ سر ہوئے جا رہا ہے۔" اس نے راجہ کو دھمکی دی۔ مگر راجہ ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا اور چیخ چیخ کر گالیاں دیتا رہا۔ شامت اعمال چمپی کرنے والا بھی خان صاحب کی حمایت میں بول اٹھا۔

راجہ اس کے سر ہو گیا۔ غصے سے اس کی تیل کی شیشیاں توڑ ڈالیں۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خاں صاحب بہت سٹ پٹائے۔ بڑی مشکل سے راجہ کو منایا۔ منت سماجت بھی کی اور گالیاں بھی کھائیں۔

راجہ نے جھنجھلاہٹ میں چائے بھی نہیں پی اور اپنی کھولی کی جانب چل دیا۔

❁ ❁ ❁

کھولی میں گھپ اندھیرا تھا۔ یہ کھولی ایک شکستہ عمارت میں تھی جو پچھلی برسات میں منہدم ہو گئی تھی۔ راجہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی بوڑھے گداگر نے

کلدار روپیہ: مراد روپے کا سکہ۔ کڑک کر: زوردار آواز میں۔ مرعوب ہوا: رعب میں آیا۔ شامتِ اعمال: گناہوں کی سزا، بدبختی۔ سر ہونا: پیچھے پڑنا۔ سٹ پٹانا: گھبرانا۔ کھولی: کوٹھری۔ منہدم ہو گئی: گر گئی۔

کھانسنا شروع کر دیا۔

راجہ نے پوچھا۔ "اماں استاد! تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

وہ کھانستے کھانستے بولا۔ "باپ رے باپ۔ آج تو غجب کی سردی پڑ رہی ہے۔ جرا دروا جا تو بند کر دے۔ اور دیکھ وہ کونے میں جو چدر پڑی ہے۔ مجھے اڑھا دے۔"

اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ راجہ نے ماچس جلائی تو سامنے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بوڑھا فرش پر گٹھری بنا ہوا دکھائی دیا۔ روشنی کے ساتھ ہی ایک چمگادڑ کھولی میں تیزی سے چکر کاٹنے لگی۔ راجہ نے کونے میں پڑی ہوئی چادر اٹھائی اور گداگر کے اوپر ڈال دی۔ گداگر اپنے کوڑھ کے زخموں کو کھجڑ کھجڑ کھجاتے ہوئے بولا۔

"آج تو جلدی آ گیا۔ سردی لگی ہوگی۔ باہر جھکڑ چل رہے ہیں۔"

راجہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازہ بند کیا اور اپنی گدڑی کے اندر گھس گیا۔ اس وقت غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ راجہ کو ایسا محسوس ہوا گویا گدڑی پانی میں بھیگ گئی ہے اور اس کا سارا بدن منجمد ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے کھلنڈرے پن سے ہو ہو کر کے حلق سے بے ہنگم آوازیں نکالیں اور دونوں گھٹنے سکیڑ کر سینے سے لگا لیے۔ بڑی دیر بعد راجہ کو نیند آئی۔

سویرے ہی سویرے گداگر نے کمر پر لات مار کر راجہ کو جگا دیا۔ آنکھ تو کھل گئی مگر وہ دم سادھے خاموش پڑا رہا۔ گداگر کی دوسری لات اس کے کندھے پر لگی۔ اب ٹالنا مشکل تھا۔ بوڑھا بخشنے والا نہیں تھا۔ لاتیں بھی مارتا اور شام کو اٹھنّی دینے میں نخرے الگ کرتا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ بوڑھے گداگر نے کھولا تھا یا رات گئے تیز ہوا سے پٹ ہٹ گیا تھا۔ باہر ہر طرف گہری دھند چھائی تھی۔ دھندلی دھندلی نیلگوں روشنی میں گداگر بھوتوں کی طرح ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔ اس کی گندی ڈاڑھی بکھری تھی اور سر کے بال الجھ کر آنکھوں پر آ گئے تھے۔ وہ اپنے رستے ہوئے زخم کھجا رہا تھا۔

راجہ نے کھولی سے لکڑی کی چھوٹی سی گاڑی باہر نکالی۔ گداگر کو اس میں بٹھایا اور گاڑی کھینچتا ہوا آگے چل دیا۔ بوڑھا تو اپنی چادر اوڑھ کر مزے سے گاڑی کے اندر بیٹھا رہا۔ مگر راجہ صرف ایک پھٹی ہوئی قمیص پہنے تھا۔ اس کا جسم صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لرز رہا تھا۔ اسے سردی سے ٹھٹھرتے دیکھ

گدڑی: بستر۔ منجمد: برف کی طرح جما ہوا۔ کھلنڈراپن: مراد لاپروائی کا انداز۔ ٹھٹھرنا: سردی سے کانپنا۔

کر گداگر نے منہ بگاڑا۔

"ابے یہ روز روز جو تو سنیما جاتا ہے۔ کیوں بے فضول پیسہ برباد کرتا ہے۔ ایک گرم کوٹ کسی پرانے کپڑے بیچنے والے سے کیوں نہیں خرید لیتا؟ دیکھ تو کیسی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔"

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ گاڑی کھینچتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔ سارا شہر نیلگوں کہر کے جال میں الجھا ہوا ابھی تک سو رہا تھا۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی، سناٹا تھا، خاموشی تھی اور اس گہرے سکوت میں آہستہ آہستہ ابھرتی ہوئی آمد صبح کی پہلی آوازیں مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ گداگر نے اپنی مخصوص صدا لگائی۔

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

گداگر کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ صبح کی گہری خاموشی میں اس کی صدا بڑی دردناک معلوم ہو رہی تھی۔ مگر راجہ پر اس دردناک صدا کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اگر کوئی احساس تھا تو سردی کا۔ وہ گاڑی کھینچتا ہوا اللہ دیا کے چائے خانے کے سامنے پہنچ گیا۔ اندر بھٹی میں انگارے دہک رہے تھے کبھی کبھی کوئی کوئلہ زور سے چٹختا تو سرخ روشنی کی لکیر دور تک لہرا جاتی۔ بھٹی کے اوپر سماوار رکھا تھا۔ سماوار سے ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی۔

راجہ نے گاڑی کی رفتار سست کر دی۔ گداگر گڑگڑا کر اللہ دیا کو دعائیں دینے لگا۔ "اللہ کاروبار میں برکت دے۔" مگر اللہ دیا، جسے اس وقت دعاؤں کے بجائے گاہکوں کی ضرورت تھی، بے رخی سے بولا۔

"بابا آگے جاؤ۔"

راجہ نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اندر چائے خانے میں اللہ دیا بڑبڑا رہا تھا۔ "سالے صبح ہی صبح نازل ہو گئے۔ نہ بوہنی نہ بٹا پہلے ان کو دے دو۔"

گداگر نے اس کی بڑبڑاہٹ سن کر راجہ سے کہا۔ "ابے تو نے بھی کس سالے نسوڑھئے کے پاس گاڑی روکی۔"

بلا کا: بہت زیادہ۔ سوز: درد۔ صدا: آواز۔ سماوار: پانی گرم کرنے کا برتن۔ نہ بوہنی نہ بٹا: مراد آمدنی ابھی بالکل نہیں ہوئی۔

راجہ نے بیزاری سے جواب دیا۔ "سوچا تھا، سالا ایک چائے تو پلا ہی دے گا۔"

گداگر نے فوراً کہا۔ "ابے تو نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی؟ پیسے دیتے تو اس کا باپ بھی چائے پلاتا۔ چل تجھے ابھی چائے پلاتا ہوں۔ اوہو ہو! بھئی جبردست سردی ہے۔" اس کے دانت سردی سے بج رہے تھے۔

آگے بڑھ کر وہ ایک اور چائے خانے کے قریب پہنچے دونوں نے ایک ایک پیالی گرم گرم چائے کی چڑھائی اور تازہ دم ہو کر پھیری پر چل دیئے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک راہ گیر نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک سکّہ گداگر کے پیالے میں ڈالا۔ ٹن سے آواز ابھری۔ بوڑھے نے ٹٹول کر اسے اٹھایا۔ خوش ہو کر بولا۔ "اکنّی جان پڑتی ہے۔" اس نے چپکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اکنّی اٹھا کر دیکھی اور بڑبڑانے لگا۔

"مجھے تو کھوٹی لگے ہے۔ جرا تو دیکھ راجہ۔"

راجہ نے اکنّی اس کے ہاتھ سے لے کر غور سے دیکھی اور واپس دے کر بولا۔ "ایک دم کنڈم ہے۔"

گداگر جل کر بولا۔ "یارو کیا جمانہ آگیا ہے۔ اب تو پبلک اللہ میاں سے بھی چار سو بیسی کرنے لگی۔" وہ رک رک کر بڑبڑاتا رہا۔ "آج کا دن تو منحوس لگے ہے۔ سالی سویرے سے نسیٹھ پر نسیٹھ ہو رہی ہے۔"

مگر وہ دن دونوں کے لئے منحوس ثابت نہ ہوا۔ کچھ ایسے بھی اللہ کے بندے مل گئے جن کے دل میں خوفِ خدا تھا اور جو خیرات دے کر اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے تھے۔ دوپہر تک روپے سوا روپے کی ریزگاری اکٹھا ہو گئی۔ ایک محلے میں کسی مرنے والے کا چالیسواں تھا۔ دونوں نے ٹھاٹھ سے فاتحہ کی خمیری روٹیاں اور سالن کھایا۔ ذرا دیر دھوپ میں بیٹھ کر آرام کیا اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں جب شہر کی ایک صاف ستھری سڑک سے گزر رہے تھے تو ایک شخص نے، جو وضع قطع سے ڈاکٹر لگتا تھا، راجہ کے برابر لمحے بھر کے لیے رک کر پوچھا۔ "اے بچّے، تم اس بوڑھے کے ساتھ کب سے ہو؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر گداگر کی جانب دیکھا جو آنکھیں بند کئے مردوں کی طرح نڈھال پڑا تھا اور اپنے زخموں کو لنجی لنجی انگلیوں سے کرید رہا تھا۔

چار سو بیسی: فراڈ، دھوکا۔ نسیٹھ: نحوست۔ لنجی: ٹیڑھی۔

"تم اس بوڑھے کا ساتھ چھوڑ دو۔ اسے کوڑھ کا مرض ہے۔ یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔"

اس نے نزدیک کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا۔ اسٹیرنگ وھیل سنبھالا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

جب کار آگے بڑھ گئی تو بوڑھے کوڑھی نے گندی سی گالی دے کر راجہ سے کہا۔ "سالے نے پیسہ ایک نہیں دیا۔ نصیحت ڈھیر بھر کر دی۔ اب اس مرغی کے جنے سے پوچھو کہ خالی نصیحت سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ دھت تیرے۔" گداگر نے پھر گالی دی۔

راجہ نے سوچا۔ بوڑھا ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ خالی نصیحت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ جب کوئی کام دھندا نہیں ملا تب ہی تو اس نے گداگر کی نوکری کی تھی۔ اب اسے دونوں وقت پیٹ بھرنے کو کھانا ملتا تھا۔ روزانہ اٹھنّی دہاڑی کی اور اس کے علاوہ گداگر کی نظر بچا کر جو پیسے بھیک سے اڑا لیتا، وہ آمدنی الگ تھی۔

دن بھر راجہ، بوڑھے گداگر کو گاڑی میں ڈال کر شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ بوڑھا اپنی دردناک صدا بلند کرتا رہا۔ گاڑی کے پہیے اونچے نیچے راستوں پر کھڑکھڑاتے رہے۔ گداگر جب ایک کروٹ پڑے پڑے تھک جاتا تو دوسرا پہلو بدلتا۔ کوئی سنسان جگہ آتی۔ راجہ دم لینے کو ٹھہر جاتا۔ سگریٹ سلگا کر دو چار کش لگاتا اور تازہ دم ہو جاتا۔

صبح کے نکلے ہوئے دونوں تھکے ہارے کھولی میں واپس پہنچے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ بازاروں کی رونق اجڑنے لگی تھی۔ گلی کوچوں میں سناٹا پڑ گیا تھا۔

کھولی میں پہنچتے ہی راجہ نے حسبِ معمول اپنی دہاڑی مانگی۔ بوڑھا اٹھنّی دینے میں حسبِ معمول ٹال مٹول کرنے لگا۔ "ابے تو ان پیسوں کو برباد کر دے گا۔ میرے کنے پڑے رہنے دے۔ تیرے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔"

راجہ ضد کرنے لگا۔ "نہیں میں تو ابھی لوں گا۔"

گداگر جل کر بولا۔ "سالے مرے گا تو کفن بھی بھیک ہی کا پڑے گا۔"

"دیکھو استاد! اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ سیدھے ہاتھ سے اٹھنّی نکال کر دو۔"

آخر گداگر نے ٹٹول ٹٹول کے آٹھ آنے کی ریزگاری گنی اور راجہ کے ہاتھ میں رکھ کر ایک گالی بھی دی۔ پیسے ملتے ہی راجہ نے زغند بھری اور کھولی سے باہر چلا گیا۔

نظر بچا کر: چوری چھپے۔ کنے: پاس۔ زغند: چھلانگ۔

(۴)

میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے صرف شامی بیٹھا تھا۔ محلے کے دوسرے لڑکے نہ جانے کہاں تھے۔ راجہ اس کے قریب سے گزرا۔ مگر کوئی بھی نہ بولا۔ اس رات کے جھگڑے کے بعد دونوں میں اب تک بات چیت بند تھی۔

راجہ ٹہلتا ہوا گلی کے نکڑ تک چلا گیا۔ چلتے چلتے اس نے سوچا۔ شامی سے اب صلح کر لینا چاہیے۔ لہٰذا واپسی پر لالٹین کے پاس دوبارہ آیا تو بے نیازی سے پوچھا۔

"ابے شامی! یہ سالا نوشا آج کہاں مر گیا؟"

شامی بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ اس نے جھٹ جواب دیا۔ "اس کی اماں نے پکڑ کر بٹھالیا ہوگا۔"

راجہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "یار! نوشے کی ماں، سالی ایک نمبر چنڈال ہے۔ باپ رے باپ۔ اس طرح زور زور سے چیختی چلاتی ہے کہ اس سے تو ڈر لگتا ہے۔"

شامی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یار تاش ہو تو نکال۔ ذرا دو چار ہاتھ ہو جائیں۔"

راجہ نے فوراً پتلون کی جیب سے گڈی نکالی اور تاش کے پتوں کو پھینٹنے لگا۔

"دیکھو استاد! ٹرک بازی نہیں چلے گی۔ ورنہ میں نہیں کھیلوں گا۔ بیکار میں جھگڑا ٹنٹا ہو جاتا ہے۔" شامی نے اسے خبردار کیا۔

راجہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ "نہیں بے۔ اس روز تو میں ذرا مجاخ کر رہا تھا۔ خاماخا کا پھڈا ہو گیا۔"

دونوں اطمینان سے بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ ایک بار شامی نے جھک کر زور سے پتا مارا اور جھوم کر بولا۔ "کہو استاد کیسی رہی؟"

اسی وقت اس کے سر پر دھڑ سے جوتا پڑا اور گرج دار بھاری آواز ابھری۔ "اور یہ کیسی رہی؟"

چنڈال: ہندوستان کا ایک کم ذات قبیلہ، بدذات۔ ٹرک بازی: دھوکا، فریب۔

شامی نے گھبرا کر دیکھا۔ اس کا باپ پشت پر کھڑا خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جوتا تھا اور چہرہ غصے سے ڈراؤنا ہو رہا تھا۔ شامی کی سٹی گم ہو گئی۔ باپ نے جوتے کا دوسرا ہاتھ گھمایا۔ مگر شامی گردن جھکا کر سر کو صاف بچا گیا۔ تاش چھوڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ باپ نے ڈپٹ کر کہا۔

"ٹھہر جا حرامی! نہیں تو کھال ادھیڑ دوں گا۔"

مگر شامی اب کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ اس نے زغند بھری اور آنکھ جھپکتے ہی دور جا پہنچا۔ گلی کا چکر کاٹ کر وہ سیدھا گھر گیا۔ باپ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ماں نے اسے دیکھا تو سمجھ گئی کہ باپ سے مڈبھیڑ ہو گئی، جب ہی اتنا خوف زدہ نظر آرہا ہے۔ اس نے شامی کو دو چار کوسنے دیئے اور کوٹھری کی جانب دھکا دے کر بولی۔

"اب منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا جلدی سے چھپ جا۔ ورنہ تیرا ابا وا آج ہڈی پسلی توڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

شامی جلدی سے کوٹھری میں گھس گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد باپ گھر کے اندر آیا اور شامی کو ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ اس کی گالیوں کی آواز گھر کے سناٹے میں ابھرتی رہی۔ شامی کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ وہ سہما ہوا کوٹھری میں بیٹھا رہا۔ دروازے پر ذرا بھی آہٹ ہوتی تو اس کا دل اچھل پڑتا۔

بہت دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماں سرگوشی میں آہستہ آہستہ اسے آواز دے رہی تھی۔ شامی نے دروازہ کھولا۔ وہ اسے باورچی خانے میں لے گئی۔ بازو میں غصے سے بکوٹا بھر کر بولی۔

"لے کچھ ٹھونس لے۔ صبح سے اب تک بھوکا پیاسا پھر رہا ہے۔ کم بختوں نے میری زندگی حرام کر دی۔"

وہ بیٹھی اپنی قسمت کو کوستی رہی اور شامی لمبے لمبے لقمے حلق کے نیچے جلدی جلدی اتارتا رہا۔ بار بار اس کی سہمی ہوئی نظریں کمرے کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ ڈرنے کی بات ہی تھی۔ مار کے معاملے میں وہ بڑا جلاد تھا۔ جو چیز ہاتھ میں آتی کھینچ مارتا۔ کئی دفعہ اس کی مار سے شامی کا سر اور پیشانی لہولہان ہو چکے تھے۔ اس روز وہ خوف کے مارے باپ کے کمرے میں نہیں سویا۔ بلکہ ماں سے رضائی لے کر کوٹھری کے اندر جا کر پڑ گیا۔

سٹی گم ہونا: گھبرانا، بوکھلانا۔ بگٹٹ: بہت تیز۔ آنکھ جھپکتے ہی: فوراً ہی۔ کوسنا: بددعا دینا، برا بھلا کہنا۔ جلاد: مراد ظالم۔

سویرے کسی کے اٹھنے سے پہلے ہی شامی گھر سے باہر نکل گیا۔ بغلوں میں ہاتھ دبائے سردی سے ٹھٹرتا اخبار کے دفتر پر پہنچا۔ مگر اخبار ابھی چھپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اخباروں کا بنڈل اٹھایا اور سڑکوں پر آواز لگانے لگا۔

"آ گیا، آ گیا، آج کا تازہ اخبار آ گیا۔"

سنسنی خیز خبروں کی سرخیاں چیخ چیخ کر سناتا ہوا وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ ابھی بہت سے ٹھکانوں پر اسے اخبار پہنچانا تھا۔ ہر گھر پر وہ اخبار کھڑکی کے راستے یا دروازے کی جھری سے اندر پھینک دیتا اور جلدی سے آگے بڑھ جاتا۔ جہاں دروازہ کھلوائے بغیر چارہ کار نہ ہوتا وہاں آواز لگاتا۔ "اخبار والا۔" اسی طرح گھروں پر اخبار پہنچاتا ہوا جب ایک مکان پر پہنچا تو آواز لگاتے ہی ایک شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس وقت وہ تولیے سے اپنا چہرہ پونچھ رہا تھا۔

شامی کو دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "تم اتنی دیر سے اخبار کیوں لاتے ہو؟"

شامی معذرت کرنے لگا۔ "آئندہ جلدی لاؤں گا جی۔ آج اخبار ذرا دیر سے چھپا تھا۔" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ لیکن اس شخص نے اخبار اٹھا کر اس کے منہ پر پھینک دیا۔

"لے جاؤ اپنا اخبار۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

"کہہ رہا ہوں اب اتنی دیری نہیں ہوگی۔"

وہ بگڑ کر بولا۔ "بس کہہ دیا کہ اخبار نہیں چاہیے۔ کیوں بیکار میں دماغ کھائے جا رہا ہے؟" شامی ملزموں کی طرح گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جب وہ شخص دروازہ بند کرنے لگا تو شامی نے دبی زبان سے کہا۔

"ساب! پچھلے مہینے کا پیمنٹ ابھی تک نہیں ہوا۔"

وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "بھاگ جاؤ۔ کوئی پیمنٹ ویمنٹ نہیں ہوگا۔ الو کے پٹھے!" اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

شامی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر اس نے سوچا اگر کوئی جھگڑا ٹنٹا ہو گیا تو دوسری جگہ بھی اخبار دیر سے پہنچے گا اور وہاں بھی ڈانٹ پڑے گی۔ ورنہ وہ اپنا پیمنٹ تو کھڑے کھڑے وصول کر لیتا۔

وہاں سے بڑھ کر وہ اپنے دوسرے ٹھکانوں کی جانب چل دیا۔ لیکن اس کے لیے سب سے بڑا

تیوری میں بل ڈالنا: غصے ہونا، ناراض ہونا۔

مرحلہ اس انجینئر کا بنگلہ تھا جہاں ایک خطرناک السیشن پلا تھا۔ اسے دیکھتے ہی غرا کر بھونکنا شروع کر دیتا۔ اس کی آواز اس طرح نکلتی گویا گنبد کے اندر گونج رہی ہو۔ جیسے ہی شامی پھاٹک پر پہنچتا وہ بھونکتا ہوا اس کی طرف جھپٹتا۔ ایک بار تو اس پر اس طرح جھپٹ کر سوار ہو گیا کہ خوف کے مارے شامی کی گھگی بندھ گئی۔ وہ شاید اس بنگلے پر کبھی اخبار نہ لگاتا مگر بات یہ تھی بل ادا کرنے کے معاملے میں انجینئر بڑا کھرا گاہک تھا۔ کبھی پیمنٹ نہیں رکا۔ یہی وجہ تھی کہ کتے کے خوف کے باوجود وہ نہایت پابندی سے اخبار پہنچاتا رہا۔

نو بجے کے قریب وہ اخبار بیچ کر تھکا ہارا گھر پہنچا تو ماں نے کمر بھی سیدھی نہ کرنے دی۔ کہنے لگی۔ "جا جلدی سے دکان چلا جا۔ آج تیرے باپ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔" وہ چپ چاپ دکان کی جانب روانہ ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

شامی کا باپ بساطی تھا۔ بازار میں اس کی چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ دکان پر بیٹھا رک رک کر کھانس رہا تھا۔ شامی پہنچا تو باپ نے صرف تیکھی نظروں سے دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ شامی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ مصیبت اس کے سر سے صاف ٹل گئی۔ وہ خاموشی سے دکان پر جا کر بیٹھ گیا۔

اس وقت دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد سات آٹھ سال کی ایک لڑکی سیپ کے بٹن خرید کر لے گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی۔ کہنے لگی۔ "سیپ کے نہیں پلاسٹک کے بٹن چاہیے ہیں۔" شامی نے پلاسٹک کے بٹن دے دیئے مگر چند ہی منٹ بعد لڑکی پھر موجود تھی۔ اس دفعہ اسے بڑے بٹن درکار تھے۔ شامی نے بٹن تو دے دیئے مگر جل کر اس کے ہاتھ میں چٹکی بھر لی۔ وہ تلملا کر چیخی تو باپ کو بھی اس کی اس حرکت کا پتہ چل گیا۔ اس نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔

"ابے او حرام کے تخم! تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا؟"

وہ دیر تک گالیاں دیتا رہا اور شامی خاموش بیٹھا گالیاں سنتا رہا۔ اس کا باپ دمے کا مریض تھا۔ وہ دکان پر بیٹھا تمام دن کھانستا رہتا یا شامی کو گالیاں دیتا۔ زیادہ غصہ آتا تو دو چار تھپڑ رسید کر دیئے۔ ایک آدھ لات ٹکا دی۔

گھگی بندھ جانا: ڈر کے مارے بول نہ سکنا۔ کھرا: عمدہ، صاف۔ بساطی: چھوٹی موٹی چیزیں بیچنے والا۔ تلملانا: تڑپنا، بے چین ہونا۔

دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ بازار میں پھیلنے لگا تھا۔ گاہکوں کی آمدورفت کم ہو گئی تھی۔ دکاندار لاپرواہی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ شامی کا باپ تو یوں بھی ہر وقت مجہولوں کی طرح پڑا رہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اسی اثنا میں برابر والی دکان کے بساطی نے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔

"اماں دلاور خان جمتی ہے؟"

یہ جوا کھیلنے کی دعوت تھی۔ شامی کے باپ نے فوراً جواب دیا۔ "یہاں کب انکار ہے؟"

وہ بولا۔ "تو پھر نکالو رقم۔"

شامی کے باپ نے گلے سے روپیہ نکالا۔ "لو یہ رہی رقم۔"

دونوں نے ایک ایک روپیہ نکالا۔ اپنا اپنا روپیہ صابن سے اچھی طرح دھو کر صاف کیا اور دکان کی گدّی کے سامنے ایک صاف جگہ پر رکھ دیا۔ دونوں ذرا ہٹ کر پاس پاس بیٹھ گئے اور پوری توجہ سے دیکھنے لگے کہ مکھّی کس کے روپے پر بیٹھتی ہے۔ شرط یہ بدی گئی کہ جس کے روپے پر پہلے مکھّی بیٹھ جائے وہ دونوں روپے اٹھالے۔

کچھ ہی دیر بعد ایک مکھّی اڑتی ہوئی آئی۔ "شامی کا باپ گردن ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ "آ آ آ جانی ادھر آ۔"

دوسری طرف سے بھی ایسی ہی آواز آئی۔ "ادھر کہاں چلیں چھبیلی۔ ادھر آ جان من ادھر۔ اے اے۔" مکھّی اس وقت شامی کے باپ کے روپے پر منڈلا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

"وہ آئی۔ وہ آئی۔ شیخ جی! آج تو دونوں روپے اپنی جیب میں گئے۔"

شیخ جی نے فوراً کہا۔ "ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار۔" مگر اس کا چہرہ فق ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے کہ مکھّی نے اس کے روپے کی جانب رخ ہی نہیں کیا۔

مکھّی بھی بڑی ستم ظریف تھی۔ شامی کے باپ کے روپے پر برابر منڈلاتی رہی۔ مگر بیٹھی

مجہول: مرا و نشئی۔ شرط بدنا: بازی لگانا، شرط لگانا۔ چھبیلی: خوش اندام۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو: (مثل) ابھی انتظار کرو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ فق ہونا: رنگ اڑ جانا، پریشان ہونا۔ ستم ظریف: ظالم۔

نہیں۔ شامی کے باپ کے دل کی دھڑکن کئی بار تیز ہوئی۔ کئی بار مسرت سے اس کی آنکھیں چمکیں۔ مگر بات نہ بنی۔ ادھر شیخ صاحب کی حالت دگرگوں تھی۔ مکھّی دوسری ہی طرف چکر کاٹ رہی تھی۔ ایک بار بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ مگر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو ڈھارس دیتا رہا۔

"بھائی وہ بیٹھے گی تو اسی روپے پر۔ بڑی کھری کمائی کا روپیہ ہے۔"

شامی کا باپ بگڑ کر بولا۔ "اور یہاں تو حرام کی رقم آتی ہے۔"

"اس کا پتہ تو ابھی چل جائے گا۔"

"اس طرح شیخی بگھارنے سے کام نہیں چلے گا۔ گنٹی والے شاہ جی سے روپیہ پڑھوا کر لاؤ۔ تب شاید کچھ ہو جائے۔ یہ روپیہ تو سمجھ لو اپنی جیب میں گیا۔"

مگر اس کا سارا طنطنہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ مکھی ایک بار پُھر سے اڑ گئی۔ شامی کا باپ جل کر بولا۔ "دھت تری کی۔" اس نے مکھّی کو ایک عدد گالی دے ڈالی۔ شیخ جی نے فوراً جلتی آگ پر تیل چھڑکا۔ "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ اب چاہے تم گالی دو یا ٹسوے بہاؤ۔ وہ تمہارے روپے پر بیٹھنے کے لیے آئی ہی نہیں تھی۔"

دونوں بچّوں کی طرح چہلیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے پر چوٹیں کس رہے تھے۔ اسی اثنا میں مکھّی پھر بھنبھناتی ہوئی آ گئی۔ وہی تھی یا کوئی دوسری۔ لیکن اس دفعہ جو آئی تو سیدھی شیخ جی کے روپے کی طرف۔

وہ اس طرح چمکارنے پچکارنے لگا جیسے وہ واقعی اس کی باتیں سن رہی ہو۔

"آ، آ پچ پچ۔ میری جان ایک بار تو کلیجہ ٹھنڈا کر دے۔"

مکھّی واقعی اس کے چمکارنے میں آ گئی۔ اس نے ایک بار پر سمیٹے اور عین اس کے روپے کے اوپر آ گئی۔ اسی وقت شامی کے باپ کو کھانسی کا ٹھسکا لگا اور وہ کھوں کھوں کر کے زور زور سے کھانسنے لگا۔ مکھّی فوراً اڑ گئی۔

شیخ جی نے جھنجلا کر کہا۔ "لگے تم چوٹا پن کرنے۔ اُڑا دیا نا کھانس کر۔"

"اماں کھانسی آ گئی تو میں کیا کروں۔" شامی کا باپ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"کچھ خدا کے غضب سے ڈرو۔ جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔ جان بوجھ کر کھانسے تھے۔"

دگرگوں: خراب۔ ڈھارس: حوصلہ، ہمت۔ طنطنہ: غرور۔ ٹسوے بہانا: جھوٹ موٹ رونا۔ چہلیں: ہنسی مذاق۔

بات بھی دراصل یہی تھی۔ شامی کا باپ مکھی کو بھگانے کے لیے کھانستا تھا۔ مگر یہ چال بازی وہ تسلیم کیسے کرتا۔ صاف مکر گیا۔ "اماں کھانسی کا تو بہانہ ہو گیا۔ وہ تمہارے روپے پر بیٹھنے والی ہی کب تھی؟"

دونوں بڈھوں میں ایک بار پھر نوک جھونک شروع ہو گئی۔ شامی ان کی حرکتیں بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ روزانہ دوپہر کو عام طور پر اسی طرح جوا ہوتا مگر ہار جیت کی نوبت شاذونادر ہی آتی۔ البتہ دونوں میں تکرار ہر بار ہوتی۔ اکثر گالی گلوچ بھی ہوتی۔ مگر دوسرے روز جہاں دوپہر ہوتی دونوں کو ہڑک اٹھتی۔ روپے نکالے جاتے اور صابن سے دھو کر رکھ دیے جاتے۔

مکھی شیخ جی کے روپے سے اڑ کر ایسی گئی کہ پھر نہ لوٹی۔ کسی دوسری مکھی نے بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ دوپہر کا سناٹا اور بڑھ گیا۔ بازار کی رونق مضمحل ہو گئی۔ دونوں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ انہوں نے اپنے اپنے روپے اٹھائے۔ آنکھیں بند کیں اور تھکے ہوئے سے لیٹ گئے۔

❋ ❋ ❋

دھوپ اب سامنے کے رخ پر آ گئی تھی۔ دوپہر کے سناٹے میں کبھی کبھی کوئی گاڑی پہیے کھڑکھڑاتی ہوئی گزر جاتی۔ بازار پر خاموشی چھائی تھی۔ صرف ٹرنک اور صندوق بنانے والے کارخانے میں دھڑا دھڑ ٹین کی چادریں پیٹنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ خالی بیٹھے بیٹھے شامی کا جی اکتا گیا۔ اس نے باپ کی جانب دیکھا۔ وہ بے خبر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ شامی اپنی جگہ سے اٹھا اور چپکے سے دکان کے باہر آ گیا۔

باہر تیز بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ موسم کچھ ایسا تھا کہ سائے میں بیٹھنے سے سردی معلوم ہوتی اور دھوپ میں سورج کی سلگتی ہوئی کرنیں جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتیں۔ دکان سے نکل کر شامی ٹہلتا ہوا بازار کے دوسرے نکڑ کی جانب چل دیا۔ وہاں نیم کا گھنا پیڑ تھا جس کے نیچے اکثر دوپہر کو راجہ گداگر کی گاڑی لا کر ٹھہراتا تھا۔ دونوں دھوپ میں بیٹھ کر جسموں کو حرارت پہنچاتے تھے اور کپڑوں سے جوئیں نکال کر مارتے تھے۔ راجہ اس وقت مل جاتا تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ کے دو چار کش لگا لیتا۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ یکایک بازار کے درمیان سے مڑنے والی گلی میں ملی جلی آوازوں کا شور

چال بازی: دھوکا۔ شاذونادر: کبھی کبھار۔ ہڑک: جوش، خواہش۔ مضمحل ہو گئی: مراد کم ہو گئی۔ بسنتی: زرد۔

ابھرا۔ شامی لپک کر گلی کے اندر گھس گیا۔ دیکھا مسجد کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا۔

"کیا ہو گیا؟"

وہ بولا۔ "چور پکڑا گیا ہے۔"

شامی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا چرایا تھا؟"

"سالا مسجد سے جوتے چرا رہا تھا۔"

شامی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اچھا!"

"ہاں جی، نمازی بے چارے تو ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے اور یہ سالا ان کے جوتوں کی تاک میں تھا۔"

شامی نے اس سے مزید کوئی بات چیت نہیں کی۔ آگے بڑھ کر مجمع میں گھس گیا۔ دیکھا، لمبے قد کا ایک آدمی لوگوں کے درمیان کھڑا ہے۔ اس کا سر ننگا تھا۔ وہ گندی سی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ دیکھنے میں بالکل سیدھا سادا لگتا تھا۔

شامی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورنے لگا۔ اس لیے کہ وہ صرف چور ہی نہیں تھا بلکہ اس نے اللہ میاں کے گھر میں چوری کی تھی۔ ابھی وہ چور کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ہجوم میں سے ایک ٹھگنا آدمی تہمد سنبھالتا ہوا نکلا اور اچھل کر چور کے منہ پر کس کے تھپڑ رسید کیا۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ پھر تو ہر طرف سے چور پر مار پڑنے لگی۔ طمانچے، مکے، لاتیں، ہر شخص بپھر بپھر کر اسے مار رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا، اور چور بالکل خاموش کھڑا مار سہ رہا تھا۔ نہ اس نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی نہ فریاد کے لیے گڑگڑایا۔ مزے سے کھڑا مار کھاتا رہا۔

اسی اثنا میں ایک بوڑھا وہاں آ گیا۔ اس کی سفید لمبی ڈاڑھی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو روکا۔ اونچی آواز سے بولا۔ "اس طرح مارنے سے کیا ہو گا۔ اسے تو ایسی سزا ملنی چاہیے کہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔"

اس نے سزا کے لیے جو اسکیم بتائی شامی غل غپاڑے میں سن نہ سکا۔ البتہ اس نے یہ ضرور دیکھا کہ ایک شخص ہاتھوں میں کالک بھرے ہوئے آیا اور چور کا سارا چہرہ سیاہ کر دیا۔ اب وہ واقعی

لپک کر: بھاگ کر۔ ٹھگنا: چھوٹے قد کا۔ غل غپاڑا: بے حد شور۔

خوفناک نظر آرہا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کہیں سے ایک گدھا بھی آگیا۔ چور کو گدھے پر بٹھا دیا گیا۔ گلے میں پرانے جوتوں کا ہار ڈالا گیا اور گدھے کو ہانک کر آگے بڑھا دیا گیا۔ پیچھے پیچھے لوگوں کا غول تھا۔ کچھ لونڈے لپاڑے ٹین کا ایک پیپا اٹھا لائے اور زور زور سے بجانے لگے۔ شامی بھی اس جلوس میں شامل ہو گیا۔ اس نے کئی بار لڑکوں سے پیپا چھین کر زور زور سے بجایا اور سب کے ساتھ مل کر نعرے لگائے۔ نعرے لگانے والے دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔

ایک گروہ گلا پھاڑ کر کہتا۔ "جوتے چور کا؟"

دوسرا گروہ جواب دیتا۔ "منہ کالا۔"

جلوس گلی سے نکل کر بازار میں آگیا۔ دکاندار اٹھ اٹھ کر چور کو دیکھ رہے تھے۔ جو ذرا زندہ دل تھے وہ دکانوں سے نیچے اتر کر جلوس میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر شخص ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ شامی کو بڑا لطف آرہا تھا۔ ایک بار اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ قہقہہ لگاتے ہی اس کی گدّی پر زناٹے کا ہاتھ پڑا۔ شامی چکرا کر گرتے گرتے بچا۔ پلٹ کر دیکھا۔ باپ بھوت کی طرح سر پر سوار تھا۔

جوتے چور کا جلوس تو پیپا بجاتا شور مچاتا آگے بڑھ گیا مگر شامی پر بیچ بازار میں دھڑا دھڑ جوتے پڑنے لگے۔ نہ جانے اس کے باپ کے مریل ہاتھوں میں کہاں سے قوت آگئی تھی۔ ایسے کس کس کے جوتے مار رہا تھا کہ شامی بلبلا کر سڑک پر لوٹنے لگا۔ آس پاس کے دکانداروں کو اس کی حالت پر ترس آگیا۔ قریب جا کر اس کے باپ کو سمجھانے بجھانے لگے۔

"اماں خاں صاحب! اب جانے بھی دو۔ بچّہ ہے آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔"

ایک نے بڑھ کر شامی کے باپ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ مگر وہ بار بار ہاتھ چھڑا کر شامی پر جھپٹتا۔

"چھوڑو جی، میں اس حرامی کی آج ہڈی پسلی برابر کر دوں گا۔ اماں ذرا آنکھ بچی اور یہ سالا دکان سے رفو چکر۔ حال یہ ہے کہ لوگ خدا کے گھر کو تو چھوڑتے نہیں۔ دکان تو پھر دکان ٹھہری۔ میاں سویا مرا برابر ہوتا ہے۔ کوئی اٹھا کر کچھ لے جائے تو اس سالے کی گرہ سے کیا جائے گا۔" وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا اور ساتھ ہی گالیاں بھی دے رہا تھا۔

دکانداروں نے منت سماجت کی۔ شامی کے باپ کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ قسمیں دیں کہ اب اور نہ

غول: ہجوم۔ گدّی: سر کا پچھلا حصہ۔ مریل: کمزور۔ رفو چکر ہونا: بھاگ جانا، چل دینا۔ گرہ: جیب۔

مارے۔ باپ نے اس کے بعد شامی کو مارا تو نہیں البتہ کئی بار جھنجلا کر مارنے کے لیے ضرور اٹھا۔ جب بھی شامی سسکی بھرتا وہ جل کر اسے گالیاں دیتا۔

شامی دکان پر بیٹھا دیر تک سسکیاں بھرتا رہا اور باپ کی گالیاں سنتا رہا۔ سہ پہر ہو گئی۔ بازار کی رونق لوٹ آئی۔ گاہک دکانوں پر منڈلانے لگے۔ ملی جلی آوازوں کا شور بڑھنے لگا۔ گاڑیوں کے پہیے پختہ سڑک پر کھڑکھڑانے لگے۔ اس شور و غل میں، اس گہما گہمی میں شامی اور اس کا باپ سب کچھ بھول گئے اور دکانداری میں الجھ کر رہ گئے۔

شام گزری۔ رات آئی۔ باپ نے دکان بند کی شامی کو تنبیہ کی۔ "میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تو سیدھا گھر کی طرف جانا۔"

شامی دکان سے نکل کر باپ کی ہدایت کے مطابق گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں نوشا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس وقت وہ اترا اترا کر چل رہا تھا۔ شامی کو دیکھتے ہی اس نے قمیص کی جیب سے دس دس کے دو کرارے کرارے نوٹ نکالے۔ گردن اکڑا کر بولا۔

"آج تو اپنے ٹھاٹھ ہیں۔"

شامی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "ابے کہاں سے مار لایا؟"

نوشا اسی طرح اترا کر بولا۔ "مار کہاں سے لاتا مجھے ملے ہیں۔"

شامی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "کہاں سے مل گئے؟ ابے اکٹھے بیس روپے۔"

نوشا پھر اترایا۔ "بس مل گئے۔"

شامی نے فوراً گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سامنے والے چائے خانے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ "تو پھر ہو جائے، کچھ چائے پانی۔"

"نہیں یار، آج نہیں، پھر کسی اور دن۔"

شامی جل کر بولا۔ "لگے سالے سیانا پن کرنے۔ ابے تو ایک نمبر کنجوس ہے۔"

نوشا نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "جا بے، تو بھی بس یونہی رہا۔ یہ روپے، میرے کب ہیں۔ مکان کا کرایہ دینے نیاز کی دکان جا رہا ہوں۔"

"جب ہی تو میں سوچ رہا تھا کہ ایک نہ دو اکٹھے اتنے روپے کہاں سے پار کر دیے۔"

مار لانا: لوٹ کر لانا، غبن کر کے لانا۔ اترانا: غرور کرنا، نازاں ہونا۔ سیانا پن: چالاکی۔

نوشا نے کہا۔ "ابے چلتا ہے نیاز کی دکان تک۔ ذرا دیر کی تو بات ہے۔"

"چائے پلاؤ تو چلتا ہوں۔"

مگر نوشا کے پاس چائے پلانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ لہٰذا شامی اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

(۴)

نیاز کی دکان بازار سے ذرا ہٹ کر گلی کے اندر تھی۔ پہلے وہ فرنیچر تیار کرنے والے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ مگر اب اس نے اپنی دکان کھول لی تھی اور پرانی اور استعمال شدہ اشیاء بیچنے اور خریدنے کا کاروبار کرتا تھا۔ دکان کے پچھلے حصے میں ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں نیاز کی رہائش تھی۔ بیوی عرصہ ہوا فوت ہو چکی تھی۔ اولاد بھی اس نے کوئی نہ چھوڑی۔ شادی کے دو سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جو چھ ماہ بعد نمونیہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ بیوی، شادی کے بعد آٹھ سال تک زندہ رہی اور اولاد کی حسرت دل میں لیے ایک روز اللہ کو پیاری ہو گئی۔

نیاز نے اب تک دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ کنواروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یوں وہ ابھی تک جوان تھا۔ اس کی عمر ۳۵ برس سے کچھ اوپر تھی۔ البتہ جسم میں چربی بڑھ جانے کے باعث وہ اب کسی قدر بھدا لگتا تھا۔ کام بھی کچھ ایسا تھا کہ زیادہ جسمانی مشقت نہ کرنا پڑتی۔ تمام دن دکان پر بیٹھے بیٹھے گزر جاتا۔ صرف اتوار کو وہ نیلام میں جاتا تھا یا کبھی اتفاقیہ سودے کے سلسلے میں دکان سے نکلتا۔ لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا۔ کہنے کو تو وہ کباڑیا تھا مگر کام دراصل کرتا تھا چوری کے مال کی خرید فروخت کا۔

اس وقت نیاز کی دکان میں لالٹین روشن تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نوشا دکان میں داخل ہوا۔ نیاز نے دیکھتے ہی پوچھا۔

"ابے آج کیسے آنا ہوا؟"

نوشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ قمیص کی جیب سے دونوں نوٹ نکالے

بھدا: نامناسب، بُرا۔ مشقت: محنت۔ کباڑیا: پرانا سامان بیچنے والا۔

اور اس کو دے کر بولا۔ "اماں نے دو مہینے کا کرایہ بھیجا ہے۔"

"دو مہینے کا کیوں؟" نیاز نے ناگواری سے کہا۔ "سارا حساب کیوں نہیں صاف کیا؟"

نوشا نے ماں کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ "انہوں نے کہا ہے بقیہ دو مہینے کا کرایہ جلد ہی آ جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"ان سے کہہ دینا۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ کرایہ وقت پر ملنا چاہیے ورنہ رہنے کا کہیں اور بندوبست کر لیں۔"

نیاز چاہتا بھی یہی تھا کہ کسی طرح مکان خالی ہو جائے۔ اس کے پاس کئی ایسے ضرورت مند آ چکے تھے جو زیادہ کرائے کے علاوہ ہزار بارہ سو پگڑی دینے کو بھی تیار تھے۔ نیاز ایسا فائدے کا سودا ہاتھ سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ محلّے میں اس کے دو مکان تھے جو اس نے ایک ہندو دکان دار سے بہت سستی قیمت پر خریدے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں سے مکانوں کا ہندو مالک بہت سہما ہوا تھا۔ وہ سندھی تھا اور کسی نہ کسی طرح ساری جائیداد اونے پونے بیچ کر بمبئی جانا چاہتا تھا۔ اس کے بال بچے پہلے ہی بمبئی پہنچ چکے تھے۔

نوشا واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نیاز نے پوچھ لیا۔ "ابے نوشے! آج کل تو کر کیا رہا ہے؟"

نوشا نے جواب دیا۔ "عبداللہ مستری کے ورکشاپ میں کام سیکھ رہا ہوں۔"

"اچھا کب سے؟" نیاز نے حیرت کا اظہار کیا۔

"چھ سات مہینے ہو گئے۔ اب تو بیس روپے مہینہ تنخواہ بھی ملنے لگی ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔ مگر عبداللہ تو ایک نمبر بدمعاش ہے۔ سنا ہے کاریگروں کو بہت مارتا پیٹتا ہے۔ پر اس نے کاروبار اچھا جما لیا ہے۔ جب یہاں آیا تھا تو ٹھیکیدار علی بخش کے ٹرک پر کلینر تھا۔ سالا پاس کھڑا ہو جاتا تو ایسی بو آتی تھی کہ دماغ پھٹنے لگتا تھا۔" نیاز تیکھے لہجے میں رک رک کر بولتا رہا۔ "میں نے تو اس کا وہ وقت بھی دیکھا ہے جب مدن خاں کے گیراج میں تیری طرح معمولی کاریگر تھا۔ پھر اس نے اپنا علیحدہ گیراج کھول لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا بنا لیا کہ کئی سو گز پر پھیلا ہوا ہے۔ پھاٹک پر 'عبداللہ آٹو ورکشاپ' کا یہ بڑا بورڈ لگا ہے۔ لیکن جب سے کاروبار چمکا ہے سالا سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔"

اونے پونے: کم قیمت پر۔ گیراج: مراد گاڑیوں کی ورکشاپ۔

نوشا چپ چاپ نیاز کی باتیں سنتا رہا۔ نیاز اسے بدظن کرنے کی غرض سے کچھ دیر تک عبداللہ مستری اور اس کے کاروبار کے بارے میں اظہار خیال کرتا رہا، پھر اس نے رازدارانہ لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ”موقع لگے تو کبھی کبھار کوئی پرزہ یا اوزار اڑا دیا کر۔ اس سالے پاپی کا مال کھانا تو ثواب کا کام ہے۔“ نوشا اس کی بات سن کر چونکا۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے نیاز کا منہ تکنے لگا۔

نیاز کہتا رہا۔ ”کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ بس سیدھا یہاں آجایا کر۔ چائے پانی کا خرچ نکل آئے گا۔ میں نے سنا ہے تجھے تو فلم دیکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔“ لمحہ بھر رک کر اس نے سوال کیا۔

”بول کیا کہتا ہے؟“

نوشا سے کچھ نہ کہا گیا۔

نیاز نے اس دفعہ زور دے کر پوچھا۔ ”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“

نوشا سہما ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”کہیں مستری جی کو پتہ چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔“

نیاز اپنے ڈھب پر لانے کے لیے اسے پھسلانے لگا۔ ”ابے جب اس سالے کو پتہ لگے تب۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ دیکھ میں تجھے ترکیب بتاؤں۔“ اس نے پرزے چرانے کے نوشا کو کئی طریقے بتائے۔ پھر بھی نوشا کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔

لیکن نیاز نے اسے اپنے پھندے سے نکلنے نہ دیا۔ نوشا جانے لگا تو اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر دیا۔ مسکرا کر بولا۔

”لے آج میری طرف سے جا کر فلم دیکھ۔“

نوشا روپیہ لینے میں ہچر مچر کرنے لگا تو نیاز نے اصرار کر کے اس کی جیب میں ڈال دیا۔ ”زیادہ ضد نہیں کرتے۔ میرے کہنے پر چلے گا تو عیش کرے گا۔“ نوشا نے اس کی باتیں خاموشی سے سنیں اور شرمایا ہوا سا دکان سے باہر چلا گیا۔

❀ ❀ ❀

میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے محلے کے لڑکے جمع تھے۔ ممد جو ہوٹل میں بیراگری کرتا تھا، مزے سے بیٹھا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔

نوشا نے گلی میں داخل ہو کر دیکھا۔ راجہ بھی وہاں موجود تھا اور منہ سے طبلہ بجا کر سنگت

پاپی: گناہ گار۔ شامت آنا: مصیبت آنا۔ ڈھب: روش۔ ہچر مچر: ٹال مٹول، پس و پیش۔ ماؤتھ آرگن: منہ سے بجایا جانے والا ایک ساز۔

دے رہا تھا نوشا پر ممد کا بڑا رعب پڑا۔ وہ بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ممد اس وقت ایک فلمی دھن بجا رہا تھا جس کے بول باجے کے سروں میں سے صاف نکل رہے تھے۔ ذرا دیر بعد اس نے ماؤتھ آرگن بجانا بند کر دیا اور منہ صاف کر کے بولا۔

”کھیل ختم پیسہ ہضم۔“

سب لڑکے اصرار کرنے لگے۔ ممد کو ان کے اصرار میں مزا آرہا تھا۔

نوشا نے پوچھا۔ ”اماں کتنے کا خریدا تم نے یہ باجا؟“

وہ ہنس کر بولا۔ ”کیا کرو گے جان کر۔ تمہارا پاجامہ بھی بک جائے گا تب بھی خرید نہیں سکو گے۔ نقد چھ روپے لگتے ہیں۔ کیا سمجھے؟ ہے ہمت خریدنے کی؟“

چھ روپے کا نام سن کر نوشا خاموش ہو گیا۔

جب لڑکوں نے بہت اصرار کیا تو ممد نے ایک نئی دھن شروع کر دی۔ سب مزے میں آکر گردن ہلانے لگے۔ ممد ماؤتھ آرگن بجاتے بجاتے ایک دم اٹھ کر بھاگ گیا۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

راجہ نے جل کر موٹی سی گالی دی اور نوشا سے کہنے لگا۔ ”ابے تھیٹر چلتا ہے؟“

نوشا حسب معمول تیار ہو گیا۔ ”ہاں ہاں چلو۔“

راجہ ہنس پڑا۔ ”پہلے ایک عدد روپیہ تو لے کر آؤ۔“

نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر سامنے کر دیا۔ ”یہ لو۔“

راجہ چونک پڑا۔ ”ابے یہ ٹھاٹھ ہیں۔ آج کہاں ہاتھ مار دیا؟“

نوشا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بے چینی کا اظہار کیا۔ ”تو پھر چلو۔ کے بجے تھیٹر شروع ہوتا ہے!“

”کل چلیں گے۔ وہ بھی اگر ایک روپیہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا۔ اپنی تو گاڑی ٹوٹی پڑی ہے ایک حرام کے جنے نے پوری موٹر چڑھا دی۔ یار اللہ نے بال بال بچایا۔“ راجہ اپنی پریشانی بیان کرنے لگا۔

”کونسا کھیل ہوگا؟“ نوشا نے پوچھا۔

”کل تو شیریں فرہاد ہوگا۔ دیکھے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ ابے جب فرہاد، شیریں، ہائے میری پیاری شیریں کہہ کے تیشہ مارتا ہے اور گر کر مر جاتا ہے تو سچ جان آنسو نکل پڑتے ہیں۔“ راجہ

نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سارا منظر کچھ ایسی اداکاری کے ساتھ بیان کیا کہ نوشا حیرت زدہ ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "تو کیا وہ سچ مچ مر جاتا ہے؟"

راجہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "یار، تو گھامڑ کا گھامڑ ہی رہا۔ کہیں وہ سچ مچ مر سکتا ہے۔ ابے یہ تو ایکٹنگ ہے ایکٹنگ۔"

نوشا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "کمال ہے بھئی۔"

"یہی نہیں، پتلی جان کا ڈانس دیکھے گا تو مزا آ جائے گا۔ سالی بالکل ننگی ناچتی ہے۔"

"ننگی ناچتی ہے، سچ؟" نوشا نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

"بس ذرا سا جانگیا پہن لیتی ہے۔ سالی کی گوری گوری رانیں روشنی میں ایسی چمکتی ہیں کہ یار طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

نوشا شرما کر رہ گیا۔ "سالے تو ایک نمبر بدمعاش ہے۔" مگر پتلی جان کی ننگی ننگی رانیں دیکھنے کے لیے اس کا بھی دل تڑپ رہا تھا۔ ذرا دیر رک کر بولا۔

"تو پھر کل کی پکّی رہی۔"

"ہاں جی کل ضرور چلیں گے۔ اب اسی بات پہ ایک ایک چائے ہو جائے۔"

نوشا تیار تو نہیں تھا مگر انکار بھی نہ کر سکا۔ روز راجہ سے چائے پیا کرتا تھا۔ سنیما دیکھتا تھا۔ وہ اسے چائے خانے میں لے گیا۔ راجہ تھیٹر کی ایک ایک تفصیل اس دلچسپی کے ساتھ بتاتا رہا کہ نوشا کا شوق اور بڑھ گیا۔ مگر جب دونوں چائے خانے سے باہر نکلے تو نوشا کے پاس کل چار آنے رہ گئے تھے۔ راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ اب تھیٹر کا پروگرام کیسے بنے گا۔

نوشا ورکشاپ گیا تو وہاں بھی تھیٹر دیکھنے کا خیال ستاتا رہا۔ شام کو چھٹی ہوئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس جگہ وہ کام کر رہا تھا وہاں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس نے ایک پرزہ اٹھایا۔ چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور جلدی سے اسے المونیم کے اس ڈبے میں رکھ لیا جس میں وہ اپنا کھانا لاتا تھا۔ مگر جب اسے لے کر چلا تو قدم کانپ رہے تھے اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر جھٹ باہر نکل گیا۔ گھبراہٹ کے باعث اس کے قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔

گھامڑ: بے وقوف۔ **المونیم:** ایک دھات۔

وہ سیدھا نیاز کی دکان پر پہنچا اور جاتے ہی پرزہ نکال کر سامنے ڈال دیا۔ نیاز نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ منہ بگاڑ کر بے زاری سے بولا۔

"ابے یہ کیا اٹھا لایا۔ کسی اچھے مال پر ہاتھ ڈالا ہوتا۔"

نوشا بجھ کے رہ گیا۔ مگر نیاز نے اسے زیادہ دیر ناامیدی میں مبتلا نہ رکھا اور ڈیڑھ روپیہ نکال کر دے دیا۔ خوشی کے مارے نوشا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ نیاز نے پیٹھ ٹھونک کر شاباش دی اور اس بات پر آمادہ کیا کہ آئندہ کوئی قیمتی پرزہ چرا کر لائے۔

نیاز کی دکان سے نکل کر نوشا آج بھی گھر جانے کے بجائے گلی میں پہنچا۔ راجہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اس نے بھی کچھ رقم کا بندوبست کر لیا تھا۔ اب شامی کا انتظار تھا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دونوں اس کے گھر کی جانب چل دیئے۔ قریب پہنچے تو گھر کے اندر ادھم مچا ہوا تھا۔ شامی چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور اس کا باپ گالیاں بک رہا تھا۔

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے شامی سالا پکڑا گیا۔"

نوشا بولا۔ "چلو یار اس کے ابّا نے دیکھ لیا تو ہم دونوں پر بھی گالیاں پڑیں گی۔" دونوں چپ چاپ لوٹ آئے اور "شیریں فرہاد" دیکھنے تھیٹر کی جانب چل دیئے۔

تھیٹر سے واپسی پر صبح ہو گئی۔ جیسے ہی دونوں گلی میں داخل ہوئے کہیں نزدیک ہی مرغ نے بانگ دی۔ نوشا سہم کر رہ گیا۔ ڈرتے ڈرتے دیوار پر چڑھا اور جیسے ہی کود کر گھر کے اندر پہنچا ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نوشا کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ اسی وقت اٹھ کر اس کی پیٹھ پر ایسا زوردار دوہتڑ مارا کہ نوشا فرش پر گر پڑا۔ وہ زور زور سے کوسنے لگی۔ اس ہنگامے سے سب کی آنکھ کھل گئی۔

نوشا مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس پر لعنت ملامت ہو رہی تھی۔

لیکن دوسرے روز نوشا نے پھر ایک پرزہ چرایا اور اسے نیاز کے پاس لے گیا۔ روپیہ ڈیڑھ روپیہ جو کچھ اس نے دیا جیب میں ڈالا۔ راجہ کے ساتھ مسلم ہوٹل میں جا کر چائے پی، بسکٹ کھائے اور فلمی گانے سنے۔

پھر تو اس کا یہ معمول ہو گیا۔ جہاں موقع لگا کوئی پرزہ یا اوزار چرا لاتا اور نیاز کے ہاتھ فروخت

پیٹھ ٹھونکنا: ہمت بڑھانا، دلاسا دینا۔ **ادھم:** شور و غل، ہنگامہ۔

کر دیتا۔ اس رقم سے روزانہ نت نئے پروگرام بنتے اور رات بھر آوارہ گردی ہوتی۔ نوشا نے غور کیا کہ جب سے اس کی جیب گرم رہنے لگی تھی شامی اور راجہ دونوں کے انداز میں خوشامد آگئی تھی۔ اب وہ اس کی ہر بات مان لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کا سرغنہ بنتا جا رہا تھا۔

(۵)

نوشا ابھی تک ورکشاپ سے واپس نہیں آیا تھا۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نوشا صبح کا نکلا رات کے پچھلے پہر اس وقت لوٹتا جب سب گھر والے سو جاتے۔ ماں اس کے انتظار میں بے چین بیٹھی تھی۔ اور جھنجلا جھنجلا کر کوسنے دے رہی تھی۔ ناگاہ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ انّو نے باہر جا کر دیکھا۔ دروازے پر نیاز کھڑا تھا۔ اس نے ماں کو فوراً ہی اطلاع دی۔

ماں نے کہا۔ ”اندر بلا لو۔“

ذرا دیر بعد نیاز گھر کے اندر آ گیا۔ اس نے نوشا کی ماں کو سلام کیا اور اس کے قریب ہی فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔ نیاز کا نوشا کی ماں سے کوئی سگا رشتہ نہیں تھا۔ نیاز کی بیوی رشتے میں سلطانہ کی ماموں زاد بہن تھی۔ اس رشتے سے وہ نوشا کی ماں کا بھتیج داماد لگتا تھا۔

نیاز کو آئے ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ سلطانہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دوپٹے سے سر ڈھانپا اور شرماتے ہوئے کہا۔

”دولھا بھائی سلام۔“

نیاز نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت عرصے بعد آیا تھا۔ وہی سوکھی مریل سی لڑکی، جو بال بکھرائے گھر میں ڈھیڑ ڈھیڑ کرتی پھرتی تھی اب چھٹ چھٹا کر پتھر کے مجسمے کی طرح سڈول ہو گئی تھی اس کی آنکھوں میں ستاروں کی جھلملاہٹ اور چہرے پر چاندنی کی چھوٹ تھی۔ نیاز نے دل ہی دل میں کہا۔ یار یہ لڑکی تو اب قیامت بن گئی ہے۔

اس روز وہ اپنا سیکنڈ ہینڈ امریکن کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کی شکنیں صاف چغلی کھا رہی تھیں

ناگاہ: اچانک۔ سگا: بہت قریبی۔ سڈول: خوبصورت۔ چھوٹ: چمک دمک۔ چغلی کھانا: مراد کہنا، ظاہر کرنا۔

کہ اسے چند ہی روز پہلے خریدا گیا ہے۔ سر پر نئی جناح کیپ تھی۔ گردن میں گلوبند تھا۔ کباڑیوں کی اصطلاح میں وہ اس وقت بالکل ثاٹن نظر آ رہا تھا۔

نیاز آیا تو مکان کے کرائے کا تقاضا کرنے کی غرض سے تھا مگر سلطانہ اس کی نظروں میں ایسی کھب گئی کہ وہ کرائے کا سوال تک زبان پر نہ لایا۔ بلکہ جب نوشا کی ماں نے دو ماہ کا کرایہ بر وقت نہ پہنچنے پر اظہارِ معذرت کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

”جب جی چاہے بھیج دیجئے گا۔ میں اس ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ اس طرف سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ کی خیریت معلوم کر لوں۔“

نوشا کی ماں اپنی پریشانیوں کا دکھڑا رونے لگی۔ نیاز نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”پریشان نہ ہوں۔ جس بات کی تکلیف ہو مجھ سے کہلوا دیا کریں۔ بشرطیکہ آپ مجھے اپنا سمجھیں۔ ورنہ مرنے والی کے ساتھ سب ہی نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں۔ حالانکہ میں تو آپ لوگوں کو آج بھی ویسا ہی مانتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

نوشا کی ماں بولی۔ ”یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم ابھی تک سب کو اسی طرح سمجھتے ہو۔ ورنہ پاکستان میں بھائی کہاں کی عزیز داری کہاں کا رشتہ۔ جسے دیکھو ایک دوسرے کی کاٹ میں لگا ہے۔ نہ وہ پہلی سی محبت نہ میل ملاپ۔ ایسی آپا دھاپی ہے۔ ایسی نفسا نفسی ہے کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔“

دونوں دیر تک ایسی ہی گھریلو باتیں کرتے رہے۔ نیاز دورانِ گفتگو میں بار بار سلطانہ کی جانب چور نظروں سے دیکھتا رہا جو ماں کے برابر خاموش بیٹھی تھی۔ ایک بار جب سلطانہ نے بھی شرمائی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو نیاز تڑپ اٹھا۔ اس نے کوٹ کے بٹن کھول دیئے اور سینہ تان کر جوان پٹھوں کی طرح ذرا اکڑ کے بیٹھ گیا۔ کسی تماش بین سے اس نے سن رکھا تھا کہ عورت پیسے کوڑی پر اتنا نہیں ریجھتی جتنا مرد کے جسم پر مرتی ہے۔

دکان سے وہ یہ سوچ کر چلا تھا کہ کھڑے کھڑے دو باتیں کر کے واپس آ جائے گا۔ مگر اس کا ایسا دل لگا کہ اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ نوشا کے گھر سے نکلا تو رات خاصی بھیگ چکی تھی۔

ثاٹن: مراد بنا ٹھنا، سجا ہوا۔ دل جوئی: تسلی، تسکین۔ سعادت مندی: فرمانبرداری۔ آپا دھاپی: اپنی اپنی فکر۔ نفسا نفسی: خود غرضی۔ ریجھنا: عاشق ہونا، متوجہ ہونا۔

ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ سنسان گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔

ایک روز ناغہ کر کے تیسرے دن وہ پھر نوشا کے گھر پہنچا۔ جھوٹے موتیوں کا ایک ہار بھی لیتا گیا۔ ہار بڑی نفاست سے تیار کیا گیا تھا۔ نیاز نے اسے انگلستان واپس جانے والے کسی انگریز خاندان کے سامان سے نیلام میں خریدا تھا اور عرصے سے کباڑ خانے کی الماری میں پڑا تھا۔ نیاز نے ڈبا کھول کر ہار نوشا کی ماں کے سامنے ڈال دیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"آج ایک شخص زبردستی یہ ہار میرے سر چپکا گیا۔ دیکھئے کیسا ہے؟"

نوشا کی ماں نے ہار ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کی تعریف کرنے لگی۔ "بڑا خوبصورت ہار ہے۔"

سلطانہ لمحہ بھر تک اسے بے چینی سے دیکھتی رہی۔ مگر الھڑ لڑکی سے زیادہ دیر ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے ماں کے ہاتھ سے ہار لیا۔ نظر بھر کر دیکھا اور گلے میں پہن کر ماں سے پوچھنے لگی۔

"کیوں اماں! کیسا لگ رہا ہے؟"

ماں نے اسے ڈانٹا۔ "اے ہے سلطانہ۔ تجھے تو کسی آئے گئے کا بھی ذرا لحاظ نہیں۔ کیسے جلدی سے ہار منڈھا کر بیٹھ گئی۔ اتار کمبخت، آنکھیں نکالے کیا دیکھ رہی ہے؟"

نیاز کو تو ایسے ہی موقعے کی تلاش تھی۔ کہنے لگا۔ "پہنے رہنے دیجئے۔" مگر سلطانہ نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ ہار اتار کر ڈبے میں ڈال دیا اور منہ لٹکا کر خاموش بیٹھ گئی۔ نوشا کی ماں نے نیاز سے کہا۔ "تمہاری بات دوسری ہے۔ تم ٹھہرے گھر کے آدمی۔ لیکن لڑکیوں میں یہ عادت نہیں ہونا چاہیے۔ کسی اور کے سامنے ایسی حرکت کر بیٹھتی تو وہ اس کے جنم پر کیا تھوکے گا۔ میں لڑکیوں کو سر پر چڑھانے کی قائل نہیں۔ اولاد کو نوالا کھلائے سونے کا مگر دیکھے ہمیشہ قہر کی نظر سے۔ ورنہ یہ آج کل کی اولادیں تو آفت کی پرکالہ ہیں۔"

نوشا کی ماں نے اولاد کی تربیت پر اپنا لیکچر ختم کیا تو نیاز نے کہا۔ "اب اس نے پہن لیا ہے تو اسی کو دے دیجئے۔"

"کتنے کا لیا تم نے؟"

الھڑ: شوخ، نادان، بے پرواہ۔ لحاظ: خیال۔ آفت کا پرکالہ: شریر، آفت کا ٹکڑا۔

نیاز نے ہنس کر کہا۔ "کیا کیجئے گا پوچھ کر؟ میں اب اس کی قیمت تو آپ سے لینے سے رہا۔"

وہ ذرا دیر اصرار کر کے خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس روز بھی وہ رات گئے واپس گیا۔

اب نیاز کا یہ معمول ہو گیا کہ رات کا کھانا ہوٹل سے کھا کر ہر دوسرے تیسرے روز نوشا کے گھر پہنچ جاتا اور گھنٹوں بیٹھا اس کی ماں سے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔

❋ ❋ ❋

نوشا حسب معمول گھر سے غائب تھا۔ ماں پڑوس میں کسی کام سے گئی تھی۔ گھر میں صرف سلطانہ تھی اور انو تھا جو لیمپ کے پاس پڑھتے پڑھتے وہیں لڑھک کر سو گیا تھا۔ اسی اثناء میں نیاز آ گیا۔ سلطانہ نے نیاز سے زیادہ بات چیت نہ کی اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نیاز نے پوچھا۔ "کہاں چلیں؟"

"اماں کو بلانے جا رہی ہوں۔ سامنے والے گھر میں تو گئی ہیں۔"

وہ باہر جانے کے لیے مڑی تو نیاز نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ ہاتھ کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ کلائی میں پڑی ہوئی تمام چوڑیاں چھن چھنا کے ٹوٹ گئیں۔ وہ منہ بسور کر بولی۔

"لیجئے آپ نے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ کل ہی تو پہنی تھیں۔"

نیاز ہنس کر بولا۔ "اور پہن لینا۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "بڑی مشکل سے اماں نے چوڑیاں پہنائی تھیں۔ آپ نے میرا پورا ہاتھ ننگا کر دیا۔ اماں دیکھیں گی تو میرا فضیتا کر کے رکھ دیں گی۔"

اس کا چہرا افسردہ ہو گیا۔

نیاز کی جیب میں اس وقت کئی سو کے نوٹ موجود تھے۔ اس نے نوٹوں کی گڈی نکال کر سامنے کر دی۔ "تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ لو کتنے کی چوڑیاں پہنو گی؟" سلطانہ نے کبھی اتنے بہت سے روپے نہیں دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکنے لگی۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولی۔

"جی نہیں! مجھے آپ کے روپے نہیں چاہیے۔"

نیاز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم بیٹھو تو، میں تمہیں کاٹ تو نہیں کھاؤں گا۔"

بے ڈھب: برے طریقے سے۔ منہ بسورنا: رونے والی صورت بنانا۔ فضیتا کرنا: ذلیل کرنا۔

وہ شرمائی ہوئی ذرا ہٹ کر وہیں دری پر بیٹھ گئی۔ لیمپ کی گہری بسنتی روشنی میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر جھکی ہوئی لانبی پلکیں اور رخساروں پر کندن کی سی چمک، سمٹتا اور پھیلتا ہوا سڈول جسم۔ نیاز نے اسے اس عالم میں دیکھا تو بے قابو ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"ایک بات کہوں؟"

وہ بولی۔ "کہیے۔"

نیاز کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہا نہ گیا۔ الجھی ہوئی سانس بھر کر صرف اس قدر کہا۔ "تمہاری اماں سے بات کروں گا۔"

سلطانہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔ دبی زبان سے بولی۔ "مجھ سے کہنے میں کوئی حرج ہے؟"

نیاز نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ "سلطانہ! نہ جانے تم مجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہو؟" اس نے بڑی سادگی سے دل کی بات کہہ دی۔

سلطانہ خاموش بیٹھی پیروں کے ناخن توڑتی رہی۔ نیاز نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں پتہ ہے میں روز روز کیوں آتا ہوں؟" وہ اس وقت سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔

وہ بے نیازی سے بولی۔ "مجھے کیا معلوم؟"

"اور جو میں یہ کہوں کہ صرف تمہاری خاطر یہاں آتا ہوں"

سلطانہ نے تڑاق سے جواب دیا۔ "بالکل جھوٹ۔"

"اب تم کو کیسے یقین دلاؤں۔"

"وہ دیدے مٹکا کر بولی۔ "واہ! بیٹھے اماں سے باتیں کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے لیے آتے ہیں۔ میرے لیے کیوں آنے لگے؟"

نیاز برابر مسکراتا رہا۔ "لیکن میری آنکھیں تو برابر تم کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔"

سلطانہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "کیوں؟"

"میرے قریب آ کر بیٹھو تو بتاؤں۔"

اس نے گردن ہلا دی۔ "میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

سلطانہ کی ایک ایک ادا نیاز کو ڈسے جا رہی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر بولا۔ "تو پھر میں تمہارے

کندن: خالص سونا۔ حرج: نقصان۔ ایک ٹک: مسلسل، غور سے۔ تڑاق سے: مراد فوراً۔ ادا: انداز، طریقہ۔

پاس آ جاؤں؟"

وہ اسی تیکھے لہجے میں بولی۔ "آپ وہاں بیٹھے کیا برے لگ رہے ہیں۔"

نیاز نے اسے پھر چھیڑا۔ "اچھا ذرا میری طرف تو دیکھو!"

وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ "لیجیے۔"

نیاز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے قراری سے بولا۔ "ہائے!"

دل کی بات ٹھنڈی سانس کے ساتھ بہہ گئی۔ سلطانہ کے لیے نیاز کی یہ تمام حرکتیں کچھ عجیب سی تھیں۔ بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں اور بہت سی وہ بالکل نہ سمجھ سکی۔

نیاز کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اسی وقت ماں دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئی۔ نیاز سنبھل کر بیٹھ گیا۔

نوشا کی ماں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "ارے تم کب آئے؟ میں تو برابر والے مکان میں تھی، بلوا لیا ہوتا۔"

وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ "آئے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی۔"

"اے سلطانہ! نیاز کو پان بھی کھلایا۔" اس نے قریب پہنچ کر پاندان کھولا اور پان بنانے لگی۔

پان کھا کر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ سلطانہ ذرا دیر تک بیٹھی رہی پھر اٹھ کر اپنے بستر میں جا کر دبک گئی۔

❁ ❁ ❁

شام ہو چکی تھی۔ نیاز اپنی دکان میں بیٹھا تھا۔

لالٹین کی مٹیالی روشنی میں ایک شخص سے رازدارانہ لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ کسی مال کا سودا ہو رہا تھا جو کسی طرح طے ہی نہ ہو پاتا۔ نیاز سو روپے سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا اور وہ شخص بضد تھا کہ ایک سو دس سے کم نہ لے گا۔

نیاز نے آخری قیمت لگاتے ہوئے کہا۔ "پانچ اور بڑھا لو۔ پسند آئے تو دے دو۔ نہیں تو دوسرے جگہ دکھا دو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ اگر دوسری جگہ بھی اتنے ہی دام لگیں تو یہیں دے جانا۔"

وہ آدمی بولا۔ "بیچوں گا تو تمہارے ہی ہاتھ اور پورے ایک سو دس لوں گا۔ لو یہ سنبھالو اپنا

مال۔"

اس نے دو گھڑیاں نیاز کے سامنے ڈال دیں۔

نیاز آمادہ نہ ہوا۔ "نہیں بھئی اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔"

"خدا قسم بازار میں صرف ایک کی قیمت دو سو سے زیادہ ہے۔ روز ہم تمہاری بات مان لیے ہیں۔ آج تم کو ہماری بات ماننی پڑے گی۔"

"دیکھنے میں تو دونوں ٹھیک لگتی ہیں۔ مگر ان کا نکالنا کتنا جوکھوں کا کام ہے۔ ہر وقت پولیس کا خطرہ۔ چوری کا مال بیچنا تم کوئی آسان کام سمجھتے ہو۔"

"نیاز بھائی، تم زیادہ دکان داری نہ کیا کرو۔ تمہارے ساتھ کوئی آج پہلا معاملہ کر رہا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ان ہاتھوں سے تم کو ہزاروں کا مال دے چکا ہوں۔ ہر وقت کی بزنس اچھی نہیں ہوتی۔ لاؤ نکالو سیدھے ہاتھ سے روپے۔"

نیاز اپنی بات پر اڑا رہا۔ "ہوں گے وہی ایک سو پانچ۔"

"لا یار نکال جو تیرا جی چاہے۔"

نیاز نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ایک سو پانچ روپے گن کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ بولا۔ "اماں چائے پانی کو تو کچھ دے دو۔" نیاز نے اٹھنی اور دے دی۔ جل کر بولا۔

"لو یہ بھی لو۔ تمہارے اسی لیچڑپن سے مجھے چڑ ہے۔"

وہ شخص ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ اس نے نوٹ گن کر کوٹ کی جیب میں رکھے اور مسکراتا ہوا دکان سے باہر چلا گیا۔ نیاز نے دونوں گھڑیوں کو لالٹین کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ بالکل نئی تھیں۔ اس نے دکان کے پچھلے حصے میں جا کر الماری کھولی۔ گھڑیاں رکھیں اور الماری میں تالا لگا دیا۔

نیاز کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ دیکھا نوشا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اس روز موٹر سائیکل کے انجن کا کوئی پرزہ لایا تھا۔ نیاز نے پرزے کو صرف ایک نظر دیکھا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر نوشا کو دیا۔

"جا آج ٹھاٹھ سے عیش کر۔"

نوشا کے ہاتھ میں پورا دس روپے کا نوٹ آیا تو وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ نیاز اس وقت ترنگ میں

جوکھوں کا کام: بہت مشکل کام۔ دکان داری: مراد بڑھ بڑھ کر باتیں کرنا۔ معاملہ: مراد سودا۔ لیچڑپن: ضدی طبیعت۔ بھونچکا: حیران۔

تھا۔ ہنس کر بولا۔

"ابے میرا منہ کیا تک رہا ہے۔ اسے جیب میں ڈال لے۔"

نوشا نے جلدی سے نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ اس وقت اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔

(۶)

گلی میں صرف شامی موجود تھا۔ راجہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ نوشا کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ جلد سے جلد راجہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی جیب میں پورے دس روپے کا کرارا نوٹ ہے۔

شامی نے بتایا کہ راجہ کالے صاحب کے گھر تمبولا کھیلنے گیا ہے اور یہ کہہ کر گیا ہے کہ نوشا آئے تو اس کو وہیں لیتے آنا۔ نوشا نے سوچا آج تو ٹھاٹھ سے وہ بھی تمبولا کھیلے گا۔ وہ شامی کے ساتھ اسی طرف چل دیا۔

کالے صاحب کا مکان فرلانگ، سوا فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ بیچ میں دو گلیاں پڑتی تھیں۔ اس کے بعد عیسائیوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ وہیں کالے صاحب کا مکان تھا۔ دونوں جب وہاں پہنچے تو اس وقت سرنگ کی طرح لمبے کمرے میں، بوسیدہ بنچوں پر بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ کمرے میں ہر طرف تمباکو کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ سامنے چبوترے پر کالے صاحب، اونچی باڑھ کی ہیٹ لگائے، ہاتھ میں جادوگروں کی طرح سیاہ چھڑی لیے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے چوکور میز تھی جس پر ایک تھیلا رکھا تھا۔ چار پانچ سال کا ایک گول مٹول بچہ تھیلے کے اندر سے ٹکٹ نکال کر دیتا جا رہا تھا جن پر لکھے ہوئے نمبر کالے صاحب سرکس کے مسخروں کی طرح گردن مٹکا مٹکا کر اونچی آواز سے پڑھ رہا تھا۔

کمرے میں ایک طرف بنچ پر راجہ بھی بیٹھا تھا۔ کالے صاحب نمبر بولتا جا رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ ہاتھوں میں دبے ہوئے کاغذوں پر پنسل سے جلدی جلدی نمبر کاٹ رہے تھے۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص کے کان کالے صاحب کی آواز پر لگے تھے جو دھڑا دھڑ نمبر بول رہا تھا۔

کوفت: صدمہ۔ تمبولا: مغربی طرز کا جوا، لاٹری۔ مٹکا مٹکا کر: گھما گھما کر۔

اچانک ایک موٹے تگڑے آدمی نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ "ہاؤس!" کسی دل جلے نے چیخ کر اپنی جھلاہٹ کا اظہار کیا۔

"دھت تیرے کی۔"

اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

شامی نے راجہ کو آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا اور اٹھ کر ان کے پاس آگیا۔

نوشا نے تمبولا کھیلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "یار! تو اس چکر میں نہ پڑ۔ یہ کالے صاحب ایک نمبر بے ایمان ہے۔ سالا ضرور گڑبڑ کرتا ہے۔"

راجہ شام سے بیٹھا تمبولا کھیل رہا تھا اور برابر ہار رہا تھا۔

کالے صاحب کے مکان پر ہر سنیچر کی شام کو تمبولا ہوتا تھا۔ راجہ کئی ہفتوں سے وہاں جا رہا تھا اور ہر بار ہار کر آتا تھا۔ تمبولا کھیلنے کے لیے وہ ہفتہ بھر تک پیسے جمع کرتا اور سب ہار آتا۔ بعد میں کالے صاحب کو گالیاں دیتا۔

نوشا کا دل تمبولا کھیلنے کو مچل رہا تھا۔ اس نے دبی زبان سے کئی بار اصرار بھی کیا مگر راجہ نے ایک نہ سنی۔ وہاں سے نکل کر تینوں باہر آئے۔ نوشا نے دس روپے کا نوٹ نکال کر دکھایا۔ راجہ پر بڑا رعب پڑا۔

ذرا دیر کے لیے تو وہ چکرا گیا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "ابے یہ نقشے ہیں۔ آج تو بڑی لمبی رقم مار لایا۔"

"اسی لیے تو تمبولا کھیلنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" نوشا نے ایک بار پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ راجہ نے اس دفعہ بھی اس کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ "ابے تمبولے میں کیا رکھا ہے۔ میں پیگی کو دیکھنے چلا آیا۔ پر سالی وہ آج آئی نہیں۔"

نوشا نے کہا۔ "یار تو تعریف تو اس کی بہت کرتا ہے۔ کسی دن دکھا تو دے۔"

شامی بیچ میں بول اٹھا۔ "ابے کیا کرے گا دیکھ کر۔ میری دکان پر روز سودا لینے آتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے۔ کالی کلوٹی۔ بالکل کواپری۔"

مچلنا: بے قرار ہونا۔ کواپری: مراد کوے کی طرح سیاہ۔

راجہ کو اس کی بات سخت ناگوار گزری۔ اس نے تیکھی نظروں سے شامی کو دیکھا۔ جل کر بولا۔ "سالے وہ تمہاری عشّو تو جیسے پرستان کی شہزادی ہے۔ سالی بھینگی کہیں کی۔"

ان کی باتیں سن کر نوشا کو شدید احساس کمتری ہوا۔ بے چارگی سے بولا۔ "یار تم دونوں نے تو ایک ایک معشوق چھانٹ لیا۔ یہاں تو سالی کوئی کالی کلوٹی بھی نہیں ملتی۔"

دونوں اس کی سادگی پر بے ساختہ ہنس پڑے۔ شامی نے آنکھ مار کر کہا۔ "استاد اس کے لیے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر کہیں لونڈیا پھنستی ہے۔"

راجہ بے تکلفی سے ہنستا رہا۔ "سالا یہ دکان پر بیٹھا دن بھر یہی تو چکر چلاتا رہتا ہے۔"

شامی نے جھٹکا دے کر اپنے بڑے بڑے بالوں کو ایکٹروں کی طرح پیچھے پلٹا اور فخریہ انداز میں مسکرانے لگا۔

راجہ بولا۔ "ابے نوشے تجھے ایک ترکیب بتاؤں۔ وہ جو اوورسیئر ہے نا۔ وہی جس کا چوراہے پر دو منزلہ مکان ہے۔ تو اس کی لونڈیا کو گانٹھ لے۔ روز اسکول پڑھنے جاتی ہے۔ باپ قسم بڑی زوردار چیز ہے۔ میں نے تو اس کے بھائی سے یارانہ کر لیا ہے۔ چاہے تو تو بھی ساجھا کر لے۔ پٹ گئی تو موج کریں گے۔ لا ملا اسی بات پر پلاؤ والا ہاتھ۔" اس نے گرمجوشی سے نوشا کا ہاتھ دبوچ لیا۔

"ویسے یار لونڈیا تو میر کلّن کی بھی بہت زوردار ہے۔ بالکل پٹاخہ ہے پٹاخہ۔" شامی نے مڑ کر نوشا کی جانب دیکھا۔ "ابے نوشے! تو نے تو اسے دیکھا ہوگا۔"

"وہی تو نہیں جو اسکول کے پچھواڑے رہتی ہے؟"

"ہاں یار وہی۔" شامی نے نوشا کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مارا۔ "میں نے تو اسے ٹانچنے کی بہت کوشش کی۔ پر سالی بدکتی بہت ہے۔ پٹھے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتی۔ تو لگ جا اس کے پیچھے۔ پھنس گئی تو عیش کرے گا۔"

"ابے اس سے کیا لونڈیا پھنسے گی۔ یہ تو ایک دم لینڈی کتا ہے۔ اس کے سامنے جا کر دم ہلانے لگے گا۔" راجہ نے زور سے قہقہہ لگایا۔

نوشا بھی کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔

بے ساختہ: بلا ارادہ۔ ریاض: محنت۔ ساجھا: برابر کی حصہ داری۔ پٹاخہ: مراد بہت خوبصورت۔ پچھواڑے: پچھلی طرف، پیچھے۔ دھپ: تھپڑ۔ بدکنا: بھڑکنا، غصے میں آنا۔ لینڈی کتا: مراد ڈرپوک۔ کھسیانا: شرمندہ۔

تینوں دیر تک محلے کی لڑکیوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ راجہ اور شامی، جو لگ بھگ نوشاہی کے ہم عمر تھے اور کسی کا بھی سن چودہ پندرہ سال سے زائد نہ ہوگا اس انداز سے بڑھ چڑھ کر بات کر رہے تھے کہ نوشا ہونّق کی طرح ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

تمبولا کھیلنے کا پروگرام منسوخ ہوا تو راجہ نے ایک نیا پروگرام بنایا مگر اس کی تفصیل نہ بتائی۔ شامی نے ضد کی تو اس نے ڈانٹ دیا۔

"بس کہہ دیا ایک جگہ چلیں گے۔ تجھے چلنا ہو تا چل۔"

شامی نے پوچھا۔ "کب تک واپسی ہوگی؟"

"کوئی ٹھیک نہیں۔ گیارہ تو بج ہی جائیں گے۔" راجہ نے جواب دیا۔

شامی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ "نا بابا! میں اتنی دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ ابا مولانا قدوس کا وعظ سننے گئے ہیں۔ دس بجے تک لوٹ آئیں گے۔ مجھے گھر میں نہیں دیکھا تو اودھم مچا دیں گے۔ میں تو بھئی چلا۔" وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

راجہ اور نوشا باتیں کرتے ہوئے بازار کی جانب مڑ گئے۔

❀ ❀ ❀

بازار کی چہل پہل اب اجڑ چکی تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا دکانیں کھلی تھیں۔ چوکیداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا تھا اور دکانوں کے تالے ہلا ہلا کر دیکھ رہے تھے۔ راجہ اور نوشا نے بازار عبور کیا اور ایک گلی میں داخل ہو گئے۔

گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ آگے آگے راجہ تھا اور اس کے پیچھے نوشا چل رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک موڑ پر تیز روشنی نظر آئی۔ قریب ہی ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ دونوں اسی طرف مڑ گئے۔ جس قدر وہ آگے بڑھتے گئے شور نزدیک آتا گیا۔ آخر راجہ ایک قدیم وضع کی اونچی عمارت کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔

بڑا پھاٹک بند تھا اور اندر خوب شور ہو رہا تھا۔ راجہ نے کھڑکی نما دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی نوشا بھی چلا گیا۔ دروازے کے سامنے کشادہ صحن تھا۔ اس کے ایک طرف نیچی محرابوں والا طویل دالان تھا جس میں گیس بتیاں روشن تھیں۔ جگہ جگہ ٹین کی کرسیاں اور لکڑی

ہونّق: احمق۔ وعظ: تقریر۔ گشت: چکر۔ قدیم وضع کی: مراد پرانی تعمیر شدہ۔

کی بھدی میزیں پڑی تھیں۔ میزوں پر شراب کی بوتلیں تھیں۔ گلاس تھے۔

اس شراب خانے میں دیسی شراب ملتی تھی۔ دالان میں شرابیوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ شراب پی رہے تھے۔ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ راجہ اور نوشا کرسیاں کھینچ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گئے۔ راجہ نے نوشا سے دس روپے کا نوٹ لیا اور کاؤنٹر پر جا کر ٹھرّے کا ایک ادھا لے آیا۔ اس نے بوتل کھول کر میز پر رکھی۔ اپنے گلاس میں شراب انڈیلی۔ لیکن جب وہ دوسرے گلاس میں شراب ڈالنے لگا تو نوشا گھبرا کر بولا۔

"یار یہ تو کس کے لیے انڈیل رہا ہے؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "ابے تیرے لیے اور کس کے لیے؟"

نوشا سہمی ہوئی آواز سے بولا۔ "نہیں یار مجھے نہ پلا۔"

راجہ اصرار کرنے لگا۔ مگر نوشا برابر انکار کرتا رہا۔ اسی اثنا میں دالان کے اندر ڈھولک ٹھنکنے لگی۔ ایک ہیجڑا لہک لہک کر گانے لگا۔

بریلی کے باجار میں جھمکا گرا رے
او جھمکا گرا رے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گانے کے ساتھ ساتھ وہ کمر لچکا کر ناچنے بھی لگا۔ ایک شرابی جھومتا ہوا اٹھا اور ہیجڑے کے ساتھ ناچنے لگا۔ اس کا جسم خاصا بھاری بھر کم تھا۔ دھم دھم کر کے ناچتا تو چھت تک ہل جاتی۔ دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ اسے ناچتے دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ دونوں کے ناچ نے شراب خانے کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی۔ نوشا بھی اس ہاؤ ہو میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ بار بار کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اسی دوران میں ایک ادھیڑ آدمی نے دونوں کے قریب آ کر پوچھا۔

"کھانے کو کچھ لاؤں۔"

راجہ نے کہا۔ "کباب ہوں گے؟"

"کباب تو ابھی ابھی ختم ہو گئے۔"

راجہ بولا۔ "اچھا تو آلو چھولے لے آؤ۔ مگر خوب چٹ پٹے ہوں۔"

"ابھی لو جی، ابھی۔"

ٹھرّا: گھٹیا شراب۔

وہ چلا گیا اور ذرا دیر بعد المونیم کی گندی سی پلیٹ میں آلو چھولے لے آیا جن پر پسی ہوئی لال مرچیں پڑیں تھیں۔

بھاری بھر کم جسم والا شرابی ابھی تک ہیجڑے کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ وہ اپنے چوڑے چکلے کولھے مٹکا کر ناچتا تو نوشا کو بڑا لطف آتا۔ راجہ نے کہا۔ "ابے ذرا سی لگائے بغیر کیا مزہ آئے گا۔" اس نے گلاس اٹھا کر نوشا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

نوشا نے ایک گھونٹ پی کر برا سا منہ بنایا۔ "یار، یہ تو بہت کڑوی ہے۔"

راجہ نے آلو چھولے کی پلیٹ سامنے کر دی۔ "لے آلو کا ایک قتلہ کھا لے۔"

نوشا نے پلیٹ سے آلو کے کئی قتلے اٹھا کر کھا لیے۔ راجہ نے گلاس اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا۔ گہری گلابی شراب کو روشنی میں دیکھا۔ گلاس کو بوسہ دیا اور غٹا غٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ نوشا نے بھی گلاس اٹھا کر تھوڑی سی پی لی اور راجہ سے کہنے لگا۔

"یار تو تو بڑا چھپا رستم نکلا۔"

"نہیں بے! بس دو تین بار اس سے پہلے اور پی تھی اور یہاں تو دوسری دفعہ آیا ہوں۔"

"لگے سالے جھوٹ بولنے۔ ابے تو پکا شرابی معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں یار! قسم لے لے۔" راجہ نے صفائی پیش کی۔

دونوں باتیں کرتے رہے اور ٹھرے کے گھونٹ چڑھاتے رہے۔ جب گلاس ختم ہو جاتا تو راجہ اور انڈیل دیتا۔

نوشا پیتے پیتے ذرا دیر بعد بولا۔ "یار راجہ مجھے تو کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"ابے ابھی سے چڑھنے لگی۔ چل تھوڑی سی اور لگا۔"

نوشا نے ٹھرے کی چسکی لی اور خواہ مخواہ ہنسنے لگا۔ یہ ہنسی بڑی بے ڈھنگی تھی۔ اس نے گلاس اٹھا اور غٹا غٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ بھاری بھر کم جسم والا شرابی ناچتے ناچتے یکایک لڑکھڑا کر گر پڑا تھا اور اب چاروں خانے چت فرش پر لیٹا بھینس کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ دالان میں بیٹھے ہوئے شرابی زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

ہیجڑے نے گانا بند کر دیا تھا۔ وہ ہر میز پر جاتا۔ کسی سے گندا مذاق کرتا۔ کسی کو دو چار بازاری

قتلہ: ٹکڑا۔ بے ڈھنگی: بے ترتیب، بدنما۔ چاروں خانے (شانے) چت: مراد پشت کے بل بالکل سیدھا۔

فقرے سناتا اور دونی چونی وصول کر کے دوسری میز پر چلا جاتا۔ وہ باری باری ہر میز پر جا رہا تھا۔ راجہ اور نوشا کو دیکھ کر اس نے ہاتھ مٹکا مٹکا کر تالیاں بجائیں اور زور سے تان لگائی۔

چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلی کھیلیں

نوشا تو اس کی حرکتوں پر شرما گیا۔ مگر راجہ نے بڑی بے باکی سے اٹھا کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور چٹاخ سے اس کا گال چوم لیا۔ ہیجڑا ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"اسی بات پر ایک چونی دلاؤ۔"

راجہ نے فوراً جیب سے چونی نکال کر دے دی۔ وہ کولہے مٹکاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

دونوں دیر تک بیٹھے ٹھرے سے شغل کرتے رہے۔ ٹھرے کی خاصیت ہے کہ اس کا نشہ طوفان کی طرح چڑھتا ہے۔ راجہ نے غضب یہ کیا کہ بوتل ختم ہونے کے بعد ایک پوا اور لے آیا۔ پوا ختم نہیں ہوا تھا کہ راجہ بہکنے لگا۔ اب وہ خواہ مخواہ ہنس رہا تھا بات کہتے کہتے بھول جاتا۔ کبھی نوشا کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ کبھی اس طرح چہرہ بگاڑتا جیسے رو پڑے گا۔ نوشا بھی ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ اسی عالم میں ایک بار وہ ڈگمگایا اور دھڑام سے فرش پر گرا۔ اٹھ کر اس نے میز کا سہارا لیا تو میز الٹ گئی۔ بوتل لڑھک گئی۔ گلاس گر کر چکنا چور ہو گئے۔ راجہ نے گندی سی گالی دی۔ ساتھ ہی ایک زناٹے کا ہاتھ نوشا کے گال پر پڑا۔ نوشا نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ راجہ خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ دالان سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ پیچھے سے راجہ نے آواز دی۔ نوشا کو ایسا محسوس ہوا جیسے راجہ کنویں کے اندر سے بول رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ پھاٹک کی کھڑکی سے نکل کر باہر گلی میں آ گیا۔

وہ ڈگمگاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ اسے مطلق علم نہیں تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟ کدھر جا رہا ہے؟ آدھ گھنٹے تک سنسان گلیوں میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ ایک کشادہ سڑک پر آ گیا۔ لیکن سڑک پر کچھ ہی دور گیا ہو گا اچانک اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے وہیں سڑک پر قے کر دی۔ اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا چند قدم گیا۔ ہر چیز اس کے سامنے گردش کر رہی تھی۔ مکانوں کے دریچوں پر جھلکتی روشنیاں جگنوؤں کی مانند اس کی نظروں کے سامنے جلنے بجھنے لگیں۔ پھر وہ سپیرے کی بین پر جھومنے والے ناگ کی طرح لہرایا اور چکرا کر گر پڑا۔ سڑک ٹھنڈی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ نوشا کو بڑا سکون

پوا: چوتھا حصہ۔ مطلق: بالکل۔ دریچہ: کھڑکی۔

ملا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور بے خبر سو گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ وہ ہاتھ پھیلائے لاش کی طرح بے جان پڑا تھا۔ دفعتہً قریب کے موڑ سے ایک کار تیز رفتار سے نکلی اور آناً فاناً نوشا کے سر پر پہنچ گئی۔ نوشا پہیے کی لپیٹ میں آکر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک بار وہ کلیجہ پھاڑ کر چیخا۔ "ہائے" اور پھر خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے۔ کار شور کرتی ہوئی زور سے اچھل کر رک گئی۔ کسی نے کار کے اندر سے گردن نکال کر نوشا کو دیکھا۔ وہ دھندلی روشنی میں مردے کی طرح بے سدھ پڑا تھا۔

"مر گیا؟" جھانکنے والے کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

کار کے اندر سے کسی نے کہا۔ "گاڑی آگے بڑھاؤ۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔" انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز خاموشی میں ابھری اور کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

(۷)

نوشا سڑک پر بے سدھ پڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ آدھی رات کو ایک راہ گیر ادھر سے گزرا۔ یہ سلمان تھا۔ وہ ایک مقامی کالج کا طالب علم تھا۔ اور فلم دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے نوشا کو دیکھا تو رک گیا۔ جھجکتا ہوا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت نوشا نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ سلمان جھک کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے تمام جسم پر خاک تھی۔ اس نے نوشا کا ہر طرف سے جائزہ لیا۔

چوٹ زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صرف کندھے کے پاس خون کا گہرا سرخ نشان تھا۔

اسے بیچ سڑک سے اٹھا کر وہ فٹ پاتھ پر لے آیا۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ ہر طرف ویرانی برس رہی تھی۔ اس نے نوشا کو ہولے ہولے جھنجوڑا اور کسی نہ کسی طرح نام اور پتہ معلوم کیا۔

اتفاق سے ایک خالی تانگا آتا ہوا نظر آیا۔ سلمان نے تانگا رکوایا۔ کوچوان کی مدد سے نوشا کو

بیچوں بیچ: بالکل درمیان میں۔ آناً فاناً: ایک دم، یکایک۔ کلیجہ پھاڑ کر: بہت زور سے۔ بے سدھ: بے ہوش۔ آدم زاد: انسان۔

تانگے میں ڈالا اور خود بھی سوار ہو گیا۔ تانگا نوشا کے گھر کی طرف چل دیا۔

سڑک کا راستہ تو تانگے میں اطمینان سے گزر گیا۔ لیکن گلی اتنی تنگ تھی کہ تانگا اندر نہیں جا سکتا تھا۔ سلمان نے تانگے والے کو کرایہ دیا اور نوشا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر گلی کے اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں دو بار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔

رات کا وقت اور اجنبی جگہ۔ سلمان کے لیے نوشا کے گھر کا پتہ لگانا بھی ایک مسئلہ بن گیا۔ نہ جانے کتنی دیر اسے اندھیری گلی میں بھٹکنا پڑتا۔ خوش قسمتی سے محلّے کا ایک آدمی مل گیا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھا اور اس وقت ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔ اس نے نوشا کا مکان بتا دیا۔ سلمان نے نوشا کو گھر کے دروازے پر لٹایا اور ذرا دیر تک ہانپتا رہا۔ وہ چھریرے جسم کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس قدر مشقّت کا عادی نہ تھا۔ اس کا سارا بدن پسینے پسینے ہو گیا تھا۔

سلمان نے دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ وہ رک رک کر دروازے پر دستک دیتا رہا۔

❁ ❁ ❁

آہٹ سے نوشا کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس روز اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ لہٰذا خود تو دروازے پر نہ جا سکی۔ آواز دے کر سلطانہ کو بیدار کیا۔ وہ کچی نیند سے اٹھی تھی۔ دروازے پر کھٹکھٹانے کی آواز سنی تو ڈر کر بولی۔

"اے اماں! یہ اتنی رات گئے دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟"

ماں غصے سے بولی۔ "ہوگا کون، وہی حرام خور ہوگا نوشا۔ ساری رات واہی تباہی پھرنے کے بعد اب لاٹ صاحب کو گھر کی سوجھی ہے۔ جا بیٹی دروازہ کھول دے۔ ورنہ وہ کمبخت سونے بھی نہ دے گا۔"

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ آنگن میں پہنچ کر سردی کا احساس ہوا تو جسم کپکپا کے رہ گیا۔

اوّل شب موسم خوشگوار تھا۔ مگر اب خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور گردن باہر نکال کر بولی۔

مشقّت: محنت۔ واہی تباہی: آوارہ، فضول۔

"نوشا! اے نوشا۔"

سلمان بھونچکا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ سلطانہ گہری نیند سے اٹھی تھی۔ اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی بھی نہ دیا۔ نوشا کی آواز نہ آئی تو وہ بولی۔

"ارے کہاں چلا گیا۔ بولتا کیوں نہیں؟"

سلمان سے اب خاموش نہ رہا گیا۔ "کار سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

ایکسیڈنٹ کا نام سنتے ہی سلطانہ بدحواس ہو کر چیخی۔ "ہائے اللہ" اور تیزی سے بھاگتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی۔

ماں نے گھبرا کر پوچھا۔ "ارے کیا ہو گیا؟"

سلطانہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "نوشا موٹر کار سے کچل گیا۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

ماں بھی چیخ کر رونے لگی۔ شور سن کر انو جاگ اٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ سلمان اس وقت تک نوشا کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کا جسم سلمان کے ہاتھوں پر بارش سے بھیگی ہوئی شاخ کی طرح جھول رہا تھا۔ سلمان نے نوشا کو دری پر لٹا دیا اور ماں بیٹی کو تسلی دینے لگا۔

"گھبرائیے نہیں۔ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے، بال بال بچ گیا۔"

دونوں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ انہیں روتے دیکھ کر انو بھی منہ بسور کر رونے لگا۔ سامنے نوشا آنکھیں بند کئے بے حال پڑا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ لاش کی طرح خاکستری نظر آ رہا تھا۔

سلمان نے پھر ان کو تسلی دی۔ "آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ کندھے پر ذرا سا زخم آ گیا ہے۔"

ماں نوشا کے سرہانے بیٹھ گئی۔ سلطانہ بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔

نوشا ابھی تک بے ہوش تھا۔

اس کی ماں اور بہن بے قرار ہو کر آنسو بہا رہی تھیں۔ رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھیں۔

یہ بڑا المناک منظر تھا۔

بال بال بچنا: مشکل سے بچنا۔ بے حال: کمزور، مراد زخمی۔ خاکستری: مٹی کے رنگ کا۔ المناک: دکھ بھرا۔

سلمان سے زیادہ دیر دیکھا نہ گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔

"اب میں چلوں گا۔"

ماں اسے دعائیں دینے لگی۔

❁ ❁ ❁

سلمان باہر گلی میں آ گیا اور سیدھا اپنے گھر کی طرف چل دیا کمرے میں پہنچ کر جب بستر پر لیٹنے لگا تو اسے خیال آیا کہ گھر پہنچانے کے بجائے وہ نوشا کو اسپتال کیوں نہ لے گیا۔ ممکن ہے چوٹ جسم کے اندرونی حصوں میں آئی ہو۔ وہ دل گرفتہ ہو گیا۔ سوچنے لگا نہ جانے نوشا کی اب کیا حالت ہو۔ گھر میں کوئی ایسا مرد بھی نظر نہ آیا تھا کہ رات میں اگر طبیعت زیادہ گڑبڑ ہو جائے تو زخمی کو اسپتال لے جائے۔

یوں تو سلمان بڑا آشفتہ طبع اور لاابالی نوجوان تھا۔ یہاں اس کا کوئی سرپرست بھی نہ تھا۔ تنہا رہتا تھا اور بڑی غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ان طالب علموں کے زمرے میں شامل تھا جو زمانہ طالب علمی میں ہی زندگی کے بہت سے تجربات حاصل کر لیتے ہیں۔ فلش یاری کھیلنے پر آتا تو رات رات بھر کھیلتا رہتا اور ایک ایک پیسہ ہار جاتا۔ محفل جم جاتی تو کبھی کبھار شراب بھی پی لیتا۔ گھر سے جس روز منی آرڈر آتا اس روز وہ کسی بالاخانے پر جا کر گانا ضرور سنتا۔ مگر ان تمام کمزوریوں کے باوجود بڑا نرم دل اور خدا ترس بھی تھا یہی وجہ تھی کہ وہ رات اس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔

صبح اٹھتے ہی وہ نوشا کے گھر پہنچا۔ نوشا کی ماں نے اسے اندر بلا لیا۔ کمرے میں جا کر اس نے دیکھا، نوشا ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ ماں نے بتایا کہ سویرے بہت تڑکے اسے ہوش آیا تھا۔ بات چیت بھی کی تھی۔ اب طبیعت ذرا ٹھیک ہے۔

سلمان وہیں دری پر بیٹھ کر نوشا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ سلطانہ کمرے کے باہر تھی۔ اس نے کئی بار سلمان کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اور برابر سگریٹ پر کش لگا رہا تھا۔ سلطانہ نے انو کو اشارے سے قریب بلایا۔ پڑوس میں بھیجا کہ کرسی مانگ لائے۔ اسے سلمان کا پتلون پہن کر فرش پر بیٹھنا بڑا بے تکا لگ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد انو کرسی لے کر آ گیا۔ کرسی بوسیدہ تھی۔ اس کا ایک پایہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کرسی کمرے کے اندر بھجوا دی۔

نوشا کی ماں نے اصرار کر کے سلمان کو کرسی پر بٹھا دیا۔ لمحہ بھر بعد اس نے پہلو بدلا تو کرسی

دل گرفتہ: غمگین۔ آشفتہ طبع: پریشان حال۔ لاابالی: بے پروا۔ زمرہ: گروہ، جماعت۔ بالاخانہ: مراد رنڈی کا کوٹھا۔ بے تکا: ناموزوں۔

ڈگمگا کر الٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی سلمان دھڑام سے فرش پر آ رہا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ کمرے کے باہر سلطانہ کی ہنسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔ سلمان جھینپ کر مسکرانے لگا۔

ماں بچوں کو خواہ مخواہ کوسنے لگی۔ "خدا سمجھے ان کم بختوں کو۔ اچھی بھلی کرسی توڑ ڈالی۔" اس نے کرسی اٹھائی۔ دیوار سے ٹکائی اور سلمان کو اس پر زبردستی بٹھا دیا۔ اس وقت وہ اس طرح چوکنا ہو کر کرسی پر بیٹھا تھا جیسے فوٹو کھنچوا رہا ہو۔ اب وہ عین دروازے کے مقابل بیٹھا تھا۔ کئی بار اس نے سلطانہ کو دروازے کی آڑ سے جھانکتے ہوئے دیکھا اور کئی بار اس کی نظریں سلطانہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔

لگ بھگ پون گھنٹے تک نوشا کی ماں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جب وہ جانے لگا تو نوشا کی ماں نے بڑے اصرار سے کہا۔ "آئندہ بھی آتے رہنا۔" اس کے لہجے میں خلوص تھا۔ محبت تھی۔ دراصل سلمان اسے بڑا شریف اور سعادت مند لڑکا معلوم ہوا تھا۔

جھینپ کر: شرما کر۔

فصل دوم

(۱)

موسم بدل رہا تھا۔ سردی کا چل چلاؤ تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ مگر راتیں بڑی سہانی ہوتیں۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ چاند نکلتا تو در و بام آئینہ خانہ بن جاتے۔ شفاف چاندنی سے دل میں کسک اٹھتی۔ کتنی ہی دبی ہوئی خواہشیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتیں۔

ایک ایسی ہی سہانی رات تھی۔ نوشا کی ماں دالان میں سائبان تلے بیٹھی تھی۔ اس نے سہ پہر کو غسل کیا تھا۔ دھلے ہوئے اجلے کپڑے پہنے تھے۔ سلطانہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ماں کا دوپٹہ اتار کر اپنا بسنتی دوپٹہ اوڑھا دیا۔

ماں نے احتجاج کیا۔ "اری لڑکی کچھ دیوانی ہو گئی ہے۔ لا میرا دوپٹہ تو دے۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "اللہ قسم اماں بسنتی دوپٹہ تو تم پر کھل گیا۔"

بات بھی ایسی ہی تھی۔ اس کی ڈھکی چھپی جوانی بسنتی دوپٹے میں جاگ اٹھی تھی۔ باہر صحن میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ماں کا چہرہ دمک رہا تھا، جگمگا رہا تھا۔ یوں اس کی عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی۔ سال بھر بعد سلطانہ پیدا ہوئی جو اب لگ بھگ سترہ سال کی تھی۔ اس حساب سے اس کا سن ۳۳ سال کے قریب تھا۔ لیکن شوہر کے انتقال کے بعد کچھ تو دکھوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا اور کچھ اس نے اپنی وضع قطع بھی بڑی بوڑھیوں کی سی بنا رکھی تھی۔ ورنہ ایک زمانے میں وہ بڑی طرحدار عورت تھی۔ شوہر چاہنے والا ملا تھا۔ ضلع کچہری میں محرر تھا مگر اس نے

چل چلاؤ: آخری وقت، روانگی۔ تمازت: شدت، گرمی۔ کھل گیا: سج گیا۔ حلیہ: حالت۔ طرحدار: خوش انداز، بانکی۔

کبھی بیوی کا دل میلا نہیں کیا۔ آدھی رات کو بھی اگر اس نے کسی چیز کی فرمائش کی تو اسی وقت جا کر لے آتا۔ لیکن اب اسے مرے ہوئے پانچ برس ہو گئے تھے اور ان پانچ برسوں میں اس کے سارے جتن ہو گئے۔ کون سی مصیبت تھی جو اس نے نہیں جھیلی، کون سی پریشانی تھی جس سے اس کا سابقہ نہیں پڑا۔

اوڑھنے کو تو اس نے بسنتی دوپٹہ اوڑھ لیا مگر ڈر رہی تھی کہ کسی محلے والے نے دیکھ لیا تو نکو بن جائے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ رنڈاپا چھوڑ چھاڑ اب بننا سنورنا شروع کر دیا ہے۔ مارتے کا ہاتھ سب پکڑ لیتے ہیں کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔ وہ بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ نیاز آ گیا۔

اس روز وہ بالکل چھیلا بن کر آیا تھا۔ سفید ململ کا کرتا اس کے نیچے شربتی بنیائن۔ کھڑکھڑاتی ہوئی کلف دار لٹھے کی شلوار، ٹوپی بھی اس نے اتار دی تھی۔ آڑی مانگ نکال کر بڑی محنت سے بالوں کو جمایا تھا جن پر چپڑا ہوا خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ ایک ہاتھ کی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا گجرا پڑا تھا۔ کان میں عطر کا پھویا تھا۔ نیاز آ کر بیٹھا تو سارا گھر مہکنے لگا۔ اس وقت وہ تھا بھی بڑا خوش۔ نوشا کی ماں کو بسنتی دوپٹہ اوڑھے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔

"ارے آج تو آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔"

سلطانہ جو قریب ہی بیٹھی تھی، مسکرا کر بولی۔ "دولھا بھائی! میں ان سے ابھی یہی کہہ رہی تھی۔ اچھا خاصا اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ جب دیکھو یہ نگوڑا موٹا سفید دوپٹہ سر پر منڈھے بیٹھی ہیں۔"

نیاز نے مڑ کر سلطانہ کو دیکھا۔ اس کا حسن سفید لباس میں کچھ اور نکھر گیا تھا۔ گلابی ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ آنکھوں میں تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی شگفتگی تھی۔ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے سلطانہ۔ خدا قسم! یہ دوپٹہ تو آپ پر بڑا اچھا لگ رہا ہے۔"

نوشا کی ماں شرما کر بولی۔ "کیوں تم دونوں مل کر مجھے بنا رہے ہو؟"

سلطانہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ نیاز کو اس کی ہنسی بڑی اچھی لگی۔ وہ اسے خوش کرنے کے لیے بولا۔ "سلطانہ۔ تم ان کو روز رنگین دوپٹے اوڑھایا کرو۔ ذرا دیکھو تو کیسی جچ رہی ہیں۔ بھئی اسی بات پر سب کا منہ میٹھا ہو جائے۔" وہ اس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں تھا۔ ابھی ابھی اس نے چوری کے سو موٹر ٹائر فروخت کیے تھے جس میں کئی سو روپے کا منافع ہوا تھا۔ اس نے انو کو بلایا اور جیب سے پانچ

دل میلا کرنا: دکھ دینا۔ جتن: دوڑ دھوپ، کوشش۔ سابقہ: واسطہ۔ نکو بننا: بدنام ہونا، رسوا ہونا۔ چھیلا: شوخ۔ جچنا: اچھا لگنا۔

روپے کا نوٹ نکال کر بولا۔

"ذرا لپک کر سیر بھر گرم گرم بالوشاہی تو لانا۔"

نوشا کی ماں نے بہت منع کیا مگر وہ باز نہ آیا۔ ضد کر کے انو کو مٹھائی لانے کے لیے بھیج دیا۔

ذرا دیر بعد انو مٹھائی لے کر آ گیا۔ نیاز نے بڑے اصرار سے نوشا کی ماں کو خود اپنے ہاتھ سے ایک بالوشاہی کھلائی۔ پھر مٹھائی تقسیم کی گئی۔ سب خوش تھے۔ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ گھر بھر میں ہنگامہ برپا تھا۔ نوشا بھی اسی وقت آیا تھا۔ اور سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔

رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ آخر نوشا اور انو اپنے اپنے بستروں میں جا کر دبک گئے۔ تھوڑی دیر میں سلطانہ بھی جمائیاں لینے لگی۔ وہ جانے کے لیے اٹھی تو نیاز نے اس طرح دیکھا کہ اس کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں۔ کچھ دیر تو اور بیٹھو۔ مگر وہ اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ نیاز بار بار مڑ کر کمرے کی جانب تکتا رہا کہ شاید سلطانہ واپس آ جائے۔ لیکن وہ بے خبر سو رہی تھی۔

نیاز ذرا دیر تک بجھا بجھا سا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا چلو آج لگے ہاتھوں سلطانہ کے ساتھ رشتے کی بات چھیڑ دی جائے۔ وہ اپنی گھریلو تکلیفوں کا رونا رونے لگا۔ ہوٹل کے خراب کھانے سے گھر کے اکیلے پن تک، ساری باتیں سنا ڈالیں۔ سلطانہ کی ماں چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو اس نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا۔

"میرا کہا مانو تو تم اپنا گھر بسا لو۔ اس طرح کب تک تکلیفیں اٹھاؤ گے۔"

نیاز یہی بات اس کی زبان سے سننے کا عرصے سے خواہشمند تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ "سوچ تو میں بھی رہا ہوں، مگر میرا یہاں کون ہے جو کہیں سلسلہ چھیڑا جائے۔ لے دے کے ایک آپ کا گھر ہے جہاں چلا آتا ہوں۔"

"کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں؟"

نیاز کے ذہن میں ایک بار یہ خیال ابھرا کہ صاف صاف کہہ دے۔ مگر ہچکچاہٹ کے باعث اپنی بات نہ کہہ سکا۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔ "یہ تو آپ ہی کو سوچنا پڑے گا۔"

وہ اس کی بات کا مطلب کچھ کچھ بھانپ گئی۔ "بھئی میں کیا بتاؤں؟ اگر میری سلطانہ کچھ بڑی ہوتی تو میں خدا قسم اس کو تمہارے ساتھ بیاہ دیتی۔"

نیاز کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ بوکھلا کر بولا۔ "آپ میری عمر کتنی سمجھتی ہیں؟"

"یہ تو میں جانتی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سلطانہ کی اور تمہاری عمر میں آدھوں آدھ کا فرق ہو گا۔"

نیاز یہ بات کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا۔ کھسیانا ہو کر بولا۔ "آپ بھی کمال کر رہی ہے۔ اتنا فرق کیسے ہو سکتا ہے۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"ضرور کہئے۔" وہ اس وقت سب کچھ سننے کو تیار تھا۔

سلطانہ کی ماں نے دبی زبان سے کہا۔ "سچ پوچھو تو سن میں دو چار سال میں تم سے چھوٹی ہوں گی۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر چیخ پڑا۔ "جی۔"

"میری عمر کیا سمجھتے ہو؟ تیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔" دو تین سال کی اس نے اپنی طرف سے ڈنڈی مار دی۔

نیاز نے اس دفعہ اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی ابھی تک جوان تھی۔ سر کے سارے بال سیاہ تھے اور بڑے سلیقے سے گندھے ہوئے تھے۔ چہرے کے نقوش کا تیکھا پن گو کہ ماند پڑ چکا تھا پھر بھی ان میں تازگی تھی۔ دل آویزی تھی۔ البتہ جسم ذرا بھدا ہو گیا تھا۔ خاص طور پر کولھے جو کسی قدر پھیل گئے تھے۔ لیکن اس میں ایک دلفریب سج دھج اور کشش تھی۔ نیاز نے اب تک اسے اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے صرف سلطانہ کی ماں کی حیثیت سے دیکھتا رہا تھا۔ مگر اس وقت صرف ایک عورت کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی ایک مرد کی نظر سے۔

سلطانہ کی ماں نے اسے اس طرح ٹٹولتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھا تو شرما کر دوپٹہ سر پر سرکا لیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ نیاز کے سامنے وہ شرما بھی سکتی ہے۔ اس احساس میں خوف تھا، لذت تھی۔ ایسی لذت جس سے وہ نا آشنا نہیں تھی اور جسے وہ تھپک کر سلا چکی تھی۔ اس نے اپنے جسم میں پسینے کی نمی محسوس کی۔ وہ گھبرا رہی تھی اور اس گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے اس نے جلدی سے پاندان کھول کر پان لگایا اور نیاز کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے؟ لو پان کھاؤ۔"

ڈنڈی مارنا: مراد کم کرنا۔

نیاز نے ہاتھ بڑھا کر پان لیا۔ دونوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے مس ہوئیں۔ نوشا کی ماں کا ہاتھ کپکپایا اور پان نیچے گر پڑا۔

دونوں چونک کر ایک ساتھ بولے۔ "ارے!!"

دونوں خاموش ہو گئے اور کئی منٹ تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ چاندنی اور نکھر گئی۔ ہوا میں سرسراہٹ تھی اور نیاز کی کلائی میں پڑے ہوئے گجرے کے پھول مہک رہے تھے۔ اچانک کمرے کے اندر لیمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی جہاں گھپ اندھیرا تھا۔

جتنی دیر وہ کمرے کے اندر رہی یہ تمام وقت نیاز نے بڑی بے چینی سے کاٹا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کیا وہ اٹھ کر یہاں سے چپ چاپ چلا جائے؟ کئی سوال اس کے ذہن میں ابھر ابھر کر غوطے لگا رہے تھے۔ اجلی چاندنی باہر صحن میں بکھری ہوئی تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور موتیے کے پھول مہک رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ نیاز نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ نیاز کی نظریں برابر اس کے جسم کے پیچ و خم پر منڈلاتی رہیں۔ مگر جب وہ اس سے ہٹ کر دور بیٹھنے لگی تو نیاز کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"یہاں میرے قریب"

وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گئی۔ مگر نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اجلی چاندنی کی ہلکی ہلکی جگمگاہٹ میں دونوں دالان کی تنہائی میں گم صم بیٹھے تھے۔ نیاز نے پھولوں کا گجرا ہاتھ سے نکال کر سامنے رکھ دیا۔ لمحہ بھر تک وہ اس کے ساتھ انگلیوں سے کھیلتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ کیا بات کرے۔

کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"بہت رات ہو گئی۔" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"گیارہ بجے ہوں گے۔"

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ یہ خاموشی بڑی ہیجان خیز تھی۔ نیاز نے گھبرا کر انگڑائی لی۔ اسے غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ "ذرا اور قریب آ جاؤ۔" اور وہ خود اس کی طرف جھک گیا۔ وہ

نکھر گئی: مراد چمکدار ہو گئی۔ ہیجان خیز: جوش بڑھانے والی۔

کسمسا کر اپنی جگہ پر رہ گئی۔

کمرے میں سلطانہ اور اس کے دونوں بھائی گھپ اندھیرے میں بے خبر سو رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

نیاز بہت تڑکے اٹھ کر نوشا کے گھر سے چلا گیا۔ رات کے حادثے کی یادگار گجرے کے مسلے ہوئے پھول رہ گئے تھے جو دالان میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

اب اکثر ایسا ہوتا کہ نیاز سرِ شام نوشا کے گھر جاتا۔ رات گئے تک بیٹھا باتیں کیا کرتا اور علی الصباح اٹھ کر چپکے سے چلا جاتا۔

لیکن سلطانہ ابھی تک اس کی نظروں میں چڑھی ہوئی تھی۔ بلکہ ماں اور بیٹی جب ساتھ بیٹھی ہوتیں تو ماں اسے بھدی اور بدوضع معلوم ہوتی۔

موقع مل جاتا تو نیاز سلطانہ سے ہنس کر بات بھی کر لیتا۔ مگر ماں اب اس کی کڑی نگرانی کرنے لگی تھی۔ کسی وقت بھی اکیلا چھوڑ کر نہ جاتی۔ ذرا ذرا سی بات پر اس سختی سے ڈانٹ دیتی کہ نیاز کی موجودگی میں سلطانہ کا بیٹھنا دوبھر ہو جاتا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ نیاز سلطانہ کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کسی رشتے دار کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ ماں اور بیٹی ذرا دیر پہلے لوٹی تھیں۔ سلطانہ ابھی تک اپنا ریشمی جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس میں اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے تھے۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ رعنائی جھلک رہی تھی۔

نیاز کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بار بار اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ کو بھی اس وقت اپنی دل کشی کا پورا پورا احساس تھا۔ ماں کے بار بار کہنے کے باوجود اس نے لباس تبدیل نہیں کیا اور وہیں ماں کے کولھے سے لگی بیٹھی رہی۔

نیاز نے ایک بار نظر اٹھا کر دیکھا تو سلطانہ کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ ماں سر جھکائے پان لگا رہی تھی۔ معاً اس کی نظر سلطانہ پر پڑ گئی۔ اس نے سلطانہ کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ قہر آلود نظروں سے

سرِ شام: شام ہوتے ہی۔ علی الصباح: صبح سویرے۔ بھدی، بدوضع: مراد بدصورت۔ کڑی: سخت۔ دوبھر: مشکل، دشوار۔ رعنائی: خوبصورتی، حسن۔ معاً: اچانک۔ تیوری: ماتھا، پیشانی۔ قہر آلود: غصے سے بھری ہوئی۔

اسے گھورا۔ ڈپٹ کر بولی۔ "جا اندر جا کر بیٹھ۔ جب دیکھو سر پر سوار ہے۔"

سلطانہ اترانے لگی۔ "ابھی نیند نہیں آ رہی۔"

ماں نے غصے سے کہا۔ "جاتی ہے کہ نہیں۔" پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے کے اندر لے گئی۔ اس نے سلطانہ کے رخسار میں زور سے چٹکی بھر کر دبی زبان سے کہا۔ "حرام زادی، میں تیرے سب کرتوت جانتی ہوں۔"

سلطانہ منہ بسور کر رہ گئی۔

ماں کے انداز میں جذبہ رقابت صاف جھلک رہا تھا۔ یہ بات سلطانہ نے تو محسوس نہیں کی۔ البتہ نیاز کو اس کا شدت سے احساس ہوا۔

دوسرے ہی دن سے نیاز محسوس کرنے لگا کہ سلطانہ اب اس کے سامنے آتے ہوئے کترانے لگی ہے۔ کمرے کے اندر سے کبھی کبھار صرف اس کے بولنے کی آواز آ جاتی۔ نیاز نے ایک آدھ بار باتوں باتوں میں سلطانہ کا ذکر چھیڑا تو اس کی ماں بے رخی سے ٹال گئی۔ نیاز کے ذہن میں اچھی خاصی الجھن پیدا ہو گئی۔ کئی روز اسی الجھن میں گزر گئے۔

❁ ❁ ❁

انھی دنوں کا ذکر ہے۔

نیاز خلاف توقع دن کے وقت نوشا کے گھر چلا گیا۔ دس ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ اس روز ماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ انو کے ساتھ اسپتال گئی تھی۔ نوشا ورکشاپ جا چکا تھا گھر میں صرف سلطانہ تھی۔

نیاز اس کے پاس پہنچا۔ وہ اسے اپنے روبرو دیکھ کر گھبرا گئی۔ نیاز نے سب سے پہلی بات جو اس سے پوچھی وہ یہ تھی۔

"تم دکھائی کیوں نہیں دیتیں۔ ہر وقت کمرے کے اندر کیوں بیٹھی رہتی ہو؟"

اس نے صاف صاف بتا دیا۔ "اماں نے آپ کے سامنے آنے سے منع کر دیا ہے۔"

نیاز کے ذہن کو زبردست دھچکا لگا گھبرا کر بولا۔ "کیوں؟"

اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ دولھا بھائی سے پردہ کیا کرو۔"

کرتوت: بری عادتیں، برے کام۔ رقابت: مخالفت، دشمنی۔ کترانا: بچنا۔

نیاز نے دل ہی دل میں کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی سلطانہ نے اس کے سامنے آنا بند کر دیا۔ اچانک اس نے سلطانہ کی ماں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ ذرا دیر خاموش کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے محبت بھری نظروں سے سلطانہ کو دیکھا اور بڑے پیار سے بولا۔

"سلطانہ۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "جی۔"

چند لمحے دونوں خاموش کھڑے رہے پھر سلطانہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ "آپ جائیے۔ اماں آتی ہوں گی۔ آپ کو یہاں دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

نیاز نے سوچا واقعی ان حالات میں اس کا وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ وہ فوراً باہر آ گیا۔ اسے رہ رہ کر سلطانہ کی ماں پر غصہ آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی سلطانہ کو حاصل کر لینے کی تمنا شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔

(۲)

کالے صاحب نے نیاز کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "مسٹر نیاز! بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

نیاز نے ٹالنا چاہا تو کالے صاحب اس کے سر ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں تم اپنی لائف انشور کرا لو۔ کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔"

نیاز اس وقت جھنجلایا ہوا تھا۔ جل کر بولا۔ "کالے صاحب! تمہیں ہر وقت بیمہ ہی کرانے کی پڑی رہتی ہے۔ نہ وقت دیکھتے ہو نہ موقع۔ ہر وقت سالا بیمہ تمہارے ساتھ لگا رہتا ہے۔"

کالے صاحب ہنسنے لگا۔ ناراض ہونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ورنہ اس قدر کامیاب انشورنس ایجنٹ نہ ہوتا۔

"ارے تم تو ناراض ہو گئے۔ آؤ تم کو چائے پلاؤں۔" کالے صاحب نرمی سے بولا۔ مگر نیاز اس کے ہمراہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔

پیچ و تاب کھانا: غصے میں آنا۔ تشویش: فکر۔ سر ہونا: پیچھے پڑنا۔

کالے صاحب اصرار کرنے لگا۔ "بیمہ نہ کراؤ۔ مگر میری چائے تو پی لو۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ نیاز کو گھیر گھار کر قریب کے اس چائے خانے میں لے گیا۔ چائے کا آرڈر دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ مگر بیمے کا ذکر کیے بغیر کالے صاحب زیادہ دیر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ گھوم پھر کر اسی موضوع پر آ گیا۔

"زندگی میں گارنٹی بہت بڑی چیز ہے اور وہ صرف انشورنس سے ملتی ہے۔ تم تجربے کے لیے دس ہزار کی پالیسی لے کر دیکھو۔ پھر خود ہی اس کی امپارٹنس سمجھ لو گے۔"

نیاز نے سنجیدگی کے ساتھ بیمہ کرانے کے بارے میں نہ کبھی سوچا تھا اور نہ اب اس کا ارادہ تھا اس نے صرف کالے صاحب کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ "دیکھو کالے صاحب، بیمہ ویمہ تو میں کرواؤں گا نہیں۔ البتہ کوئی ایسی ترکیب تم کو معلوم ہو تو بتاؤ جس سے سال سوا سال میں چالیس پچاس ہزار کی رقم مل جائے۔"

کالے صاحب کہاں میدان چھوڑنے والا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "اس کا بھی ایک ہی طریقہ ہے۔ انشورنس اور صرف انشورنس۔ اپنے کسی بچے یا وائف کا بیمہ کرا دو۔ اگر سال بھر کے اندر اس کی موت واقع ہو گئی تو پچاس ہزار کیا ایک لاکھ کی بھی پالیسی لو گے تو تم کو کمپنی اتنا ہی روپیہ دے گی۔"

نیاز سوچ میں پڑ گیا کالے صاحب سمجھا کہ وہ اس کی باتوں پر ناراض ہو گیا۔ لہٰذا معذرت کرنے کے انداز میں بولا۔ "دیکھو بھئی اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ انشورنس ایجنٹ موت اور زندگی کی بات ہمیشہ ڈاکٹروں کی طرح صاف صاف کرتا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ دراصل میں اس وقت ایک پریشانی میں ہوں۔ بات یہ ہے؟" نیاز آگے اور کچھ کہتا مگر کالے صاحب نے بات بھی پوری نہ کہنے دی۔ لگا اپنی ہانکنے۔ "میں تمہاری پریشانی خوب جانتا ہوں۔"

نیاز نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور چائے کا گھونٹ پی کر سوچنے لگا۔ یہ کالے صاحب بھی عجیب مسخرا ہے۔ میری پریشانی یہ کیا جانے۔ مگر کالے صاحب قطعی کاروباری موڈ میں تھا۔ اس نے دیکھا شکار پھنس رہا ہے۔ اب اسے نکلنے نہ دو۔ یہیں گردن دبوچ لو کہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکے۔ وہ

گھیر گھار کر: بہلا پھسلا کر۔ اپنی ہانکنا: کسی دوسرے کی بات پر توجہ دینے کی بجائے اپنی کہے جانا۔

جوش میں آ کر بولنے لگا۔ "دیکھو مسٹر نیاز! آگے کا حال کوئی نہیں جانتا۔ زندگی کیا ہے؟" یہ بات
خود کالے صاحب کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے وہ الجھا کہ اب کیا کہے۔ پھر
اس نے میز پر رکھی ہوئی چینی کی پلیٹ اٹھائی اور اسے نیاز کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"زندگی کی مثال اس پلیٹ کی طرح ہے۔ اس پلیٹ کو اٹھاتے ہوئے تم ڈرو گے کہ کہیں ٹوٹ
نہ جائے۔ لیکن اگر اس کا انشورنس ہو چکا ہے تو ڈر کی کوئی بات نہیں۔ اس کی قیمت تو تمہاری جیب
میں ہے۔ تم اس کو یوں اٹھا کر پھینک سکتے ہو۔"

اور کالے صاحب نے واقعی پلیٹ اٹھا کر اچھال دی۔ وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ پلیٹ
کے ٹوٹنے کا چھناکا ہوا تو کالے صاحب بھی چونکا کہ یہ اس نے کیا کر دیا۔ چائے خانے میں ذرا دیر کے
لیے سنسنی پھیل گئی۔

ایک بیرا لپک کر اس کے پاس آیا۔ حیرت زدہ ہو کر گویا ہوا۔ "صاحب۔ آپ نے پلیٹ کیوں
توڑ ڈالی؟"

کالے صاحب بہت چکرایا۔ پھر کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا نیاز کو بھی ہنسی آ گئی۔

بیرا بولا۔ "ساب ہنسی کی بات نہیں۔ دو روپیہ ڈنڈ بھرنا پڑے گا۔"

ہوا بھی یہی۔ چائے کے بل کے ساتھ کالے صاحب کو پلیٹ کے بھی دو روپے دینا پڑے۔
اس دو روپے کی چپت سے کالے صاحب کی ساری تیزی رفو چکر ہو گئی۔ بھیگی بلی کی طرح مری ہوئی
آواز سے اس نے نیاز کو مخاطب کیا۔

"مسٹر نیاز اب تم سے کہاں ملاقات ہو گی؟"

آج سے پہلے اگر کالے صاحب یہ بات نیاز سے پوچھتا تو وہ جل کر کہتا۔ "جہنم میں۔" مگر اب
وہ واقعی بیمہ کرانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

"پرسوں سہ پہر کو آ جاؤ۔ اس وقت کام بھی نہیں ہوتا۔ اطمینان سے بات ہو گی۔"

دوبارہ ملنے کا پروگرام طے کر کے دونوں اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔

دکان پر پہنچ کر کالے صاحب کی باتوں پر نیاز دیر تک غور کرتا رہا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو
صرف روپیہ پیدا کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے بوجھ سے دبے ہوئے ایک روز ٹھنڈے

سنسنی: پریشانی/حیرانی۔ ڈنڈ بھرنا: جرمانہ ادا کرنا۔ چپت: مراد نقصان۔ ٹھنڈے ٹھنڈے: چپکے سے۔

ٹھنڈے دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔

نیاز نے سوچا کہ اگر بیمے کے ذریعے سال دو سال میں چالیس پچاس ہزار کی رقم ہاتھ لگ
جائے تو مزہ آ جائے۔ بات کچھ سمجھ میں آتی بھی تھی۔ لیکن اس کے لیے پہلے ایک عدد بیوی کی
ضرورت تھی۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک اسکیم تیار کی اور نوشا کے گھر پہنچ گیا۔

❁ ❁ ❁

سلطانہ کمرے کے اندر بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کی آواز ابھرتی تو نیاز کے سینے پر سانپ لوٹ
جاتا۔

نوشا کی ماں کی ہر بات اسے زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوتی۔ وہ اس وقت نیاز کے سامنے بیٹھی
ہنس ہنس کر پڑوس کی ایک عورت کا قصہ سنا رہی تھی جس کی شلوار میں چوہیا گھس گئی تھی۔

جب پہر رات گزری اور گھر پر سناٹا چھا گیا تو نیاز نے خلوت میں بڑے پیار سے کہا۔ "اس
طرح کب تک یہ چوری چھپے کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ میرا تو اب تمہارے بغیر ایک گھڑی جی نہیں
لگتا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "دن میں گھڑی دو گھڑی کو چلے آیا کرو۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ کیوں نہ ایک روز قاضی کو بلوا کر دو بول پڑھوا لیے جائیں۔ اللہ رسول بھی
خوش اور دنیا کا خوف بھی نہیں۔"

سلطانہ کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی مگر اس کے پروگرام کے مطابق ابھی اس نیک کام کا
وقت نہیں آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اسے نیاز کی نیت پر شبہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے سلطانہ کو بیاہ کر گھر
سے رخصت کر دے۔

اس نے نیاز کی بات خوش اسلوبی سے ٹال دی۔

زہر میں بجھی ہوئی: انتہائی تلخ۔ خلوت: تنہائی۔ نیک کام: مراد شادی۔ خوش اسلوبی سے: اچھے طریقے سے، عمدہ طریقے سے۔

(۳)

سہ پہر کا وقت تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ سلمان کہیں سے تھکا ہارا آرہا تھا۔ راستے م
اس کی اتو سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔

گھر نزدیک تھا۔ وہ اصرار کر کے سلمان کو گھر لے آیا۔ ماں نے اندر بلا لیا۔

سلمان ان دنوں پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ مگر ا
دفعہ وہ گھر نہیں گیا تھا۔ باپ اس سے ناراض تھا۔ ہر ماہ کے اخراجات کے لیے جو رقم گھر سے آ
تھی وہ بھی بند کر دی گئی تھی وہ پیسے پیسے کو محتاج تھا۔ اکثر فاقے بھی کرنا پڑتے۔ صحت خراب ہو گ
تھی۔ چہرہ بیماروں کی طرح زرد نظر آرہا تھا۔

نوشا کی ماں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو تعجب سے پوچھا۔ "کیا تم بیمار پڑ گئے تھے؟"

وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ "جی ہاں ملیریا ہو گیا تھا۔"

"جب ہی تو میں کہوں کہ تم اس روز کے بعد سے آئے کیوں نہیں۔"

سلمان کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے جانے لگا تو نوشا کی ماں نے روک لیا کہ کھانا کھا
جانا۔ وہ تھی بھی کچھ باتونی عورت اور اس روز تو اس پر باتوں کا دورہ پڑا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں ک
قصے سناتی رہی۔ اس عرصے میں کئی بار دروازے پر سلطانہ کی جھلک نظر آئی۔ سلمان جو ماں کی ب
سروپا باتوں سے اکتا گیا تھا، سلطانہ میں دلچسپی لینے لگا۔ اب وہ ماں کی نظریں بچا کر اس کی جانب
دیکھ لیتا۔

سلمان نے سوچا لڑکی خوبصورت ہے۔ الھڑ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی ذا
میں دلچسپی بھی لے رہی ہے۔ یہ احساس خود اپنی جگہ کم کشش انگیز نہیں تھا۔ ان دنوں وہ سخ
پریشان تھا۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی۔ ذہنی فرار کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے میں گر
اور حبس کے باوجود دیر تک بیٹھا نوشا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔

دن ڈھلنے لگا شام کی آمد آمد تھی۔ نوشا کی ماں کسی ضرورت سے باہر چلی گئی۔ کمرے میں
تنہا رہ گیا تھا۔ اور اس تنہا کمرے میں سلطانہ کے جوان جسم کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس مہک

باتونی: بہت باتیں کرنے والی۔ بے سروپا: فضول۔

ایک لذت اور وارفتگی تھی جسے وہ چپ چاپ بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔

شام کا دھندلکا افق کی سیڑھیوں سے اترتا ہوا در و دیوار پر پھیل گیا۔ گلی کی چہل پہل بڑھ گئی۔ گھروں میں بچوں کا شور ابھرنے لگا۔ موسم گرما کی یہ ایک ایسی شام تھی جس کی گہما گہمی وہ صرف آوازوں سے محسوس کر رہا تھا۔ ان آوازوں میں سلطانہ کی بھی آواز شامل تھی۔ وہ خواہ مخواہ اٹھلا اٹھلا کر اس طرح بول رہی تھی جیسے اسے بخوبی احساس تھا کہ کوئی اس کی آواز سن رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آگیا۔ کھانے میں خاصا تکلف کیا گیا تھا۔ وہ صبح کا بھوکا تھا۔ کھانا اسے پسند آیا اور اس نے تعریف بھی کی۔ نوشا کی ماں اصرار کر کے ایک ایک چیز کھلاتی رہی۔ اس کی یہ شام بڑی مزے دار گزری۔

دو روز کا غوطہ دے کر چوتھے روز سلمان پھر وہاں پہنچا۔ نوشا کی ماں اس روز بھی بڑی محبت سے پیش آئی۔ باتوں باتوں میں نوشا کے باپ کا ذکر آگیا۔ وہ ایک لمبی چوڑی داستان سنانے لگی۔ نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا اسی اثناء میں کسی نے آکر اطلاع دی کہ پڑوس میں جو منشی جی رہتے تھے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے گھر سے نوشا کی ماں کے دیرینہ مراسم تھے۔ کچھ تو وہ زود رنج تھی کچھ دکھوں کی ماری ہوئی بھی تھی۔ اس خبر کے سنتے ہی ایسی حواس باختہ ہوئی کہ سلمان سے بھی کچھ نہ کہا۔ اٹھی اور فوراً منشی جی مرحوم کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

کمرے میں اب سلمان کے پاس نوشا رہ گیا تھا۔ کمرے کے باہر سلطانہ تھی جو کھانا پکانے میں مشغول تھی۔

وہ نوشا سے باتیں کرنے لگا۔ اب زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے جانے کا قصد کیا تو سلطانہ نے خود دروازے پر آکر کہا۔

"کھانا کھا کر جایئے گا۔ اماں تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔"

وہ دروازے کی آڑ میں کچھ اس طرح کھڑی تھی کہ 'صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں' والی کیفیت تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ کی نگاہیں جھک گئیں اور سلمان نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

وارفتگی: بے خودی۔ اِٹھلا اِٹھلا کر: نخرے کے ساتھ، ادا کے ساتھ۔ دیرینہ: پرانے۔ مراسم: تعلقات۔ زود رنج: جلد ناراض ہو جانے والی۔ قصد: ارادہ۔

❁ ❁ ❁

شام کی خاموشی میں دروازے پر دستک ہوئی۔ نیاز آیا تھا۔ پہلے تو سلطانہ گھبرا گئی کہ کیا کرے۔ پھر اس نے مناسب یہی سمجھا کہ نیاز کو اندر نہ بلائے۔

اس نے نوشا کو قریب بلا کر کہا۔ "دولھا بھائی سے کہہ دو۔ اماں گھر میں نہیں۔ آپ رات کو آیئے گا۔ اس وقت تک وہ واپس آ جائیں گی۔"

نیاز نے نوشا کی زبانی یہ بات سنی تو تلملا کر رہ گیا۔ سلطانہ پر تو اسے ذرا شبہ نہ ہوا۔ البتہ اس کی ماں پر سخت غصہ آیا۔ سوچا گھر سے جاتے ہوئے وہ سلطانہ کو منع کر گئی ہو گی۔ وہ جھنجلایا ہوا واپس چلا گیا۔

نوشا دیر سے باہر نکلنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ دیکھا موقع غنیمت ہے وہ بھی وہاں سے کھسک گیا۔ کمرے میں سلمان تنہا رہ گیا۔ اس تنہائی نے اسے شدید بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ اب گھر میں وہ تھا اور سلطانہ تھی۔ ان کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ دیوار میں دروازہ تھا جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ شام کی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کمرے کے اندر آ رہے تھے۔ لیمپ کی لو بار بار بھڑک اٹھتی۔ ایک بار سلطانہ دروازے کے سامنے سے گزری۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ لیمپ کی بھڑکتی ہوئی لو جیسے بار بار کہہ رہی تھی۔

"کچھ ہونے والا ہے۔"

"کچھ ہو کے رہے گا۔"

اچانک گہری خاموشی میں شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا۔ سلمان چونک پڑا۔ کمرے کے باہر شیشے کا کوئی برتن گر کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ چھناکا کچھ اس طرح گونجا کہ سلمان نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا ہو گیا؟"

باہر سے سلطانہ کی آواز ابھری۔ "کچھ نہیں۔ چوہوں نے طاق سے گلاس گرا دیا تھا۔"

"چوٹ تو نہیں آئی؟" سلمان نے اظہار ہمدردی کیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنسی کی آواز سن کر سلمان کو اپنے سوال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔

تلملانا: بے چین ہونا۔ کرچی کرچی: ٹکڑے ٹکڑے۔

کچھ اور وقت خاموشی میں گزر گیا۔

سلمان نے خاموشی سے اکتا کر اونچی آواز سے کہا۔ "یہ نوشا کہاں چلا گیا؟" سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سلمان کو سخت کوفت ہوئی۔

ذرا دیر بعد کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ سلطانہ نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پوچھا۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا؟"

"جی ہاں۔ دیواروں سے تو باتیں کرنے سے رہا۔"

"ارے!" وہ بے نیازی سے ہنسنے لگی۔

"اب میں چلوں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ شوخی سے بولی۔ "اکیلے کمرے میں آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

کالج کا شوخ اور کھلنڈرا نوجوان شرارت پر اتر آیا۔ "بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

اس دفعہ سلطانہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"ایسا کیجیے آپ یہاں کمرے میں آ کر بیٹھ جایئے اور میں کھانا تیار کروں گا۔" سلمان نے اسے چھیڑا۔

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ایسا فرسٹ کلاس کھانا تیار کروں گا کہ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔"

"کہاں سیکھا آپ نے؟"

"باقاعدہ امتحان پاس کیا ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "اچھا تو کھانا پکانے کا بھی امتحان ہوتا ہے۔"

"بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔"

دونوں باتیں کرتے کرتے بالکل آمنے سامنے آ گئے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر سلطانہ شرما گئی اور دروازے کی اوٹ میں چھپنے لگی۔ سلمان نے فوراً کہا۔

"اب کیا کیجیے گا پردہ ورد کر کے۔"

سلطانہ نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ پھر بڑی معصومیت سے کہا۔ "اماں ناراض ہوں گی۔"

سلمان مسکرانے لگا۔ "ان کے سامنے پردہ کر لیا کیجئے۔ ٹھیک ہے نا۔"

وہ کمرے سے باہر نکل کر اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطانہ نے اسے اپنے روبرو اِ
طرح پایا تو گھبرا کر بولی۔

"ہائے اللہ۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ سلمان کو اس کی یہ ادا بھا گئی۔ اس نے ڈرتے ڈر
سلطانہ کے شانے پر اپنا ہاتھ اس طرح رکھ دیا جیسے وہ دہکتی ہوئی انگیٹھی ہو جس سے اس کا ہاتھ جھل
جائے گا۔

سلطانہ کا تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ سلمان نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

ذرا دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔ سلمان کسی نامعلوم خوف سے گھبرا گیا۔ دبی زبان
بولا۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس نے سلطانہ کے جواب کا انت
بھی نہ کیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کے باہر چلا گیا۔

سلطانہ سوچتی ہی رہ گئی کہ کیا کہے۔

(۴)

شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سلمان نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ نہ اس
جیب میں کوئی پیسہ تھا اور نہ کہیں سے کچھ ملنے کی امید تھی۔ اس کے پاس ایک گھڑی رہ گئی تھی ج
کئی روز سے فروخت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ راستے میں نیاز کی دکان پڑتی تھی۔ وہ جھجکتا ہوا دکان
اندر داخل ہو گیا۔

دکان میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی پیلی پیلی روشنی میں نیاز خاموش بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ
بولا۔ "کہیے؟"

سلمان گھبرایا ہوا تھا۔ دبی زبان سے گویا ہوا۔ "میں یہ گھڑی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"
نے اس کے ہاتھ سے گھڑی لی۔ الٹ پلٹ کر دیکھی۔ کان کے پاس لے جا کر اندازہ لگایا کہ آیا

بھا گئی: پسند آگئی۔

رہی ہے یا بند ہے۔ جب وہ اسے اچھی طرح دیکھ بھال چکا تو مسکرا کر بولا۔

"آپ ہی کی ہے نا؟"

سلمان کو اس بے تکے سوال پر حیرت بھی ہوئی۔ کچھ تاؤ بھی آیا۔ جی چاہا کہ جواب دے۔ "جی نہیں چوری کی ہے۔" مگر وہ جھگڑنے نہیں آیا تھا۔ گھڑی فروخت کرنے آیا تھا۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔

"جی میری ہی ہے۔"

"اگر آپ کی نہیں بھی ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔" نیاز کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

سلمان تیکھے لہجے میں بولا۔ "جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ناراض نہ ہوں میں نے مان لیا کہ آپ ہی کی ہے۔" نیاز بدستور مسکراتا رہا۔

"آپ اسے خریدنا چاہتے ہیں؟"

نیاز بے نیازی سے بولا۔ "خرید لوں گا۔ ویسے عام طور پر ایسی چیزیں خریدتا نہیں۔ یہ مشینری کا معاملہ ہے۔ اس میں بڑی چار سو بیسی ہوتی ہے۔"

سلمان سوچنے لگا عجیب نامعقول سے سابقہ پڑا ہے۔ الو کا پٹھا خواہ مخواہ ایک کے بعد دوسرا الزام عائد کرتا جا رہا ہے۔ لیکن کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں۔"

نیاز نے سلمان کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ زیر لب مسکرایا۔ "صورت سے تو آپ بھلے مانس لگتے ہیں۔" لحہ بھر وہ خاموش رہا۔ اس کی یہ خاموشی سلمان کو بے حد شاق گزری۔ جی چاہا کہ گھڑی واپس لے لے۔ دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر دکان سے باہر چلا جائے۔ مگر وہ دکان سے باہر نہیں گیا۔ گومگو کے عالم میں کھڑا رہا۔

نیاز نے کہا۔ "اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ لیں گے کیا؟"

"یہ اومیگا واچ ہے۔ میں نے اسے ۳۲۵ روپے میں خریدا تھا۔"

"چار پانچ سال سے استعمال بھی کر رہے ہوں گے۔ اس سے کم تو پرانی نہیں لگتی۔"

زہرخند: وہ ہنسی جو غصے، ناگواری، یا شرمندگی کی وجہ سے ہو۔ الو کا پٹھا: ایک گالی، نہایت بیوقوف۔ عائد کرنا: لگانا۔ شاق: ناگوار۔ گومگو: شک و شبہ، مشکوک۔

"جی ہاں کوئی چار سال تو اسے خریدے ہوئے ہوگئے۔" سلمان نے صاف گوئی سے کام لیا۔
وہ ہنس کر بولا۔ "یوں سمجھئے کہ اس کی قیمت تو آپ نے وصول ہی کر لی۔"
سلمان نے جلدی سے کہا۔ "نہیں صاحب۔"
نیاز نے بات کو زیادہ طول نہیں دیا۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ "میں تو اس کے
پچاس روپے سے زیادہ نہیں دوں گا۔ جی چاہے تو گھڑی رکھ جائیے اور روپے لیتے جائیے۔"
سلمان ۵۰ روپے میں گھڑی فروخت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔
بڑی مشکل سے نیاز نے ۱۵ روپے اور بڑھائے۔ سلمان کو گھڑی بیچتے ہوئے دکھ تو بہت ہوا مگر
اس کے بغیر چارہ کار بھی نہ تھا۔ اس نے نیاز سے ۶۵ روپے لے کر جیب میں ڈالے اور دکان سے باہر
جانے کے لیے مڑا۔ نیاز نے ٹوکا۔
"سنئے، آئندہ بھی کچھ بیچنے کھوچنے کا ارادہ ہو تو یہیں آجایا کیجئے۔ انشاء اللہ دوسری جگہ کے
مقابلے میں آپ یہاں سے خوش جائیں گے۔"
سلمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "بہت بہتر۔"
وہ دکان سے نکل کر باہر سڑک پر آگیا۔

❁ ❁ ❁

رات سہانی تھی اور سلمان کی جیب گرم تھی۔ عرصے سے دبی ہوئی خواہشیں اچانک جاگ
اٹھیں۔ وہ سیدھا ایک بار میں گیا اور بیئر کی دو بوتلیں چڑھائیں۔ ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا کھایا اور ایک
دوست کے گھر چلا گیا۔ حسب معمول وہاں رمی ہو رہی تھی۔
سلمان بھی جا کر شامل ہو گیا۔
سنیچر کی رات تھی۔ دوسرے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ لہٰذا تمام رات کھیل ہوتا رہا۔ اُس
روز سلمان کا ستارہ عروج پر تھا جیسے تاش کے پتّے اس نے چاہے ویسے ہی ملے۔ دو آنے پوائنٹ کا
کھیل ہو رہا تھا۔ سلمان کے وارے نیارے ہوگئے۔
جب وہ رمی کھیل کر اٹھا تو مسجدوں میں اذانیں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف سرمئی دھند چھائی
ہوئی تھی۔ سلمان کی جیب میں کچھ اوپر تین سو روپے تھے اور آنکھیں شب بیداری سے سرخ ہو رہی

صاف گوئی: سچائی۔ چارہ کار: حل، تدبیر۔ بار: شراب خانہ۔ ڈٹ کر: خوب پیٹ بھر کر۔ وارے نیارے ہونا: خوشحال ہونا۔

تھیں۔
تمام دن وہ کمرے میں پڑا بے خبر سوتا رہا جس کی ہر چیز اس کی زندگی کی طرح بے ترتیب
تھی۔ دن ڈھلے وہ نوشا کے گھر کی جانب جانے کے ارادے سے نکلا۔ راستے میں اکبر مل گیا۔ وہ اس کا
بے تکلف دوست تھا۔ دونوں نے بار میں جا کر کئی گلاس بیئر کے پیئے اور وہیں یہ پروگرام بنا کہ کسی
عشوہ ساز اور طرح دار طوائف کا گانا سنا جائے۔
دونوں نے کئی بالا خانوں کے چکر کاٹے۔ آخر ایک گانے والی ان کو پسند آئی۔ گانا تو وہ کچھ واجبی
سا جانتی تھی۔ مگر آواز ایسی رسیلی تھی جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ سن بھی زیادہ نہیں تھا۔ اداؤں میں
شوخی اور لگاوٹ تھی۔ ایک ایک بول کے ساتھ یوں بھاؤ بتاتی کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی۔
سلمان کو وہ سانولی سلونی طوائف کچھ اس طرح بھا گئی کہ کئی گھنٹے تک بیٹھا گانا سنتا رہا۔ شروع
میں کچھ دوسرے تماش بین بھی موجود تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب چلے گئے۔
پہر رات گزر چکی تھی۔ محفل اپنے شباب پر تھی۔ سلمان کی فرمائش پر طوائف ایک ٹھمری
گا رہی تھی۔

تم بن ناہیں آوت چین

اب اس نے پیروں میں گھونگھرو باندھ لیے تھے اور آہستہ آہستہ ناچتی بھی جا رہی تھی۔ ٹھمری
کے بول اونچے اٹھتے گئے۔ ناچ تیز ہوتا گیا۔ طبلچی جھوم جھوم کر ٹھیکا دے رہا تھا۔ طوائف کے جسم میں
یوں پیچ و خم پیدا ہو رہے تھے کہ سلمان بے قرار ہو جاتا۔ بار بار پہلو بدلتا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کر لہراتی ہوئی قریب آتی تو وہ تڑپ کر گہری سانس بھرتا۔ جھک کر اکبر کے کان میں کہتا۔
"یار ہم تو قتل ہوگئے۔"
"بڑی زوردار لونڈیا ہے۔"
ناچ اور ٹھمری کے پھڑک دار بولوں نے سلمان کو وارفتہ کر دیا تھا۔ وہ بے قابو ہو کر چیخ پڑتا۔
"ہائے کیا بات ہے میری جان۔"
"ہے جیو جگ جگ جیو۔"

بے تکلف: مراد راز داں۔ عشوہ ساز: ناز و ادا کرنے والی۔ واجبی سا: تھوڑا سا۔ سن: عمر۔ بھاؤ بتانا: ناچ گانے میں ہاتھوں، آنکھوں اور دوسرے اعضاء سے گیت کے مضمون کا نقشہ کھینچنا۔ ٹھمری: گیت کی ایک قسم۔ طبلچی: طبلہ بجانے والا۔ زوردار: مراد خوبصورت۔ وارفتہ: بے خود۔

"ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔"

عین ہنگام طرب ایک بھدا اور بے ڈول شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کی گھنی مونچھ
تھیں۔ آنکھیں الّو کی طرح گول گول تھیں۔ لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وضع قطع سے بھڑوا لگتا تھا۔ اند
آکر اس نے دونوں کو غور سے دیکھا اور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ سلمان بھی اسے بھڑوا ہی سمجھا
بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔

"اماں کچھ پینے پلانے کا بھی انتظام ہوگا؟"

اس نے سلمان کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کو طوائف سے کہا۔ "بند کرو جی
ناچ واچ، بہت ہو چکا مجرا۔"

طوائف نے فوراً ناچ بند کر دیا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف کھسک کر بیٹھ گئی۔

ساز بھی خاموش ہو گئے۔ سارنگیا، سارنگی پر غلاف چڑھانے لگا۔ طبلچی ہتھوڑی لے کر طبلہ
کو ٹھونکنے پیٹنے لگا۔ سلمان کو سخت طیش آیا۔ وہ سو روپے سے زائد خرچ کر چکا تھا اور جب محفل
شباب پر آئی تو اس نامعقول آدمی نے جو ہر طرف سے بھڑوا لگتا تھا، رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔

سلمان نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "آپ یہاں کے چودھری ہیں؟"

اس شخص نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ چٹکی بجا کر ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی
گردن اونچی کی اور بڑے طنطنے سے کہا۔ "جی نہیں! ہزار روپے مہینہ دیتا ہوں۔ یہ ملازم ہے میری
کیا سمجھے؟"

سلمان سرخوشی کے عالم میں تھا۔ جھوم کر بولا۔ "بہت سستا سودا کر لیا۔ یہاں تو صرف
رات بھر کے ہزار روپے دینے کا ارادہ تھا۔"

"آپ لوگوں کا افیون کا ٹھیکہ تو نہیں ہے؟" اس نے سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی۔ مگر سلما
سمجھا کہ چوٹ کر رہا ہے۔ تڑ سے بولا۔ "آپ بتا سکتے ہیں آج کل کوئلے کا بھاؤ کیا ہے؟" وہ زیر لب
مسکرایا۔ "کوئلے کی دلالی ہی کرتے ہیں نا؟"

وہ شخص کالا بھجنگ تھا۔ سخت تلملایا۔ "دیکھئے صاحب! میں اس قسم کی بدتمیزی برداشت نہ

ہنگام طرب: خوشی کے وقت۔ بھڑوا: دلال، رنڈی کا سودا کرانے والا۔ طیش: غصہ۔ شباب: مراد عروج۔ رنگ میں بھنگ ڈالنا: مزا
کرنا۔ طنطنہ: غرور، تکبر۔ سرخوشی: مسرت، شراب کا نشہ۔ چوٹ: طنز۔ کالا بھجنگ: بہت زیادہ کالا۔

کر سکتا۔"

سلمان نے کہا۔ "رنڈی کے کوٹھے پر تمیز تو لکھنؤ کے نواب زادے سیکھا کرتے ہیں۔ ہم
ٹھہرے روہیل کھنڈی۔"

وہ جل کر بولا۔ "آپ روہیل کھنڈی ہوں یا بند ھیل کھنڈی۔ بس اب شرافت کے ساتھ
یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

اکبر جواب تک خاموش بیٹھا تھا بیچ میں بول پڑا۔ "ورنہ؟"

اس نے اکبر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اونچی آواز سے پکارنے لگا۔ "ابے میرو۔ کہاں مر
گیا۔ یہاں تو آ۔"

فوراً ایک لحیم شحیم آدمی کمرے کے اندر آگیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا حکم ہے سیٹھ؟ ذرا
سلفے پر دم لگا رہا تھا۔"

"کمرے خالی کرا کے دروازہ بند کر دو۔ یہ دونوں پھڈا کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہاں سے چلتا
کرو۔"

میرو نے دونوں کو بغور دیکھا۔ "چلو جی بڑھاؤ ٹٹو۔ اب گانا وانا نہیں ہوگا۔"

سلمان کو اس کی بدتمیزی پر غصہ آگیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "ٹھیک سے بات کرو۔"

"سیدھی طرح جاؤ گے یا کچھ لے کر۔"

اس نے جھپٹ کر سلمان کا بازو پکڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ سلمان نے
گھبرا کر طوائف کی جانب دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ سلمان سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ
میرو نے اپنے مضبوط ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور زینے کے دروازے کی جانب لے چلا۔
سلمان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر اس کی گرفت سے نہ چھوٹ سکا۔ میرو نے دروازے پر پہنچ کر
اس زور سے چوتڑوں پر لات ماری کہ سلمان سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا سڑک پر آگیا۔

وہ سڑک پر دم بخود پڑا رہا۔ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ معاً اسے
اکبر کا خیال آیا۔ اسی وقت اکبر آکر اس کے اوپر دھم سے گرا۔ دونوں بوکھلا کر ایک دوسرے سے
چمٹ گئے۔

لحیم شحیم: موٹا تازہ۔ سلفہ پر دم لگانا: مراد چرس پینا، نشہ کرنا۔ پھڈا: لڑائی، ہنگامہ۔

ذرا دیر بعد انہوں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی صرف جسم پر کہیں کہیں خراشیں آئی تھیں۔ اکبر کی گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی تھی۔

سلمان نے گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ "سالے کے ہاتھ لوہے کے بنے ہوئے تھے۔"

اکبر کھسیانا ہو کر بولا۔ "یار بڑی بے عزتی ہوئی۔"

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جھک کر دائیں ہاتھ کی کہنی دیکھنے لگا جس سے ہلکی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ کچھ دیر ٹھہر کر دونوں چپ چاپ آگے بڑھ گئے۔

❁ ❁ ❁

سلمان اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

دن ڈھل چکا تھا۔ دھوپ چڑھ کر مکانوں کی اونچی منڈیروں پر پہنچ چکی تھی۔ سائے جھک گئے تھے اور ان جھکے ہوئے سایوں میں دروازے کے پاس "دلربا ہوٹل" کا مالک روشن خان کھڑا تھا۔ سلمان اسے دیکھتے ہی گھبرا گیا۔

روشن خان نے بلا کسی تمہید کے کہا۔ "مشٹر، آج ہمارا حساب بے باق ہو جانا چاہیے۔"

اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر سلمان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ قرض کی رقم لیے بغیر ٹلے گا نہیں۔ ادھر اس کی حالت یہ تھی کہ پاس کھوٹا پیسہ بھی نہ تھا۔ رات وہ جوئے میں سب کچھ ہار آیا تھا اور صبح سے اب تک بے خبر سو رہا تھا۔ سوال یہ درپیش تھا کہ اس بلا کو کس طرح ٹالا جائے۔ اس نے خوشامد کا پہلو اختیار کیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "اماں خاں صاحب کیا کسی سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

وہ بغیر کسی لگاوٹ کے بولا۔ "نہیں مشٹر، ہم غریب آدمی ہیں، بھلا کس سے جھگڑا ٹنٹا کر سکتے ہیں۔"

اس دفعہ سلمان نے ہمدردی جتائی۔ "تو پھر کچھ طبیعت خراب ہو گی۔ دیکھنے سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔"

"گرمی کے دن ہیں جی۔ آج کل طبیعت کا معاملہ بس گڑبڑ ہی رہتا ہے۔" اس کی چڑھی ہوئی تیوری کے بل رفتہ رفتہ کھلتے جا رہے تھے۔ وہ ایک جھنجلائے ہوئے قرض خواہ کے بجائے سیدھا سادا

ٹیس: درد۔ حساب بے باق کرنا: اگلا پچھلا حساب چکا دینا۔ تیور: انداز۔ بلا: مصیبت۔ قرض خواہ: قرض دینے والا۔

عام آدمی نظر آنے لگا تھا۔ سلمان اسی عالم میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اطمینان سے بولا۔ "گھر سے ابھی میرا منی آرڈر نہیں آیا۔ کل پرسوں تک آ جائے گا۔ تمہارا سارا پیمنٹ کر دوں گا۔"

یہ بات وہ دو ہفتے پہلے بھی کہہ چکا تھا اور پرسوں رات چائے پیتے ہوئے بھی یہی عذر تراش کر اسے صاف غچّا دے گیا تھا۔ لہٰذا بات کچھ بنی نہیں۔ روشن خان معاً بھڑک اٹھا آنکھیں نکال کر بولا۔

"مشٹر، اس طرح کام نہیں چلے گا۔ پورا حساب چکتا کرنا ہو گا۔ آج اور ابھی۔"

سلمان نے پھر مسکہ لگایا۔ "خاں صاحب تم ضرور کسی سے لڑ کر آئے ہو۔" اس نے خواہ مخواہ مسکرانے کی کوشش کی۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ لگتا ہے بیگم سے لڑ کر آ رہے ہو۔"

روشن خان نے بیرا گیری کرتے کرتے خود اپنا چائے خانہ کھول لیا تھا جس میں چائے کے علاوہ کھانا بھی ملتا تھا۔ اس کی چھت پھوس کی تھی اور دیواریں کچی تھیں۔ مگر اس کا نام اس نے "دل ربا ہوٹل" رکھا تھا۔ روشن خان کو اپنی پھٹیچر بیوی کے لیے بیگم جیسا معزز لفظ کچھ عجیب سا لگا۔ بہر حال اسے خوشی ضرور ہوئی۔ اس دفعہ وہ مسکرا کر بولا۔

"وہ تو میکے گئی ہے جی۔ لڑوں گا کس سے!"

سلمان کو موقع مل گیا۔ ہنس کر بولا۔ "یاد ستا رہی ہو گی۔"

روشن خان اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنس پڑا۔ سلمان کی جان میں جان آئی۔ اس نے اصرار کر کے روشن خان کو کمرے میں بلا کر بٹھایا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

اس طرح اسے کچھ روز کی اور مہلت مل گئی۔ مگر آج کی باتوں سے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر جلد ہی روشن خاں کو کچھ نہ دیا گیا تو وہ کسی روز ہنگامہ برپا کر دے گا۔ روشن خاں کمرے سے باہر گیا تو اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سگریٹ کی طلب محسوس کی۔ مگر سگریٹ موجود نہیں تھی۔ البتہ کمرے کے ایک گوشے میں سگریٹوں کے کئی خالی ڈبے اور مختلف برانڈ کے پیکٹ پڑے تھے۔ فرش پر جابجا سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ادھ جلی سگریٹ فرش سے اٹھا کر سلگائی۔ کش لگاتے ہی خالی معدہ سلگنے لگا۔ جھنجلا کر اس نے سگریٹ پھینک دی۔ غصے سے اسے مسل ڈالا۔

وہ بت کی مانند ساکت بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر میز

عذر تراشنا: بہانہ بنانا۔ غچّا دینا: دھوکا دینا۔ مسکہ لگانا: خوشامد کرنا۔ جان میں جان آنا: اطمینان ہو جانا، ہمت بندھنا۔ جھنجلا کر: غصے میں آ کر۔

پر رکھے ہوئے تھرماس پر پہنچ گئی۔ پچھلے سال وہ اسے گھر سے لایا تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ سفر میں تکلیف نہ ہو، برف بھروا کر یہ تھرماس ساتھ کر دیا تھا۔ وہ خوابناک نظروں سے اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کئے اور تھرماس اخبار میں لپیٹ کر باہر آ گیا۔

نیاز کی دکان اس کے گھر سے دور تھی۔ تھرماس لے کر اتنی دور پیدل چلنا اسے کھل رہا تھا۔ بھوک کی نقاہت اور بھی نڈھال کئے دے رہی تھی۔ جب وہ نیاز کی دکان پر پہنچا تو گلا خشک پڑ گیا تھا، سانس بوجھل ہو گئی تھی۔ خیریت ہوئی کہ نیاز اس وقت دکان پر موجود تھا۔

نیاز نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آج ادھر کیسے بھول پڑے؟"

اس کی بے تکلفی سلمان کو اچھی نہ لگی۔ وہ کوآپریٹو سوسائٹیز کے رجسٹرار کا بیٹا تھا۔ کسی کباڑیے کا اس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اس کے نزدیک انتہائی بدتمیزی تھی۔ اس نے نیاز کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے تھرماس پر لپٹا ہوا کاغذ علیحدہ کیا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ تھرماس بالکل نیا تھا۔

نیاز نے قدرے حیرت سے کہا۔ "بیچنے لائے ہو۔"

سلمان نے گردن ہلا دی۔ "جی ہاں!"

نیاز نے تھرماس اٹھایا۔ گھما پھرا کر اندر باہر سے دیکھا۔ "اپنا ہی ہے نا؟" اس نے ایک آنکھ دبا کر رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"دیکھئے آئندہ آپ مجھ سے ایسی بات نہ کہیں۔"

نیاز بے باکی سے ہنسنے لگا۔ "ارے بھئی آپ تو برا مان گئے۔ اچھا یہ بتایئے اس کا کیا دے دوں؟"

"جو آپ مناسب سمجھیں۔"

یہ کیا بات ہوئی۔ میں کہوں کہ مفت دے دیں تو آپ دے دیں گے؟"

سلمان بھی ترنگ میں آ گیا۔ "آپ مانگ کر تو دیکھیں۔ مفت بھی دے دوں گا۔"

خوب صورت چہرے والے سلمان کی یہ ادا نیاز کے دل میں اتر گئی۔ خوش ہو کر بولا۔ "بھئی بزنس کی بات تو بعد میں ہو گی۔ آپ پہلے چائے پئیں گے۔" اس نے گردن بڑھا کر چائے خانے کے بیرے کو آواز دی۔

کھلنا: ناگوار / برا لگنا۔ نقاہت: کمزوری۔ نڈھال: تھکا ہوا۔ ترنگ: جوش۔

وہ دکان کے اندر آ گیا۔ نیاز اسے چائے اور پیسٹری لانے کا آرڈر دینے لگا۔ سلمان تکلفاً انکار کرنے لگا۔ مگر نیاز نے ایک نہ سنی۔ گردن اکڑا کر بولا۔ "واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے!" اس نے بیرے سے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے منہ کیا تک رہا ہے جا جلدی سے ایک سیٹ چائے لے کر آ۔ پیسٹری تازہ لانا۔ کل کا بچا ہوا مال نہ لانا۔ مرزا جی سے بولنا۔ بیکری سے جو مال ابھی آیا ہے اس میں سے بھیجیں۔ ورنہ ایک پیسہ نہ دوں گا۔" بیرا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد بیرا چائے لے کر آ گیا۔ نیاز نے اپنے ہاتھ سے سلمان کو چائے بنا کر پلائی۔ اصرار کر کے تازہ پیسٹریاں بھی کھلائیں۔ اس خاطر مدارات میں نیاز کی کوئی غرض وابستہ نہ تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ صورت شکل اور وضع قطع سے تعلیم یافتہ اور شائستہ نظر آنے والا سلمان اسے بہت اچھا معلوم ہوا تھا۔

چائے پیتے پیتے اچانک اس نے سلمان سے پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟"

سلمان نے صاف بات کہہ دی۔ "پریشان نہ ہوتا تو یہ تھرماس لے کر یہاں کیوں آتا؟"

نیاز کو اس پر ترس آ گیا۔ بڑی شفقت سے بولا۔ "کتنے روپے کی ضرورت ہے؟"

سلمان اس کے احساسات کا اندازہ نہ لگا سکا۔ "تھرماس کی آپ جو قیمت لگائیں۔"

نیاز نے مسکرا کر کہا۔ "بھئی حد ہو گئی۔ اماں تھرماس گیا ایسی تیسی میں۔" اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "لو، اس سے کام چل جائے گا؟"

سلمان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوچنے لگا۔ آخر ماجرا کیا ہے۔ یہ کباڑیا اچانک اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو گیا؟

اسے خاموش دیکھ کر نیاز نے فوراً کہا۔ "اماں پہلے ان کو جیب میں تو رکھو۔" سلمان نے روپے لے لیے۔

"تھرماس جی چاہے تو لیتے جاؤ۔" نیاز نے بے نیازی سے کہا۔

سلمان نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

نیاز نے اس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا "یار ہم تو شرافت پر جان دیتے ہیں۔ پیسہ سالا تو ہاتھ کا میل ہے۔ ادھر آیا ادھر گیا۔ سچ پوچھو تو اس روز بھی تمہاری گھڑی نہ رکھتا۔ پھر یہ سوچ کر رہ

خاطر مدارات: مہمان نوازی، آؤ بھگت۔ غرض: مقصد، مطلب۔ شائستہ: مہذب۔ ہاتھ کا میل: بے حقیقت شے۔

گیا کہ پہلا سابقہ ہے۔ تم نہ جانے کیا سوچو۔ یہ زمانہ سالا بہت خراب ہے۔"

حالانکہ یہ بات اس نے بالکل جھوٹ کہی تھی۔ اس روز اس نے کوئی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔ بس چلتا تو وہ گھڑی کے بیس روپے سے زائد نہ دیتا۔ مگر آج اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔

سلمان اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ گردن جھکا کر گویا ہوا۔ "تھرماس اپنے پاس ہی رکھیں۔ میں آپ کی رقم دے کر اسے واپس لے جاؤں گا۔"

نیاز تیکھے لہجے میں بولا۔ "یار اب دل توڑنے کی باتیں نہ کرو۔ دوستوں کا حساب دل میں رہتا ہے۔ یہ لینا دینا تو چلتا ہی رہے گا۔" وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا اور سلمان کو اس کی یہ بے تکلفی ذرا بھی بری نہ لگی۔

وہ دیر تک بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔

شام ہو گئی اندھیرا پھیلنے لگا۔ سلمان نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور دکان سے باہر آ گیا۔ لیکن جس وقت وہ باہر نکل رہا تھا عین اس وقت نوشا بھی پہنچ گیا۔ اس نے سلمان کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ سلمان کی اس پر نظر نہ پڑی۔ نوشا چاہتا بھی یہی تھا۔ جیسے ہی سلمان آگے بڑھا نوشا جھٹ دکان کے اندر داخل ہو گیا۔

(۵)

نوشا اس روز خالی ہاتھ آیا تھا اور اس ارادے سے آیا تھا کہ نیاز سے ایک روپیہ ادھار لے جائے۔ اس شام اس نے راجہ اور شامی کے ساتھ سنیما دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نیاز نے صاف انکار کر دیا۔ بے رخی سے گویا ہوا۔

"جب کچھ پاس ہوا کرے تب ہی یہاں آیا کرو۔"

نوشا خوشامد کرنے لگا۔ "کل میں ضرور کچھ نہ کچھ لے کر آؤں گا۔ بس آج ایک روپیہ دے دو۔"

وہ بگڑ کر بولا۔ "بس ایک بار کہہ دیا۔ خواہ مخواہ جان نہ کھا۔"

نوشا ذرا دیر گردن لٹکائے چپ بیٹھا رہا پھر اٹھ کر چل دیا۔ لیکن جب وہ دروازے پر پہنچا تو

پیچھے سے نیاز کی آواز آئی۔

"ابے اب چلا ہی جائے گا؟"

نوشا نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ نیاز بیٹھا بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے نوشا کو بلایا۔

وہ پالتو کتے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

"سنیما دیکھنے کے لیے روپیہ چاہیے ہے نا؟"

نوشا نے انکار نہ کیا۔ گردن ہلا کر بولا۔ "ہاں۔"

نیاز نے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں دیں۔ پھر جیب سے ایک روپیہ نکال کر سامنے پھینک دیا۔ "لے! مگر یاد رکھنا سالے یہ سنیما کی چاٹ تجھے تباہ کر دے گی۔" نوشا نے چپ چاپ روپیہ اٹھا لیا۔ نیاز تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "دیکھ! کل کچھ نہ کچھ لے کر ضرور آنا۔ ورنہ سالے خاں آئندہ ایک پیسہ نہ دوں گا۔"

نوشا خوش خوش باہر چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

میونسپلٹی کی لالٹین روشن ہو چکی تھی۔ مگر راجہ موجود نہیں تھا۔ قریب ہی ایک مکان کے چبوترے پر شامی اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کی قمیص کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔ جسے وہ بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا۔ آستین پر جگہ جگہ خون کے لال لال دھبے نظر آ رہے تھے۔

شامی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے نوشا کی طرف دیکھا اور ہونٹ سے رستا ہوا خون پونچھنے لگا۔

نوشا نے قریب جا کر گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "ابے کیا ہو گیا۔ ابا نے مارا ہے؟"

اس نے گردن ہلا دی۔ "نہیں۔"

نوشا نے جلدی سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

شامی نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ البتہ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ گردن جھکا کر رونے لگا۔

نوشا اور گھبرا گیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "ابے کچھ منہ سے تو بول۔ ہوا کیا؟"

شامی نے بھرائی ہوئی آواز سے بتایا۔ "ڈاکٹر موٹو کے لڑکے اور اس کے نوکر نے مل کر مارا

ہے۔" وہ اور بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اچھا تو وہ سالا بھوریا تھا۔ وہ تو ایک نمبر حرامی ہے۔ پر تو اس سے کہاں ٹکر گیا۔"

شامی نے سسکیاں بھر کر کہا۔ "بات کچھ بھی نہیں تھی۔ دوپہر کو میں دکان سے کھانا کھانے کے لیے گھر آرہا تھا۔ بڑے میدان میں وہ مل گیا۔ کہنے لگا۔ آؤ گلی ڈنڈا کھیلیں۔ پہلے تو یہی بدمعاشی کی کہ داؤں اپنا رکھا۔ پھر دیر تک دھوپ میں پدایا۔ جب میری باری آئی تو کہنے لگا کہ داؤں نہیں دوں گا۔ میں نے کہا۔ داؤں دیئے بغیر جانے نہ دوں گا۔ کیوں ٹھیک بات کہی نا میں نے؟" اس نے اپنی بات کہتے کہتے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک بات تھی۔" نوشا نے اس کی تائید کی۔ "ہاں پھر کیا ہوا؟"

"سالے نے چھوٹتے ہی ناک پر گھونسا مارا۔ خدا قسم میرے آنسو نکل آئے۔ پھر تو مجھے بھی تاؤ آگیا۔ سالے کو اٹھا کر دھوں سے وہیں دے مارا۔ روتا ہوا چلا گیا۔ اب شام کو اپنے نوکر کے ساتھ آیا۔ دونوں کے پاس اسٹکیں تھیں۔"

نوشا نے حیرت سے کہا۔ "اچھا تو سالے اسٹکیں لے کر آئے تھے؟"

"ہاں جی، آتے ہی مارنا شروع کر دیا۔"

"ان کی تو ایسی کی تیسی۔ آخر سمجھا کیا ہے۔" نوشا نے آستین چڑھاتے ہوئے کڑک کر کہا۔

"تو پرواہ نہ کر۔ سالوں کو گھر میں گھس کر نہ مارا تو نام نہیں۔" شامی کا سارا دکھ درد اڑن چھو ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔ "راجہ کو بھی ساتھ لیے لیتے ہیں۔"

"ہاں اس کو بھی لے لے۔ مگر وہ آیا کیوں نہیں؟"

پتہ نہیں، کیوں نہیں آیا اب تک؟"

نوشا نے مشورہ دیا۔ "چل پہلے اسے ڈھونڈ لیں۔"

شامی جھٹ چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ دونوں راجہ کی کھولی کی جانب چل دیئے۔

راجہ خلاف معمول دروازے پر منہ لٹکائے گم صم بیٹھا تھا۔ قریب ہی لکڑی کی بھدی گاڑی نظر آرہی تھی جس پر بوڑھے گداگر کو بٹھا کر وہ پھیری پر جاتا تھا۔ کھولی کے اندر گہری تاریکی چھائی تھی۔ دونوں نے اسے افسردہ دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ نوشا سمجھا کہ راجہ بھی کہیں سے لڑ جھگڑ کر

پدایا: مراد دوڑایا۔ کڑک کر: زوردار آواز میں۔ اڑن چھو ہونا: غائب ہونا۔ جھٹ: جلدی سے۔ کھولی: کوٹھڑی۔ گم صم: خاموش

آیا ہے۔ قریب جا کر بولا۔

"ابے یہ رونی صورت بنائے کیوں بیٹھا ہے؟"

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر ٹن سے بجایا۔ "بول کیا کہتا ہے؟"

اس دفعہ وہ بیزاری سے بولا۔ "یار تنگ نہ کر۔ پہلے ہی اپنا ڈبا گل ہو رہا ہے۔"

شامی بیچ میں بول پڑا۔ "استاد سے جھگڑا ہو گیا؟"

"نہیں یار۔! استاد بے چارے کو تو پولیس والے پکڑ کر لے گئے۔"

راجہ کی بات سن کر دونوں چونک پڑے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے انسداد گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کر کے سرکاری محتاج خانے میں بھیج دیا گیا۔ راجہ بات کہتے کہتے اداس ہو گیا۔ اداس ہونے کی بات ہی تھی۔ گداگر کے گرفتار ہو جانے کے باعث اس کی آمدنی کا ذریعہ اچانک بند ہو گیا تھا۔

دونوں جس ارادے سے آئے تھے راجہ کو غمگین دیکھ کر اس کا ذکر بھی نہ کیا۔

سینما جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا۔ تینوں نے جا کر مسلم ہوٹل میں چائے پی اور دیر تک غور کرتے رہے کہ راجہ کو اب کیا کرنا چاہیے۔ رات گئے جب ان کی محفل برخاست ہوئی تو نوشا نے وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنے آٹو ورکشاپ میں کام دلانے کے لیے حاجی فٹر سے بات کرے گا۔

مگر نوشا کی کوئی کوشش کام نہ آئی۔ راجہ کئی کئی وقت کے فاقے کرنے لگا۔ اس نے بھیک مانگنے کی کوشش کی۔ ان دنوں انسداد گداگری کی مہم زور شور سے چل رہی تھی۔ گداگروں اور بھکاریوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ راجہ بھی ایک روز پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دوسرے گداگروں کے ساتھ اسے بھی مویشیوں کی طرح ہانک کر پولیس کی لاری میں بند کر دیا گیا مگر راجہ کا نڈرپن کام آگیا۔ ہوا یہ کہ جب گداگروں کو تھانے کے احاطے میں لاری سے اتارا گیا تو راجہ سب کی نظریں بچا کر لاری کے نیچے دبک گیا اور موقع ملتے ہی احاطے کی دیوار پھاند کر ایسا رفوچکر ہوا کہ پولیس والے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کئی روز تک وہ اپنی کھولی میں پولیس کے ڈر سے چھپا رہا۔ نوشا اور شامی آجاتے تو پیٹ بھرنے کا

انسداد گداگری: بھکاریوں کی روک تھام۔ نڈرپن: بہادری۔ رفوچکر ہونا: بھاگ جانا۔

سہارا ہو جاتا۔
شامی ان دنوں دیر سے آتا۔ آتے ہی قمیص کے اندر چھپی ہوئی روٹیاں نکالتا اور راجہ کے سامنے رکھ دیتا۔ یہ روٹیاں وہ گھر سے چرا کر لاتا تھا۔ نیاز سے جس روز کچھ رقم مل جاتی تو نوشا ہوٹل سے سالن منگوا دیتا۔ ورنہ راجہ کو روکھی سوکھی روٹیوں پر ہی گزارہ کرنا پڑتا۔

(۶)

نوشا قریب قریب ہر روز کچھ نہ کچھ اڑا لاتا اور سیدھا نیاز کے پاس پہنچتا۔ مگر روز روز کی چوری سے ورکشاپ میں جلد ہی کھلبلی پڑ گئی۔ عبداللہ مستری چیخ چیخ کر سارے کاریگروں کو گالیاں دیتا۔ پھاٹک پر ہر کاریگر کی سختی سے تلاشی لی جاتی۔ مگر نوشا اپنے کام میں ایسا منجھ گیا تھا کہ چوکیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر صاف نکل جاتا۔
ایک بار ایسا ہوا کہ اس کے ہتھے کوئی پرزہ یا اوزار نہ چڑھا۔ لہٰذا اس نے موقع ملتے ہی تانبے کے تار کا لچھا اٹھا کر ایک پرانی کار کی سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔
چھٹی ہونے سے کچھ دیر پہلے اس نے کاریگروں کی نظریں بچا کر تار قمیص کے اندر چھپایا اور جھٹ پیشاب خانے میں گھس گیا۔ دروازہ بند کیا اور پاجامہ اتار کر تار کسی نہ کسی طرح ران سے باندھا اور باہر آ گیا۔ سیر سوا سیر وزن تھا۔ چلنے میں قدم ٹھیک سے نہ پڑتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا پھاٹک سے گزرا تو چوکیدار نے مشتبہ نظروں سے دیکھ کر ٹوکا۔
"خو تم کیسا چلتا ہے۔ تمہارا ٹانگ کو کیا ہو گیا؟"
نوشا نے جلدی سے چہرے پر تکلیف کے تاثرات پیدا کئے اور برا سا منہ بنا کر بولا۔ "لالہ، بڑا درد ہو رہا ہے۔ سالا پورا ٹائی راڈ ٹانگ پر گر پڑا۔" یہ کہتا ہوا وہ پھاٹک سے باہر نکل گیا۔
گھبراہٹ میں اس نے تیز قدم اٹھانے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر اس طرح پھاٹک کے سامنے گرا کہ تار کا لچھا پاجامے کے اندر سے نکل کر باہر آ گیا۔ چوکیدار اسے برابر دیکھ رہا تھا۔ فوراً اس کی نظر تار پر پڑ گئی۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔

کھلبلی پڑنا: ہنگامہ ہونا، ہلڑ مچنا۔ منجھنا: تجربہ کار ہونا۔

"اوئے خنزیر، چوری کرتا ہے۔ بولتا ہے ٹانگ میں درد اے۔"
اس نے ہاتھ بڑھا کر نوشا کی گردن اپنے چوڑے چکلے ہاتھ میں دبوچ لی۔ "خو چہ اب تم سیٹھ کے پاس چلو۔"
نوشا گڑگڑانے لگا۔ مگر چھ فٹے پٹھان چوکیدار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا پھاٹک کے اندر لے گیا۔
عبداللہ مستری اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا شغل بادہ نوشی کر رہا تھا۔ اس کے سامنے جیم خانہ وہسکی کی بوتل رکھی تھی۔ ہاتھ میں گلاس تھا۔ چوکیدار نے نوشا کو اس کے روبرو پیش کیا اور تار کا لچھا میز پر ڈال کر بولا۔
"ساحیب، اس خنزیر نے چوری کیا تھا۔ ہم نے اس کو پکڑ لیا۔"
عبداللہ نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ چوکیدار کو مخاطب کیا۔ "خان تم بہت اچھا چوکیدار ہے، ہم تم سے بہت خوش ہوا۔" چوکیدار نے فوراً اٹینشن ہو کر سلام کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔
عبداللہ نے تار کا لچھا چھو کر دیکھا۔ پھر نوشا پر نظر ڈالی۔ غصے سے اس کی آنکھیں ابل کر سرخ پڑ گئیں۔ کڑک کر بولا۔ "کیوں بے حرامی۔"
اس نے غضب ناک ہو کر میز پر رکھا ہوا جسٹر اٹھایا اور نوشا کے منہ پر دے مارا۔ نوشا بھوں بھوں رونے لگا۔ عبداللہ نے اس کے رونے پر مطلق توجہ نہ دی۔ اس نے لوہے کی تین لمبی لمبی میخیں نکالیں جنہیں وہ کاریگروں کو سزا دینے کی غرض سے ہمیشہ میز کی دراز میں رکھتا تھا۔ عبداللہ نے کھڑے ہو کر ایک میخ دیوار میں ٹھونکی۔ اسے ہلا جلا کر دیکھا کہ مضبوط لگی ہے کہ نہیں۔ نوشا سہما ہوا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔
"مستری جی، اب کبھی چوری نہیں کروں گا۔"
"اب چوری کروں تو جو جی چاہے سزا دینا۔"
"مستری جی! بس اب کے معاف کر دو۔"
عبداللہ شکار پر جھپٹنے والے تیندوے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور اس کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ "چپ! سالے آواز نکلی تو یہیں دفن کر دوں گا۔"

گڑگڑانا: منت کرنا، خوشامد کرنا۔ شغل بادہ نوشی: شراب پینے میں مصروف۔ مطلق: بالکل، ذرا بھی۔ تیندوا: چیتے کی قسم کا ایک درندہ۔

نوشا کو سانپ سونگھ گیا۔ اس نے چوں تک نہ کی۔ عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح آپس میں پھنسائیں کہ انگلیاں ہتھیلیوں کے اندر ہی رہیں۔ اس کے بعد اس نے نوشا کو اٹھا کر میخ پر لٹکا دیا اور عین اس کے تلووں کے نیچے فرش پر دو میخیں گاڑ دیں جن کے نکیلے سرے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"دیکھ بے ہاتھ چھوڑے تو سمجھ لینا سالے دونوں میخیں پوری اندر اتر جائیں گی۔"

نوشا نے جھک کر میخوں کو دیکھا تو سہم کر رہ گیا۔ تکلیف سے اس کی انگلیاں ٹوٹے جارہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک انگلی کی ہڈی دوسری کی ہڈی توڑ کر اندر پیوست ہو جائے گی۔ وہ درد سے بلبلا کر رونے لگا۔

"مستری جی! اللہ کے لیے چھوڑ دو۔"

"مستری جی! ہائے مستری جی! میں مرا۔"

"ہائے میری انگلیاں ٹوٹے جارہی ہیں۔"

نوشا گڑگڑاتا رہا۔ تکلیف سے بلکتا رہا۔ خدا اور رسول کی دہائی دیتا رہا۔ مگر مستری اطمینان سے بیٹھا چسکی لے لے کر دیسی وہسکی کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارتا رہا۔ جب نوشا زیادہ شور مچاتا تو گالیاں دے کر چیختا۔

"چپکا رہے گا یا سالے دو چار ہاتھ بھی لگاؤں۔"

"سالے رات بھر لٹکاؤں گا۔ تو نے مجھے سمجھا کیا ہے۔"

"روز روز چوری کر کے بہت شیر ہو گیا تھا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے۔"

اس کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر نوشا لمحہ بھر کے لیے چپ ہو جاتا پھر گڑگڑانے لگتا۔ عبداللہ وہسکی کی چسکی لگا کر کہتا۔ "چوری کرو بیٹا، چوری کرو۔"

دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر طرف اندھیرے کا جال پھیلتا جارہا تھا۔ عبداللہ پر جیم خانہ وہسکی کا تیز نشہ چڑھ رہا تھا۔ وہ بے ڈھنگے پن سے اپنی بھونڈی آواز میں جھوم جھوم کر گنگنانے لگا۔

او دور جانے والے وعدہ نہ بھول جانا

او دور جانے والے

عبداللہ نشے کی دھن میں کسی دور جانے والے کو یاد کر رہا تھا اور نوشا کو، جو قریب کی دیوار سے لٹکا ہوا تکلیف سے بلبلا رہا تھا، بھول چکا تھا۔ دفعتہً نوشا زور سے چیخا۔

"ہائے مستری جی میں مرا۔"

عبداللہ نشے کی جھونک میں بولا۔ "ابے تو ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ لٹکے رہو بیٹا۔ بالکل چمگادڑ لگ رہا ہے اس وقت تو۔" اپنی بات پر وہ خود ہی زور سے ہنس پڑا۔

لیکن نوشا کی ٹانگیں لوہے کے اسپرنگ کی طرح زور زور سے کانپ رہی تھیں۔ وہ ذبح ہونے والے بکرے کی مانند گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس دفعہ عبداللہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ اوپر سے خون کا ایک قطرہ فرش پر گرا۔ پھر دوسرا، تیسرا، ٹپ، ٹپ، ٹپ، خون کے قطرے نیچے گر رہے تھے۔ انگلیوں کی کھال پھٹ گئی تھی۔ نوشا کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔ وہ کب کا ہاتھ چھوڑ چکا ہوتا، مگر عبداللہ نے انگلیوں کو اس طرح پھنسا کر لٹکایا تھا کہ وہ کھل نہ سکتی تھیں۔ خون دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے عبداللہ کا چہرہ فکر مند ہو گیا۔ وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے گلاس میں پڑی ہوئی وہسکی ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھائی۔ نوشا کو گندی سی گالی دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

قریب جا کر اس نے نوشا کو نیچے اتارا۔ اس کی انگلیاں ابھی تک آپس میں گتھی ہوئی تھیں۔ ان سے جیتا جیتا لہو بہہ رہا تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے پاجامے میں پیشاب کر دیا عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے۔ نوشا تکلیف سے بلبلا کر زور سے چیخا۔ انگلیاں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔

عبداللہ خاموش کھڑا نشے سے جھومتا رہا۔ پھر اس نے ڈپٹ کر کہا۔ "جا پہلے ہاتھ دھو کر آ۔"

نوشا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر چلا گیا۔ عبداللہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی وہسکی انڈیلی اور آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد نوشا واپس آ گیا۔ عبداللہ نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ جیب سے بیس روپے کے نوٹ نکالے اور نوشا کے سامنے پھینک دیے۔

"لے یہ بھی لیتا جا۔ مگر اب کبھی یہاں اپنی شکل نہ دکھانا۔ ابے منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا دفان ہو۔" وہ چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگا۔

دھن: مراد مستی، سرور۔ قہر آلود: غصے سے بھری ہوئی۔

نوشانے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ اٹھائے اور سسکیاں بھرتا ہوا پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

❁ ❁ ❁

نوشا کی انگلیاں سوج گئی تھیں۔ ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ چہرہ گیندے کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ ماں نے دیکھا تو بدحواس ہو گئی۔ جلدی سے پوچھا۔ "ارے یہ کیا کر لیا ہاتھوں کا؟"

نوشانے جیب سے بیس روپے نکال کر ماں کے سامنے ڈال دیے۔ منہ بسور کر بولا۔ "مستری جی نے مجھے نکال دیا۔" مگر اس نے صاف بات نہ بتائی۔ بہانہ یہ بنایا کہ ایک قیمتی پرزہ ٹوٹ گیا تھا ناراض ہو کر عبداللہ مستری نے مارا بھی اور برطرف بھی کر دیا۔

ماں عبداللہ کو کوسنے لگی۔

نوشا جب ورکشاپ سے نکلا تھا اسی وقت سے اُس کا جسم بخار سے تپنے لگا تھا۔ اب بخار کی شدت اور بڑھ گئی تھی۔ ماں نے جراح سے مرہم منگوایا اور انگلیوں پر لگا کر اوپر سے پٹی لپیٹ دی۔ نوشا بستر پر لیٹ گیا۔ رات گئے اس نے بخار کے عالم میں سنا نیاز گھر میں آیا تھا اور ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

وہ اس وقت نوشا ہی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں کہتا ہوں کہ یہ تو آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر پرلے درجے کا حرام خور ہو گیا ہے۔ اس نے ضرور کوئی ایسی حرکت کی ہو گی جس پر عبداللہ نے اس طرح مارا۔ ورنہ وہ تو بڑا بھلا آدمی ہے۔ کاریگروں کو اولاد کی طرح رکھتا ہے۔"

نوشا کو اس کی باتیں سن کر سخت غصہ آیا۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کئی گالیاں دیں اور کروٹ بدل کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

(۷)

نیاز کی دکان پر کالے صاحب کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ کالے صاحب دوسرے تیسرے روز کسی نہ کسی وقت وہاں پہنچ جاتا۔ دیر تک بیٹھا انشورنس کی خوبیاں بتاتا رہتا نیاز بھی اس کی باتوں میں اب انہماک اور گہری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ پچاس ہزار کی پالیسی کا معاملہ تھا کمیشن اچھا بنتا تھا

جراح: وہ شخص جو زخموں اور پھوڑے پھنسیوں کا علاج کرے۔ پرلے درجے کا: انتہائی، بے حد۔ حرام خور: مفت خور۔ انہماک: مکمل توجہ

کالے صاحب چاہتا تھا کہ جلد از جلد معاہدے پر دستخط ہو جائیں۔

ایک روز اس نے آتے ہی اپنا بریف کیس کھولا۔ بیمہ کمپنی کے کچھ کاغذات نکالے اور نیاز کے سامنے رکھ کر بولا۔

"مسٹر نیاز! آج تم فارم تو بھر ہی دو۔"

"مگر بیمہ تو میں اپنی بیوی کا کرواؤں گا۔"

کالے صاحب نے حیرت سے نیاز کو دیکھا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ "کوئی بات نہیں۔ تم خود پالیسی لو یا وائف کے نام سے لو۔ بات ایک ہی ہے۔" لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔ "تو پھر ایسا کرو کہ وائف کے نام سے فارم بھروا کر دستخط کروا دو۔ اس کے ساتھ پہلی قسط بھی ادا کرنی ہو گی۔"

نیاز مسکرا کر بولا۔ "مگر بیوی تو میری موجود نہیں۔"

کالے صاحب اس کی بات کا مفہوم سمجھ نہ سکا۔ "میکے ویکے گئی ہیں؟"

نیاز اسی طرح بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ "اس کو تو مرے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے۔"

کالے صاحب سناٹے میں آگیا۔ جھنجلا کر بولا۔ "تو گویا تم اب تک مجھ سے مسکری کر رہے تھے۔"

وہ غصے سے نجانے اور کیا کیا کہتا۔ مگر نیاز نے قطع کلام کرتے ہوئے فوراً وضاحت کی۔ "بھئی کالے صاحب! تم تو خواہ مخواہ برا مان گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں عنقریب دوسری شادی کرنے والا ہوں۔"

کالے صاحب کے چہرے کی کرختگی کم ہو گئی۔ "تو یوں کہو نا۔"

"تم نے میری پوری بات ہی کب سنی۔ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔"

"تو پھر کب تک ارادہ ہے؟ ایک عدد پارٹی تو ضرور ہو گی۔"

"پارٹی ہو گی اور بہت جلد ہو گی۔"

اس کے بعد دونوں بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد کالے صاحب نے اپنے کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھے اور دکان سے باہر چلا گیا۔

سناٹے میں آنا: حیران ہو جانا۔ مسکری: مذاق۔ کرختگی: سختی۔

❁ ❁ ❁

نیاز خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ نوشا کی ماں سے نکاح کر لے گا۔ پچاس ہزار روپے میں اس
بیمہ بھی کرادے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اسے کس طرح راستے سے ہٹایا جائے تاکہ بیمے کی رقم بھی
سے جلد مل جائے اور سلطانہ بھی اس کے قابو میں آجائے۔

سوچتے سوچتے ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے اٹھ کر دکان بند کی۔ تالا ڈالا اور
ڈاکٹر موٹو کے مطب کی جانب چل دیا۔

نیاز نے مطب کے اندر جا کر دیکھا۔ ڈاکٹر اس وقت تک پہنچا نہیں تھا۔ کمپاؤنڈر نے بتایا کہ وہ
گھر پر ہے۔ تھوڑی دیر بعد آئے گا۔ نیاز نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ مطب میں وہ مریضوں کی
موجودگی کے باعث ٹھیک سے بات نہ کر سکتا تھا۔ گھر پر اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر گھر سے نکلنے ہی والا تھا اسی اثنا میں نیاز پہنچ گیا ڈاکٹر نے اسے کمرے میں بٹھایا۔ مسکرا کر
گویا ہوا۔

"کہو میاں نیاز! آج ادھر کیسے آ گئے؟"

نیاز اپنی بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر موٹو سے اس کے اچھے خاصے مراسم
تھے۔ وہ بیمار پڑتا تو اسی کے زیرِ علاج رہتا۔ مگر اس وقت جو بات وہ کہنا چاہتا تھا ایسی نہ تھی کہ بے
دھڑک کہہ دی جائے۔ گو کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر موٹو کو رقم کھلائی جائے تو وہ ہر کام
کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ڈاکٹر موٹو کا نام خیرات محمد تھا۔ مگر اپنے
ڈیل ڈول اور تنومند جسم کے باعث عرفِ عام میں ڈاکٹر موٹو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ کرنال کا رہنے والا
تھا اور وہاں ایک ڈاکٹر کے مطب میں کمپاؤنڈر تھا۔ فسادات کے بعد مہاجر بن کر پاکستان آیا تو اس نے
اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ اب اس نے اپنے نام کے ساتھ ایک بوگس ڈگری لگالی تھی اور ٹھاٹھ سے
ڈاکٹری کرتا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے پورے چار سال بھی نہیں ہوئے تھے مگر اس عرصے میں
کئی سنگین مقدمات میں ملوث ہو چکا تھا اور ہر بار جیل جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔ لیکن اس بدنامی
کے باوجود وہ اپنی خطرناک حرکتوں سے باز نہ آتا تھا۔

ڈاکٹر خیرات محمد عرف موٹو نے نیاز کو خاموش دیکھا تو ہنس کر گویا ہوا۔ "کیا کہیں سے کوئی

مطب: دواخانہ۔ بے دھڑک: بلاخوف۔ بوگس: جعلی۔

پوشیدہ بیماری لے آئے ہو جو کہتے ہوئے جھجک رہے ہو۔ میرا کہنا مانو تو اب تم گھر بسالو اور یہ بازاری
عورتوں کا چکر چھوڑ دو۔"

کسی اور وقت ڈاکٹر نے یہ بات کہی ہوتی تو نیاز اس کے سر ہو جاتا۔ مگر اس وقت تو وہ غرض
مند بن کر آیا تھا۔ مسکرا کر اس کی بات ٹال گیا۔

"آپ کہہ رہے ہیں تو گھر بھی بسالوں گا مگر اس وقت میں آپ کے پاس ایک ضروری کام
سے آیا ہوں۔"

"لوگوں کی خدمت کرنا تو اپنا پیشہ ٹھہرا۔ کہو کیا کام ہے؟"

نیاز بات کہتے کہتے رک گیا۔

"کہو کہو گھبرا کیوں رہے ہو؟ کوئی خاص بات ہے؟"

"خاص ہی بات ہے۔"

ڈاکٹر حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ "اچھا! تو پھر کہتے کیوں نہیں؟"

نیاز ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب!" وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ گھبرا کر ڈاکٹر کا
چہرہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر نے زچ ہو کر کہا۔ "بھئی اب کہہ بھی چکو۔ تم نے خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا کر دیا۔"

نیاز گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "پھر کسی وقت آ کر بات کروں گا۔"

ڈاکٹر نے فوراً ٹوکا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے اب تو تم اپنی بات کہہ کر ہی جاؤ گے۔ بیٹھو، کہاں
چلے؟"

نیاز کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ اس نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔ "میں نے سنا ہے کوئی چیز
سلو پوائزننگ ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے جسے بتاتے ہوئے اس قدر جھجک محسوس
ہو رہی تھی وہ نہ خائف ہوا اور نہ ہی کسی طور گھبرایا۔ لمحہ بھر تک نیاز کا چہرہ بغور دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر
پوچھا۔

"خیریت تو ہے۔ یہ سلو پوائزننگ کے بارے میں معلوم کرنے کی ضرورت تم کو کیوں

غرض مند: ضرورت مند۔ زچ ہو جانا: تنگ ہو جانا۔ تشویش: فکر۔ خائف ہونا: ڈرنا۔

محسوس ہوئی؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھر آئی۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "میرا کہا مانو تو سلو پوائزننگ کے چکر میں نہ پڑو۔ یہ طریقہ خطرناک ہے اور اس میں بڑا جھنجٹ بھی ہے۔"

نیاز کسی قدر ناامید ہو کر بولا۔ "تو پھر کیا کیا جائے؟"

ڈاکٹر نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "گھبراؤ نہیں، ذرا صبر سے کام لو۔ ایسے کاموں کے لیے اب تو ایک سے ایک نیا طریقہ نکل آیا ہے۔"

نیاز خاموش بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔

"صرف چند انجکشن لگانے ہوں گے جن سے دل کمزور پڑ جائے گا اور حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہو جائے گی اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔" ڈاکٹر سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "کام ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کر کرنا چاہئیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں دھر لیے جاؤ۔ میری رائے پوچھتے ہو تو یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اب یہی چل رہا ہے۔"

نیاز کو ڈاکٹر کا مشورہ پسند آ گیا۔ اس نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

ڈاکٹر کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا اس نے دروازے کا بولٹ چڑھایا۔ نیاز کے قریب پہنچا۔ کوٹ کی جیب سے ایک ڈبا نکال کر کھولا اور نیاز کے سامنے رکھ کر رازدارانہ لہجے میں گویا ہوا۔

"دیکھو یہ ہیں وہ انجکشن۔ ایسی چیزیں میں کلینک کی بجائے گھر میں رکھتا ہوں۔"

نیاز نے ڈبے کے اندر رکھے ہوئے انجکشنوں کو حیرت اور خوف سے دیکھا۔ "یہی ہیں انجکشن؟" اس نے اٹکتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں۔" ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر اس کام کے میں پانچ ہزار روپے لوں گا۔"

نیاز نے پانچ ہزار کا نام سنا تو سناٹے میں آ گیا۔ مری ہوئی آواز میں بولا۔

جھنجٹ: مصیبت، الجھن۔ دھر لیے جاؤ: پکڑے جاؤ۔

"ڈاکٹر صاحب یہ تو بہت ہیں۔"

"بس اتنا ہی لوں گا۔ اس سے کم نہ ہوگا۔ سوچ سمجھ لو۔ سچ پوچھو تو ایسے خطرناک کاموں کے لیے لاکھوں بھی تھوڑے ہیں۔"

نیاز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر بھی خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نیاز نے کہا۔ "کچھ کم نہیں کیجئے گا؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔

"میری اتنی حیثیت نہیں۔"

"تو پھر یہ خیال چھوڑ دو۔" ڈاکٹر بے مروتی سے بولا۔

نیاز لمحہ بھر بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے ڈاکٹر کی بات مان لی۔ "چلئے آپ ہی کی بات بڑی رہی۔ مگر اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "چار پانچ مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"آپ چاہیں تو اور بھی زیادہ وقت لے سکتے ہیں۔ مگر سال بھر سے زیادہ نہ لگے۔"

"نہیں بھئی سال بھر کی مدت تو بہت ہوئی۔"

دونوں نے کچھ اور ضروری باتیں کیں اور یہ طے ہوا کہ نیاز، ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ پیشگی دے گا اور جب مریض کی حالت خطرناک صورت اختیار کرنے لگے تو مزید دو ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ بقیہ رقم موت واقع ہو جانے کے بعد فوراً ادا کر دی جائے گی۔

نیاز نے تمام باتیں طے تو کر لیں مگر جب دکان پر واپس پہنچا تو نامعلوم خوف سے سہما ہوا تھا۔ ہر چند کہ وہ چوری کا مال بیچ بیچ کر خاصا نڈر ہو گیا تھا لیکن اتنا خطرناک جرم اس سے اب تک سرزد نہ ہوا تھا۔ لہٰذا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

اسی الجھن میں وہ اس روز نوشا کے گھر بھی نہیں گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا اور چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

❁ ❁ ❁

رات کے کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔

اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ سلمان سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں
بال بے ترتیب تھے۔ چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔

نیاز اسے اپنے ہمراہ اندر لے آیا۔ رات گئے آنے کا سبب پوچھا۔ سلمان نے ہچکچاتے ہوئے
کہا۔ "نیاز بھائی! اس وقت تمہارے پاس بڑے ضروری کام سے آیا ہوں۔ اگر سو روپے کا بندوبست
کر دو تو تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔"

نیاز اس کی باتوں سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ اس نے سخن سازی سے کام لیا۔ "مجھے تو آج کل خود
روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس وقت تو میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔"

سلمان خوشامد کرنے لگا۔ "نہیں نیاز بھائی، اس وقت تو تم کو کہیں نہ کہیں سے بندوبست کرنا
ہی پڑے گا۔ میں بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں۔"

حالانکہ نیاز کے پاس اس وقت کئی سو روپے موجود تھے مگر وہ اسے کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔
سلمان، جس روز سے تھرماس دے کر گیا تھا اس کے بعد اب پلٹا تھا۔ نیاز نے اس عرصے میں کئی بار
سوچا کہ سلمان مل جائے تو اس سے روپے کا تقاضا کرے۔ اب وہ آیا بھی تو روپے مانگتا ہوا۔ دس بیس
نہیں، پورے سو۔ اس نے بے رخی سے کہا۔

"بھئی معاف کرنا۔ تم نے پہلی ہی جو رقم لی تھی وہی نہیں دی۔ اب اور مانگ رہے ہو۔"

سلمان پھر بھی اصرار کرتا رہا۔ بات یہ تھی کہ وہ دوپہر سے بیٹھا فلش کھیل رہا تھا اور اس وقت
ایک ایک پیسہ ہار کر نکلا تھا۔ ہارے ہوئے جواری کی جو حالت ہوتی ہے وہی اس وقت اس کی تھی۔
اسے روپیہ چاہیے تھا چاہے کسی طرح ملے۔

جب نیاز کسی طرح روپیہ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو سلمان نے کہا۔ "اگر آپ کو میرا اعتبار نہیں تو
رسید لکھوا لیجیے۔"

نیاز اچانک بھڑک اٹھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھئی واہ! اچھا یارانہ
پالا۔ رسید ہی لکھوانا ہوتی تو پھر تم ہی رہ گئے تھے؟"

سلمان شرمندہ ہو کر بولا۔ "آپ میری بات کا مطلب غلط سمجھے۔"

"میں تمہاری بات کا مطلب بالکل سمجھ گیا۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ میرے پاس اس

سخن سازی: بات بنائی، مراد جھوٹ بولا۔ بھڑک اٹھا: غصے میں آگیا۔ یارانہ: دوستی۔

وقت ایک پیسہ نہیں۔"

سلمان ذرا دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر منہ لٹکائے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔

نیند ایسی اچاٹ ہوئی کہ دیر تک نہ آئی۔ نیاز کروٹیں بدلتے بدلتے اکتا گیا تو خیال آیا کہ نوشا
کے گھر چلنا چاہیے۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور نوشا کے گھر کی طرف چل دیا۔

جس وقت نیاز وہاں پہنچا رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر نوشا کے گھر میں اچھی خاصی
چہل پہل تھی۔ بات یہ تھی کہ جب سے نوشا کی ملازمت ختم ہوئی تھی سلطانہ اور اس کی ماں کو زیادہ
کام کرنا پڑتا تھا۔ دونوں اس وقت لیمپ کی روشنی میں کارخانے کے لیے بیڑیاں تیار کر رہی تھیں۔

گھر میں نیاز کے داخل ہونے سے قبل سلطانہ دالان سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ لیکن نیاز
نے جاتے جاتے بھی اس کی ایک جھلک دیکھ ہی لی۔ چست لباس میں وہ اس وقت قلمی آم کی قاش
معلوم ہو رہی تھی۔ نیاز نے بڑے جذباتی انداز میں گہری سانس بھر کر سوچا کہ اب اسے اپنی اسکیم پر
جلد ہی کام شروع کر دینا چاہیے۔

چہل پہل: رونق۔ چست: تنگ۔ قاش: ٹکڑا۔

فصل سوم

(۱)

نوشا کے ہاتھوں کے زخم مندمل ہو گئے تھے، مگر اب وہ دن بھر لاوارث کتوں کی طرح گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتا۔ راجہ بھی ہنوز فاقہ مستی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان دنوں دونوں عام طور پر ساتھ ساتھ نظر آتے۔

کچھ عرصے سے انہوں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ دن چڑھے دونوں میں سے کوئی نہ کوئی، راشن کے دفتر کے سامنے نیم کے پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ جاتا اور دوسرے کا انتظار کرتا۔ یہاں سائیکلوں کی مرمت کرنے کی چھوٹی سی دکان تھی اس کا مالک مجید نامی ایک نوجوان تھا جس سے انہوں نے یارانہ گانٹھ لیا تھا۔ دن کا زیادہ وقت دونوں اس کے پاس گزارتے۔ وہ اکیلا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی گاہک ایک ساتھ آجاتے تو وہ پہیوں میں ہوا بھرنے یا ایسے ہی چھوٹے موٹے کاموں پر ان کو لگا دیتا۔ اس کے صلے میں سگریٹ اور کبھی کبھار چائے بھی پلا دیتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ مجید کے پاس کام بالکل نہ آیا۔ راشن کے دفتر کے سامنے اسٹینڈ پر بہت سا سائیکلیں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ راجہ اور نوشا حسب معمول دکان پر موجود تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سڑک پر سناٹا چھایا تھا۔ مجید کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ آنکھ مار کر دونوں سے مخاطب ہوا

"ابے آج تم ہی کچھ باندگی دکھاؤ۔ گاہک نے تو آنے کی قسم کھالی ہے۔"

انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ مگر اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ مجید نے خود ہی

ہنوز: ابھی تک۔ گانٹھ لیا: جوڑ لیا۔ باندگی: مہارت۔

وضاحت کی۔ "یار جا کر دو چار سائیکلوں میں پنکچر ہی کر دو۔ کچھ تو سالا کام آئے گا۔"

نوشا تو چپ رہا۔ لیکن راجہ نے کہا۔ "یار پکڑے گئے تو بڑی مار پڑے گی۔"

مجید منہ بگاڑ کر بولا۔ "ابے تو تو بڑا ڈرپوک نکلا۔ بس ٹائر میں جا کر ذرا پن ہی تو چبھونی ہے اور کون سا بڑا تم کو ڈاکہ ڈالنا ہے۔"

راجہ رضامند ہو گیا۔ "یار برا کیوں مناتا ہے۔ آج یہ بھی سہی۔" وہ اٹھ کر دفتر کی عمارت کی طرف چل دیا۔ احتیاطاً اس نے نوشا کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت آس پاس کوئی نہ تھا۔ نوشا کو پہرے پر لگا کر راجہ نے جھپاک جھپاک کئی سائیکلوں کے پنکچر کر دیے۔

مجید کا قیاس ٹھیک نکلا۔ کچھ ہی دیر بعد سائیکلوں کے پنکچر جڑوانے والے اس کی دکان پر آنا شروع ہو گئے۔ دن ڈھلے جب دکان بند کرنے لگا تو اس نے راجہ اور نوشا کو فی پنکچر ایک آنے کے حساب سے سات آنے دیے۔

تجربہ کامیاب رہا تھا۔ لہٰذا دوسرے دن انہوں نے پورے ایک درجن پنکچر کیے اور اس کے صلے میں نقد بارہ آنے کمائے۔ اب تو ان کا یہ معمول ہو گیا کہ سائیکلوں کے اسٹینڈ کے اردگرد منڈلاتے رہتے۔ انگلیوں میں مضبوط نوکیلی پنیں دبی ہوتیں۔ جہاں موقع ملا آنکھ بچا کر کام کر جاتے۔

وہ اپنے کام میں اس قدر منجھ گئے تھے کہ اکثر بے دھڑک پنکچر کر دیتے۔ ان کی اس دیدہ دلیری پر مجید نے ایک آدھ بار تنبیہہ بھی کی مگر ان کو تو اب خطرہ مول لینے میں لطف آنے لگا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے بدمعاشی کی حد کر دی۔ ایک سرے سے تمام سائیکلوں کے پنکچر کر ڈالے۔ بڑی کھلبلی مچی۔ کچھ لوگوں نے مشتبہ نظروں سے بھی دیکھا مگر وہ ذرا نہ گھبرائے۔ اس روز انہوں نے کچھ کم تین روپے کمائے۔

چند روز بعد کا ذکر ہے۔ راجہ نے ایک سائیکل میں پنکچر کیا۔ عین اسی وقت دفتر سے وہ شخص باہر نکلا جس کی سائیکل تھی۔ اس نے راجہ کو ٹائر میں پن چبھوتے دیکھ لیا۔ پہلے بھی دو بار اس کی سائیکل میں اسی اسٹینڈ پر پنکچر ہو چکا تھا۔ اس نے جھپٹ کر راجہ کی گردن دبوچ لی۔ شور سن کر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ ان میں بیشتر ایسے تھے جن کی سائیکلوں کے پنکچر ہو چکے تھے۔ پہلے تو راجہ پر گالیاں پڑیں۔ پھر مار پڑنے لگی۔ نوشا بھی ہجوم میں موجود تھا اور گھبرایا ہوا سوچ رہا تھا کہ کس طرح راجہ کو بچایا جائے۔ اسی وقت کسی نے کہا۔

"اس کے ساتھ ایک لڑکا اور بھی ہوتا تھا۔ اس سالے کی بھی خبر لو۔"

نوشا کے فوراً کان کھڑے ہوئے۔ سخت پریشان ہوا۔ ہجوم کو چیر کر دھکم دھکا کرتا ہوا
بھاگا۔ لوگوں نے شور مچایا۔ "پکڑنا، پکڑنا۔ جانے نہ پائے۔" مگر نوشا کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔
چھوڑ کر جھپاک سے ایک گلی میں گھس گیا اور گلیوں گلیوں پھرتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

شام کو راجہ ملا۔ نوشا نے دیکھا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ ایک آنکھ سوج گئی تھی۔
لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "یار سالوں نے مار مار کے بھرکس نکال دیا۔"

نوشا نے پوچھا۔ "مجید نے نہیں بچایا؟"

"وہ سالا تو خود ڈرا ہوا تھا۔ دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔"

دونوں گلی کے نکڑ پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں شامی آ گیا۔ وہ بڑا خوش نظر آ
تھا۔ اس نے آتے ہی پانچ روپے کا نوٹ دکھایا اور چہک کر بولا۔ "سنیما چلتے ہو؟" نوشا اور راجہ
تیار ہو گئے۔

سنیما جانے سے قبل تینوں نے مسلم ہوٹل میں چائے پی اور وہیں شامی نے بتایا کہ پانچ رو
کا نوٹ اس نے دکان سے اڑایا ہے۔ اس روز اس کے باپ کو دمے کا سخت دورہ پڑا تھا۔ لہٰذا وہ دکا
نہیں گیا۔ جس روز باپ دکان نہیں جاتا تھا شامی کے پو بارہ ہوتے۔ خوب گلچھرے اڑاتا۔ پکڑا جاتا
مرمت بھی خوب ہوتی۔

راجہ اور نوشا نے شامی کے پانچ روپے سے سنیما بھی دیکھا اور تفریح بھی کی۔ بڑے مزے
شام گزری۔

دوسرے روز نوشا سویرے ہی سویرے راجہ کے پاس پہنچ گیا۔ مجید کی دکان پر جانے کی اب
گنجائش نہیں تھی۔ اس نے راجہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ "دیکھو جی اب تم یہاں نہ آنا۔ ورنہ خو
مخواہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ساری دکان داری چوپٹ ہو جائے گی۔"

اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وقت کہاں گزارا جائے۔ کچھ دیر دونوں کھولی کے اندر بیٹھے ادھر اُد
کی باتیں کرتے رہے۔ پھر شامی کی دکان پر پہنچے۔ مگر شامی وہاں موجود نہ تھا۔ البتہ اس کا باپ بی

کان کھڑے ہونا: ہوشیار ہونا، چوکنا ہونا۔ بھرکس نکالنا: بہت زیادہ مارنا۔ پو بارہ ہونا: داؤ لگنا، قسمت جاگنا۔ گلچھرے اڑانا: عیاشی کر
چوپٹ ہونا: خراب ہونا، غارت ہونا۔

ھانس رہا تھا۔

دونوں نے بازار کا ایک چکر لگایا اور راجہ کی تجویز پر دریا کی طرف جانے کا پروگرام بنایا۔

پروگرام یہ تھا کہ دریا کے اس پار سے آنے والے پھلوں اور سبزیوں کو کشتیوں پر سے اتارنے
دھندا کیا جائے۔ مگر چار میل کا راستہ طے کر کے جب دونوں وہاں پہنچے تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا
تھا۔ کشتیاں موجود ضرور تھیں لیکن ان میں سے بیشتر ریت پر دور تک کچھوؤں کی طرح الٹی پڑی
تھیں۔ قریب ہی ملاح بیٹھے اونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ ایک
ٹیلے پر کھڑا کشتیوں کو دیکھتا رہا۔

ذرا دیر بعد ایک ملاح قریب سے گزرا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میونسپلٹی نے
شتیوں پر ٹیکس بڑھا دیا ہے۔ لہٰذا بطور احتجاج ملاحوں نے ہڑتال کر دی۔ اس اطلاع سے دونوں کو
بڑی کوفت ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھاٹ پر پہنچے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ گھاٹ آثار قدیمہ کے کسی کھنڈر
طرح شکستہ تھا۔ اس کا ایک حصہ دریا کی طغیانیوں سے کٹ کٹ کر منہدم ہو چکا تھا۔ صرف ایک
برج باقی تھا۔ اس میں بھی بڑا سا شگاف تھا۔ دونوں سیڑھیاں طے کرتے ہوئے برج کے اوپر پہنچ گئے۔

⊛ ⊛ ⊛

دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ آ گیا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ راجہ
ور نوشا تھکے ہوئے تھے۔ تیز دھوپ میں کئی میل چل کر آئے تھے۔ برج کے اندر پہنچتے ہی ایسا بھیگا
ہوا جھونکا آیا کہ مزہ آ گیا۔

دونوں شکستہ محراب کے نیچے بیٹھ گئے۔ نشیب میں دریا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ دور تک پانی ہی
پانی تھا۔ نوشا کو برج کے اندر بیٹھ کر دریا کا نظارہ کرنے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ مگر راجہ چپ چپ تھا۔
اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ نوشا نے کئی بار بات کرنے پر اکسایا۔ مگر وہ بیزاری سے کچھ نہ کچھ کہہ کر
خاموش ہو جاتا۔ آخر نوشا نے دریافت کیا۔

"ابے راجہ! بات کیا ہے جو تم اتنے چپ چاپ بیٹھے ہو؟"

وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "یار پریشان نہ کر۔"

گھاٹ: دریا یا تالاب پر اترنے کی جگہ۔ شکستہ: ٹوٹا ہوا۔ اکسانا: ابھارنا، آمادہ کرنا۔

نوشا باز نہ آیا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ ”آخر ہوا کیا؟ یار! تو خواہ مخواہ روٹھا ہوا سا بیٹھا ہے؟
راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اماں کچھ بتاؤ تو۔“ نوشا نے اصرار کیا۔

اس دفعہ بھی وہ خاموش رہا۔ نوشا بھی چپ ہو گیا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ سور
سنہری کرنیں دریا کی لہروں پر جھلملاتی رہیں۔ پانی کے آہستہ آہستہ بہنے کی گنگناہٹ ابھرتی ر
بھیگی ہوا کے جھونکوں سے ان کے سر کے بال بار بار بکھر کر چہرے پر آ جاتے۔ برج کے اند
سکوت تھا اور اس سکوت میں دونوں شکستہ محراب کے نیچے الو کی طرح گول گول آنکھیں نکا
خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک راجہ کھسک کر آگے چلا گیا۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں باہر لٹکا دیں۔

نوشا نے راجہ سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ لہریں بار بار امڈ کر گھا
دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کے ٹکرانے سے سفید سفید جھاگ اٹھتا۔ پانی کے چھینٹے دور
تک بکھر جاتے۔ ہر بار ایسا شور اٹھتا جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ سسکیاں بھر رہا ہو۔ خوف سے اس کا جسم
اٹھا۔ اسی وقت لہروں کے شور میں راجہ کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”یار جی چاہتا ہے، مر جاؤں۔“

نوشا نے سہمی ہوئی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ اس کی گردن دیوار سے ٹکی تھی۔ آنکھ
آسمان کی جانب تھیں اور ٹانگیں دریا کی طرف تھیں۔ نوشا اس کی بات سن کر کچھ اس قدر خوف
ہو گیا کہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

راجہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا۔ ”سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔“

نوشا نے دیکھا، اس کا چہرہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے ایسا محسوس
تھا جیسے وہ دیر تک روتا رہا ہے۔ راجہ نے گہری سانس بھری اور گردن جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ اس
ٹانگیں کھسک کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ آدھا دھڑ باہر لٹک رہا تھا۔

نوشا نے جھپٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ گھبرا کر بولا۔ ”یار راجہ تجھے ہو کیا گیا
راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نوشا کی گرفت سے خود کو چھڑانے لگا۔ دونوں ایک دوسر
کے ساتھ گتھ گئے۔ راجہ نے خفگی سے کہا۔ ”نوشا مجھے چھوڑ دے۔“ مگر نوشا باز نہ آیا۔ وہ اسے
جانب گھسیٹ رہا تھا۔ اور راجہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دو

ٹانگیں باہر لٹکی ہوئی زور زور سے ہل رہی تھیں۔ نیچے دریا کی لہریں ابھر ابھر کر گھاٹ کی دیوار سے
ٹکراتیں۔ پانی اچھل کر دور تک بکھر جاتا۔ سطح آب پر سفید سفید جھاگ پھیل جاتا۔ ہر بار اس طرح
شور اٹھتا جیسے کوئی کراہتے ہوئے ہائے ہائے کرے۔

لہریں ٹکراتی رہیں۔ شور ابھرتا رہا۔

ہائے، ہائے، ہائے!

”نوشا مجھے چھوڑ دے۔ نوشا مجھے چھوڑ دے۔“ راجہ بار بار کہہ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں۔ چہرے پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ بڑے
بڑے بال جھک کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ اچانک راجہ نے چیخ کر کہا۔

”چھوڑ دے مجھے ورنہ تو بھی میرے ساتھ جائے گا۔“

نوشا نے کچھ کہنا چاہا۔ اسی وقت بلبلا کر راجہ نے اس کی کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ لمحہ بھر
کے لیے نوشا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ابے حرامی چھوڑ مجھے۔“

نوشا نے جلدی سے بازو پکڑ کر زور سے گھسیٹا۔ راجہ کا تمام جسم اوپر آ گیا۔

راجہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا جسے اس
نے ایک ہاتھ سے چھپا لیا تھا۔ نوشا اس کے قریب ہی بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ گھاٹ کے شکستہ برج کے
اندر آہستہ آہستہ سسکیاں ابھرنے لگیں۔ راجہ فرش پر پڑا رو رہا تھا۔ وہ دیر تک روتا رہا۔ نوشا کھسک
کر اور نزدیک ہو گیا۔ اس کا بازو جھنجوڑ کر بولا۔

”ابے کب تک یوں عورتوں کی طرح روتا رہے گا۔“

راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرہ ہاتھ سے چھپائے سسکیاں بھرتا رہا۔

نوشا نے کہا۔ ”آ اب گھر چلیں۔“

راجہ بیزاری سے بولا۔ ”نہیں یار میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”ابے کچھ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

راجہ ذرا دیر خاموش رہا، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”یار تو نے ناحق روک لیا۔ مر جاتا تو اچھا
تھا۔ میرے مرنے سے کسی کو دکھ نہ ہوتا۔ کوئی نہ روتا۔ میرا بیٹھا ہی کون ہے۔ نہ ماں نہ باپ، نہ

مزاحمت: مخالفت۔ نڈھال: تھکا ہوا۔ ناحق: فضول، بلاوجہ۔

بھائی، نہ بہن کوئی بھی تو نہیں۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دوپہر کے سناٹے میں ناگہاں بندوق چلنے کی آواز ابھری۔ دونوں خوفزدہ ہو گئے۔ رونا
بھول کر برج سے باہر دیکھنے لگے۔ دریا کے اوپر پرندے شور مچاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ گھاٹ
مشرقی جانب، نشیب میں سرکنڈوں اور دریائی گھاس کے اونچے اونچے جھنڈ تھے جن کی اوٹ
شکاریوں کی ابھری ہوئی گردنیں نظر آ رہی تھیں۔ اوپر فضا میں آبی پرندوں کے غول منڈلا
تھے۔ دونوں ذرا دیر چپ چاپ بیٹھے انھیں دیکھتے رہے، پھر برج سے نیچے اتر کر اسی طرف چل د

شکاری دبے دبے قدموں آگے بڑھتے۔ دھائیں دھائیں کر کے بندوقیں چلتیں۔ کوئی
زخمی ہو کر چیختا ہوا نیچے گرتا۔ راجہ اور نوشا کیچڑ اور پانی میں گھس کر اسے نکال لاتے۔ بڑا د
مشغلہ تھا۔ بہت دیر بعد جب شکاری تھکے ہارے پڑاؤ پر آ کر اکٹھا ہوئے تو انہوں نے دونوں کو بھ
گوشت اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے دیے۔ سہ پہر کو چائے پلائی۔ دن ڈھلے تک وہ شکاریوں کے
ہاؤ ہو کرتے رہے۔

شام ہو گئی۔ سورج مغرب میں اتر گیا۔ درختوں کے سائے طویل ہو گئے۔ افق پر گہری نا
روشنی پھیل گئی۔ دریا کی چنچل موجیں دلہن کے سرخ آنچل کی طرح لہرانے لگیں۔ شکاریوں کی
جیپ میں سوار ہو کر جا چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ مغرب میں بکھرے ہوئے شوخ رنگ
پڑتے جا رہے تھے۔

دونوں دن بھر کے تھکے ہارے شہر کی جانب چل دیے۔

(۲)

نوشا گھر میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ ماں بے روزگاری کے باعث ان دنوں اس
یوں بھی بیزار تھی۔ بات بات پر برس پڑتی۔ نوشا تمام دن غائب رہا لہٰذا وہ اور بھی جلی بھنی بیٹھی
جیسے ہی وہ صحن میں پہنچا ماں اسی وقت باورچی خانے سے نکل کر دالان میں آ گئی۔ نوشا نے چا

ناگہاں: اچانک۔ غول: گروہ۔ پڑاؤ: ٹھہرنے کی جگہ، سرائے۔ افق: وہ جگہ جہاں زمین اور آسمان ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، آسمان کا
چنچل: بے چین، شوخ۔ بیزار: ناراض۔ جلی بھنی: غصے میں بھری ہوئی۔

نظریں بچا کر کمرے میں گھس جائے مگر اس کی نظر پڑ گئی۔ غضب ناک ہو کر بولی۔

"حرام خور، نکھٹو! اب کیوں واپس آیا؟ دن بھر جہاں آوارہ گردی کرتا رہا وہیں جا۔ یہاں کس لیے آیا ہے؟"

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں دیر تک کوسنے اور طعنے دیتی رہی۔ وہ چپ چاپ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ کھانا لے کر آئی۔ گرم گرم کھانے کی خوشبو نتھنوں میں پہنچی تو وہ مریل کتے کی طرح سہا ہوا اس طرف بڑھا۔ ماں نے اسے بے رخی سے جھڑک دیا۔

"خبردار جو کھانے پر ہاتھ لگایا۔ میں اپنی ہڈیاں پیل پیل کے اس لیے محنت نہیں کرتی کہ تو مسٹنڈا حرام کی کھا کھا کر اینڈتا پھرے۔"

نوشا کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ سلطانہ نے سفارش کی۔ ماں نے اسے بھی ایسی سختی سے ڈانٹا کہ سہم کر رہ گئی۔ اسی وقت انو بھی آ گیا۔ ماں نے اسے اپنے قریب بلا کر بٹھا لیا۔ تینوں نوشا کے سامنے کھانا کھاتے رہے۔ کسی نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ خاموش بیٹھا رک رک کر ان کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھ لیتا۔ اسے توقع تھی کہ ماں ضرور کھانے پر بلائے گی۔ مگر جب سب کھانا کھا چکے اور سلطانہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف چل دی تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ غصے اور دکھ سے اس کا دل بھر آیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا اور اندھیرے میں بیٹھا سسکیاں بھر کر آنسو بہاتا رہا۔

ذرا دیر بعد وہ کمرے سے نکلا اور آنگن سے گزرتا ہوا باہر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ ماں نے تیکھے لہجے میں ٹوکا۔ "پھر باہر چلا۔"

نوشا نے جواب نہیں دیا۔

ماں غضب ناک ہو کر بولی۔ "ایک باپ کا جنا ہے تو اب واپس نہ آنا۔"

اس نے بھی پلٹ کر ماں کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں آؤں گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

❁ ❁ ❁

کوسنے دینا: برا بھلا کہنا۔ ہڈیاں پیلنا: ہڈیاں گلانا، مر او بہت زیادہ محنت کرنا۔ مسٹنڈا: ہٹا کٹا، موٹا تازہ آدمی۔ اینڈتے پھرنا: اکڑ کر چلنا۔

راجہ اپنی کھولی کے دروازے پر کبڑوں کی طرح جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ نوشا کو دیکھتے ہی حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ابے بہت جلدی آ گیا؟"

نوشا نے اس کی بات خاموشی سے سنی اور زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر چپ چاپ قریب جا کر بیٹھ گیا۔

راجہ نے اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔

"ابے نوشے، کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا؟"

"نوشا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "راجہ میں اگر تیرے ساتھ رہوں تو مجھے رکھ لے گا؟"

"کیوں؟" راجہ اور حیرت زدہ ہو گیا۔

"میں گھر نہیں جاؤں گا۔"

"آخر بات کیا ہوئی؟"

نوشا نے آبدیدہ ہو کر بتایا۔ "اماں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔" یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار رو دیا۔ راجہ نے فوراً تسلی دی۔ "ابے تو تو رونے لگا۔ گھبراتا کیوں ہے؟ دونوں مزے سے یہاں رہیں گے۔ نوشا سسکیاں بھر کر شکوہ کرنے لگا۔ "سب مجھے ذلیل سمجھتے ہیں۔ ہر ایک برا کہتا ہے۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔"

"ابے میں تو موجود ہوں۔ تو کسی کی پرواہ نہ کر۔" راجہ نے اس کی دل جوئی کی۔ "یہ مائیں سالیاں سب ایک نمبر حرام کی جنی ہوتی ہیں۔ اب میری ہی ماں کو دیکھ۔ سنا ہے بہت ٹھاٹھ سے لاہور میں رہتی ہے اور میں یہاں بھیک مانگتا پھرتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے دکھ کا گہرا سایہ اس کے چہرے پر پھیل گیا۔

نوشا کو اس کی بات پر سخت تعجب ہوا۔ ہونق کی طرح آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "ابے تیری ماں بھی ہے؟"

بھانپنا: صورت سے اندازہ لگا لینا۔ آبدیدہ: رونے پر آمادہ۔ دل جوئی کی: تسلی دی۔ ٹھاٹھ: عیش آرام، شان و شوکت۔ ہونق: احمق۔

راجہ ترش روئی سے بولا۔ "کیوں نہیں ہے؟"

"اور باپ؟" نوشا نے دریافت کیا۔

راجہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر نوشا کو دیکھا۔ دکھ بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ "یار! وہ تو فسادات میں مارے گئے۔ دو بڑے بھائی تھے وہ بھی قتل کر دیے گئے۔ ہم دونوں کو تو ولی سے وہ سالا بشیر الایا تھا۔ ایک نمبر حرامی تھا۔ مجھے بہت مارا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے جل کر گالی دے دی۔ سالا میرے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ جلتی سگریٹ سے میرا منہ چیر کر زبان جلا ڈالی۔ یہ دیکھ۔" اس نے منہ کھول کر زبان نکالی جس کے ایک گوشے میں بھورا سا دھبا تھا۔ نوشا نے غور سے اس کی جلی ہوئی زبان دیکھی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر بولا۔

"سالا بڑا حرامی تھا۔"

"ایک نمبر حرام کا تخم تھا۔ میری زبان جلانے پر اماں کو بھی بہت غصہ آیا تھا۔ اس سالے سے تو کچھ کہا نہیں۔ لیکن دوسرے ہی دن مجھے یتیم خانے میں داخل کرا دیا۔"

نوشا نے ایک بار پھر اسے احمقوں کی طرح گول گول آنکھیں نکال کر دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ابے تو یتیم خانے میں بھی رہ چکا ہے؟"

"یہ سالی بھیک مانگنے کی عادت وہیں سے تو پڑی ہے۔ وہاں سالا ایک ملاں تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ پر ایک نمبری تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ چھوٹا مہتمم تو ذرا اچھا تھا مگر بڑا بہت پاجی تھا۔ روزانہ شام کو معائنہ کرنے آتا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں بید ہوتا۔ جو لڑکا پیسے کم لاتا بس اس کی شامت آ جاتی۔ یار ایسی مار مارتا تھا کہ اب بھی یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" راجہ نے یتیم خانے کے بڑے مہتمم کو ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں دے کر اپنے دل کا غبار ہلکا کیا۔ "ایک روز مجھے صرف گیارہ آنے ملے۔ بس اسی بات پر اس کے آگ لگ گئی۔ سالے نے مار مار کر دنبہ بنا دیا۔ اسی رات میں یتیم خانہ سے نکل بھاگا۔"

نوشا نے پوچھا۔ "وہاں سے تم ماں کے پاس گئے ہو گے؟"

"نہیں یار! وہ پھر یتیم خانے بھجوا دیتی۔ وہ سالا دڑھیل میری کھال ادھیڑ دیتا۔"

جل کر: غصے میں آ کر۔ تخم: بیٹا/ بیج۔ ایک نمبری: مراد دھوکے باز۔ مہتمم: منیجر، انتظام کرنے والا۔ پاجی: کمینہ، بدمعاش۔ رونگٹے کھڑے ہونا: خوف کے باعث کانپنا/ ڈرنا۔ دل کا غبار: غصہ۔ دڑھیل: لمبی داڑھی والا۔

"ہاں تم کو یاد تو کرتی ہو گی۔" نوشا نے دبی زبان سے کہا۔

"پتہ نہیں۔ پر میں تو اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گا۔"

نوشا نے سوال کیا۔ "کیوں؟"

راجہ خاموش بیٹھا رہا۔

نوشا اصرار کرنے لگا۔ "یار آخر بات کیا ہے؟" اس نے قدرے توقف کے بعد دریافت
"وہ رہتی تو یہیں ہے نا؟"

"نہیں بے۔ وہ تو ابھی تک لاہور ہی میں ہے۔ میں بھاگ کر یہاں آ گیا۔"

"کبھی اس سے ملنے بھی نہیں گئے؟" نوشا نے کرید کر پوچھا۔

راجہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "اب اس کے پاس جا کر کیا کروں گا۔ سالی
منڈی میں رنڈی کا پیشہ کرتی ہے۔ کبھی مل گئی تو خدا کی قسم قتل کر دوں گا۔ بشیرے کو بھی نہ
چھوڑوں گا۔ اسی سالے نے تو اسے اس دھندے سے لگایا ہے۔" وہ نتھنے پھلا کر ہانپنے لگا۔ نوشا
مارے ڈر کے کوئی بات نہیں کی۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد راجہ نے کہا۔ "
بات میں نے تجھے بتا تو دی لیکن تو نے اگر کسی سے کچھ کہا سنا تو سمجھ لینا اچھا نہ ہوگا۔"

نوشا نے جلدی جلدی قسمیں کھا کر اسے یقین دلایا۔

راجہ کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجلاہٹ رفتہ رفتہ مٹتی جا رہی تھی اور دکھ کا احساس سائے
طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ کھولی کے پچھواڑے کھنڈر میں ایک کتا خوفناک آواز سے رو رہا تھا۔ بہت دیر
راجہ کی آواز ابھری۔

"یار میرا تو جی چاہتا ہے اس سالے شہر ہی کو چھوڑ دیں۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"مگر جائیں گے کہاں؟"

"ابے کراچی چلیں گے۔ بڑے زوروں کا شہر ہے۔ کام تو وہاں چھٹ سانی مل جاتا ہے۔" را
نے مسکرا کر بتایا۔

نوشا فوراً رضامند ہو گیا۔ "میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔ یار واقعی اب یہاں رہنے کو
نہیں چاہتا؟"

دھندا: مکروہ کام۔ پچھواڑے: پچھلی طرف۔ چھٹ سانی: فوراً۔

راجہ خوشی سے اچھل کر بولا۔ "تو پھر ملا اسی بات پر پلاؤ والا ہاتھ۔"

دونوں نے گرم جوشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ دبوچ لیا۔ اس وقت وہ کسی انجانی مسرت سے
سرشار تھے۔ ان کے لیے اس احساس میں بڑی دل کشی تھی کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دیں گے جس میں ہر
طرف دکھ ہی دکھ تھے۔ ان دکھوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اب انہوں نے راستہ دیکھ لیا تھا۔ وہ
ابھی اس لذت سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ شامی پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی راجہ نے زور کا نعرہ
لگایا۔ "آ یار۔ بس تیری ہی کسر تھی۔"

لیکن شامی اس پر جوش خیر مقدم سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ وہ اداس اور مرجھایا ہوا نظر
آ رہا تھا۔ نوشا نے اس کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر پوچھا۔ "ابے چپ چپ کیوں ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ راجہ نے ڈپٹ کر دریافت کیا۔ "ابے منہ سے تو بول۔ آخر بات کیا ہے؟"

اس نے آہستہ آہستہ بتایا۔ "سالے ڈاکٹر موٹو نے ابّا سے میری شکایت کر دی۔ بس اسی بات
پر انہوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اب تک کمر میں درد ہو رہا ہے۔" وہ اپنی کمر سہلانے لگا۔

راجہ نے کہا۔ "تو نے ابّا سے کہا نہیں کہ اصلی بات کیا تھی۔"

"یار انہوں نے میری سنی ہی کب۔ بس ایک دم دھنکنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر موٹو کے ساتھ
سالا اس کا لڑکا بھی تھا۔ خوب خوش ہو رہا تھا۔ یار کتنی ذلت کی بات ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

نوشا نے فوراً اسے بتایا۔ "ابے ہم دونوں تو کراچی جا رہے ہیں۔ یہاں اب رہنا بالکل بیکار ہے۔
جسے دیکھو گالیاں دے رہا ہے۔ مار رہا ہے۔"

شامی نے حیرت زدہ نظروں سے پہلے نوشا کو دیکھا پھر راجہ سے پوچھا "کیوں بے راجہ! یہ
نوشے ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

"ہاں جی، اپنا تو اب یہی پروگرام ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تو بھی ہمارے ساتھ چل۔ تینوں
ٹھاٹھ سے وہاں رہیں گے۔ نہ کسی سالے کا ڈر نہ کسی کی دھونس۔"

شامی پہلے تو کچھ جھجکا، پھر آمادہ ہو گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ سفر کے لیے رقم کہاں سے مہیا کی
جائے۔ یہ مسئلہ شامی نے حل کر دیا۔ اس کے پاس اخباروں کی بکری کے تیس روپے موجود تھے۔
وہاں سے اٹھ کر وہ گھر گیا اور چپکے سے سارے روپے نکال لایا۔

کسر: کمی۔ ڈپٹ کر: ڈانٹ کر۔ دھنکنا: بہت زیادہ مارنا۔ دھونس: دھمکی۔

رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ پونے گیارہ بجے ایک پسنجر ٹرین کراچی جاتی تھی۔ انہو[ں نے] سوچا، کل تک انتظار کیوں کیا جائے۔ سیدھے اسٹیشن پہنچے۔ ٹکٹ خریدے اور ٹرین میں سوار [ہو کر] کراچی روانہ ہوگئے۔

(۳)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

راجہ، نوشا اور شامی ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ [راجہ] فرش پر ٹانگیں پھیلائے بے خبر سو رہا تھا۔ قریب ہی نوشا اور شامی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بجلی کی زرد روشنی میں مسافر سامان کے بنڈلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ سو رہے تھے۔ کچھ ا[ونگھ] رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو جاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نوشا نے اچانک راجہ کو جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی گہری نیند میں تھا۔ کر[وٹ] بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ نوشا نے جل کر اس دفعہ زور سے جھنجوڑا۔ راجہ نے آنکھ کھو[ل] کر اس کی جانب دیکھا۔ بگڑ کر بولا۔

"یار سونے دے۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان کر رہا ہے؟"

نوشا نے آہستہ سے کہا۔ "ابے اٹھ تو۔"

راجہ لمحہ بھر تو آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہا پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ ایک آنکھ دبا کر شامی کی طرف اشارہ کیا جو دیوار کی طر[ف] منہ کیے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ راجہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گھبرائی ہوئی نظروں [سے] شامی کو گھورنے لگا۔

ذرا دیر وہ اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر کھسک کر شامی کے قریب گیا۔ محبت سے اس کے کند[ھے] پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ تھپ تھپایا۔

"ابے رو رہا ہے؟"

شامی نے کوئی جواب نہ دیا۔ برابر سسکیاں بھرتا رہا۔ راجہ نے اس کے کان کے پاس منہ لے [جا]

کر سرگوشی کی۔ "ابے بات کیا ہے؟"

کئی بار دریافت کرنے پر شامی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "گھر یاد آرہا ہے۔"

راجہ کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ اس نے شامی کو گندی سی گالی دی۔ "جب یہی بات تھی تو سالے ہمارے ساتھ آیا ہی کیوں تھا۔؟"

نوشا نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اور بھی زیادہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اب اس کی آواز کمپارٹمنٹ کی خاموشی میں صاف سنائی پڑ رہی تھی۔ جو مسافر جاگ رہے تھے وہ مڑ مڑ کر تینوں کی جانب دیکھنے لگے۔ راجہ نے پریشان ہو کر نوشا سے کہا۔ "یار یہ سالا تو سب کو پکڑوائے گا۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

نوشا بھی سہما ہوا تھا۔ دبی زبان سے گویا ہوا۔ "سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔"

دونوں نے چمکار کر خاموش کرانے کی کوشش کی تو شامی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ راجہ غصے سے تلملا اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ شامی کی گردن دبوچ کر خوب مارے مگر مسافروں کے ڈر سے کچھ نہ کر سکا۔ آخر دونوں نے طے کیا کہ اگلے اسٹیشن پر شامی کو سمجھا بجھا کر منانے کی کوشش کی جائے۔ اب سفر جاری رکھنا ان کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ جیسے ہی ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی دونوں شامی کے ہمراہ کمپارٹمنٹ سے باہر آگئے۔

یہ چھوٹا سا قصباتی اسٹیشن تھا ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ ٹرین ذرا دیر رک کر روانہ ہوگئی اسٹیشن کے سناٹے میں چند لمحوں کے لیے ہلچل پیدا ہوئی پھر ہر طرف ہو کا عالم طاری ہوگیا۔ اسٹیشن کی مختصر عمارت میں دھندلا سا لیمپ روشن تھا جو ہر سمت پھیلے ہوئے اندھیرے میں روشنی کا دھبا معلوم ہو رہا تھا۔

تینوں اسٹیشن سے باہر جانے کے بجائے پلیٹ فارم ہی کے ایک گوشے میں ٹھہر گئے۔ شامی ابھی تک سسکیاں بھر رہا تھا۔

راجہ جلا ہوا تو تھا ہی اس نے جھنجلا کر کئی گالیاں دیں۔ مارنے کے لیے بھی جھپٹا۔ مگر نوشا نے سمجھا بجھا کر مار پیٹ سے باز رکھا۔ شامی نے خوفزدہ ہو کر رونا بند کر دیا۔

تینوں نے طے کیا کہ صبح تڑکے جو ٹرین آئے گی اس سے سفر کیا جائے۔ شامی نے گھر واپس

تن بدن میں آگ لگنا: سخت غصہ آنا۔ ہو کا عالم: ویرانی، مکمل خاموشی۔ صبح تڑکے: صبح سویرے

جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب وہ کسی حد تک مطمئن نظر آ رہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے
تھے۔ تینوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ سناٹا
ہو گیا تھا۔

نیند کا غلبہ ہوا تو تینوں اونگھنے لگے اور وہیں پتھریلے فرش پر سو گئے۔

❁ ❁ ❁

ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔ سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ گیا تھا راجہ کی آنکھ کھلی
اس نے دیکھا ایک خارش زدہ کتا برابر بیٹھا اپنی گردن زور زور سے کھجا رہا تھا۔ راجہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا
کتا دم دبا کر بھاگ گیا۔ راجہ کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ نوشا تو وہیں پڑا سو رہا تھا مگر شامی کا کہیں
پتہ نہ تھا۔ اس نے فوراً نوشا کو جگایا۔ دونوں دیر تک شامی کا انتظار کرتے رہے کہ شاید کہیں ادھر ادھر
چلا گیا ہو تو آ جائے۔

مگر شامی رات کے پچھلے پہر آنے والی ٹرین سے واپس جا چکا تھا۔ اس نے کسی کو کانوں کان خبر
نہ ہونے دی۔ چپکے سے کھسک گیا۔

راجہ اور نوشا اس قدر گہری نیند سوئے تھے کہ کراچی جانے والی گاڑی جب صبح تڑکے آئی تو
ان کی آنکھ نہ کھلی۔ دوسری گاڑی سہ پہر کو آتی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ ساری رقم
شامی ہی کے پاس تھی جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ دونوں کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ خیریت یہ
ہوئی کہ ٹکٹ راجہ کے پاس رہ گئے تھے۔

دن بھر وہ پلیٹ فارم پر ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہے۔ چار بجے کے قریب ٹرین آئی تو وہ
اس میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہو گئے۔

جب وہ کراچی پہنچے تو پہر رات ہو چکی تھی۔ اجنبی شہر، نہ کسی سے جان نہ پہچان، رات کا وقت
دونوں جاتے بھی کہاں۔ سفر کے تھکے ہارے اور دن بھر کی بھوک سے نڈھال وہ مسافر خانے کے
ایک کونے میں جا کر پڑ گئے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔

مسافر خانے میں اکا دکا مسافر رہ گئے تھے۔ وہ ٹانگیں پسار کر سو گئے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ مگر

کانوں کان خبر نہ ہونا: اس طرح کوئی بات ہونا کہ دوسرے کو ذرا بھی خبر نہ ہو۔

راجہ اور نوشا کو بھوک کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی۔

(۴)

رات گئے مسافر خانے میں ایک شخص داخل ہوا۔ وہ چال ڈھال اور وضع قطع سے اوباش اور
کائیاں نظر آتا تھا۔ اس نے چاروں طرف تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ مسافر خانے کا ایک سرے
سے دوسرے تک چکر لگایا۔ اچانک اس کی نظر ان دونوں پر پڑی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹکا اور تیکھی
نظروں سے دیکھتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا پھر اطمینان سے ان کے
پاس بیٹھ گیا۔

اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔ "گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

نوشا تو دم بخود ہو کر ڈر گیا۔ البتہ راجہ نے کسی قدر نڈر ہو کر جواب دیا۔ "نہیں جی، ہم تو اپنے
ماموں کے پاس آئے ہیں۔"

"کہاں رہتا ہے تمہارا ماموں؟"

اس غیر متوقع استفسار پر راجہ گھبرا گیا۔ اسے شہر کے کسی علاقے کا نام ہی معلوم نہیں تھا۔
پہلی بار آیا تھا۔ ہکلا کر بولا۔ "وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہاں رہتے ہیں۔ ادھر۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا
کر اشارہ کیا۔

وہ شخص ایک آنکھ دبا کر بدمعاشی سے مسکرایا۔ "جھوٹ بولو گے تو استاد سیدھے حوالات میں
ہو گے۔" اب تو راجہ کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ سہمی ہوئی نظروں سے اجنبی کی جانب دیکھنے لگا۔
وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، دونوں کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لو
پہلے سگریٹ پیو۔" نوشا تو خاموش بیٹھا رہا۔ مگر راجہ نے ہچکچاتے ہوئے ایک سگریٹ نکال ہی لی۔
اس نے ماچس جلا کر راجہ کی سگریٹ سلگائی۔ کندھا تھپک کر بولا۔ "ڈرو مت۔ مجھ سے تم کو کچھ
فائدہ ہی پہنچے گا۔ ویسے یہ کراچی سالا بہت خراب شہر ہے۔ یہاں ایک سے ایک بڑا دس نمبریا پڑا ہے۔"
دونوں خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ لمحہ بھر رک کر اس نے کہا۔ "کسی ایسے ویسے

اوباش: بدمعاش۔ کائیاں: نہایت چالاک۔ استفسار: سوال۔ اوسان خطا ہونا: حواس درست نہ رہنا۔ دس نمبریا: فراڈیا، بدمعاش۔

کے چکر میں پڑگئے تو سمجھ لو گئے کام سے۔"

انہوں نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ ا
نے جیب سے دوبارہ سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس دفعہ اس نے اپنی سگریٹ سلگائی۔ لمبا کش لگا
پوچھا۔ "نوکری کرو گے؟"

دونوں نے ایک ساتھ چونک کر اسے دیکھا۔ جلدی جلدی گردن ہلا کر اپنی رضامندی کا اظ
کیا۔ وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر تیکھے لہجے میں بولا۔ "دھندے سے تو میں تم دونوں
لگوادوں گا مگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

ان کی سمجھ میں اس شخص کی بات کا مطلب نہ آیا۔ وہ احمقوں کی طرح اسے دیکھنے لگے۔ مگر ا
نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں اس کے ہمراہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے نکل کر باہر سڑک پر آئے اور مختلف راستوں ک
چکر کاٹتے ہوئے کوئی پون گھنٹے بعد ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ یہ علاقہ اسٹیشن سے زیا
دور نہیں تھا۔ آبادی خاصی گھنی تھی۔ مگر گندی اور بے ترتیب تھی۔ جس میں تنگ اور پر پیچ گلیا
تھیں۔ بیشتر مکانات کچے اور نیم پختہ تھے۔ مگر وہ مکان پختہ تھا۔ الگ تھلگ تھا اور ایک گلی کے نکڑ
تھا۔ اس کی دیواریں بلند تھیں۔ اور دھلے ہوئے کپڑوں کی طرح اجلی نظر آرہی تھیں۔ چارو
طرف گہرا سناٹا تھا۔ گلی کے اندر اندھیرا بھی تھا۔ راجہ اور نوشا خاموش کھڑے رہے۔ اس شخص
آگے بڑھ کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

دروازہ تو نہیں کھلا۔ البتہ کسی نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر پوچھا۔ "کون؟"

"میں ہوں جی رحمان۔" وہ شخص بولا۔

"اچھا اچھا۔" اندھیرے میں کسی کی آواز ابھری لیکن اس کا چہرہ نظر نہ آسکا۔

ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ رحمان دونوں کے ہمراہ اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرے دالان سے
گزر کر وہ کمرے میں پہنچے جہاں لیمپ کی دھندلی روشنی میں گٹھے ہوئے جسم اور میانہ قد کا ایک آد
آنکھیں بند کیے سر کی مالش کر رہا تھا۔ وہ گھٹنوں تک اونچی لنگی باندھے ہوئے تھا۔ بدن پر صرف بنیا

پر پیچ: پیچیدہ، بل کھاتی ہوئی۔ گٹھا ہوا جسم: مضبوط جسم۔ میانہ قد: درمیانہ قد، نہ لمبا نہ چھوٹا۔

تھی۔ رحمان نے کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ بے تکلفی سے بولا۔

"میں نے کہا شاہ جی! بہت زوروں کی چمپی ہو رہی ہے۔"

شاہ جی نے بغیر آنکھیں کھولے ہوئے جواب دیا۔ "کہاں رہا اتنے دنوں تک؟"

رحمان نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ "بیمار پڑ گیا تھا۔ جی۔"

"اوئے خانہ خراب۔ بے ایمان ہر بار تو یہی کہتا ہے۔" اس دفعہ اس نے آنکھیں کھول کر
دیکھا۔ مگر جیسے ہی راجہ اور نوشا پر نظر پڑی وہ چونکا۔ فوراً پوچھا۔ "دونوں تیرے ساتھ آئے ہیں؟"
اس نے قدرے توقف کیا۔ "سٹیشن سے لایا ہے؟"

رحمان نے آنکھ مار کر جلدی سے کہا۔ "ہاں جی بے چارے گھر سے روٹھ کر چلے آئے۔ مسافر
خانے میں پڑے تھے۔ یہاں ان کا کوئی جان پہچان کا بھی نہیں۔ میں اپنے ساتھ لے آیا۔ رکھ لو پڑے
رہیں گے۔"

شاہ جی نے اس کی باتیں سن کر لمبی "ہوں" کی۔ دونوں کو گہری نظروں سے دیکھا۔ "ویسے تو
ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔"

رحمان نے اس کی بات کاٹ کر فوراً کہا۔ "مصیبت کے مارے ہوئے ہیں جی۔ دھندے سے
لگ جائیں گے۔ تم کو زندگی بھر دعائیں دیں گے۔"

وہ گردن ہلا کر بولا۔ "اچھا، اچھا۔" پھر ان سے مخاطب ہوا۔ "کب آئے جی تم دونوں یہاں؟"

راجہ نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "آج ہی آئے تھے۔"

شاہ جی نے گردن گھما کر رحمان کو دیکھا۔ "تو پھر ان کو رکھ لیا جائے؟"

"ان کو لایا تو اسی لیے ہوں۔"

شاہ جی بے تکلفی سے مسکرایا۔ "اچھا جی، میں نے تیری بات مان لی۔ ویسے بھی کب تیرا کہا ٹالا
ہے۔" اس نے دونوں کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "تم نے روٹی شوٹی بھی کھائی؟"

دونوں سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ شاہ جی نے چمپی کرنے والے مالشے سے کہا۔ "اوئے
دُلّے! جا ہوٹل سے ان کے لیے روٹی لے کر آ۔"

عبداللہ عرف دلا جانے لگا تو اس نے ٹوکا۔ "دیکھ وہ کونے والا کمرہ خالی کرا دینا۔ دونوں اس
میں رہیں گے۔ آج تو ان کو کہیں اور سلا دے۔" وہ نوشا اور راجہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "جاؤ جی تم اس

کے ساتھ۔ ڈٹ کر روٹی کھاؤ اور آرام کرو۔"

دونوں خاموشی سے دلا کے پیچھے پیچھے کمرے سے چلے گئے۔

❂ ❂ ❂

شاہ جی نے رحمان سے دریافت کیا۔ "ہاں جی اب معاملے کی بات کرو۔ کیا لو گے؟"

"شاہ جی آج تو سیدھے ہاتھ سے سو سو کے بیس کرارے کرارے دلوا دو۔ خدا قسم بڑے کے چھو کرے ہیں۔"

شاہ جی نے اسے جھڑک دیا۔ "ٹھیک ٹھیک بات کر۔ ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہیں ملے گا۔"

"ارے شاہ جی! کیا ظلم کر رہے ہو۔ اتنے میں سودا نہ ہوگا۔ واپس بلوا لو۔ ابھی تو انہوں تمہارا نمک بھی نہیں چکھا۔"

شاہ جی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "دلالی کرتے کرتے دادا گیری تو نے کب شروع کر دی؟ کھال میں رہ کھال میں۔ زیادہ پیترے بازی نہ دکھا۔ مارا جائے گا۔"

رحمان رونی صورت بنا کر بولا۔ "جب ہی تو میں تمہارے لیے مال نہیں لاتا۔"

"چل چل ٹسوے نہ بہا۔ سو اور لے لے۔"

رحمان نے تھوڑی حیل و حجت کرنے کے بعد شاہ جی کو پندرہ سو روپے پر راضی کر لیا۔ سودا اسی وقت مل گئے۔ بقیہ چودہ سو کے لیے شاہ جی نے وعدہ کیا کہ تیسرے دن ادا کر دیے جائیں گے۔

رحمان سو روپے لے کر چلا گیا۔ شاہ جی خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دلا واپس آگیا۔ جی نے پوچھا۔

"دونوں کو روٹی کھلا دی؟"

وہ مستعدی سے بولا۔ "ہاں جی۔"

"دونوں کو بلا کر یہاں لا۔"

دلا فوراً جا کر دونوں کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ شاہ جی نے انہیں دیکھ کر کسی قدر شفقت سے کہا

"روٹی پیٹ بھر کر کھائی؟"

اس تمام عرصے میں نوشا پہلی مرتبہ بولا۔ "خوب پیٹ بھر کر کھائی ہے۔"

دلالی: سودا کروانے کا پیشہ۔ دادا گیری: بدمعاشی۔ کھال میں رہنا: اوقات میں رہنا، حیثیت میں رہنا۔ پیترے بازی: ہوشیاری، چا
ٹسوے بہانا: ٹسوے بہانا: لاٹ موٹ رونا، دکھاوے کے آنسو بہانا۔ حیل و حجت: بحث و تکرار۔

"ارے تو بھی بولنے لگا۔"

نوشا شرما گیا۔ شاہ جی بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "چائے پیو گے؟"

دونوں نے آمادگی کا اظہار کیا تو اس نے گردن موڑ کر دلا کو مخاطب کیا۔ "دلے دو سنگل چائے منگوا۔"

راجہ کو سگریٹ کی طلب ستا رہی تھی۔ دبی زبان سے بولا۔ "شاہ جی! ایک سگریٹ بھی منگوا دو۔"

شاہ جی بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ "او تیرا خانہ خراب، سگریٹ بھی پیتا ہے۔" اس نے دلا کی جانب دیکھا۔ "ان کے لیے پاسنگ شو کا ایک پاکٹ بھی لا دے۔"

دونوں کے چہرے پر تازگی آگئی۔ شاہ جی اس وقت بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے بے نیازی سے پوچھا۔ "اور کچھ؟" راجہ اور نوشا نے انکار میں گردن ہلا دی۔ شاہ جی نے دونوں کا جائزہ لیا۔ ان کے لباس گندے اور بوسیدہ تھے۔ راجہ ننگے پیر تھا۔ نوشا جوتے پہنے ہوئے تھا۔ مگر ان کی حالت بھی خستہ تھی۔ ایک جوتے کے اگلے حصے سے انگوٹھا جھانک رہا تھا۔

"کیوں جی تم دونوں کے پاس کپڑے لتے بھی ہیں؟"

دونوں ایک ساتھ بولے۔ "نہیں۔"

شاہ جی نے دلا کے لیے ایک اور حکم صادر کیا۔ "کل تو نے بازار جانا ہے۔ ان کے لیے دو شلواروں اور کرتوں کا کپڑا لے آنا۔ ماسٹر سے کہنا فٹافٹ سی دے۔ موچی گلی سے دو پشوری چپلیاں اور ٹوپیاں بھی۔ دلے نباب بنا دے ان کو۔"

وہ ان کو "نباب" کے لیے ابھی اور نہ جانے کیا کچھ کرتا اسی اثنا میں باہر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ شاہ جی نے چوکنا ہو کر دروازے کی جانب دیکھا۔ باہر دالان میں بھاری قدموں کی آواز ابھری۔ پھر ملی جلی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ شاہ جی لنگی ٹانگ کے اوپر چڑھا کر، ایک ہاتھ سے ران کھجانے لگا۔

"تم جا کر اب سو جاؤ۔ دلے! ان کو سونے کی جگہ بتا دے۔" شاہ جی نے دونوں کو رخصت کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عبداللہ عرف دلا کے ہمراہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

آمادگی: رضامندی۔ بے ڈھنگا پن: برا طریقہ۔ خستہ: خراب۔

فصل چہارم

(۱)

نوشا کے اچانک غائب ہو جانے سے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔

رات کو وہ واپس نہیں پہنچا تو سویرے ہی سویرے ماں نے پوچھا۔ "ارے یہ نوشا ابھی تک ن
آیا؟" کوئی اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ وہ جھنجلا کر نوشا کو کوسنے پیٹنے لگی اور دیر تک بڑبڑاتی رہی۔
چڑھ گیا۔ ہر طرف دھوپ پھیل گئی۔ انّو کتابیں سنبھال کر اسکول چلا گیا۔ گلی میں پھیری لگانے وا
کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ محلّے کے بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا لیکن نوشا کا کہیں پتہ نہ چلا۔

ماں نے جھنجلانا اور بڑبڑانا بند کر دیا تھا۔ اب اسے تشویش لاحق ہوئی۔ بار بار دروازے
جانب نظر اٹھ جاتی۔ آج تک نوشا اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر رات کی باتیں
آ رہی تھیں۔ ہر بار سوچتی کہیں سچ مچ وہ ناراض ہو کر کسی طرف چلا تو نہیں گیا۔ اپنے اس خد
اظہار اس نے سلطانہ سے بھی کیا جو دالان میں بیٹھی بیڑی کے پتے تراش رہی تھی۔ اسے ڈر تھا
کہیں ساری آئی گئی اس کے سر نہ جائے۔ جب وہ ان خدشات کے بارے میں سوچتی تو دل ہی دل
نوشا کو کوسنے دیتی۔ حرامی نے خواہ مخواہ پریشانی میں ڈال دیا۔ نہ جانے کہاں واہی تباہی گھوم رہا ہوگا۔

اسی ادھیڑ بن میں دوپہر ہو گئی۔ گھر کے کام کاج میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گلی میں کس
آواز ابھرتی وہ چونک پڑتی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور اس کے کان کھڑے ہوئے۔ سلطانہ بھی
پریشان ہو گئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بیٹھ کر قیاس آرائیاں کرنے لگیں کہ نوشا کہاں ہو سکتا ہے۔

خدشہ: خوف، خطرہ۔ تراشنا: کاٹنا۔ واہی تباہی: آوارہ۔ ادھیڑ بن: سوچ بچار، غور و فکر۔ قیاس آرائیاں کرنا: اندازے لگانا۔

قدر وہ سوچتیں اسی قدر دل میں نئے نئے وسوسے پیدا ہوتے۔

انّو اسکول سے واپس آیا تو ماں نے اسے فوراً نوشا کی تلاش میں بھیجا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

گھنٹہ بھر بعد انّو آیا تو وہ اکیلا تھا۔ اسے تنہا دیکھ کر ماں کے دل پر گھونسا سا لگا۔ انّو کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ بالوں پر گرد اور آنکھوں میں تھکن تھی۔ وہ صبح کا بھوکا پیاسا تھا۔ ماں نے اسے کھانا نکال کر دیا۔ مگر خود کچھ بھی نہ کھایا۔ نڈھال ہو کر کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پیشتر سلمان آیا۔ ماں نے نوشا کی گمشدگی کی اسے بھی اطلاع دی۔ وہ اسی وقت انّو کو اپنے ہمراہ لے کر نوشا کی تلاش میں نکل گیا۔ جہاں جہاں اس کے ٹھکانے تھے ہر جگہ ڈھونڈا۔ محلّے کے ہر لڑکے سے دریافت کیا۔ کسی نے کوئی سراغ نہ دیا۔ شامی سے بھی انہوں نے پوچھا۔ مگر وہ ڈر کے مارے صاف جھوٹ بول گیا۔

"میں نے تو اسے ہفتے بھر سے نہیں دیکھا۔"

دیر تک وہ جگہ جگہ نوشا کو تلاش کرتے رہے۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا۔ روشنیاں جھلملانے لگیں۔ مگر نوشا کی کوئی خبر نہ ملی۔

سلمان جب انّو کے ساتھ نوشا کے بغیر واپس پہنچا تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کمرے میں سلطانہ کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ سلمان سر جھکائے دالان میں خاموش بیٹھا تھا۔ لیمپ کی یرقان زدہ زرد روشنی میں سب کے چہرے پر چھائیوں کی طرح دھندلے نظر آ رہے تھے۔

سلمان کچھ دیر ٹھہر کر چلا گیا۔

اس روز گھر میں کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ انّو تو دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھتے اونگھتے سو گیا۔ مگر سلطانہ اور اس کی ماں کو نیند نہ آئی۔ رات کا سنّاٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ گلی کی چہل پہل ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ پھر اس سکوت میں ماں کی آواز ابھری۔

"بیٹی اللہ سے دعا کرو۔"

وسوسے: وہم، ڈر، خوف۔ تمازت: گرمی۔ کہرام مچنا: رونا پیٹنا پڑنا، ماتم ہونا۔

اس نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر اسی وقت غسل کیا۔ دھلے ہوئے اجلے کپڑے پہنے اور مصلا
کر نماز پڑھنے لگی۔ سلطانہ بھی وضو کر کے اس کے پاس آگئی۔ نماز سے فارغ ہو کر ماں دیر
سجدے میں پڑی رو رو کر دعائیں مانگتی رہی۔

جب رات آدھی ہو گئی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا تو ماں سلطانہ کے ہمراہ باہر صحن
آگئی۔ آسمان کے نیچے برہنہ سر ہو کر دونوں گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔ ان کی آنکھوں سے آ
جاری تھے۔ ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کبھی کبھی ماں بے قرار ہو کر اونچی آواز میں کہتی۔

"اللہ! میں بہت مصیبت زدہ ہوں۔ میرے بچے کو مجھ سے ملا دے۔ میں رانڈ بیوہ ہوں۔
کوئی سہارا نہیں، میرا کوئی نہیں۔ ہائے میرا کوئی بھی تو نہیں۔"

وہ بلک بلک کر رونے لگتی۔ سلطانہ کی آواز بھی بھرا جاتی۔ اس کی سسکیاں ابھرنے لگتیں۔
آسمان پر تارے آنسوؤں کے قطروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ رات ڈھلتی گئی۔ ستاروں
رنگت کافوری پڑ گئی۔ ہوا سرد ہو گئی۔ اوس سے در و دیوار بھیگ گئے۔ دونوں برہنہ سر صحن میں
ٹہل کر دعائیں مانگتی رہیں، گڑگڑاتی رہیں، اشک بہاتی رہیں۔

ساری رات پریشانی اور بے قراری میں گزری۔ پھر کئی راتیں اسی عالم میں گزریں۔ ماں
رو کر برا حال کر لیا تھا۔ وہ ہر وقت چپ بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھر کے بے خیالی میں

"یا اللہ! میرا بچہ نہ جانے کہاں ہوگا۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔"

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ بیٹھے بیٹھے خود کو کوسنے لگی۔ نوشا کے چلے جانے کا اسے بے حد
تھا۔ اس نے نوشا کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ ضرورت سے زیادہ اس کا لاڈ کیا تھا۔ اس کی معقول
بھی تھی۔ سلطانہ کے بعد دو لڑکے پیدا ہوئے مگر سال ڈیڑھ سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ نوشا
بچپن میں دائم المریض تھا۔ اس کے علاج معالجے کے لیے اس نے نہ جانے کیا کیا جتن کیے تھے۔

انہی دنوں ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ بیڑی کے کارخانے میں ہڑتال ہو گئی۔ آمدنی کا
اچانک منقطع ہو گیا۔ یہ بہت بڑی مار تھی۔ ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ اف بھی نہ کر سکی۔ صرف ایک خیا
بار بار ذہن میں سوال بن کر ابھرتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ ہوتا کیا۔ چند ہی روز میں فاقہ کشی کی نوبت آ
نیاز ان دنوں اپنے کسی کام سے کوئٹہ گیا ہوا تھا۔ البتہ سلمان اکثر آتا رہتا۔ مگر وہ بھی پر

برہنہ سر: ننگے سر۔ کافوری: کافور کی طرح سفید۔ ناز و نعم سے پالنا: لاڈ اور پیار سے پالنا۔ دائم المریض: ہمیشہ بیمار رہنے والا۔ جتن: کو

پریشان سا نظر آتا۔ لباس میں بے نیازی، بال الجھے ہوئے، آنکھوں میں دبے دبے کرب کے
سائے۔ عام طور پر وہ خاموش رہتا۔ گھڑی دو گھڑی بات کرتا۔ وہ بھی انو کے بارے میں۔ اس کا ارادہ
تھا کہ انو کو کسی اچھے اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ انو اگر موجود ہوتا تو
بلا کر پڑھائی کے متعلق پوچھتا۔ کتابیں منگواتا اور دیر تک بیٹھا اسے پڑھاتا رہتا۔ اس عرصے میں کبھی
کبھار سلطانہ کی جھلک نظر آجاتی۔ یہ لمحہ بڑا حسین ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے خوشبو میں بسا ہوا
جھونکا پاس سے گزر جائے۔

❁ ❁ ❁

شام کا وقت تھا ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا
سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ گھر پر ویرانی چھائی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سب خاموش بیٹھے
تھے۔ گھر میں صبح سے کچھ نہیں پکا تھا۔ نقاہت کے باعث سب کی طبیعتیں نڈھال تھیں۔

ماں بت بنی، کھوئی کھوئی نظروں سے آنگن کی دیوار کو تک رہی تھی جس پر برابر والے مکان
میں لگے ہوئے شیشم کے درخت کا مہیب سایہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ
انو کو مار کر بیٹھی تھی جو بھوک سے بے قرار ہو کر رونے لگا تھا اور سمجھانے بجھانے پر بھی روتا رہا۔
اب وہ کمرے میں پڑا ہوا سسکیاں بھر رہا تھا۔ مارنے کو تو وہ مار بیٹھی مگر اب خود کو ملامت کر رہی تھی۔
اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔

سلمان آیا تھا۔ ماں نے اندر بلا لیا۔ اسے دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو گئی۔ سلمان کی قمیص پر جگہ
جگہ خون کے سرخ سرخ دھبے تھے۔ ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ اس
نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے یہ کیا ہو گیا؟"

وہ بے نیازی سے بولا۔ "تانگے سے آ رہا تھا۔ سڑک گیلی تھی۔ گھوڑے کا پیر پھسل گیا۔ تانگا
الٹنے سے چوٹ آگئی۔" مگر یہ چوٹ تانگا الٹنے کی نہیں تھی۔ اس کی لال لال آنکھوں سے پتہ چلتا تھا
کہ کسی سے لڑ کر آیا ہے۔ لیکن نوشا کی ماں کو اس کی بات پر یقین آگیا۔

ماں نے جلدی سے سلطانہ کو باورچی خانے میں بھیجا۔ پانی گرم کروایا۔ اور اس کے بازو اور

کرب: دکھ۔ گھڑی دو گھڑی: کچھ دیر کے لئے۔ نقاہت: کمزوری۔ مہیب: ڈرا دینے والا۔

کندھے پر جو زخم تھے ان کو اپنے ہاتھ سے صاف کرنے لگی۔ بارش یکایک تیز ہو گئی۔ پانی کے موٹے قطرے شور کرتے ہوئے گرنے لگے۔ رات اور گہری ہو گئی۔ موسلا دھار بارش برابر رہی۔ ہوا کے جھکڑ سیٹیاں بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ایسی طوفانی رات میں سلمان کے جا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ گھر جانے کے لیے اصرار بھی کرتا رہا مگر نوشا کی ماں نے ایک نہ سنی۔ دالان چارپائی بچھا کر بستر لگا دیا۔ کچھ دیر بستر پر لیٹا وہ باتیں کرتا رہا مگر زخموں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھ زیادہ دیر باتیں نہ کر سکا۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ماں اٹھ کر کمرے میں چل بارش کے قطرے شیشم کے پتوں پر گرتے رہے۔ ہوا کی تیز سرسراہٹ رک رک کر ابھرتی رہ

گیارہ بجے کے قریب بارش کا زور ٹوٹا۔ مینہ بند ہو گیا تھا لیکن ہوا تیز چلتی رہی۔ بادل رہ گرجتے۔ اچانک رات کے سناٹے میں دروازے پر نیاز کی آواز ابھری۔ نوشا کی ماں تذبذب میں پڑ اس وقت نیاز کو گھر میں بلایا جائے یا ٹال دیا جائے۔ سلمان کو دیکھ کر نہ جانے کیا سوچے۔ مزاج کا بھی شکّی تھا۔ خدا معلوم کیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ وہ خاموش لیٹی یہی سوچ رہی تھی کہ نیاز نے آواز سے انّو کو پکارا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتا۔ وہ اسے ناراض بھی کرنا نہ تھی۔ بادل نخواستہ خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ نیاز گھر کے اندر آ گیا۔ سلمان کو دالان میں دیکھ کر بولا

"یہ کون لیٹا ہے؟"

سلمان نے نیاز کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ گھبرا گیا کہ اگر نیاز نے اسے دیکھ لیا تو بہت برا اس گھر میں اس کا جو بھرم قائم تھا فوراً خاک میں مل جائے گا۔ نیاز اس کے سارے حالات سے نو ماں کو آگاہ کر دے گا۔ وہ کسی قیمت پر یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ باتیں نوشا کی ماں کو معلوم ہوں۔ وہ سہا سادھے چپ لیٹا رہا اور آنے والے حادثے کا انتظار کرتا رہا۔

نیاز کے اچانک استفسار پر نوشا کی ماں لمحہ بھر کے لیے گھبرائی۔ لیکن اس نے خود کو سنبھا فوراً بات بنائی۔ "بھائی اچھّن کا منجھلا لڑکا ہے۔"

خیریت یہ ہوئی کہ اس نے سلمان نام نہیں بتایا۔ لیکن نیاز کسی بھائی اچھّن کو نہیں جان لحظہ بھر کے لیے اس نے غور کرنے کی کوشش کی پھر بولا۔

"کون بھائی اچھّن؟"

تذبذب: شش و پنج، سوچ بچار۔ بادل نخواستہ: دل نہ چاہنے کے باوجود۔ بھرم: عزت۔ خاک میں مل جانا: ختم ہو جانا۔ منجھلا: درمیا

وہ اس سوال کے لیے تیار تھی۔ "اے وہی خالہ نجّو کے بڑے بیٹے اور کون؟" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "تم نے ان کو کہاں دیکھا ہو گا۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

"وہ لوگ جب سے پاکستان آئے ہیں ملتان ہی میں ہیں۔ کبھی یہاں آتے تو تم سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ یہ لڑکا کل آیا تھا۔ شام تک اچھا بھلا تھا۔ اس وقت بخار میں بھن رہا ہے۔"

نیاز نے حیرت سے کہا۔ "بارش میں تو نہیں بھیگ گیا؟" وہ سلمان کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ لگایا۔ سلمان کی سانس لحظہ بھر کے لیے رک گئی۔ "ارے اس کو تو بڑا تیز بخار ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے سلمان کو غور سے دیکھا جو چادر اوڑھے دیوار کی طرف منہ موڑے لیٹا تھا۔ نیاز کو کچھ شبہ ہوا۔ مگر سلمان کے چہرے پر اندھیرا چھایا تھا۔ لہٰذا وہ اسے پہچان نہ سکا۔

نوشا کی ماں نے جلدی سے بات کا رخ پلٹ دیا۔ وہ نوشا کے اچانک گھر سے چلے جانے کی خبر سنانے لگی۔ مگر نیاز نے اس کی بات سن کر کسی تشویش کا اظہار نہ کیا۔ نہ ہمدردی کی نہ دل جوئی۔ بے نیازی سے بولا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کچھ دن ٹھوکریں کھائے گا۔ ساری آوارہ گردی نکل جائے گی۔"

نوشا کی ماں کو نیاز کا روّیہ اچھا نہ لگا۔ وہ اس سے ہمدردی کے دو بول سننے کی خواہش مند تھی۔ نوشا کا تذکرہ نظر انداز کر کے نیاز کوئٹہ کی باتیں بتانے لگا۔

وہ چپ بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔

نیاز زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔

سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ جتنی دیر نیاز بیٹھا باتیں کرتا رہا اتنی دیر اس کی جان سولی پر لٹکی رہی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آئندہ اس گھر میں آتے وقت اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ان کی باتوں سے یہ تو واضح ہو چکا کہ نیاز، نوشا کی ماں کا رشتہ دار ہے اور وہ نیاز سے اس کی آمد و رفت چھپانا بھی چاہتی ہے۔ یہی اس کے حق میں بہتر ہوا۔ ورنہ وہ دوبارہ اس گھر میں آنے جانے کے قابل نہ رہتا۔

❂ ❂ ❂

رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ بادل ایک بار زور سے گر
تیز بارش شروع ہو گئی۔ پانی کے قطرے چھت پر شور مچانے لگے۔ سلمان کبھی کبھار درد سے کر
بخار تیز ہو گیا تھا۔ اس کا تمام جسم بھٹی کی طرح تپ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے سلگ رہے تھے
میں شدید درد تھا۔

یکایک اس نے اپنے قریب گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اس نے کر
نہیں بدلی۔ خاموش لیٹا رہا۔ البتہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سامنے د
ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ کوئی اس کے سرہانے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ پھر اسے اپنے رخسار پر ٹھنڈا
محسوس ہوئی۔ ایک ہاتھ اس کے چہرے پر آ کر ٹک گیا۔

وہ بے قرار ہو کر آہستہ سے بولا۔ "سلطانہ۔"

"شی۔" سلطانہ نے اسے خاموش کر دیا۔

سلمان نے اپنا جلتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے سلطانہ کا نرم نرم ہاتھ ہ
کے پاس لا کر چوم لیا۔

سلطانہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ چپ چاپ اس کے پلنگ کے قریب کھڑی رہی
تیز بارش ہوتی رہی۔ ہوا شیشم کے پتوں میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی۔ بادل زور سے گرجتے۔
کمرے کے اندر کروٹ بدلنے کی آواز ابھری۔ سلطانہ نے سلمان کے چہرے پر سے ا
ہٹایا اور دور چلی گئی۔ نہ جانے وہ کب کمرے میں گئی۔ کب اپنے بستر پر لیٹی۔ کب اسے نیند آئی۔
کو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ وہ دیر تک خاموش لیٹا سلطانہ کے دوبارہ آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئی
صبح ہوئی تو سلمان کا بخار ہلکا پڑ چکا تھا۔ زخموں میں ٹیس بھی کم تھی۔ اب ٹھہرنا مناسب
وہ سویرے ہی سویرے نوشا کے گھر سے چلا گیا۔

(۲)

بیڑی کے کارخانے کی ہڑتال طول پکڑتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی نوشا کی
پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ کئی کئی وقت کے فاقے پڑ جاتے۔ گھر میں گرہستی ہی کون سی تھی۔ تھو

جو سامان تھا وہ بازار میں فروخت ہونے لگا۔ کوئی ایسا کام نہیں مل رہا تھا جس سے پیٹ پالا جا سکے۔ سلائی
کی مشین ہوتی تو پاس پڑوس کے کپڑے سی پرو کر بھی گزارہ ہو جاتا۔ اسے خریدنے کے لیے نوشا کی
ماں نے کئی بار رقم جوڑی، مگر کوئی نہ کوئی ایسا خرچ نکل آتا کہ ساری بچت صرف ہو جاتی۔
وہ بستر پر لیٹی اپنی پریشانیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ سلطانہ
اور انو کب کے سو گئے تھے اور وہ خاموش پڑی رات کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ اسی اثناء میں نیاز آ گیا۔
وہ کئی روز بعد آیا تھا بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر ہنس رہا تھا۔ وہ سامان سے لدا پھندا آیا تھا
جس میں مٹھائی تھی، پھل تھے اور سنگھار کی کچھ اشیاء تھیں۔ آتے ہی سارے بنڈل اس نے نوشا کی
ماں کے سامنے ڈال دیئے اور چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ کر بولا۔

"آج تو میں بہت تھک گیا۔"

وہ بولی۔ "خیر تو ہے۔ کہاں سے تھکے ہارے آ رہے ہو؟"

"کچھ نہ پوچھو۔ پہلے تم مجھے پانی پلاؤ۔ پیاس کے مارے گلا سوکھ رہا ہے۔"

وہ فوراً پانی لے آئی۔ نیاز واقعی بہت پیاسا تھا۔ پورا گلاس ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گیا۔
پانی پی کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ نوشا کی ماں، نیاز کا لایا ہوا سامان کھول کر دیکھنے لگی۔ شام کو گھر میں کچھ پکا
نہیں تھا۔ سلطانہ اور انو بھوکے سو رہے تھے۔ اس نے سوچا۔ دونوں کو جگا کر کچھ کھلا دے۔ مگر جب
اس نے اپنا ارادہ نیاز پر ظاہر کیا تو اس نے منع کر دیا۔

"مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ سب اٹھ جائیں گے تو بات کرنے کا موقع نہیں
ملے گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ نیاز پلنگ اٹھا کر باہر صحن میں لے گیا۔ دونوں وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔
آسمان بالکل صاف تھا۔ دور تک ستاروں کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ نرم نرم جھونکے چل رہے
تھے۔ فضا میں خنکی تھی۔ مگر ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ نیاز نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔

"آج میں یہ طے کر کے آیا ہوں کہ مجھے ہاں یا نا کا جواب دے دو۔"

وہ دبی زبان میں بولی۔ "کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔"

وہ اور بھی جذباتی ہو گیا۔ "تم ہر بار یہی کہتی ہو۔ اسی آج کل میں کئی مہینے ہو گئے۔"

صرف: استعمال۔ خنکی: ٹھنڈک۔

وہ ناز سے بولی۔ "کئی مہینے؟ اے توبہ کرو۔"

"بس اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مبارک دن ہے۔ اسی روز ہو جانا چاہیے۔"

نوشا کی ماں گھبرا کر بولی۔ "ارے ارے، اتنی جلدی۔"

نیاز نے بڑے پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ رخساروں کو تھپک کر بولا۔ "مجھ تو اب گھڑی بھر بھی تم سے الگ نہیں رہا جاتا۔ میری بات تم کو ماننی ہی پڑے گی۔" نوشا کی ماں کچھ کہنا چاہا تو اس نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم کو میری جان کی قسم جو انکار کیا۔ اب پروگرام طے ہو گیا۔"

نوشا کی ماں نے چاہا کہ حسب معمول اس وقت بھی نیاز کو ٹال دے۔ مگر وہ اس کے سر ہو گیا۔ کر بولا۔ "اگر اس جمعے کو نکاح نہیں ہو سکتا تو پھر کبھی نہ ہو گا۔" حالات کچھ اس قدر خراب تھے کہ وہ کی دھمکی کا مقابلہ نہ کر سکی۔ روز روز کی فاقہ کشی اور طرح طرح کی پریشانیوں نے اسے بے بس کر دیا اس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ چپ چاپ نیاز کی بات مان لی۔

نیاز نے اسی وقت ضروری اخراجات کے لیے جیب سے نکال کر دو سو روپے دیے پروگرام بھی بتا دیا۔ "جمعے کو فجر کے وقت میں قاضی کو لے کر آ جاؤں گا۔ وکیل اور گواہ بھی لیتا آ گا۔ میرے خیال میں یہ سب سے مناسب وقت رہے گا۔ میرے ساتھ صرف چند آدمی ہوں گے تم سارا بندوبست کر لینا۔ جی چاہے تو پڑوس سے کسی بڑی بوڑھی کو بھی بلا لینا۔" گویا ساری اسکیم پہلے ہی تیار کر کے آیا تھا۔ ایک ایک بات بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ نوشا کی ماں چپ بیٹھی اس باتیں سنتی رہی۔

جب ساری باتیں طے ہو گئیں تو خلاف توقع وہ رات ہی کو اٹھ کر چلا گیا۔

نوشا کی ماں نے ہامی تو بھر لی مگر رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند کا کوسوں پتہ تھا۔ اسے سب سے زیادہ فکر سلطانہ کی تھی۔ دوسرے دن بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی۔ بار خاموش نظروں سے سلطانہ کو دیکھتی۔ اس کی بپھری ہوئی جوانی کو، اس کے نکھرے ہوئے حسن آب و تاب کو اور ہر بار کسی آنے والے خطرے کے احساس سے کانپ اٹھتی۔

بپھری ہوئی: پُرجوش، بھرپور۔ آب و تاب: چمک دمک، خوبصورتی۔

(۳)

اب صرف ایک دن باقی تھا۔ نوشا کی ماں کی الجھن بڑھتی گئی۔ اس بات کو اب سلطانہ سے چھپایا بھی نہ جا سکتا تھا۔ مگر یہ بات اس سے کہتی بھی تو کس منہ سے۔ زندگی میں پہلی بار وہ خود اپنی بیٹی سے ڈر رہی تھی۔ بات کرتے ہوئے اسے خوف معلوم ہو رہا تھا۔ آخر ہچکچاتے ہوئے اس نے سلطانہ کو اپنے قریب بلایا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے گزر گئے مگر ماں سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔

بہت دیر بعد اس نے دبی زبان سے کہا۔ "تم سے ایک بات کہنی تھی۔"

ماں کے بدلے ہوئے لہجے پر سلطانہ کو تعجب ہوا۔ "کیا بات ہے اماں؟"

"کیا بتاؤں کیا بات ہے!" وہ آگے نہ کہہ سکی۔ سلطانہ نے جلدی سے پوچھا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

ماں نے اٹکتے ہوئے بتایا۔ "کل رات نیاز آیا تھا۔" سلطانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں ماں نے اس کا رشتہ نیاز سے تو طے نہیں کر دیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

ماں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اچھا۔" سلطانہ کی سانس حلق میں رک گئی۔ اس نے لرزتے ہوئے پوچھا۔ "کس سے؟"

ماں نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ "میرے ساتھ۔" اور یہ کہتے کہتے اس کا چہرہ پسینے پسینے ہو گیا۔

سلطانہ حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ اس کا جسم اس طرح جھنجھنایا جیسے کہیں قریب ہی چینی کی پلیٹ گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ماں بھی چپ ہو گئی کہنا تو اسے ابھی بہت کچھ تھا۔ اپنی مجبوریوں کا اظہار کرنا تھا اور بیٹی سے معذرت کرنا تھی مگر وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔

"جمعے کو فجر کے وقت نکاح ہے۔"

یہ بات اس نے اس انداز سے کہی گویا گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہی ہو۔ وہ زیادہ دیر سلطانہ کے پاس نہ بیٹھ سکی۔ سلطانہ سوچتی ہی رہ گئی کہ کیا کہے۔ ماں اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ صندوق کھول کر سامان الٹنے پلٹنے لگی۔

چند منٹ بعد باہر نکلی تو سلطانہ سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ "میں ایک کام سے بڑی ممانی کے پاس جا رہی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی وہ گھر سے باہر چلی گئی۔

سلطانہ اسے دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔

⊛ ⊛ ⊛

انو اسکول جا چکا تھا۔ سلطانہ گھر میں تنہا تھی۔ وہ خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یا اللہ! یہ سب ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کسی انجانے خوف سے وہ بار بار کانپ اٹھتی۔ اچانک سلمان نے در کھٹکھٹایا۔

پہلے تو وہ جھجکی پھر ہمت کر کے اسے اندر بلا لیا۔

سلمان حسب معمول کمرے میں جا کر بیٹھ گیا ذرا ہی دیر بعد دروازے پر سلطانہ کا چہرہ نظر آ مگر وہ کمرے کے اندر نہ آئی۔ دہلیز سے لگی کھڑی رہی۔ اس روز وہ بڑی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ کھ کھوئی آنکھیں اور رخساروں پر ڈھلتی رات کی سی دھند۔ اس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا اور سو لگی کہ اب آئندہ وہ اس سے نہ مل سکے گی۔ کل نیاز اس کا سوتیلا باپ بن جائے گا اور جب وہ اس سوتیلا باپ بن جائے گا تو یہ گھر اس کا ہو جائے گا۔ وہ کسی صورت میں سلمان کو اپنے گھر میں آ دے گا۔ سلمان اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ محبت سے اس کا رخسار تھپتھپا کر بولا۔

"کیا بات ہے۔ تم بہت اداس لگ رہی ہو۔ اماں نے کچھ کہا ہے؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "نہیں۔"

"تو پھر بات کیا ہے؟"

مگر وہ کچھ نہ بولی اور اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ پیار سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا دونوں مبہوت کھڑے تھے۔ ناگاہ ماں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ سلمان اور سلطانہ کو اس آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ اس نے دونوں کو اس عالم میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ لمحہ بھر تک د دروازے کے قریب گم صم کھڑی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر چلی گئی۔ دروازہ باہر سے بند کیا اور مخواہ کواڑ کھٹکھٹانے لگی۔ ذرا دیر بعد خود ہی دروازہ کھول کر بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی۔

"اے لو دروازہ تو کھلا ہے۔ میں سمجھی کہ اندر سے بند ہے۔ نہ جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟"

سلطانہ اب وہاں نہ تھی۔ وہ دالان کے نکڑ پر کھڑی جلدی جلدی آنسو پونچھ رہی تھی۔ سل کمرے کے اندر جا چکا تھا۔ ماں سیدھی وہیں پہنچی اور سلمان کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔ "ارے تم

مبہوت: حیران، گھبرایا ہوا۔ ناگاہ: اچانک۔ گم صم: خاموش۔

آئے؟"

"بس ابھی ابھی آیا تھا۔"

"آج تو بڑا حبس ہے۔" اس نے دروازے سے منہ نکال کر سلطانہ سے کہا۔ "سلطانہ، تم ذرا ہمسائی کے پاس چلی جاؤ۔"

سلطانہ نے وہیں سے جواب دیا۔ "جی اچھا۔" اور گھر سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا۔ "یہاں دالان میں آ جاؤ۔ اندر تو گرمی سے دم بولا رہا ہے۔"

سلمان خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ نوشا کی ماں تھکی ہوئی سی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر سکوت رہا۔ وہ چپ بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "میں تو ایسے چکر میں پھنس گئی ہوں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

"خیر تو ہے؟" سلمان نے دریافت کیا۔

"اب تم کو کیا بتاؤں کہ کس پریشانی میں گرفتار ہوں۔"

سلمان اصرار کرنے لگا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں خاص ہی بات ہے۔ اب تم سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے کہ سلطانہ کا بیاہ ہو رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے کنکھیوں سے سلمان کے رد عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ گھبرا کر بولا۔

"کب؟"

"کل۔" اس نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔ وہ برابر سلمان کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے غور کیا کہ اس دفعہ گھبراہٹ کے بجائے حیرت کا اظہار زیادہ تھا۔ سلمان کہہ رہا تھا۔

"کل یعنی جمعے کو؟ آپ نے پہلے نہیں بتایا۔"

وہ صفائی پیش کرنے لگی۔ "میں خود بھی اتنی جلدی نہیں چاہتی تھی۔ مگر خاندان کے بڑے بوڑھوں نے مجبور کر کے دن تاریخ مقرر کر دی۔"

سلمان کا چہرہ رفتہ رفتہ اداس ہوتا گیا۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کہاں رشتہ طے کیا؟"

"خاندان ہی کا لڑکا ہے۔ برسر روزگار ہے۔ مزاج کا بھی اچھا ہے۔"

دم بولانا: دل گھبرانا، وحشت ہونا۔ کنکھیوں سے: ترچھی نظروں سے۔

سلمان زیادہ دیر تک اس کی تعریف نہ سن سکا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "خدا مبارک کرے۔" نے بڑا رسمی سا جملہ کہا اور چپ ہو گیا۔

نوشا کی ماں نے بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سلمان اب خاصا پریشان نظر آ رہا وہ خاموش بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اسی عالم میں وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب میں چلوں گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بیٹھو چلے جانا۔"

مگر اب وہ لمحہ بھر بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ نوشا کی ماں چاہتی تھی کہ وہ کچھ دیر ٹھہرے۔ کچھ بات چیت ہو اور اس نے ابھی ابھی جو صاف جھوٹ بولا تھا اس کا کچھ نتیجہ برآمد مگر سلمان نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ نوشا کی ماں اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

(۴)

سلمان اپنے کمرے میں جا کر یوں گر پڑا جیسے مدت کا بیمار ہو۔ اس نے نہ جوتے اتارے کپڑے تبدیل کیے۔ خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا اور لگاتار سگرٹ پیتا رہا۔ یہ عجیب سا غم تھا۔ عجیب سا احساس تھا۔ ایسا بوجھ تھا جس سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اپنی لاابالی زندگی میں اس سے قبل اس نے سلطانہ کی اس قدر اہمیت محسوس نہ کی تھی۔ وہ اسے ایک عام سی لڑکی سمجھتا تھا جو جوان تھی، الھڑ تھی، خوبصورت تھی۔ آج اچانک وہ معمولی لڑکی معمولی لڑکی بن گئی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ بار بار چونک پڑتا۔ دل سے ہوک اٹھتی۔ کوئی اس کے وجود میں بار بار چیختا۔

"یہ کیا ہو گیا؟"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس کا تمام وجود سوالیہ نشان بن جاتا۔

لمبے لمبے ڈگ بھرنا: بڑے بڑے قدم اٹھانا۔ لاابالی: بے پروا۔ الھڑ: چھوٹی عمر کی، من موجی۔

شام تک وہ اسی کرب اور اسی دکھ میں مبتلا رہا۔ بے چینی سے پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ سگریٹیں پھونکتے پھونکتے اس کا گلا خشک ہو گیا۔ ہونٹ جلنے لگے۔ جب کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تو اس نے اٹھ کر دو گلاس پانی کے پیے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ انسانی آوازوں کا شور تھا۔ زندگی ہنس رہی تھی۔ نکھر رہی تھی۔ گرمیوں کی شام کا حسن جوبن پر تھا۔

اس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ کچھ دیر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے دیکھا کہ وہ نوشا کے دروازے پر کھڑا ہے۔ نوشا کی ماں نے اسے فوراً اندر بلوالیا۔ وہ جیسے اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر بولی۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

سلمان گھبرا گیا۔ لمحہ بھر چپ رہا، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گی؟" اس کی آواز میں ہلکا ہلکا ارتعاش تھا۔

نوشا کی ماں یہی بات اس کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔ مجسم سوال بن کر بولی۔ "ہاں ہاں، کہو کیا بات ہے؟"

بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔ "آپ سلطانہ کی شادی نہ کریں۔" کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی۔ مگر یہ کہہ کر پشیمان بھی ہو گیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سلمان نے فوراً کہا۔ "آپ نے میری بات کا برا تو نہیں مانا۔"

"یہ بات نہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے خود بھی یہ رشتہ زیادہ پسند نہیں۔ پھر سوچتی ہوں۔ سیانی لڑکی کو کب تک بٹھائے رکھوں گی۔ کوئی اچھا بر بھی تو نہیں ملتا۔"

سلمان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے متعلق اگر کچھ کہوں۔" وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ اور دھڑکتے دل کے ساتھ جواب سننے کا انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر خاموشی چھائی رہی پھر نوشا کی ماں کی آواز ابھری۔

"یہ بات کاش تم نے چند روز پہلے کہی ہوتی۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "تمہارے ساتھ سلطانہ کا رشتہ کرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوتی مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟"

بات بھی یہی تھی۔ رات بھر میں وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کل سے نیاز اس گھر کا مالک بننے والا

جوبن: عروج۔ ارتعاش: کپکپاہٹ۔ سیانی: مراد بڑی عمر کی۔ بر: مراد رشتہ۔ توقف: وقفہ۔

تھا۔ پتہ نہیں وہ اس رشتے میں کیا کیا رخنے ڈالے۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا
باتیں اس نے چند روز قبل سلمان سے کہی ہوتیں۔ مگر چند روز قبل اسے ان دونوں کی محبت کا علم
کب تھا۔

سلمان اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ "ابھی تو آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔" پھر وہ بچوں کی طرح
مچل کر گویا ہوا۔

"اللہ کے لیے کچھ کیجیے۔"

نوشا کی ماں نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور پورے اعتماد کے ساتھ بولی۔ "اب یہی ہو سکتا ہے
میں سلطانہ کو تمھارے ساتھ کر دوں۔ دنیا زیادہ سے زیادہ یہی تو کہے گی کہ سلطانہ بھاگ گئی۔ یہ
رسوائی بھی قبول کر لوں گی۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی قاضی یا مولوی کو اپنے ساتھ لے آؤ کہ میں دو بول نکاح
پڑھوا دوں۔ تم اس کے لیے تیار ہو؟"

سلمان فوراً آمادہ ہو گیا۔

"ابھی جھٹ پٹا ہے۔ تم گیارہ بجے تک آ جاؤ۔ میں سلطانہ کو تیار کیے دیتی ہوں۔ جاؤ اب دیر نہ
کرو۔"

سلمان چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

سلطانہ کھانا پکا چکی تھی۔ چولھے کے قریب بیٹھی تنکے سے گرم گرم راکھ کرید رہی تھی۔ ماں
نے سلطانہ سے کہا۔

"جا بیٹی جلدی سے نہا لے۔"

اس نے اچنبھے سے پوچھا۔ "کیوں اماں؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "بس جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کر لے۔"

وہ اس وقت بڑی مسرور نظر آ رہی تھی۔ بات بات پر باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ سلطانہ
تذبذب میں پڑ گئی۔ اسے ماں کی معنی خیز مسکراہٹ کا کوئی سبب نظر نہ آیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر

رخنے ڈالنا: رکاوٹیں کھڑی کرنا۔ جھٹ پٹا: سورج ڈوبنے کا وقت۔ مسرور: خوش۔ باچھیں کھل جانا: بہت خوش ہونا۔

خانے کی طرف چلی گئی۔

ماں جلدی سے کمرے میں گئی۔ اس نے ایک صندوق کھول کر سلطانہ کا سب سے قیمتی جوڑا
نکالا۔ افشاں کاٹی اور مہندی گھول کر سلطانہ کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ غسل کر کے
نکلی۔ ماں قریب بٹھا کر اس کے ہاتھ پیروں پر مہندی لگانے لگی۔ پھر اس نے اتو کو بازار بھیج کر عطر،
پھولوں کے گجرے اور ایسا ہی دوسرا ساز و سامان منگوایا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہی۔
مگر جب وہ سرخ عروسی جوڑا پہنانے لگی تو اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"اماں! یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

ماں نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی۔ مصنوعی غصے سے ڈپٹ کر بولی۔ "چپکی بیٹھی رہ۔ ہر
معاملے میں نہیں بولا کرتے۔"

سلطانہ خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں اتو سارا سامان بازار سے لے کر آ گیا۔ ماں نے اپنے ہاتھوں سے سلطانہ کے بال
گوندھے۔ سرخ جوڑے پر عطر سہاگ لگایا۔ بالوں میں افشاں چنی۔ پھولوں کے گجرے پہنائے۔
جب سلطانہ دلھن بن گئی تو ماں نے آہستہ سے کہا۔

"گیارہ بجے سلمان تجھے لینے آئے گا۔"

سلطانہ حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ لمحہ بھر تک سکتے کے عالم میں ماں کے چہرے کو تکتی رہی،
پھر اس نے بیک وقت متضاد کیفیت محسوس کی۔ اس میں خوشی بھی تھی اور بے چارگی بھی۔ ماں نے
شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بیٹی! میری تو خوشی تھی کہ میرے گھر بارات چڑھتی۔ میں تجھے دھوم دھام سے رخصت
کرتی۔ مگر قسمت میں یونہی لکھا تھا۔ میری بچی مجھے معاف کرنا۔"

سلطانہ نے سر جھکا لیا اور خاموش بیٹھی رہی۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ سلطانہ کے بھی آنسو نکل
آئے۔

ماں نے اسے روتے دیکھا تو جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے۔ زبردستی

سکتے کا عالم: بے حس و حرکت ہونے کی حالت۔ متضاد: الٹ۔ شفقت: محبت۔

مسکرا کر گویا ہوئی۔

"اری پگلی تو کیوں رو رہی ہے؟ لو بھئی یہ بھی ایک رہی۔"

اس نے سلطانہ کے آنسو پونچھے اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔

سلطانہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا سارا جسم تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ چہرے پر چاندنی را
کا جمال تھا۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ دل میں وہ دبا دبا خوف تھا جو ہر دوشیزہ ا
عروسی پہننے کے بعد محسوس کرتی ہے۔ ذرا دیر بعد ماں اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک طشتری
پھل اور مٹھائی لائی تھی۔

❁ ❁ ❁

بھادوں کی مدھ ماتی رات باہر آنگن میں اتر آئی تھی شیشم کے پتے تالیاں پیٹ رہے
بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے، عود و عنبر کے سرمئی مرغولوں کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے۔

رات بھیگتی گئی۔

گیارہ بج گئے۔

ماں کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔

سلطانہ کا دل بار بار دھڑک رہا تھا اور یہ دھڑکن تیز ہوتی گئی۔

رات کی آنکھوں کا کاجل پھیل گیا۔ تاریکی کی زلف پریشاں اور پریشاں ہو گئی۔ بہت
ہو گئی۔ گلی سنسان تھی۔

نہ کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری نہ دروازے پر دستک ہوئی۔

رات آدھی ہو گئی۔

رات ڈھلنے لگی۔ راستے قبرستان کی طرح ویران ہو گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا۔

دونوں جاگ رہی تھیں۔

ہر آہٹ پر ماں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ پھر
ہوتے ہوتے اس قدر سست پڑ جاتی کہ ایسا محسوس ہوتا جیسے دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔

رات اور ڈھل گئی۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ افقی سرحدوں پر کافوری شمعیں را

لباس عروسی: شادی کا لباس۔ طشتری: بڑی پلیٹ۔ مدھ ماتی: نشیلی۔ عود و عنبر: سیاہ رنگ کی خوشبوؤں کے نام۔

ہو گئیں۔ اجالا مشرق کے غاروں سے سر ابھار رہا تھا۔

ماں کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں۔ اچانک گلی میں کتوں کے زور زور سے بھونکنے
کی آواز ابھری۔

کہیں دور چاپ سنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

قدموں کی آہٹ قریب ہوتی گئی۔ قریب اور قریب!

قدموں کی آہٹ عین دروازے پر پہنچی تو سلطانہ کا دل دھڑکتے دھڑکتے جیسے ٹھہر گیا۔

ماں ایک ٹک دروازے کو تکتی رہی۔ پھر بے قرار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

دروازے پر دستک نہ ہوئی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ جانے والا آگے چلا گیا۔ چاپ دور ہوتی گئی۔
دور اور دور۔

اسی وقت برابر والے گھر میں مرغ نے بانگ دی۔

سحر ہو رہی تھی۔ رات کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔

ماں لڑکھڑا کر سلطانہ کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ مردے کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں
بجھتے ہوئے چراغوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ ذرا دیر وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی رہی پھر
اس نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹی! یہ لباس اتار دو۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے سلطانہ کو سینہ سے لگایا
اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دونوں سسکیاں بھر کر دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔

باہر صبح کاذب کا ملگجا دھندلکا پھیل رہا تھا۔

وقت کم تھا۔ ماں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سلطانہ سے کہا۔ "میں نہانے جا رہی
ہوں۔ تم دالان میں چاندنی بچھا دو۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔" یہ کہتی ہوئی وہ غسل کرنے چلی گئی۔

ماں غسل کر کے نکلی۔

اُس نے دیکھا۔ سلطانہ دالان میں چاندنی بچھا رہی تھی۔ سرخ لباس اس نے اتار دیا تھا۔ افشاں

گلوگیر: جو گلا پکڑ لے، مراد ہلکی آواز۔ صبح کاذب: صبح کی روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا ہو جاتا ہے (جھوٹی صبح)۔ ملگجا: کچھ میلا کچھ صاف۔

پونچھ ڈالی تھی۔

پھولوں کے گجرے، مٹی کے گھڑوں پر لٹک رہے تھے۔

ماں نے سلطانہ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اس سے نظریں نہ ملا سکی۔ چپ چاپ کمرے جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

❁ ❁ ❁

مسجدوں میں فجر کی نماز ختم ہو گئی۔

گلی میں تھوڑی بہت چہل پہل شروع ہو گئی۔ پاس پڑوس کے مکانوں سے ملی جلی آوازوں کا شور ابھرنے لگا۔

نیاز نے دروازے پر دستک دی۔ انّو نے ماں کی ہدایت پر دروازہ کھول دیا۔ نیاز گھر میں دا ہوا۔ نکاح خواں کے علاوہ اس کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ان میں وکیل اور گواہ بھی تھے، نیاز کے شناسا اور ملنے جلنے والے تھے۔

برسات کی اس دھندلی صبح کو چپ چپاتے نکاح کی رسم ادا ہوئی۔

حبیب احمد مرحوم کی بیوہ مسماۃ رضیہ بیگم، نیاز کی منکوحہ اور سلطانہ سوتیلی بیٹی بن گئی۔ اب اس کنبے کا سربراہ تھا۔ اس گھر کا مالک و مختار تھا۔

شناسا: واقف کار۔ چپ چپاتے: خاموشی سے۔ منکوحہ: بیوی۔

فصل پنجم

(۱)

شاہ جی کے سفید دیواروں والے مکان میں رہتے ہوئے نوشا اور راجہ کو ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ اس تمام عرصے میں نہ تو شاہ جی سے ان کی دوبارہ ملاقات ہوئی نہ کوئی کام کرنا پڑا۔ دونوں وقت ہوٹل سے کھانا آ جاتا۔ صبح شام ایک ایک پیالی چائے کی ملتی اور روزانہ ایک پیکٹ بگلا مارکہ سگریٹ کا بھی مل جاتا۔ کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ چوبیس گھنٹے مکان کی چار دیواری کے اندر رہنا پڑتا۔ دروازے پر ہر وقت ایک ہٹا کٹا پٹھان مستعدی سے اسٹول پر بیٹھا رہتا۔ وہ ہر آنے جانے والے کو ٹوکتا۔ ایک بار دونوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا تو وہ آنکھیں نکال کر چیخا۔

"خوتم کیدھر جاتا ہے۔ تمارا باہر جانے کا منادی ہے۔ جاؤ کمرے میں جاؤ۔ ادھر مت آؤ۔"

اس کی ڈانٹ ڈپٹ سے وہ اس قدر خائف ہوئے کہ دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کیا۔ رہنے کو کمرہ مل گیا تھا۔ دونوں تمام وقت اسی میں پڑے رہتے۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو باہر کی جانب کھلتی تھی۔ مگر اس پر لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ دل گھبراتا تو وہ بندروں کی طرح جھک جھک کر جھانکتے۔ اس طرف گلی تھی جس کے دونوں طرف اونچے نیچے مکانوں اور جھگیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ گلی میں دن بھر ننگ دھڑنگ گندے گندے بچے شور مچاتے اور عورتیں دروازوں کی دہلیز پر بیٹھ کر اونچی آوازوں سے باتیں کرتیں۔

دن کے وقت مکان میں سناٹا چھایا رہتا۔ کبھی کبھار شاہ جی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دیتی۔ وہ

ہٹا کٹا: موٹا تازہ۔ مستعدی: ہوشیاری۔ منادی ہے: مراد منع ہے۔ ننگ دھڑنگ: بالکل ننگے۔

عام طور پر کمرے کے اندر رہتا تھا۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ نکل کر باہر آتا۔ رات کو البتہ
شکلیں نظر آتیں۔ جو بھی آتا سیدھا شاہ جی کے کمرے میں جاتا جہاں سے آدھی رات تک
کرنے کی آوازیں ابھرتی رہتیں۔

ایک بار چھت پر قوالی بھی ہوئی۔ بڑا جشن رہا۔ اس روز سہ پہر ہی سے چھت پر چھڑکاؤ
ہو گیا تھا۔ شام ہوتے ہی دو گیس بتیاں بھی آ گئیں۔ چھت پر دری اور چاندنی کا فرش ہو گیا۔
کی چوکیاں آنا شروع ہو گئیں۔

پہر رات گزری۔ شاہ جی چھت پر آیا اور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا اس نے بھی لباس
اہتمام کیا تھا۔ ململ کا کلف دار کرتا، کھڑکھڑاتی ہوئی لٹھے کی شلوار، ہاتھ میں ریشمی رومال او
میں پڑا ہوا خوشبودار تیل جو تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔

شاہ جی نے اشارہ کیا اور قوالی شروع ہو گئی۔ نوشا اور راجہ بھی اس محفل میں شریک
ایک کونے میں دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ شاہ جی قوالی سنتا رہا، جھومتا رہا اور قوالوں کو روپے با
ایک کے بعد دوسری چوکی آتی رہی۔ اپنے کمالات دکھا کر داد پاتی رہی۔ انعام لیتی رہی۔ سار
یہ سلسلہ چلتا رہا۔

راجہ اور نوشا قوالی سنتے سنتے وہیں چھت پر پڑ کر سو گئے۔

❁ ❁ ❁

دن گزرتے رہے۔ مگر دونوں اس زندگی سے جلد ہی اکتا گئے۔ ایک روز راجہ نے
ہو کر نوشا سے کہا۔ "یار ہم دونوں کسی چکر میں تو نہیں پھنس گئے۔ نہ کوئی کام ہے نہ کاج۔ ہر
کے اندر بند۔ کہیں آ جا بھی نہیں سکتے۔ مجھے تو کچھ معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔"

نوشا نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "ابے تجھے ہر جگہ گڑبڑ ہی نظر آتی ہے۔"

راجہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "یار نہ جانے کیوں مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔"

دیر تک وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ اتفاق سے اسی روز شاہ جی کے پاس دونوں
ہوئی۔ وہ اس وقت ایک چوڑی چکلی کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ہنس کر

"ہاں جی! تم دونوں نے خوب آرام کر لیا۔ اب کچھ کام شام بھی ہونا چاہیے۔"

چوکیاں: قوالوں کے گروہ۔ آلتی پالتی مارنا: چارزانو بیٹھنا۔

دونوں اس کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔ وہ کہتا رہا۔ "سوچتا ہوں آج تمہاری بھی ڈیوٹی
لگا دی جائے۔" اس نے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ "لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میرے ساتھ
ٹھیک ٹھیک کام کرنا ہوگا۔ میں برے بندوں کے ساتھ بہت برا ہوں۔" دونوں نے گردنیں ہلا کر
اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"یوں ڈنگر کی طرح گردن ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ میرے سامنے قسم کھاؤ۔"

دونوں نے قسمیں کھائیں۔

شاہ جی نے نور خان کو آواز دی۔ "نورے ادھر آ۔" فوراً ہی ایک لمبا تڑنگا آدمی کمرے میں
داخل ہوا۔ دونوں پہلے بھی اسے گھر میں دیکھ چکے تھے۔ مگر کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی
نے نورا سے کہا۔

"یہ دونوں آج سے تیرے چارج میں رہیں گے۔ ویسے ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ اب ان سے
تجھے کام لینا ہے۔ آج ہی ان کو گشت پر لے جا۔"

نور خان عرف نورا نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے جی۔ جیسا حکم کریں اللہ نے
چاہا ویسا ہی ہوگا۔"

شاہ جی اب ان دونوں سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو جی! یہ تم دونوں کو کوٹھیوں اور بنگلوں پر لے
جائے گا۔ صرف تم ہی اندر جاؤ گے۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ وہاں جا کر تم کہنا کہ ہم نوکری
کرنی چاہتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کے لیے تھوڑی سی اپنی مصیبت بھی بیان کر دینا تاکہ آسانی سے
ملازمت مل جائے۔ جو تنخواہ دیں اسی پر کام شروع کر دینا۔ جس روز تم کو نوکری مل جائے، اس کے
دوسرے دن نورا تم سے ملنے آئے گا۔ جو کچھ یہ پوچھے ٹھیک ٹھیک بتانا۔ اس کے بعد یہ جیسا کہے ویسا
ہی کرنا۔ سمجھ گئے نا سب باتیں؟"

دونوں نے فوراً کہا۔ "ہاں جی سب سمجھ گئے۔"

"اب تم دونوں جاؤ۔" شاہ جی نے نورا کو دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔ "لے یہ چائے پانی کو
رکھ لے۔"

نورا نے سلام کیا اور دونوں کے ہمراہ کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ انہیں قریب کے کمرے میں لے

ڈنگر: جانور۔ چارج: نگرانی۔ گشت: چکر۔

گیا اور وہاں دیر تک بہت سی باتیں سمجھاتا رہا۔ یہ باتیں تقریباً وہی تھیں جو شاہ جی ان سے کہہ چکا تھا۔ شام ہونے سے کچھ دیر قبل نورا دونوں کو اپنے ہمراہ جمشید روڈ لے گیا۔ بس سے اتر کر نورا نے سڑک کے دونوں جانب بنی ہوئی کوٹھیوں کو غور سے دیکھا۔ اس کی نظروں میں سراغ لگانے والے کھوجی کی سی چمک تھی۔ کچھ دور چل کر وہ عامل کالونی کی جانب مڑ گیا۔ تینوں آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آگے آگے نورا تھا۔ اس کے پیچھے راجہ اور نوشا تھے۔ آخر ایک موڑ پر نورا ٹھہر گیا۔ اس کی نظریں ایک دو منزلہ کوٹھی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جس کے لان میں کئی بچے کھیل رہے تھے۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا پھر دونوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"بس جی یہیں سے بسم اللہ کرو۔"

ایک بار پھر اس نے ضروری ہدایتیں دیں اور انہیں دو منزلہ کوٹھی کی جانب روانہ کر دیا۔ نورا کھڑا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ گئے۔ نوشا اندر جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ مگر راجہ جھٹ اندر داخل ہو گیا۔ نوشا بھی چلا گیا۔ نورا دونوں کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

چند ہی منٹ بعد دونوں واپس آ گئے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ فی الحال وہاں ملازم کی ضرورت نہیں۔ نورا نے ان کو دل شکستہ نہ ہونے دیا۔ ہنس کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ دوسری جگہ کوشش کرتے ہیں۔"

وہ ان کو ایک اور کوٹھی پر لے گیا۔ وہاں بھی کام نہ بنا۔ نورا کی ہدایت کے مطابق وہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں گئے مگر کام کہیں نہیں ملا۔ آخر رات گئے تینوں اڈے پر واپس آ گئے۔

دوسرے روز نورا سویرے ہی سویرے ان کو لے کر گشت پر نکل گیا اس بار وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف گئے۔ دن چڑھے تک دونوں نے کئی جگہ کوشش کی۔ ایک کوٹھی میں ملازمت مل رہی تھی مگر وہاں چوکیدار تھا اور اس سے بھی زیادہ خطرناک وہ کتا تھا جس کے بھونکنے کی آواز دور سے سنائی پڑتی تھی۔ جس وقت نورا نے دونوں کو اس کوٹھی میں بھیجا تھا چوکیدار کتے کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی نورا نے فوراً پروگرام بدل دیا۔

دوپہر سے کچھ پہلے ان کا کام بن گیا۔ مگر ملازمت صرف راجہ کو ملی۔ نوشا ڈھیلا ڈھالا تھا بولتا بھی شرما شرما کر تھا۔ مگر راجہ خوب چاق و چوبند تھا۔ اس نے بڑی مستعدی سے تڑاق پڑاق باتیں

دل شکستہ: مایوس۔ چاق و چوبند: تیز طرار، ہوشیار۔ تڑاق پڑاق: جلد جلد، بے باکانہ۔

کیں۔ یہ ایک انجینئر کی کوٹھی تھی۔ وہ خود تو اس وقت دفتر میں تھا۔ گھر پر اس کی بیوی تھی۔ وہ تیز طرار قسم کی عورت تھی۔ راجہ کی تیزی اسے پسند آ گئی۔ اس نے ۲۵ روپے ماہوار تنخواہ اور دونوں وقت کے کھانے پر راجہ کو ملازم رکھ لیا۔ وہ تو وہیں رک گیا۔ نوشا واپس آ گیا۔ اس نے یہ اطلاع نورا کو دی۔ اس کے چہرے پر کامیابی کی خوشی لہرا گئی۔

نورا اور کہیں نہیں گیا۔

❁ ❁ ❁

اس رات نوشا کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ اکیلے کمرے میں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ پہلے وہ راجہ کو یاد کرتا رہا۔ پھر راجہ کی یاد کے سہارے وہ بھی دور چلا گیا۔ جہاں اس کا اپنا گھر تھا۔ ماں تھی، بہن تھی، چھوٹا بھائی تھا۔ اسے گھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی اور انہیں یاد کرتے کرتے وہ رو پڑا۔ دیر تک خالی کمرے میں اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ ابھرتی رہیں۔ وہ اسی طرح روتے روتے سو گیا۔

دوسرے روز بھی اس کی طبیعت پریشان رہی۔ تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا بے چینی کے عالم میں وہ اکیلے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ تھک جاتا تو لیٹ جاتا۔ گھنٹوں گلی میں کھلنے والی کھڑکی سے لگا خواب ناک نظروں سے باہر تکتا رہا۔ شام ہوئی تو نورا اس کے پاس آیا اور اپنے ہمراہ ہاؤسنگ سوسائٹی لے گیا۔

نورا کوٹھی سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ اس نے نوشا کو کوٹھی کے اندر بھیجا کہ راجہ کو بلا لائے۔ نوشا نے جا کر دیکھا۔ راجہ ایک شان دار کمرے میں بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ریڈیو پر گانے سن رہا تھا۔ اس کے برابر دو سنہری بالوں والے خوب صورت بچے بیٹھے تھے۔ راجہ نے نوشا کو دیکھا تو اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

نوشا نے کہا۔ "ریڈیو پر فلمی گانے سنے جا رہے ہیں۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "اپنے تو یہی ٹھاٹھ ہیں پیارے۔"

"مزے میں ہو؟"

"ہاں یار! میں تو یہاں بڑا خوش ہوں۔"

نوشا نے سرگوشی کی۔ "نورا باہر کھڑا ہے۔ تم کو بلایا ہے۔"

نورا کا نام سنتے ہی راجہ کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر مری

ہوئی آواز میں بولا۔ "اچھا چلو۔" دونوں کوٹھی سے باہر آگئے۔

نورا ایک سنسان گلی کے نکڑ پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ "ٹھیک ٹھاک ہے؟"

راجہ نے مختصر جواب دیا۔ "ہاں۔"

"کسی کو تم پر کوئی شبہ وبہ تو نہیں ہوا؟"

"بالکل نہیں۔" راجہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تمہارے علاوہ اور کتنے نوکر ہیں؟"

راجہ لمحہ بھر تک کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے بتایا۔ "ایک، دو، تین، ہاں تین ہیں۔"

"سب کوٹھی ہی میں رہتے ہیں؟"

"نہیں، آیا اور رحمت تو شام کو گھر چلے جاتے ہیں۔ خانساماں ہے۔ وہ باہر اپنی کوٹھری میں رہتا ہے۔"

نورا نے ایک لمبی "ہوں" کی اور گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے پھر سوالات شروع کر دیے۔ "گھر میں کتنے مرد ہیں؟"

"صرف بڑے صاحب ہیں اور تو سب بابا لوگ ہیں۔"

"صاحب رات کو باہر جاتے ہیں؟"

"میرے سامنے تو گئے نہیں۔"

"رحمت کیسا بندہ ہے؟"

"سالا ہر وقت بیٹھا اونگھا کرتا ہے۔ بی بی جی کہتی ہیں روز سینما دیکھتا ہے۔ وہ اس کو خوب ڈانٹتی ہیں۔"

نورا نے اس کی پیٹھ گرم جوشی سے تھپتھپا کر کہا۔ "تو تو بہت ہوشیار نکلا۔ جیو میرے بس تھوڑا سا کام تم کو اور کرنا ہے۔"

اس نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی جانب بڑھایا۔ "لو اسے رکھ لو۔ استاد جی نے خرچے کو دیا ہے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔ میں نوشے کے ہاتھ پہنچوا دوں گا۔"

راجہ نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ لے لیا۔ "ابھی تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

نورا نے پیشہ ور مجرموں کی طرح ایک آنکھ دبا کر کہا۔ "اب تم یہ پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ بی بی جی زیور اور نقدی کہاں کہاں رکھتی ہیں۔ جب بھی موقع لگے، اس کمرے کو اچھی طرح دیکھ لینا۔ جن جن بکسوں اور الماریوں میں قیمتی سامان رکھا ہو ان کو اچھی طرح بھانپ لینا۔"

راجہ یہ سنتے ہی لرز اٹھا۔ نورا اس کے خوف سے بے نیاز کہتا رہا۔ "اس کے علاوہ یہ بھی پتہ لگاؤ کہ رات کو صاحب اور بی بی جی کا کیا پروگرام رہتا ہے۔ کس روز سینما جا رہے ہیں؟ کس روز دعوت میں جا رہے ہیں اور کب تک واپسی ہوگی۔ مطلب یہ کہ۔" مگر اس نے مطلب کی بات نہ بتائی۔ صاف گول کر گیا۔ صرف اس قدر کہا۔ "اب میں تم سے پانچویں دن ملوں گا۔" ذرا دیر وہ کھڑا کچھ شمار کرتا رہا۔ "آج منگل ہے۔ گویا اب میں تمہارے پاس ہفتے کو آؤں گا۔ اس وقت تک تم ساری باتیں معلوم کر لینا اور مجھ کو پوری رپورٹ دینا۔ سمجھ گئے نا؟"

راجہ نے گردن ہلا دی۔ "سمجھ گیا۔ سب کچھ سمجھ گیا۔"

نورا نے مزید بات چیت نہ کی۔ سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ راجہ کو سگریٹ پلائی اور خود اپنے لیے بھی سلگائی۔ دونوں لمبے لمبے کش لگا کر دھوئیں کے بھبکے چھوڑنے لگے۔ نوشا خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔

اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اسے رہ رہ کر راجہ پر رشک آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راجہ کوٹھی کی طرف چلا گیا اور وہ نورا کے ساتھ اڈے پر واپس آ گیا۔

(۲)

سنیچر کا دن تھا۔ راجہ کو ملازمت کرتے ہوئے ساتواں روز تھا۔ اس عرصے میں وہ کوٹھی کے ماحول سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ سب بچوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ دن بڑے مزے میں گزر رہے تھے۔

روزانہ کا پروگرام یہ رہتا کہ سویرے ہی سویرے گرم گرم چائے پینے کو مل جاتی۔ ناشتے کی میز سے جو کچھ بچ کر آتا اس میں سے ایک آدھ ٹوسٹ، انڈا یا ایسی ہی کوئی چیز کھانے کو مل جاتی۔ اس

پیشہ ور: مراد ماہر۔ بات گول کرنا: ٹال دینا۔ رشک: یہ آرزو کہ جو چیز دوسرے کے پاس ہے مجھے بھی مل جائے۔ مانوس: واقف۔

وقت تک سات ساڑھے سات کا وقت ہو جاتا تھا۔ آپا ناشتے کے بعد دونوں بچوں کو تیار کر دیتی
راجہ انہیں اسکول لے جاتا۔ واپسی پر نو بج جاتے۔ یہ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہوتا۔ وہ دوڑ
کر مستعدی سے ان کا ہر کام کرتا۔

اس کے کان ان کی آواز پر لگے رہتے۔ ادھر انہوں نے کچھ کہا اور وہ لپکا۔ ان کا کام زیادہ
تھا مگر وہ شور بہت مچاتے تھے۔ پہلے روز تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ مگر رفتہ رفتہ عادی ہوتا گیا۔ جب وہ
جانے لگتے تو ان کا ایک ایک سامان اٹھا کر کار کے اندر رکھتا۔ اس کی مستعدی دیکھ کر وہ ایک روز
خوش نودی کرتے ہوئے بیوی سے کہنے لگے۔

"بیگم! یہ راجہ تو بڑے کام کا لڑکا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "دیکھ لیجیے، میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ میں نے تو پہلے ہی روز تاڑ لیا تھا کہ
ہوشیار اور کیرا ہے۔"

"ارے بھئی تمہارے انتخاب کی کیا بات ہے۔"

دونوں ہنسنے لگے اور راجہ اپنی تعریف سن کر جھوم اٹھا۔ اس روز سے وہ اور بھی مستعد ہو
اس کے سپرد زیادہ کام نہیں تھا۔ بارہ بجے بچوں کو اسکول سے واپس لاتا تو سہ پہر تک اس کے
کوئی کام نہ ہوتا۔ مگر وہ نچلا نہ بیٹھتا۔ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا۔ کبھی فرنیچر جھاڑ پونچھ رہا ہے۔
جوتوں پر پالش کر رہا ہے۔ کبھی بچوں کے کپڑے دھو رہا ہے۔ یہ کام رحمت اور آپا کے سپرد تھے
وہ ان کا بھی کام کر ڈالتا۔ ان دونوں نے شروع شروع میں اس کی آمد پر بڑی ناک بھوں چڑھائی
مگر اب وہ بھی اس سے بہت خوش تھے۔

سہ پہر کو دونوں بڑے لڑکے کالج سے آ جاتے۔ ان سے بھی اس نے تھوڑا بہت یارانہ گا
تھا۔ ان کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ کوٹھی کے پچھواڑے وسیع میدان تھا۔ پاس پڑوس
کوٹھیوں کے لڑکے بھی آ جاتے۔ شام تک کرکٹ ہوتی۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھیلتا اور اب تو
الٹی سیدھی گیند پھینکنا بھی آ گئی تھی۔ ایک آدھ رن بھی بنا لیتا تھا۔ صاحب اور بیگم نے اس بار
کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ ایک روز دونوں دیر تک کھیل دیکھتے رہے۔

رات کا کھانا آٹھ سوا آٹھ بجے ختم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ بچوں کے ساتھ کمرے میں

خوشنودی: خوشی۔ کیرا: کام کرنے والا۔ نچلا نہ بیٹھنا: کچھ نہ کچھ کرتے رہنا، چپ نہ رہنا۔ ناک بھوں چڑھانا: ناگواری کا اظہار کرنا۔

ریڈیو سے ڈرامے سنتا۔ گانے سنتا۔ کبھی کبھار تھوڑی بہت ٹھٹول بازی بھی کر لیتا۔ ان سے اس کی
خوب پٹتی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے اپنے بستروں پر چلے جاتے تو وہ چھوٹی بی بی، ناہید کی طرف چلا
جاتا۔ اس سے بھی وہ خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ بھی کالج جاتی تھی اور علیحدہ کمرے میں رہتی تھی۔
وہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتی۔ ٹیلی فون کا ریسیور کان سے لگائے دیر تک باتیں کرتی رہتی یا پھر پیانو پر
لہک لہک کر گانا گاتی۔ اس کی آواز سریلی تھی۔ راجہ کو اس کا گانا پسند تھا۔ وہ اس کے پیروں کے پاس
بیٹھ کر چپ چاپ آنکھیں بند کیے گانا سنا کرتا۔ وہ گانا ختم کرتی۔ اپنے بڑے بڑے سرخ ناخن اس کی
کنپٹی میں چبھو کر کہتی۔

"اے چلو اٹھو۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔"

وہ مکاری سے رونی شکل بنا کر کہتا۔ "ابھی سے۔"

وہ ہنس کر کہتی۔ "چل بھاگ۔ مجھے ابھی کالج کا بہت کام کرنا ہے۔"

راجہ فوراً کہتا۔ "چھوٹی بی بی اوولٹین نہیں پیو گی؟"

ناہید رات کو اوولٹین شوق سے پیتی تھی۔ وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی۔ "اچھا جا
ایک کپ بنا لا۔ مجھے آج دیر تک کام کرنا ہے۔"

وہ فوراً ہیٹر پر دودھ گرم کرتا اور ٹرے میں اوولٹین کی پیالی سجا کر لے آتا۔ ناہید بڑی نفاست
پسند لڑکی تھی۔ لہٰذا وہ صفائی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جتنی دیر وہ اوولٹین پیتی اس سے کچھ نہ کچھ بات
چیت کرتی رہتی۔ وہ نظریں چرا چرا کر اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہتا۔ یہ عجیب سی لذت تھی۔
یوں وہ عمر میں اس سے کئی سال بڑی تھی۔ مگر وہ اپنے مخصوص انداز میں کبھی کبھی سوچا کرتا۔
یار بڑی غضب کی لونڈیا ہے۔ جی چاہتا کہ بس سالی کو بیٹھے دیکھا کرو۔ یوں دیکھتی ہے کہ قتل کر کے
رکھ دیتی ہے۔

ناہید کے علاوہ محمود اور مسعود تھے۔ ان سے بھی اس کی پٹنے لگی تھی۔ کرکٹ کے علاوہ رات
کو کمرے میں دروازہ بند کر کے ان کے ساتھ چپکے چپکے تاش کی بازی لگتی۔ تاش کھیلنے کا وہ ہمیشہ سے
رسیا تھا۔ خوب خوب ہاتھ دکھاتا۔ ایسی ایسی چالیں چلتا کہ دونوں دنگ رہ جاتے۔
لیکن کوٹھی میں سب سے زیادہ اس پر مہربان بیگم صاحبہ تھیں جن کو سب ملازم بی بی جی کہتے

ٹھٹول بازی: ہنسی مذاق۔ خوب پٹتی: مراد اچھی طرح گزر بسر ہوتی۔ نفاست پسند: صفائی کو پسند کرنے والی۔ رسیا: شوقین۔

تھے۔ وہ ان کا کام بھی جی لگا کر کرتا تھا۔ ایک روز وہ ان کے جوتوں پر پالش کر رہا تھا اور انہیں ایسا چمکا
تھا کہ چماچم کر رہے تھے۔ بی بی جی بھی کہیں سے ٹہلتی ہوئی ادھر آ گئیں۔ اس کے قریب کھڑے
ہو کر جوتوں کو دیکھنے لگیں۔ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد بولیں۔

"راجہ اگر تو ٹھیک سے آگے بھی کام کرتا رہا تو سچ کہتی ہوں بہت اچھا رہے گا۔ خدمت سے
عظمت ہے۔ دل لگا کر کام کرے گا تو تیری زندگی بنا دوں گی۔ میرا تو ارادہ ہے کہ تو ذرا بڑا ہو جائے تو
صاحب سے کہہ کر تجھے ان کا اردلی لگوا دوں۔"

راجہ نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ "میں اردلی بن جاؤں گا۔ وہ جو سفید کوٹ پر سنہری
پیٹی ڈالے رہتے ہیں۔" اس نے بڑے کھلنڈرے پن سے اپنی گردن ہلائی۔ "پھر تو اپنے ٹھاٹھ
ہو جائیں گے۔"

"ٹھاٹھ تو ہو ہی جائیں گے۔ ساٹھ روپے تنخواہ ملے گی اور بخشیش اوپر سے۔ کام کاج بھی زیادہ
نہیں کرنا پڑتا۔"

"میں کام کاج سے گھبراتا تھوڑی ہوں۔"

وہ مسکرانے لگیں۔ "بس اب تو تھوڑا سا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لے۔ اردلی بن جائے گا تو کوئی
اچھی سی لڑکی دیکھ کر تیرا بیاہ بھی کرا دوں گی۔ دونوں میاں بیوی یہیں رہنا۔"

راجہ شرما گیا۔ دل ہی دل میں سوچا۔ لو یار اپنی ایک عدد جورو بھی ہو جائے گی۔ مگر یہ خیال اسے
عجیب سا لگا دھت تیری کی یہ بھی کیا بات ہوئی۔ لیکن بی بی جی کی باتوں کا یہ اثر ضرور ہوا کہ وہ اور بھی
زیادہ مستعدی اور جانفشانی سے کام کرنے لگا۔ ادھر کسی نے کچھ کہا اور جھٹ اس کا کام کر دیتا۔

یہ دن اس نے بڑے مزے میں گزارے تھے۔ اب اس کا رنگ بھی ذرا نکھر گیا تھا۔ بی بی جی
نے محمود اور مسعود کی دو پرانی پتلونیں اور کئی قمیصیں دے دیں جن کو پہن کر پہلے روز جب اس نے
قد آدم آئینے کے سامنے اپنا عکس دیکھا تو حیرت سے چونک کر زیر لب بڑبڑایا۔ "استاد بالکل
اشٹوڈنٹ لگ رہے ہو۔"

وہ دیر تک آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

❂ ❂ ❂

اردلی: ساتھ رہنے والا سپاہی۔ کھلنڈرا پن: بچپنا، بے پروائی کا انداز۔ جورو: بیوی۔ جانفشانی: محنت، سرگرمی۔ قد آدم: انسانی قد کے برابر

سہ پہر سے راجہ پریشان تھا۔ شام کو نورا آنے والا تھا جس کی گھنی مونچھوں اور پان سے رچے
ہوئے کالے کالے دانتوں سے اس گھن معلوم ہوتی تھی۔ جوں جوں دن ڈھلتا گیا اس کی پریشانی
بڑھتی گئی۔ وہ اس گھر کے رہنے والوں سے دغا بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اس گھر کو
چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد زندگی میں اسے پہلی بار ایسی گھریلو زندگی نصیب ہوئی
تھی جہاں خوشی تھی سکون تھا۔ نہ کسی کا ڈر تھا نہ خوف۔ مزے سے ہنستے کھیلتے وقت گزرتا تھا۔ رات کو
لمبی تان کر سوتا۔ سویرے اٹھتا تو طبیعت بشاش ہوتی۔

شام ہوتے ہوتے وہ بے چین ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ شاہ جی بے حد
خطرناک آدمی تھا۔ اسے ناراض کر کے جان خطرے میں ڈالنا تھی۔ نہ جانے وہ کیا کرے۔ اس کے
تصور ہی سے وہ کانپ اٹھتا۔ دوسری طرف بی بی جی تھیں جو مہربانی سے پیش آتی تھیں۔ ننھے للّی اور
اکو تھے جن سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ خوب رو اور خوش طبع ناہید تھی جس کی خوب صورت
آنکھیں چاقو چلاتی تھیں۔ محمود اور مسعود تھے جن کے ساتھ اس کا یارانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کو
کرکٹ ہوتی اور رات کو تاش کی بازی لگتی۔ دونوں وقت گرم گرم کھانا ملتا اور مزے دار ہوتا۔ صرف
سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پینا پڑتی تھی۔

سوچتے سوچتے وہ بد حواس سا ہو گیا۔ پریشانی اور بے بسی کے عالم میں باہر درختوں کے نیچے
اندھیرے میں چلا گیا اور بے اختیار رو پڑا۔

شام کا دھندلکا جب رات کے اندھیرے میں ڈھلنے لگا تو دروازے پر نوشا کا چہرہ نظر آیا۔ اسے
دیکھتے ہی راجہ نے شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے منہ پر تھوک دے اور
چیخ کر کہے۔ "نکل جا سالے کمینے یہاں سے۔" لیکن اس نے کچھ بھی نہ کہا اور خاموش کھڑا رہا۔ نوشا
آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ کر رسان سے بولا۔

"نورے نے بلایا ہے۔"

راجہ اس طرح خاموش رہا جیسے اس نے نوشا کی بات ہی نہیں سنی۔

نوشا نے دوبارہ کہا۔ "باہر نورا کھڑا تم کو بلا رہا ہے۔"

گھن: نفرت۔ لمبی تان کر سونا: بے فکر ہو کر سونا۔ بشاش: تر و تازہ۔ گاڑھی چھننا: آپس میں خوب میل جول ہونا۔ خوب رو: خوبصورت
چہرے والا۔ خوش طبع: زندہ دل، اچھی طبیعت کی۔

راجہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور بے رخی سے بولا۔ "کھڑا ہے تو کھڑا رہے میں
سالے کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

نوشا حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "کیا کہا، نہیں جاؤ گے؟"

راجہ جھنجلا کر بولا۔ "ہاں جی نہیں جاؤں گا۔ میں اب ان سالے بدمعاشوں کے چکر میں
پڑنا چاہتا۔" لمحہ بھر کے لیے اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"میرا کہنا مانو تو تم بھی ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ کسی کوٹھی میں تم کو بھی کام دلا دوں گا۔ مار گو
سالے حرامیوں کو۔"

"یار کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں کب ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ تو بڑے خطر
لوگ ہیں۔"

"خطرناک ہیں تو ہوا کریں۔ صاحب سے کہہ دوں گا۔ سب سالوں کو بند کروا دیں گے۔
کی ہوا کھانی پڑے گی۔ مذاق نہیں ہے۔"

نوشا اور خوفزدہ ہو گیا۔ "نہیں یار ایسا نہ کرنا۔ خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ شاہ جی
خطرناک آدمی ہے۔ اس سے بگاڑنا اچھا نہیں۔"

مگر راجہ ذرا مرعوب نہ ہوا۔ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "اچھا جی میں تو کسی کے پاس نہیں ج
گا اور دیکھو آئندہ تم یہاں نہ آنا۔" یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے مڑا اور برابر والے کمرے میں داخل ہو
نوشا اسے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ذرا دیر گم صم کھڑا رہا پھر کوٹھی سے نکل کر سیدھا نورا
پاس پہنچا۔

نوشا کو اکیلا آتا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ گھبرا کر پوچھا۔ "راجہ
نہیں آیا؟"

نوشا صاف بات بتانے میں جھجکنے لگا تو نورا نے ڈپٹ کر کہا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا۔ بات کیا ہے؟
سالا راجہ کیوں نہیں آیا؟"

نوشا کو مجبوراً بتانا پڑا۔ "وہ کہتا ہے میں نہیں آؤں گا۔"

"تو بات یوں ہے۔" نورا آہستہ آہستہ گردن ہلا کر بڑبڑانے لگا۔

مرعوب نہ ہوا: رعب میں نہ آیا۔ ماتھا ٹھنکنا: کسی بات یا کام کا برا انجام آثار سے معلوم ہو جانا۔

نوشا نے دبی زبان سے کہا۔ "اور اس نے آئندہ مجھے بھی آنے سے منع کر دیا ہے۔ بہت غصے
میں تھا۔"

شاہ جی نے نورا کی پوری بات بھی نہ سنی۔ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ غضب ناک ہو کر بولا۔
"اس حرام کے تخم راجہ کا دوسرا بندوبست کرنا پڑے گا۔" کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد
شاہ جی کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ "نورے!"

نورا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ہاں جی!"

شاہ جی گویا ہوا۔ "رات زیادہ ہو گئی ہے اب تو جا کر آرام کر۔ کل اپنے ساتھ لوٹن کو لینا اور
ترکیب نمبر ۹ لگانا۔ ضرورت ہو تو اور بندے بھی ساتھ لے جانا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ چھوکرا
ایک نمبر حرامی لگتا ہے۔ لیکن بچ کر کہاں جائے گا۔"

"تمہارا حکم چاہیے شاہ جی! کہاں جائے گا نکل کے۔" نورا نے اسے اطمینان دلایا۔

مزید بات چیت نہ ہوئی۔ نورا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی نوشا بھی نکل آیا۔ مگر وہ
بہت ڈرا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر راجہ پر ترس آ رہا تھا۔ وہ بار بار سوچتا کہ یہ لوگ نہ جانے بے چارے کا
کیا حال کریں۔ خوف کے مارے اس نے نورا کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چپکے سے اپنے کمرے
میں چلا گیا۔

دوسرے روز کوئی آٹھ بجے رات کو شاہ جی نے اپنے کمرے سے نوشا کو آواز دی۔ وہ فوراً سہما
ہوا وہاں پہنچا۔ شاہ جی بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ "تو بھی کسی کام آئے گا۔ آ
ذرا میری پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ مکیاں تو لگا۔ وہ حرام کا جنا وُدلا نہ جانے کہاں مر گیا۔"

نوشا خاموشی سے جا کر پائینتی بیٹھ گیا اور پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ مکیاں لگانے لگا۔ شاہ جی
خاموش لیٹا رہا۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ اچانک باہر دروازے پر کار کے رکنے کی آواز ابھری۔ پھر
دھڑ سے کار کا دروازہ بند ہوا۔ کمرے کے باہر ملے جلے قدموں کی آواز ابھری۔

ذرا ہی دیر بعد نورا اور لوٹن کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے نرغے میں راجہ بھیگے ہوئے
چوہے کی طرح سہما ہوا نظر آیا۔ لوٹن نے راجہ کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرا اور
دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

آگ بگولا ہونا: سخت غصہ میں آنا۔ نرغہ: گھیرا۔

"لو شاہ جی۔ یہ رہا تمہارا مجرم۔"

شاہ جی اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ سامنے فرش پر اوندھے منہ پڑے ہوئے راجہ کو خونخوار ن
سے گھورنے لگا۔ پھر اس کی آواز گونجی۔

"زنانیوں کی طرح نخرا کیا دکھا رہا ہے۔ سیدھا کھڑا ہو۔"

راجہ خوف سے کانپتا ہوا اٹھا۔ مگر وہ پورے طور پر کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ شاہ جی نے ج
کر اس کے گال پر بھرپور تھپڑ مارا۔ راجہ ہائے کر کے زمین پر گر پڑا۔ شاہ جی نے اس کی کمر پ
ماری۔ پھر دوسری۔ کئی ٹھوکریں تابڑ توڑ راجہ کے جسم پر لگیں۔ وہ گیند کی طرح فرش پر لڑھک
اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

ہر ٹھوکر پر وہ چیختا۔ "ہائے مر گیا۔" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر شاہ جی کے سامنے جوڑ د
اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ شاہ جی گردن ہلا کر بولا۔ "ابھی سے۔" پھر وہ نورا
مخاطب ہوا۔

"کچھ مزا نہیں آیا۔ ذرا اس کا ٹین پاٹ تو بنا تاکہ اسے پتہ چل جائے کہ قسم کھا کر مکر ج
ہوتا ہے۔"

نورا لپک کر راجہ کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے چوڑے چوڑے بھدے ہاتھ سے را
گردن دبوچ کر جھکائی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگ پکڑ کر گردن کے اوپر چڑھا دی۔ راجہ بل
چیخا۔ "ارے مر گیا۔ ہائے مر گیا۔" نورا نے راجہ کی کنپٹی پر کہنی سے ضرب لگائی۔ فوراً اس کی
بند ہو گئی۔ نورا نے راجہ کی دوسری ٹانگ بھی اٹھا کر گردن پر چڑھا دی۔

راجہ ذرا دیر تک اس حالت میں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ ذ
ٹانگوں کی قینچی میں پھنسی ہوئی اس کی گردن سانپ کا پھن بن گئی تھی۔ راجہ اس عالم میں لمحہ بھر
ٹک کر بیٹھ نہ سکا۔ اس کا جسم کپکپایا اور وہ فرش پر منہ کے بل گرا۔ مگر اس طرح بھی چین نہ آیا
جاپانی کھلونے کی طرح ادھر ادھر جھولنے لگا۔ ہر بار وہ پہلو بدل کر بڑی دردناک آواز نکالتا۔

"ارے میری گردن ٹوٹی۔"

"ہائے میری ٹانگیں پھٹی جا رہی ہیں۔"

"اللہ کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں مر جاؤں گا۔"

"شاہ جی میری توبہ۔"

"شاہ جی، میں تمہارے قدموں پر پڑتا ہوں۔"

راجہ کی دل دوز چیخیں کمرے میں گونجتی رہیں۔ نوشا سہما ہوا سارا تماشا دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ آخر جب راجہ کی آواز بیٹھنے لگی اور وہ رک رک کر تھکے ہوئے خچر کی طرح منہ پھاڑ کر ہانپنے لگا تو شاہ جی نے کہا۔

"نورے کھول دے۔ ابھی کچا ہے۔"

نورا نے حکم پاتے ہی راجہ کو ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بے حال ہو کر وہیں پڑ گیا اور گہری گہری سانسیں بھر کر ہانپتا رہا۔ شاہ جی زور سے دھاڑا۔ "یہ پہلا کورس ہے۔ ابھی چھ اور ہیں اور سب سے آخری یہ ہے۔" اس نے تکیے کے نیچے سے یہ لمبا چاقو نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔ "ٹوٹے کر کے یہیں دبا دیتا ہوں۔ اس گھر کا آنگن اسی لیے کچا رکھا ہے تاکہ زمین کھودنے میں دشواری نہ ہو۔"

راجہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور خوف سے لرز کر گڑگڑانے لگا۔ "نہیں، نہیں۔" اس نے بڑی بے چارگی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور جا کر شاہ جی کے پیر پکڑ لیے۔ "اس دفعہ معاف کر دو۔ پھر غلطی کروں تو جان سے مار دینا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شاہ جی نے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا۔ گردن ہلا کر پوچھا۔

"آئندہ سب کام ٹھیک ہو گا؟"

راجہ قسمیں کھا کر یقین دلانے لگا۔ شاہ جی ڈپٹ کر بولا۔ "قسمیں تو نے پہلے بھی بہت کھائی تھیں۔ یاد رکھنا دوبارہ کوئی الٹ پھیر کی تو تیری یہاں لاش ہی نظر آئے گی۔ میں خطرناک بندے کو زندہ نہیں چھوڑا کرتا۔"

راجہ گردن جھکائے اس کی باتیں سنتا رہا۔ ابھی تک اس کی ٹانگیں قابو میں نہیں تھیں۔

شاہ جی نے مکھن کی دو ٹکیاں منگوا کر راجہ کو کھلائیں۔ چائے بھی پلائی۔ سگریٹ بھی سلگا کر دی۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو راجہ نے کوٹھی کے اندر کی ایک ایک تفصیل بتائی۔ شاہ جی کرید کرید کر ہر بات پوچھتا رہا۔ پھر یہ ہدایت دی کہ آئندہ نورا اس کے پاس نہیں جائے گا۔ وہ خود آ کر

دل دوز: دل پر اثر کرنے والی۔ کچا: ناتجربہ کار۔ بے چارگی: عاجزی۔ الٹ پھیر: مکر و فریب۔

رپورٹ دے گا۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے وہ نورا کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر
سوسائٹی کی طرف چلا گیا۔

(۳)

رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کوٹھی اونگھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف گہر
نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ سارے دروازے بند تھے۔ راجہ کمرے میں تنہا تھا۔ اس کے علاوہ
انجینئر کی بوڑھی ماں تھی۔ وہ سر شام ہی سو جاتی۔ اس وقت وہ نکڑ والے کمرے میں بے خبر سو
انجینئر اور اس کے بیوی بچے ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ آدھی رات سے پہلے ان
آنے کی توقع نہیں تھی۔ راجہ شام ہی کو یہ اطلاع شاہ جی کو پہنچا چکا تھا اور اب سہما ہوا بیٹھا تھ
پشت کمرے کے دروازے کی جانب تھی۔ ذرا سی آہٹ ہوتی۔ اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

رات سنسان ہو گئی۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ عین اس وق
کے باہر تین بار سیٹی بجنے کی آواز ابھری۔ یہ اس بات کا سگنل تھا کہ شاہ جی کے گرگے پہنچ گئے ہ
گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہی، پھر کوٹھی کے پچ
جہاں گھنے درخت تھے، خشک پتوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی رک رک کر چل رہا تھا۔

رات کے سناٹے میں یکایک پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ کھٹ، کھٹ۔ ہر آ
ساتھ راجہ کی ٹانگیں کانپ اٹھتیں۔ سانس رک رک کر چلتی۔ دروازے پر کئی بار آہٹ ہو
لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ دروازہ نہ کھولے۔ لیکن وہ اپنے اس ارادے پر قائم نہ رہ سکا
سے کمرے کے باہر آیا اور اس دروازے پر پہنچا جس پر آہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے جل
دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ کسی نے باہر سے دھکا دے کر دروازہ کھولا۔ دھندلی روشنی میں
خوفناک چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے کئی آدمی اور تھے۔ سب اندر آ گئے۔

شاہ جی نے ایک آدمی کی ڈیوٹی دروازے پر لگائی۔ چار کو اپنے ہمراہ لے کر راجہ کے
کمرے کے قریب پہنچا جس میں قیمتی سامان رکھا تھا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ شاہ جی نے بال

نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور جھٹ تالا کھول دیا۔ سب اندر چلے گئے۔ کمرے میں اندھیرا
۔ راجہ نے سوئچ دبا کر روشنی کر دی اور ان الماریوں اور بکسوں کی نشان دہی کرنے لگا جن میں
ورات اور نقدی تھی۔

آن کی آن میں بالم نے ہر الماری کا تالا کھول دیا۔ سارے بکسوں کے ڈھکنے اٹھا دیے گئے۔ شاہ
عین دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ وہ اس وقت کسی چٹان کی طرح پر شکوہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی
نکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر صرف ہاتھ اور آنکھوں کے
اروں سے اپنے گرگوں کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں کمرے کے اندر ہر طرف سامان ہی
امان بکھر گیا۔ کمرہ کسی کباڑیے کی دکان معلوم ہونے لگا۔

باہر خانساماں کی کھنکار سنائی دی۔ وہ رک رک کر کھانس رہا تھا۔ سب ٹھٹک کر جہاں تھے وہیں
گئے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ شاہ جی خونخوار نظروں سے سب کو گھورنے لگا۔ ان کے ہاتھ پھر بجلی
ی پھرتی سے چلنے لگے۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر وہ تمام قیمتی اشیاء نکال کر ایک بڑے سوٹ کیس میں بھر چکے تھے۔ دو
دمیوں نے اسے اٹھایا اور کمرے سے باہر آ گئے۔ سب سے آخر میں شاہ جی نکلا۔ راجہ بھی اس کے
اتھ ساتھ سہما ہوا چل رہا۔ پچھلے دروازے سے جب سب باہر چلے گئے تو وہ ٹھٹکا۔

شاہ جی نے دبی زبان سے کہا۔ "راجہ تجھے بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا ہے۔"

سب کوٹھی کے لان سے گزر کر باہر سڑک پر آ گئے۔ پھاٹک کے قریب ہی اندھیرے میں
اہ رنگ کی لمبی چوڑی ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس میں جلدی سے سوٹ کیس رکھا گیا۔ سب پھرتی سے
ر داخل ہو گئے۔

ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ وہ سنسان سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔

ٹیکسی شاہ جی کے مکان پر رکی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سوٹ کیس اندر بھیجا
ا اور شاہ جی سب کے ہمراہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

راجہ کو اس نے نوشا کے کمرے میں بھیج دیا۔

❁ ❁ ❁

ٹ: فوراً۔ آن کی آن میں: ذرا سی دیر میں۔ پر شکوہ: عظیم الشان، شان و شوکت والا۔

نوشا ابھی تک جاگ رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں لمحے بھر ایک دوسر
خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر نوشا نے آہستہ سے دریافت کیا۔

"تم آگئے؟"

"ہاں؟" راجہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

نوشا نے سادگی سے پوچھا۔ "اب تم کوٹھی پر واپس نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں۔" راجہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"یہ شاہ جی سے پوچھو۔"

راجہ سخت بیزار نظر آ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ فرش پر چت لیٹ گیا اور چھت کو تکنے لگا۔

"یار اب کیا ہوگا؟" نوشا نے اپنے تجسس کا اظہار کیا۔

"جو تقدیر میں لکھا ہے۔"

نوشا نے غور کیا۔ راجہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ہر بات کا اکھڑا اکھڑا جواب د
اس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک پڑے کروٹیں
رہے۔ دونوں میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

دوسرے ہی روز سے دونوں کی کڑی نگرانی شروع ہو گئی۔ شاہ جی ان کے کمرے میں خود آیا
ہدایت کی کہ کمرے کے اندر رہا کریں۔ نہ باہر نکلیں اور نہ اڈے کے کسی آدمی سے بات چیت
لیکن اس دفعہ خونخوار نظروں سے گھور کر بات کرنے کے بجائے وہ نرمی اور شفقت سے پیش آیا۔

اس کی یہ شفقت دونوں کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ اکثر ان کے کمرے میں آ جاتا
ان کے لیے پھل اور مٹھائیاں لاتا۔ کبھی سگرٹوں کے نئے نئے قسم کے پیکٹ۔ اس نے دونو
لیے کئی نئی قمیصیں اور کٹ پیس کی پتلونیں بھی بنوا دی تھیں۔ دل بہلانے کے لیے کیرم ب
تاش کی دو گڈیاں بھی منگوا دی تھیں۔

مگر اس قدر ناز برداری کے باوجود دونوں سہمے سہمے رہتے۔ ان کے چہرے زرد پڑ گئے
رخساروں کی ہڈیاں ابھرنے لگی تھیں۔

بے اعتنائی: بے پروائی۔ بیزار: خفا، ناراض۔ چت: پشت کے بل، بالکل سیدھا۔ ناز برداری: ناز اٹھانا، نخرے سے رہنا۔

شاہ جی بھی کم پریشان نہیں تھا۔ بات یہ تھی انجینئر کا ایک بھائی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ لہٰذا
اس واردات کے سلسلے میں سخت تفتیش ہو رہی تھی جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ پولیس کو
سب سے زیادہ تلاش راجہ کی تھی جس سے سارا سراغ مل سکتا تھا۔ شاہ جی کو اپنے مخبروں کے ذریعے
پولیس کی کارروائیوں کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں۔ ایسی صورت میں راجہ کی موجودگی اڈے پر
بے حد خطرناک تھی۔ روزانہ نت نئی اطلاع آتی۔ ہر اطلاع پر شاہ جی گہری فکر میں ڈوب جاتا۔

(۴)

یہ جولائی کی ایک گرم رات تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ گھٹن تھی۔ پہر رات گزری تو اڈے پر
ایک بردہ فروش آیا۔ وہ شاہ جی کا پرانا واقف کار تھا۔ پہلے بھی کئی بار سودا کر چکا تھا۔ شاہ جی نے اسے
دیکھا تو اس کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ اونچے قد کا باتونی آدمی تھا۔ پان بے حد کھاتا تھا اور جہاں جی
چاہتا وہیں پیک تھوک دیتا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے پان کھا کھا کر کمرے کا سارا فرش گندا کر دیا۔ یہ اس
کی پرانی عادت تھی۔

ایک بار شاہ جی نے جل کر اسے گالیاں بھی دی تھیں۔ اس لیے کہ گرمیوں میں وہ فرش پر
لیٹ کر مالش کراتا تھا۔ مگر اس وقت وہ بالکل مشتعل نہ ہوا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

وہ شخص لگ بھگ ڈیڑھ سال بعد شاہ جی سے ملا تھا اور اس تمام عرصے کی اپنی سرگزشت سنا
دینا چاہتا تھا۔

اس کی باتوں سے شاہ جی کو جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ صرف نوجوان عورتوں اور لڑکیوں
کو اٹھوانے اور ادھر ادھر کرنے کا دھندا کرتا تھا۔ یہ بات شاہ جی کو بھی کھٹکی۔ اس نے فوراً بات کاٹ
کر کہا۔ "چوہدری، میرے پاس دو چھوکرے ہیں۔ بہت سدھے ہوئے اور کام کے بندے ہیں۔"

وہ بے نیازی سے بولا۔ "میں نے تو جی یہ لین ہی چھوڑ دی۔ ایسے مال کی آج کل کھپت کم ہی
ہوتی ہے۔"

شاہ جی نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

مخبر: جاسوس۔ بردہ فروش: انسانوں کی تجارت کرنے والا۔ مشتعل ہونا: غصے میں آنا۔ سرگزشت: کہانی، داستان۔ کھپت: مانگ۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس شخص نے کہا۔ "یاد آیا، سکھر سے اس طرح کا ایک ا
آیا تھا۔ کیوں جی یتیم خانے میں چل سکیں گے؟"

شاہ جی فوراً بولا۔ "یہ مت پوچھ چوہدری! دونوں آفت ہیں آفت۔ تو یتیم خانے کی بات
ہے۔ وہ تو سکہ سازی اور جعلی کرنسی تک میں بڑوں بڑوں کے کان کاٹ لیں گے۔ خرکاروں کے
بھی چل سکتے ہیں۔"

وہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑ کر بولا۔ "کہاں سے ہاتھ لگ گئے؟"

"ٹریننگ دی ہے۔ رقم خرچ کی ہے۔"

اس نے دریافت کیا۔ "کیا لو گے ان کا؟"

"تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پورے تین ہزار میں خریدے تھے۔ پر اب پانچ ہزار سے
میں مال نہیں اٹھے گا۔"

"یہ تو زیادہ ہے۔ ویسے یہ سمجھ لے، میں نے ان سے کچھ نہیں لینا۔"

"چل تیرے لیے کچھ کم کر دوں گا۔"

شاہ جی تو خدا سے چاہتا تھا کہ دونوں کسی طرح کراچی سے باہر چلے جائیں۔ لہٰذا تھوڑی
حجت کے بعد چار ہزار میں سودا ہو گیا۔

چوہدری نے اسی وقت پانچ سو بیعانہ بھی دے دیا۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے روز وہ پوری رقم
کر دے گا اور رات گئے دونوں کو اپنے ہمراہ لے جائے گا۔

❀ ❀ ❀

رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔

نوشا اور راجہ سوئے نہیں تھے۔ دونوں بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ راجہ نے بڑ
سے کہا۔ "یار بہت برے پھنس گئے۔"

"ہاں یار سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ خدا قسم اب تو بہت جی گھبراتا ہے۔"

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ "یہاں سے اب نکلنے کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔"

"ابے ایسی بات مت کر، جان سے مارا جائے گا۔"

کان کاٹنا: بازی لے جانا۔ خرکار: انسانوں کو اغوا کر کے مفت کام لینے والے۔ بیعانہ: وہ ابتدائی رقم جو سودا کرتے وقت دی جاتی ہے۔

"جان سے تو یوں بھی مارے جائیں گے۔"

نوشا خوف سے لرز کر بولا۔ "کیوں؟"

"تجھے پتہ ہے کہ ہم دونوں پر اتنی پابندی کیوں لگائی گئی ہے؟"

"یار مجھے کیا معلوم؟"

وہ جل کر بولا۔ "ابے تو یونہی رہا۔ اس لیے کہ سالے پکڑے نہ جائیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی تو شاہ جی کمرے سے بھی باہر نکلنے نہیں دیتا۔"

"یار اسی لیے تو ڈر لگتا ہے کہ سالا ہم دونوں کو قتل نہ کر دے تاکہ کسی کو پتہ بھی نہ لگے۔ ان
بدمعاشوں کو تو کیا جانے۔ ایک نمبر حرامی ہوتے ہیں۔"

نوشا بے حد ڈر گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "یار تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شاہ جی بڑا ظالم ہے۔"

راجہ بولا۔ "میرا کہنا مان تو جان بچ سکتی ہے۔"

"یار میں نے تیری اب تک کون سی بات نہیں مانی۔"

"بس ذرا ہمت کی بات ہے۔ سالوں کو صفا غچا دے جاؤں گا۔"

"ڈر لگ رہا ہے۔" نوشا نے دبی زبان سے کہا۔

راجہ نے اسے ڈانٹا۔ "دیکھ یار تو زنخا پن مت کر۔ لگ گیا موقع تو آج ہی نکل جائیں گے۔"

"آج؟" نوشا نے پوچھا۔ راجہ اطمینان سے بولا۔ "یہ سب تو مجھ پر چھوڑ دے۔"

اسی وقت کمرے کے باہر شاہ جی کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر شاہ جی
اندر نہیں آیا۔ کسی سے ذرا دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر واپس چلا گیا۔ دونوں دم سادھے پڑے رہے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ بہت دیر بعد جب محلے پر قبرستان کی سی خاموشی
چھا گئی تو راجہ اٹھ کر دروازے پر آیا۔ اس نے کواڑ کی اوٹ سے جھک کر باہر دیکھا۔ سامنے دالان میں نورا
بے خبر سو رہا تھا۔ البتہ بیرونی دروازے پر چوکیدار کی کھانسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔

پہلے راجہ کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے نوشا تھا۔ دونوں نے دبے قدموں چل کر
صحن عبور کیا۔ دالان میں پہنچے نورا ان کے قریب ہی لیٹا تھا۔ وہ جھکے جھکے اس کے قریب سے گزرے
اور چھت پر جانے والے زینے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

صفا: صاف۔ غچا: دھوکا، فریب۔ زنخا پن: مراد بزدلی۔

دونوں لمحہ بھر کھڑے کانپتے رہے۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ راجہ نے ہمت
کام لیا۔ پنجوں کے بل اٹھ کر زینے کی چٹخنی کھولنے کی کوشش کی۔ مگر گھبراہٹ میں ہاتھ بے
گہری خاموشی میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ دونوں کا دم نکل کر رہ گیا۔ اسی وقت نورا نے کروٹ بدلی
اپنی پیٹھ کھجانے لگا۔

جب نورا خراٹے بھرنے لگا تو راجہ پنجوں کے بل پھر اٹھا۔ اس دفعہ اس نے چٹخنی کھول
آہستہ سے ایک پٹ کھولا۔ دروازہ چرچرایا۔ راجہ نے دل ہی دل میں دروازے کو گندی سی گالی
دونوں زینے میں داخل ہوئے اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر پہنچ گئے۔

دور تک چٹیل چھت پھیلی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھا
تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے، پھر راجہ نے نوشا
اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ گئے جس میں لگا ہوا
دیوار کے ساتھ ساتھ نیچے گلی میں چلا گیا تھا۔ راجہ نے پائپ ہاتھ سے پکڑ کر ہلایا۔ پائپ مضبو
سے لگا تھا۔

راجہ پائپ کے سہارے پھسلتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے گلی میں اتر گیا۔ نوشا منڈیر پر جھکا ہوا
رہا۔ جب راجہ تاریکی میں غائب ہو گیا تو نوشا نے پائپ پکڑا اور نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگا
اس کے پیر ڈگمگانے لگے۔ وہ منڈیر سے چمٹ گیا۔ نیچے راجہ شی شی کر رہا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ
کہ وہ جلدی سے اتر آئے۔ مگر نوشا جھجک رہا تھا۔ اتنے میں نیچے گلی سے راجہ کی آواز ابھری۔

"ابے اتر، نہیں تو میں چلا۔"

نوشا نے بدحواس ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور پائپ پر پھسل پڑا۔ نیچے راجہ کھڑا تھا۔ اس
فوراً سنبھال لیا ورنہ وہ منہ کے بل زمین پر گرتا۔ راجہ نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ خوشی سے بولا۔

"شاباش میرے شیر۔ بس اب بن گیا کام۔"

دونوں اندھیری گلی میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ انہوں نے گلی عبور کی۔ آگے میدان
دوسری طرف سڑک تھی جس پر ایک کار تیز روشنی بکھیرتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ وہ اسی سمت
دیے۔ لیکن جیسے ہی میدان میں آئے نہ جانے کہاں سے کتوں کا غول نکلا اور ان کے سامنے آ

بے تکا: غلط۔ منڈیر: کنارا۔ ڈگمگانا: لرزنا۔

کتے بھونکتے ہوئے ان پر جھپٹے۔
دونوں نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کر دیا۔

(۵)

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ رات دم بخود کھڑی تھی۔

راجہ اور نوشا ایک شکستہ دیوار کی اوٹ میں دبکے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ اب وہ شاہ جی کے اڈے سے بہت دور آ چکے تھے۔ دونوں خوف سے سہمے ہوئے سوچ رہے تھے کہ رات کہاں گزاری جائے۔ نہ ان کا کوئی شناسا تھا اور نہ ہی شہر کے راستوں سے آشنا تھے۔ شاہ جی کے اڈے سے فرار ہو کر جس طرف منہ اٹھا اسی طرف چل دیے۔ اگر کتے ان کو نہ دوڑاتے تو کسی اور سمت نکل جاتے۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ ان کے سامنے گدڑی کے اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ تھا جو اندھیرے میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ جس سڑک پر چل کر وہ یہاں تک پہنچے تھے وہ ان ٹیلوں کے دامن میں اژدھے کی طرح بل کھاتی چلی گئی تھی اور ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ اسی اثنا میں سامنے سے آنے والی ایک کار کی روشنی ابھری۔ انہوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ ذرا دیر میں کار ان کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کی تیز روشنی میں وہ دور سے صاف نظر آ رہے تھے۔ کسی نامعلوم خوف سے دونوں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار کی طرف منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔

کار کی رفتار ان کے قریب پہنچتے پہنچتے سست پڑ گئی۔ پھر بریک لگنے کی آواز ابھری۔ دونوں کے جسم لرز کر رہ گئے مگر کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ کوئی ان کے قریب نہ آیا۔ کار جس رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے سنسان سڑک پر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جب کار دور نکل گئی تو جان میں جان آئی۔

نوشا نے کہا۔ "ابے یہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔ کسی اور طرف چلیں راہ گیروں سے اسٹیشن کا راستہ معلوم کریں۔ رات وہیں اچھی گزر سکتی ہے۔ گھر جانے کے لیے ریل گاڑی بھی مل جائے گی۔"

ہو کا عالم: ہر سو مکمل خاموشی اور ویرانی۔ شناسا: جاننے والا۔ آشنا: واقف۔

راجہ اسے گھورنے لگا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "سالے کچھ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ گھاس تو کھا گیا۔ تو ضرور پکڑا جائے گا اور تیرے سنگ میری گردن بھی پھنسے گی۔"

نوشا نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیوں؟"

"ابے تو شاہ جی کو الو کا پٹھا سمجھتا ہے۔ وہ نورے اور لوٹن کو سب سے پہلے اسٹیشن پہ پولیس الگ اپنی تلاش میں ہے۔"

نوشا حیرت سے منہ پھاڑ کر بولا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔"

"تو ابھی لونڈا ہے۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"یار تو بہت پہنچا ہوا نکلا۔ لیکن اب یہ تو بتا کہ اس وقت جائیں کہاں؟"

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ "ابے یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

دونوں خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنے دل مضبوط کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ان کے ایک طرف فوجی بیرکیں تھیں۔ دو طرف بنجر اور اجاڑ ٹیلے تھے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

انہوں نے میل بھر سے کچھ کم ہی راستہ طے کیا ہوگا کہ دور سے ریلوے لائن دکھائی ریلوے لائن کے اس پار کچھ فاصلے پر روشنی نظر آئی۔ انہوں نے اپنی رفتار کسی قدر تیز کر ریلوے لائن عبور کی اور روشنی کی سمت بڑھنے لگے۔ قریب جا کر دیکھا۔ یہ ایک خانقاہ تھی جو احاطے میں گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ایک اونچے درخت پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے اندر تیز روشنی تھی۔ لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

دونوں درختوں کے نیچے سے گزر کر خانقاہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ خانقاہ کے سامنے وسیع جس کے ایک رخ پر حجرے اور دالان تھے۔ صحنچیاں تھیں۔ اونچے گنبد کے نیچے مزار تھا ڈھیروں ہار پھول بکھرے ہوئے تھے۔ مزار کے چاروں طرف دیواروں میں طاق تھے جن پر چراغ رہے تھے۔ مزار کے قریب دو آدمی سجدے میں پڑے تھے اور کچھ آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے مزار سے متصل کشادہ حجرہ تھا۔ حجرے میں گیس بتی روشن تھی۔ فرش پر اجلی چاندنی

سنگ: ساتھ، ہمراہ۔ بنجر: ناقابلِ کاشت زمین۔ خانقاہ: کسی بزرگ کا مزار۔ صحنچی: وہ چھوٹا صحن جو دالان کے پہلو میں بناتے ہیں، جڑے ہوئے۔ اجلی چاندنی: صاف ستھری سفید چادر۔

مسند پر ایک بوڑھا شخص دو زانوں بیٹھا تھا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ سر پر عمامہ تھا ہاتھ میں بڑے بڑے دانوں کی تسبیح تھی۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وضع قطع سے خانقاہ کا سجادہ نشین یا متولی نظر آتا تھا۔ اس کے روبرو کچھ لوگ عقیدت سے سر جھکائے مراقبے میں بیٹھے تھے۔

راجہ اور نوشا دور کھڑے حجرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک سمت سے شور بلند ہوا۔

"یا سائیں بابا۔ ہو حق اللہ!"

دونوں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا۔ ایک صحنچی میں کچھ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ دونوں اسی طرف چل دیئے۔ وہاں روشنی کم تھی۔ وہ خاموشی سے حلقے میں شامل ہو گئے۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ "کہاں سے آئے ہیں؟" ان میں ملنگ تھے۔ قلندر تھے اور ایسے ہی دوسرے لوگ تھے۔ کچھ نیم برہنہ تھے۔ کچھ بوسیدہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ جسموں سے پسینے کی بو اٹھتی تھی۔ لمبے لمبے گندے چیکٹ بال اور کالے کالے چہروں پر سرخ سرخ آنکھیں۔ وہ گلوں میں مونگوں کے منکے اور ہاتھوں میں کڑے پہنے ہوئے تھے۔ ایک ملنگ کے ہاتھ میں لمبی چلم تھی۔ اس نے چلم پر دم لگایا۔ سرخ شعلہ لہرایا۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور چلم برابر بیٹھے ہوئے ملنگ کی جانب بڑھا دی۔

چلم اسی طرح ایک دوسرے سے ہوتی ہوئی راجہ تک پہنچی۔ اسے لیتے ہوئے وہ جھجکا۔ اس شخص نے، جس کے ہاتھ میں چلم تھی، راجہ کو اپنی لال لال آنکھوں سے گھورا۔ اونچی آواز سے گرج کر نعرہ لگایا۔ "یا سائیں بابا۔" اس نعرے سے راجہ ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے چلم پر کش لگایا۔ اس کا کلیجہ تک سلگ گیا۔ سانس حلق میں گھٹنے لگی۔ اس نے کھانستے ہوئے چلم فوراً نوشا کی طرف بڑھا دی۔

نوشا نے بغیر سوچے سمجھے چلم پر دم لگایا اور جلدی سے چلم آگے بڑھا دی۔

سلفے پر دم لگانے سے دونوں کے کلیجے جلنے لگے تھے۔ حلق خشک پڑ گئے۔ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا جسم بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا، دونوں بے اختیار جھوم اٹھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے پردے لہرانے لگے۔ جسم رفتہ رفتہ بے قابو ہوتے جا رہے تھے۔ چرس کا نشہ اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ دونوں خاموش بیٹھے جھومتے رہے۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو گئے۔

مسند: تخت۔ عمامہ: پگڑی۔ سجادہ نشین: کسی بزرگ یا پیر کا جانشین۔ متولی: منتظم، نگران۔ مراقبہ: سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کے دھیان میں بیٹھنا۔ سلفے پر دم لگانا: چرس پینا، نشہ کرنا۔

غنودگی بڑھنے لگی۔

دونوں وہیں ایک طرف لڑھک کر گہری نیند سو گئے۔

❁ ❁ ❁

دن چڑھے تک دونوں سوتے رہے۔ باہر دھوپ پھیل چکی تھی۔ اچانک کسی نے راجہ کی ٹا[ng]
کھینچ کر زور سے جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا بڑے بڑے بالوں والا ایک نیم برہنہ ملنگ اُ[س پر]
جھکا ہوا کھڑا ہے۔ وہ ڈپٹ کر بولا۔

"لنگر بٹ جائے گا۔ جاؤ جلدی سے جا کر لے آؤ۔"

وہ اپنے ہاتھوں کے کڑے بجاتا آگے بڑھ گیا۔ راجہ نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو ہاتھ سے ملا اور انگڑائی لے کر کسل مندی دور کرنے لگا۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ گلا خشک تھا۔ ہاتھ ٹوٹ رہے تھے۔ جب وہ گردوپیش کے ماحول سے کسی قدر مانوس ہو گیا تو اس نے پاس لیٹے ہو[ئے] نوشا کو جگایا۔ جواب تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بھی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں کو تیز پیاس لگی تھی۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کہاں جا کر پانی پئیں اسی اثنا میں وہ ملنگ پھر واپس آ گیا جس [نے] راجہ کو جگایا تھا۔ "تو ابھی تک لنگر لینے نہیں گیا۔" وہ برہم ہو کر چیخا۔

راجہ نے پوچھا۔ "کہاں سے؟"

"اوئے تجھے پتہ نہیں۔ یہ زندہ پیر کا مزار ہے۔ یہاں سب کو لنگر ملتا ہے۔ وہ رہا لنگر خانہ۔" اس نے اس طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا جہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔

ملنگ ایک طرف چلا گیا۔ راجہ اور نوشا اٹھ کر لنگر خانے کی جانب بڑھے۔ لنگر خانے [کے] سامنے کنگلوں اور ملنگوں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف دھکم پیل مچی تھی۔ لنگر لینے والے زور زور سے [چیخ] رہے تھے۔ گالیاں دے رہے تھے۔ کتوں کی طرح لڑنے کے لیے جھپٹتے تھے۔ ہجوم کے سامنے ا[یک] چبوترے پر دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ڈھیر سی تنوری روٹیاں دبی تھیں۔ دوسرا ا[یک بڑی] سی بالٹی لٹکائے کھڑا تھا۔ وہ بالٹی میں ڈونگا ڈال کر دال نکالتا اور سامنے پھیلے ہوئے ٹین کے ڈبوں[،] المونیم یا مٹی کے میلے میلے پیالوں میں ڈالتا جاتا۔ کنگلے لنگر لینے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور لنگر تقسیم کرنے والے ان کو نفرت سے جھڑک رہے تھے۔

لنگر بٹنا: غربا میں مفت کھانا تقسیم ہونا۔ کسل مندی: سستی۔ دھکم پیل: رش میں دھکے لگنا۔

"خنزیرو! پیچھے ہٹو۔"

"تو دوبارہ آیا ہے۔ او خانہ خراب! پیچھے ہٹ۔"

"شور مت مچا۔ او تیرا بیڑہ غرق۔"

نیم برہنہ جسموں والے کنگلے اور ملنگ گالیاں سن رہے تھے۔ بندروں کی طرح دانت نکالے بے غیرتی سے ہنس رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ راجہ اور نوشا سہمے ہوئے ان کو دیکھتے رہے۔ آخر راجہ نے نوشا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں بھیڑ میں گھس گئے۔ انہوں نے دھکے کھائے۔ گالیاں سنیں۔ مگر ڈٹے رہے۔ ان کو بھی دو دو روٹیاں مل گئیں۔ ان کے پاس برتن نہیں تھے۔ لہٰذا دال روٹیوں پر ہی ڈال دی گئی۔

لنگر لے کر دونوں ایک درخت کے نیچے پہنچے۔ وہاں دو ملنگ پہلے ہی سے موجود تھے اور ہبڑ ہبڑ لنگر کی دال روٹی کھا رہے تھے۔ قریب ہی ایک مرد قلندر دھوپ میں بیٹھا اپنے لمبے لمبے بالوں سے جوئیں نکال نکال کر مار رہا تھا۔ نوشا نے اسے دیکھا تو جی متلانے لگا۔

"چل یار کہیں اور چل۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑ کر راجہ سے کہا۔

راجہ نے اسے جھڑک دیا۔ "ابے یہ نخرے چھوڑ۔ بھوک کے مارے اپنا دم نکلا جا رہا ہے۔"

وہ زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ نوشا کو بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ دونوں گردن جھکا کر دال روٹی کھانے لگے۔ روٹیاں ٹھنڈی تھیں مگر چنے کی دال گرم تھی۔ دال میں مرچیں زیادہ تھیں اور پتلی بھی تھی۔ دونوں کے منہ میں جیسے آگ لگ گئی۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور کنوئیں کی طرف بھاگے جس کی منڈیر کے پاس ہی بڑے بڑے مٹی کے مٹکے ایک پختہ چبوترے پر رکھے تھے۔

دونوں نے المونیم کے گندے اور بدوضع گلاسوں میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ پی گئے۔ پانی پینے کے بعد وہ بھاری بھاری پیٹوں کے ساتھ ایک صحنچی کی جانب بڑھے۔ اندر گئے اور ایک گوشے میں خاموشی سے لیٹ گئے۔ صحنچی میں ان کی طرح اور بھی کتنے ہی بے فکرے اور ملنگ فرش پر لیٹے اونگھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔

دونوں کچھ دیر تک خانقاہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے، پھر آنکھیں بند کر کے سو گئے۔ تمام دوپہر وہ بے خبر سوتے رہے۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے ان کی آنکھ کھل گئی۔ اب زندہ پیر کے

ہبڑ ہبڑ: جلدی جلدی۔ جی متلانا: قے / الٹی آنے کی کیفیت ہونا۔ پھسکڑا مار کر بیٹھنا: آلتی پالتی مار کر / بے تکلف ہو کر بیٹھنا۔

مزار پر چہل پہل بڑھ گئی تھی۔

ہر طرف گیس بتیوں کی روشنی پھیل گئی۔ عقیدت مندوں کی آمد و رفت میں بھی اض
ہو گیا۔ سفید ڈاڑھی والے سجادہ نشین مزار کے سرہانے بیٹھے تھے اور اشاروں سے مجاوروں کو احکا
دے رہے تھے۔ عقیدت مند اور زائرین آتے۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔ دونوں ہاتھوں پر ر
رکھ کر نذرانہ پیش کرتے اور الٹے قدموں لوٹ کر مزار کے پاس ہی ایک طرف بیٹھ جاتے۔

قریب ہی صحنچی میں قلندروں اور درویشوں کی محفل جمنے لگی تھی۔ وہ چلم پر لمبے لمبے ک
لگا رہے تھے اور سرخوشی کے عالم میں طرح طرح کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ناگاہ ایک سب ا
پولیس چار کانسٹیبلوں کے ہمراہ مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ پہلے وہ سجادہ نشین کے پاس گیا۔ ا
سے آہستہ آہستہ کچھ دیر بات چیت کی پھر کانسٹیبلوں کے ساتھ حجروں، دالانوں اور صحنچیوں کی تلا
لینے لگا۔

پولیس والے جب راجہ اور نوشا کے قریب آئے تو ان کے چہرے خوف سے زرد پڑ گ
انہوں نے ذبح ہونے والے مویشیوں کی طرح اپنی گردنیں لٹکا لیں اور آنے والی مصیبت کا دھڑ
دلوں سے انتظار کرنے لگے۔ مگر مصیبت ان کے سر سے صاف ٹل گئی۔ پولیس والے چپ چاپ ا
کے پاس سے گزر گئے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے دیکھا چرسیوں کے غول میں سے کانسٹیبلوں نے ایک
دبلے پتلے ملنگ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے گرفتار کر لیا۔

خانقاہ میں سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں کے لیے کھلبلی مچی۔ ذرا دیر خاموشی رہی اور جب پولیس
والے اس ملنگ کو حراست میں لے کر احاطے سے باہر چلے گئے تو درویشوں اور قلندروں نے سلفے
دم لگایا۔ چلم کے اوپر شعلہ لہرایا۔ ہر طرف سے نعرہ بلند ہوا۔

"یا سائیں بابا۔"

"ہو۔ حق اللہ۔"

خانقاہ کی زندگی میں یہ غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ البتہ راجہ اور نوشا ابھی تک سہمے ہو
تھے۔ پولیس والوں کے قدموں کی آواز جب دور ہو گئی تو نوشا نے کہا۔

"یار راجہ، یہ جگہ تو بہت خطرناک ہے۔ اللہ نے بال بال بچا لیا۔"

"ہاں یار یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

"مگر اب جائیں کہاں؟" نوشا نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

راجہ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "یار میری سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے، مگر تو مانے گا نہیں۔"

"مانوں گا کیوں نہیں۔ کچھ بتا تو۔"

راجہ سر کے بال کریدتے ہوئے بولا۔ "میرا تو جی چاہتا ہے کہ بی بی جی کے پاس جا کر ان کے پیر پکڑ لوں۔ ان کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں۔ میں تو دوپہر سے یہی سوچ رہا ہوں۔"

"مگر یار شاہ جی سے دشمنی مول لینی پڑے گی۔ وہ ہم دونوں کو قتل کروا دے گا۔ بڑا خطرناک آدمی ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "یہی تو مجھے بھی ڈر ہے۔ مگر جب پولیس اس کو پکڑ لے گی تو پھر وہ ہمارا کیا بگاڑے گا۔"

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ رات کا اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔

خانقاہ کی رونق شباب پر تھی۔ جمعرات کا دن تھا۔ زائرین اور عقیدت مندوں کا خوب ہجوم تھا۔

نوشا اور راجہ بہت سوچ بچار کے بعد آخر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ خانقاہ چھوڑ دینا چاہیے اور انجینئر کی کوٹھی پر جا کر بی بی جی کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ یہ منصوبہ بنا کر راجہ نے ایک شخص سے ہاؤسنگ سوسائٹی کا راستہ پوچھا اور دونوں خانقاہ سے باہر آ گئے۔ انہوں نے کالا پل عبور کیا۔ ڈرگ روڈ پر پہنچے اور ہاؤسنگ سوسائٹی کی جانب روانہ ہو گئے۔

❁ ❁ ❁

راجہ اور نوشا انجینئر کی کوٹھی پر پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے۔ انہوں نے پیدل کئی میل کا راستہ طے کیا تھا۔ تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ راجہ وہاں آ تو گیا مگر جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ آخر کار وہ ڈرتے ڈرتے پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ نوشا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لان عبور کر کے جیسے ہی وہ روشنی میں آیا۔ نہ جانے اس وقت کہاں سے اکو اور للی نکل آئے۔ راجہ کو دیکھ کر انہوں نے چیخنا شروع کر دیا۔

"راجہ آ گیا۔ راجہ آ گیا۔"

دونوں بچے آ کر اس سے چمٹ گئے۔ شور سن کر بی بی جی بھی آ گئیں۔ انہوں نے راجہ اور نوشا

تزئین: قمر شباب: عروج۔

کو دیکھا تو حیرت سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ ان کے پاس گئیں۔ لیکن فوراً ہی کسی نامعلوم خوف س
گھبرا کر جلدی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ راجہ اور نوشا سر جھکائے ان کے سامنے گنہگاروں کی طر
کھڑے تھے۔ بی بی جی دونوں کو غصے سے گھور رہی تھیں۔ اسی وقت انجینئر کی کار آ گئی۔ وہ دروازہ کھ
کر باہر نکلا اور بیگم سے مخاطب ہوا۔ "تم یہاں کھڑی ہو۔" اچانک اس کی نظر راجہ پر پڑی۔ حیرت ز
ہو کر بولا۔

"ارے راجہ۔"

وہ لمحہ بھر تک کچھ سوچتا رہا پھر دونوں کو اپنے ہمراہ کوٹھی کے اندر لے گیا۔ ان کو ایک کمر
میں بٹھایا۔ بیوی کو نگرانی پر مقرر کیا۔ پولیس کو ٹیلیفون کیا اور دونوں کی آمد سے مطلع کر دیا۔

کمرے میں پہنچ کر راجہ نے بی بی جی کے پیروں کو پکڑ لیا۔ گڑگڑا کر رونے لگا۔ "بی بی جی!
معاف کر دو۔ اللہ قسم میری ذرا بھی غلطی نہیں۔"

اس نے رو رو کر شاہ جی اور اس کے گروہ کا حال بتایا۔ اپنی مجبوری بیان کی۔ وہ خاموشی
ساری باتیں سنتی رہی۔ اسے حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر متاثر بھی ہوئی۔ مگر اسے سب سے ز
فکر اپنے قیمتی زیورات اور سامان کی تھی۔ اس نے جل کر دل ہی دل میں کہا۔ دونوں بھاڑ میں جا
پہلے چوری کا مال ملنا چاہیے۔

اسے خاموش پا کر راجہ نے کہا۔ "بی بی جی! سچ کہتا ہوں، میرا تو جی چاہتا ہے زندگی بھر
رہوں۔ آپ ہم دونوں کو پولیس سے بچا لیجئے۔"

"اللہ قسم، ہمارا بالکل قصور نہیں۔" نوشا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

وہ "اچھا، اچھا" کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ذرا دیر بعد راجہ کو پیشاب آنے لگا۔ اس
کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھنکا۔ پریشان ہو کر نوشا سے کہا۔

"لگتا ہے یار چوٹ ہو گئی۔"

نوشا نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "کیا ہو گیا؟"

"کمرہ باہر سے بند ہے۔"

"کیوں؟" نوشا اور گھبرا گیا۔

بھاڑ میں جائیں: مراد خواہ تباہ و برباد ہو جائیں۔ چوٹ ہونا: دھوکا ہونا۔

راجہ اس کے سوال کا جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ دفعتہً کمرے کا دروازہ کھلا۔ پولیس والے اپنے بھاری بھاری بوٹ پختہ فرش پر بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ راجہ اور نوشا دم بخود رہ گئے۔ پولیس والوں نے دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ انہیں تھانے لے گئے۔ مار پیٹ اور دھونس دھمکی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ دونوں نے اپنے بیان میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش بھی کی۔ روئے، گڑگڑائے مگر انہیں حوالات میں ڈال دیا گیا۔

اسی رات شاہ جی کے اڈے پر چھاپہ مارنے کی غرض سے پولیس کی مسلح پارٹی روانہ کر دی گئی۔ شاہ جی کو اپنے گرگوں کے ذریعہ راجہ اور نوشا کی گرفتاری کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ پولیس پارٹی جب شاہ جی کے اڈے پر پہنچی تو وہاں صرف چوکیدار موجود تھا۔ پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔

پوچھ گچھ کرنے پر چوکیدار سے معلوم ہوا کہ شاہ جی اور اس کے ساتھی گھنٹہ بھر پہلے گھر سے نکل گئے تھے اور یہ کہہ کر گئے تھے کہ صبح کو واپس آ جائیں گے۔

شاہ جی کے گھر کی نگرانی شروع کر دی گئی۔

شہر کے ہر تھانے اور چوکی کو مطلع کر دیا گیا۔ وائرلیس کے ذریعہ حیدر آباد اور ٹھٹھہ کے تمام تھانوں کو بھی خبردار کر دیا گیا۔ پولیس کا اندازہ تھا کہ چند گھنٹوں میں شاہ جی اور اس کے ساتھی زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ کسی ریل گاڑی کے جانے کا وقت نہیں تھا۔ شاہ جی صرف کار کے ذریعہ فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔

راجہ اور نوشا حوالات کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ راجہ گم صم تھا۔ مگر نوشا برہم تھا وہ راجہ کو خونخوار نظروں سے دیکھتا جس نے اپنے ساتھ اسے بھی مصیبت میں پھنسوا دیا تھا۔

⊛ ⊛ ⊛

تھانے میں ایس ایچ او کے کمرے سے بار بار بولنے اور باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس چونکہ ذاتی طور پر کیس میں دلچسپی لے رہا تھا، لہٰذا تھانے کا پورا عملہ زبردست مستعدی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ایس ایچ او ٹیلی فون کے پاس بیٹھا تھا۔ چائے پی رہا تھا۔ سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔

رات تاریک ہوتی جارہی تھی۔ تھانے میں گہرا سناٹا تھا۔ کبھی کبھار فرش پر کانسٹیبلوں کے
بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ابھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

رات کے دو بجنے والے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی۔ انسپکٹر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری
طرف سے اطلاع ملی کہ ٹھٹھہ میں شاہ جی کے حلیے کا ایک شخص پانچ افراد کے ہمراہ مشتبہ حالت میں
گرفتار کرلیا گیا۔ وہ دو بڑی ٹیکسیوں کے ذریعے سفر کررہے تھے۔ انسپکٹر نے جواب میں ہدایت دی کہ
انہیں فوراً کراچی پہنچادیا جائے۔

صبح کاذب کے دھندلکے میں شاہ جی، نورے، لوٹن اور دلا کو دو اور مشتبہ افراد کے ساتھ
پولیس کی حراست میں تھانے لایا گیا۔ مگر انہیں تھانے کی حوالات میں بند کرنے سے قبل راجہ اور
نوشا کو ریمانڈ ہوم پہنچادیا تھا۔

شاہ جی اور اس کے ساتھیوں نے کئی روز تک پولیس کو اپنے جرائم کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔
ہر الزام سے انکار کیا۔

وہ کئی بار کے سزا یافتہ اور بڑے گھاگ جرائم پیشہ تھے۔ مگر جب طرح طرح سے زدوکوب
کیا گیا تو ان کے اعصاب نے جواب دے دیا۔ انہوں نے سب کچھ اگل دیا۔ ان کی نشاندہی پر چوری کا
مال بھی برآمد کرلیا گیا۔

پولیس نے بیانات قلم بند کرنے کے بعد عدالت میں ان کے خلاف چالان پیش کردیا۔ انہیں
حوالات سے عدالت کے ریمانڈ پر سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

شاہ جی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں ڈاکہ زنی اور بردہ فروشی
کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ راجہ اور نوشا کو وعدہ معاف گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا گیا۔
چار مہینے تک مقدمہ چلتا رہا۔ پیشیاں پڑتی رہیں۔ مقدمے کی سماعت ہوتی رہی۔ شاہ جی کے وکیل نے
اسے اور اس کے ساتھیوں کو بری کرانے کی بہت کوشش کی۔ اپنے موقف کی تائید میں دلائل کے
ساتھ ساتھ گواہ بھی پیش کیے۔

شاہ جی اور اس کے ساتھی ان بیانات سے منحرف بھی ہوگئے جو انہوں نے پولیس کے روبرو
دیئے تھے۔

مشتبہ: مشکوک۔ گھاگ: تجربہ کار۔ منحرف ہوگئے: پھر گئے، مکر گئے۔

چوری کا مال پہلے ہی برآمد ہوچکا تھا۔ سارے ثبوت بھی موجود تھے۔ شاہ جی اور اس کے
ساتھیوں کو ڈاکہ زنی اور دوسرے جرائم کی پاداش میں چار چار سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ شاہ جی
کے وکیل نے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی۔ مگر اپیل خارج ہوگئی۔ ماتحت عدالت کی سزا بحال
رکھی گئی۔

راجہ اور نوشا کو اعانت جرم کی پاداش میں سال، سال بھر کی سزا ہوئی۔ دونوں کو ریمانڈ ہوم
سے بورسٹل جیل میں منتقل کردیا گیا۔ یہ جیل نوعمر اور نابالغ مجرموں کے لیے مخصوص تھی۔

اعانت: مدد۔ پاداش: نتیجہ، عوض۔

فصل ششم

(۱)

شادی کے چند ہی روز بعد نیاز، دکان کی کوٹھری سے اپنا سامان اٹھا کر نوشا کے گھر میں ہو گیا۔ اس نے مکان کی مرمت کرائی۔ اپنی رہائش کے لیے علیحدہ کمرہ بنوایا۔ دیواروں پر از سر نو کرایا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر روغن پھروایا۔ وہ مکان جو کبھی کھنڈر کی طرح شکستہ اور بوسیدہ آتا تھا، اب دلہن کی طرح سجا ہوا لگتا تھا۔

سلطانہ کے ساتھ اس کا رویہ بہت سنبھلا ہوا تھا۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتا۔ کبھی کمرے میں نہیں گیا جس میں سلطانہ اور انو رہتے تھے۔ یوں کاروبار سے اس کا جتنا وقت بچتا وہ گھر گزرتا تھا۔ وہ عام طور پر اپنے کمرے میں بیٹھا بیوی کے ساتھ دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتا۔ اکثر بازار لے جاتا اور سامان سے لدا پھندا لوٹتا۔ دو بار اسے فلم دکھانے بھی لے گیا۔ رات کو دکان واپس آتا تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ خالی ہاتھ آیا ہو۔ ہمیشہ پھل، مٹھائی یا کچھ اور کھانے پینے کی لے کر گھر میں داخل ہوتا۔ روزانہ شام کو گل فروش دروازے پر آواز دے کر مہکتے ہوئے گجرے ہار دے جاتا۔

یہ بڑے ہنسی خوشی کے دن تھے۔ گھر میں ہر وقت چہل پہل رہتی۔ سب سے زیادہ سلطانہ کی ماں تھی۔ اس کے رخسار نکھر کر گلابی پڑتے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں نرالی چمک تھی۔ شام کو جب وہ بن ٹھن کر بیٹھتی تو عطر اور پھولوں کے گجروں سے جسم مہکتا ہوتا۔ اس

گل فروش: پھول بیچنے والا۔ بن ٹھن کے: بج سنور کے۔

نئی پھبن آجاتی۔ وہ بڑی سدابہار عورت تھی۔ دیکھنے والوں کو اس پر اور سلطانہ پر چھوٹی بڑی بہنوں کا گمان ہوتا۔ لیکن ماں جس قدر شادماں تھی سلطانہ اس قدر بجھی بجھی اور افسردہ نظر آتی۔ اس میں دوشیزگی کا جو الھڑپن تھا اس پر بددلی اور بیزاری چھاتی جا رہی تھی۔ وہ بہت کم بات چیت کرتی۔ وہ عام طور پر تھکی ہوئی سی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

❁ ❁ ❁

ستمبر کی ایک شام کا ذکر ہے۔ ماں نیاز کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی۔ انو بھی ضد کر کے ساتھ لگ گیا تھا۔ سلطانہ گھر میں تنہا تھی اور نڈھال سی باورچی خانہ میں بیٹھی تھی۔ چولھے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ آگ سے نارنجی شعلے ابھر رہے تھے۔ باہر رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شیشم کے درخت سے زرد زرد پتے ٹوٹ کر آنگن میں گر رہے تھے۔ ہوا چلتی تو بکھرے ہوئے پتے کھڑکھڑاتے۔ بڑی پر اسرار سی آہٹ پیدا ہوتی۔ انہی آہٹوں میں ملی جلی ایک آواز دروازے پر ابھری۔

یہ سلمان تھا۔ وہ انو کو آواز دے رہا تھا۔ سلطانہ اس کی آواز سن کر چونک پڑی۔ وہ خاموش بیٹھی سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کئی لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ آواز رک رک کر ابھرتی رہی۔

سلطانہ سکون کے ساتھ بیٹھ نہ سکی۔ بے چینی کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس کے پیچھے سلمان کھڑا تھا۔ چھریرے جسم کا وہ نوجوان، جس کی آنکھیں شرمائی شرمائی رہتی تھیں۔ بالوں میں بے ترتیبی تھی اور چہرے کے تیکھے نقش و نگار میں دلآویزی تھی۔

ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ خشک پتے رک رک کر اس طرح کھڑکھڑانے لگے، گویا سلطانہ کے کان میں سرگوشی کر رہے ہوں۔

دیکھ وہ واپس چلا جائے گا
وہ جو چل کر تیرے در تک آیا ہے
جس کے انتظار میں تیری آنکھوں کا کاجل پھیکا پڑ گیا
رخسار گیندے کے پھول بن گئے
سہانی راتیں اداس اور کافوری صبحیں ویران ہو گئیں

پھبن: خوبصورتی۔ سدابہار: ہمیشہ تر و تازہ رہنے والی۔ شادماں: خوش۔ چھریرا: دبلا پتلا۔ دلاویزی: خوبصورتی۔

وہ واپس جا رہا ہے

دیکھ! وہ واپس جا رہا ہے

خزاں رسیدہ پتے آنگن میں کھڑ کھڑاتے رہے۔ ہوا سر سراتی رہی۔ دبی دبی سرگوشیاں رہیں۔ سلطانہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باورچی خانے سے نکلی۔ اس نے آنگن عبور کیا اور درواز کنڈی کھول دی۔ وہ اس وقت کسی سحر زدہ ہستی کی طرح مبہوت نظر آ رہی تھی۔

سلمان نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ دھندلی روشنی میں اس نے سامنے کھڑی ہوئی سا دیکھا اور ٹھٹک گیا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "سلطانہ!"

"جی۔" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔

دونوں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموش کھڑے رہے۔

ذرا دیر بعد سلطانہ کی آواز ابھری۔ "اب آپ کیوں آئے ہیں؟" اس کا لہجہ تلخ تھا۔ سلما اس کی تلخی شدت سے محسوس کی۔ سر جھکا کر بولا۔

"تم سے معذرت کرنے آیا تھا۔"

"کاہے کی معذرت؟"

"بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔"

سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔

"سلطانہ! میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ آج میں تم سے سب کچھ صاف صاف چاہتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بات یہ ہے کہ اس رات جب تمہارے گھرے گیا تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ایسی حالت میں، کیسے اپنے ہمراہ لے جاتا۔ اس رات میں اپنے ہر دوست اور جاننے والے کے پاس گیا۔ مگر کوئ میرے آڑے وقت پر کام نہیں آیا۔ میں تمام رات پاگلوں کی طرح ویران سڑکوں پر گھو تمہیں کس طرح بتاؤں کہ اس رات مجھ پر کیا بیتی۔"

سلطانہ اس انکشاف پر چونکی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر سلمان کو دیکھا۔ اس کی پشت درواز

سحر زدہ: جس پر جادو کا اثر ہو گیا ہو۔ مبہوت: ہکا بکا، حیران۔ آڑا وقت: مراد مشکل وقت۔

جانب تھی اور وہ مدہم لہجے میں رک رک کر بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا کرب تھا۔ چہرے پر دکھ کا سایہ پھیلا تھا۔ سلطانہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ سلمان کہتا رہا۔

"شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میں ایک عرصے سے پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ ابّا جان نے خرچ بھیجنا بند کر دیا ہے۔ میری تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ ملازمت تلاش کر رہا ہوں، وہ ابھی تک نہیں ملی۔" وہ اس وقت اپنی زندگی پر سے ہر پردہ اٹھا دینا چاہتا تھا۔ ہر بات کہہ دینا چاہتا تھا۔

"زندگی میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ اور اس عذاب میں، میں تم کو شریک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ میری سب سے بڑی تمنا تھی کہ تم میری بن جاتیں اور ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتیں۔"

سلمان نے گہری سانس بھری۔ اس کا چہرہ اور بھی زیادہ اداس ہو گیا۔ سلطانہ کو اس کی باتوں سے صدمہ پہنچا۔ وہ لرز لرز اٹھی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر اس نے کہا۔ "تو پھر آپ اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"نہیں سلطانہ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ زندگی میں اتنی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے کے بجائے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کروں۔ یہ عہد میں نے اسی رات کیا تھا۔ وہ رات میری زندگی کی عجیب رات تھی۔" ایک بار پھر سلمان نے گہری سانس بھرئی۔ "سچ تو یہ ہے سلطانہ! میں نے بڑی بے راہ روی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ مگر اب چاہتا ہوں کہ زندگی میں کچھ باقاعدگی آ جائے اور میں ـــــ"

اپنی بات کہتے کہتے اس نے اچانک نظریں اٹھا کر سلطانہ کو دیکھا۔ "تم مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں اتنا برا نہیں ہوں۔" وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ آواز قدرے بھرا گئی۔ اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ سلطانہ مبہوت کھڑی رہی۔

چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ صحن میں خشک پتّے آہستہ آہستہ کھڑ کھڑاتے رہے۔ رات کا اندھیرا اور بڑھ گیا۔ سناٹا آسیب زدہ ہو گیا۔ سلطانہ نے سوچا کہیں سب لوگ واپس نہ آ جائیں۔ بڑا غضب ہو گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ایک بات کہوں۔ برا نہ مانیئے گا۔" پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی بات کہہ دی۔ "آئندہ آپ یہاں نہ آیا کریں۔"

بلا کا کرب: بہت زیادہ دکھ، تکلیف۔ لرز اٹھنا: خوف سے کانپ جانا۔ بے راہ روی: غلط راستے پر چلنا، بد چلنی۔

سلمان کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ سلطانہ نے اسے خاموش دیکھ کر
وضاحت کی۔ "بات یہ ہے کہ اماں نے شادی کرلی ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ گھبرا گئی۔
سلمان حیرت سے چونک پڑا۔ "اماں کی شادی ہو گئی؟" اسے سلطانہ کی بات پر یقین نہ آیا
آہستہ سے بولی۔ "جی ہاں۔"
وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "کس کے ساتھ شادی ہوئی؟"
"آپ انہیں نہیں جانتے۔ ہمارے ایک رشتہ دار ہیں نیاز۔ ان کے ساتھ ہوئی ہے۔"
سلمان نے گھبرا کر پوچھا۔ "وہی تو نہیں، جن کا کباڑ خانے کا کاروبار ہے؟"
"ہاں وہی۔ آپ ان کو جانتے ہیں؟"
وہ صاف مکر گیا۔ "ایسے ہی ایک بار ملاقات ہو گئی تھی۔"
"آپ یہاں آئیں گے تو وہ ناراض ہوں گے۔ وہ بڑے شکی آدمی ہیں۔ کسی دن آپ کی
عزتی کر بیٹھے تو کتنی بری بات ہو گی۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آئندہ نہ آئیں۔ مجھے
ڈر معلوم ہوتا ہے۔"
سلمان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اچھا نہیں آؤں گا۔"
سلطانہ نے ٹھنڈی سانس بھری جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بو
"اب آپ جائیں۔ سب لوگ سینما گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔"
"اچھا۔" سلمان سر جھکا کر فرش تکنے لگا۔
"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" سلطانہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ سلمان نے ہچکچاتے ہوئے پو
"سلطانہ تم نے اپنی شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"
وہ حیرت سے بولی۔ "میری شادی؟"
"اس رات جب میں تم کو لینے کے لیے آنے والا تھا، اس کی صبح تو تمہارا نکاح ہونے والا
تمہاری اماں نے مجھ سے یہی کہا تھا۔"
"لیکن اس صبح تو اماں کا نکاح ہوا تھا۔"
سلمان کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آیا۔ وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔
سلطانہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے وضاحت کی۔ "وہ پہلے میری شادی کر دینا

تھیں۔"
سلمان نے پوچھا۔ "کیوں؟"
"وہ نیاز کو اچھا آدمی نہیں سمجھتیں۔" وہ اپنی بات پوری طرح واضح نہ کر سکی۔ مگر سلمان ذہین
نوجوان تھا فوراً اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ آن کی آن میں نیاز اس کے سامنے رقیب روسیاہ کے
روپ میں آ کھڑا ہوا۔ اپنے دل کے چور کو بہت چھپانا چاہا مگر اس نے بے اختیار پوچھ ہی لیا۔ "اور نیاز
کے متعلق تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟"
وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ "مجھے ان سے نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے؟"
اس سادگی پر سلمان کو پیار آ گیا۔ سلطانہ کا رخسار تھپتھپا کر بولا۔ "میری بھولی بھالی گڑیا۔" اور
بے قرار ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔
لیکن لمحہ بھر ہی بعد وہ سہمی ہوئی آواز سے بولی۔ "آپ جائیے، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"
سلمان بھی گھبرا گیا۔ "مجھے اب چلا جانا چاہیے۔ تم جب بھی کسی پریشانی میں ہو انو کے ذریعے
مجھے پیغام بھجوا دینا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس سے یہ کام لے سکتی ہو۔"
"کہیں وہ کسی سے کچھ کہہ نہ دے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔"
"نہیں تم اسے سمجھا دینا۔"
"اچھی بات ہے۔"
سلمان نے دروازے کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "خدا حافظ۔" اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔
گلی میں پہنچ کر وہ آگے جاتے جاتے رک گیا۔ سوچا نہ معلوم سلطانہ سے کب ملاقات ہو۔ کچھ
دیر اس سے اور باتیں کر لے۔ پھر یہ موقع بھی میسر نہ آئے گا۔ ابھی کتنی ایسی باتیں تھیں جو وہ سلطانہ
سے دریافت کرنا چاہتا تھا، جن کا جاننا اس کے لیے ضروری تھا۔ لیکن وہ لوٹ کر دروازے پر نہ گیا۔
آہستہ آہستہ تاریک گلی میں چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دوسری گلی کی جانب مڑنے لگا تو
دفعتاً اس کی نظر نیاز پر پڑی۔ وہ میونسپلٹی کی لالٹین کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک
برقع پوش عورت تھی اور ساتھ ساتھ انو بھی چل رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے ان کو پہچان لیا۔ وہ
آگے جانے کے بجائے گھبرا کر فوراً مڑا اور قریب کی گلی میں داخل ہو گیا۔

رقیب: مخالف

(۲)

بازار میں دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ البتہ پنواڑیوں کی دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ چائے خا
میں خاصی رونق تھی۔ سلمان کو بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن جیب میں بمشکل بارہ آنے کی ریز
تھی۔ کسی اچھے ہوٹل میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بازار
اس نکڑ پر پہنچ گیا جہاں سے ایک سڑک نشیب میں جاتی تھی۔ اس سڑک پر چند قدم چل کر با
ہاتھ کو ایک بھٹیار خانہ تھا۔ ویسے اس کے مالک نے اپنے گاہکوں کی تسکین کے لیے دروازے پر "
پسند ہوٹل" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔

سلمان "شاہ پسند ہوٹل" پہنچا۔ وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ لمبی لمبی بوسیدہ میزوں کے گ
گاہکوں کی بھیڑ تھی جن میں زیادہ تر محنت مزدوری کرنے والے نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ وہ او
آوازوں سے بول رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھ
سلمان ایک الگ تھلگ گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں روشنی کم تھی اور زیادہ ہنگامہ نہیں
اس کے سامنے صرف ایک آدمی بیٹھا تھا جو جبڑوں سے آواز پیدا کرتے ہوئے جلدی جلدی کھانا
رہا تھا۔ اس نے نفرت سے ایک بار اسے دیکھا اور کھانا لانے کا آرڈر دے دیا۔ ذرا دیر بعد دو
تنوری روٹیاں اور سالن کی پلیٹ اس کے سامنے آ گئی۔ کھانا چٹ پٹا تھا۔ اس کا ذائقہ سلمان کو اچھا
اس کے پاس تھوڑے پیسے ہوتے تو وہ اسی سستے ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر
نے چائے بھی پی۔ پورا بل ساڑھے سات آنے بنا تھا۔

"شاہ پسند ہوٹل" سے باہر نکلتے ہی اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ علی احمد تھا۔ کالج میں
عرصہ اس کا استاد رہ چکا تھا۔ بعد میں اس نے کسی اور کالج میں ملازمت اختیار کر لی تھی یا سرے
درس و تدریس کا پیشہ ہی ترک کر دیا تھا۔ سلمان کو اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ عرصہ دراز
ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سلمان جہاں تھا وہیں رک گیا۔

پروفیسر علی احمد گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ سلمان نے
کہ نظر بچا کر گزر جائے۔ مگر وہ چند ہی قدم گیا ہو گا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

پنواڑی: پان بیچنے والا۔ بھٹیار خانہ: سرائے۔ چٹ پٹا: مزیدار۔

"مسٹر سلمان!"

اس نے با دل ناخواستہ مڑ کر اس طرف دیکھا۔ پروفیسر علی احمد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ خشک بال، سوچتی ہوئی آنکھیں اور مرجھایا ہوا زرد چہرہ۔ لیکن اس کی مخصوص مسکراہٹ اس وقت بھی ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

اس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "بہت دبلے ہو گئے ہو تم۔"

سلمان صاف جھوٹ بول گیا۔ "بیمار پڑ گیا تھا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" علی احمد نے دریافت کیا۔

"گھر جانے کا ارادہ تھا۔"

علی احمد نے کہا۔ "اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو آؤ میرے ساتھ چائے پیو۔ میرا مکان یہاں سے دور نہیں ہے۔" سلمان انکار نہ کر سکا اور خاموشی سے اس کے ہمراہ ہو لیا۔

علی احمد کا مکان واقعی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ تنہا رہتا تھا۔ اس نے اب تک شادی بیاہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی فی الحال ایسا ارادہ تھا۔ کوئی عزیز اور رشتے دار بھی نہ تھا۔ وہ سیاسیات میں ایم اے کر چکا تھا اور بیشتر وقت مطالعے میں گزارتا تھا۔

دونوں نے مشکل سے دو فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ علی احمد ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر ٹھہر گیا اس نے آگے بڑھ کر زینے کا دروازہ کھولا اور سلمان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ زینے کے اندر اندھیرا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ علی احمد نے جیب سے کنجی نکالی اور دروازے پر پڑا ہوا تالا کھولا۔

مکان کے اندر بجلی کا بلب روشن تھا جس کی روشنی چاروں طرف پھیلی تھی۔ وہ ایک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں تاریکی تھی۔ علی احمد نے سوئچ دبایا۔ فوراً روشنی ہو گئی۔ سلمان نے دیکھا، کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ کمرے میں معمولی سا فرنیچر تھا۔ بید کا بنا ہوا سستے قسم کا صوفہ، تین چار کرسیاں، ایک آفس ٹیبل اور اس کے برابر کتابوں کی الماری۔ میز پر چند کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مطالعہ کرتے کرتے وہ اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ علی احمد نے "لائف" کا تازہ شمارہ اٹھایا، اور سلمان کی طرف بڑھا کر بولا۔

"تم اسے دیکھو۔ میں چائے تیار کر کے لاتا ہوں۔"

سلمان بولا۔ "آپ خواہ مخواہ تکلف نہ کریں۔ میں۔۔۔۔"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "اس میں تکلف کی کونسی بات ہے۔ میں روزانہ اس وقت چائے
ہوں اور ہمیشہ خود ہی تیار کرتا ہوں۔ میرا نوکر کھانا کھلانے کے بعد اپنے گھر چلا جاتا ہے۔"

"میں آپ کی کچھ مدد کروں؟"

"شکریہ! تم مجھ سے زیادہ اچھی چائے نہیں بنا سکتے۔ مسٹر یہ سیدھا سادا ٹیسٹ کا سوال ہے
وہ مسکرا کر بولا۔

علی احمد کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلمان خاموش بیٹھا میگزین کے ورق الٹتا پلٹتا رہا۔ تصویر
دیکھتا رہا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں جہاں علی احمد چائے
کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پروفیسر علی احمد کمرے میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ سلمان نے غور
علی احمد نے چائے بڑی نفاست سے تیار کی تھی۔ دونوں بیٹھے چائے پیتے رہے اور سگرٹ کے
لگاتے رہے۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے اندر آ رہے تھے۔ شہر کے ہنگامے سرد ہو
جا رہے تھے۔ آوازوں کا شور رفتہ رفتہ دھیما پڑتا جا رہا تھا۔

علی احمد نے غور سے سلمان کا چہرہ دیکھا۔ "سنا ہے تم نے کالج چھوڑ دیا۔" اس نے قدر
توقف کے بعد پوچھا۔ "آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" سلمان کا مختصر جواب تھا۔

"آئندہ کے متعلق تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"بہرحال مستقبل کے بارے میں تم نے کچھ نہ کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔"

سلمان کچھ اور سنجیدہ ہو گیا۔ "اس معاشرے نے مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ بنا
حق ہی کب دیا ہے۔ یہ حق تو زندگی میں صرف چند خوش نصیبوں کو حاصل ہے اور ان خوش نصیبوں
کی فہرست میں میرا نام نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

علی احمد مسکرا کر نرمی سے بولا۔ "کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم معاشرے کو برا بھلا کہنے

بجائے صرف اپنے متعلق بات کرو؟"

سلمان اسی تلخی کے ساتھ بولا۔ "دیکھئے بات یہ ہے۔ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر
جاری نہیں رکھ سکتا۔ ملازمت چاہتا ہوں، وہ ملتی نہیں۔ ایک ذمہ دار اور کارآمد شہری کی حیثیت سے
زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں، اس کے امکانات نہیں۔ سیدھا سادا اقتصادی مسئلہ ہے اور کوئی اقتصادی
مسئلہ معاشرے سے ہٹ کر اپنا وجود نہیں رکھتا۔"

پروفیسر علی احمد ذرا دیر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر ناصحانہ لہجے میں بولا تم تو بڑے ذہین
طالب علم تھے۔ افسوس کہ تم نے اپنی ذہانت اور صلاحیت سے کوئی کام نہیں لیا۔"

"کیا آپ کے خیال میں، میں واقعی ذہین اور باصلاحیت نوجوان ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی رائے پر فی الحال نظرثانی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"تو پھر میرے ساتھ کسی انٹرویو میں چلئے، جہاں سے آج تک مجھے ناکارہ اور گھامڑ ہونے کی
سند ملتی رہی ہے۔"

علی احمد نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے۔"

"معاف کیجئے پروفیسر صاحب! مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ تو میں کسی بھوکے کو ایک
وقت کا کھانا کھلا کر آسانی سے خرید سکتا ہوں۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "تم واقعی بیمار ہو۔"

"یہ بات بھی نہیں۔ آپ بند کمروں میں بیٹھ کر زندگی کو کتابوں میں تلاش کرتے ہیں اور میں
نے زندگی کو قحبہ خانوں میں دیکھا ہے۔ جھگیوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں دیکھا ہے۔ مسلسل فاقے
کئے ہیں۔ ذلتیں برداشت کی ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد تجربہ حاصل کیا ہے۔
زندگی کو برہنہ آنکھ سے دیکھئے وہ کس قدر مظلوم ہے۔"

وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اس کے ذہن میں مدت سے جو آگ سلگ رہی تھی وہ اچانک
بھڑک اٹھی تھی۔ آج اس کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ وہ ان زخموں کو اپنی تمام آلائش کے
ساتھ پروفیسر علی احمد کے سامنے برہنہ کر دینا چاہتا تھا۔ جذبات کی طوفانی رو میں وہ ایسی باتیں بھی

اقتصادی: مالی، معاشی۔ ناصحانہ لہجہ: نصیحت کرنے والا انداز۔ نظرثانی: ترمیم یا تصحیح کی غرض سے دوبارہ دیکھنا۔ گھامڑ: بیوقوف، سست۔ قحبہ
خانہ: فاحشہ عورت کا مکان، رنڈی کا کوٹھا۔ زخم ہرے ہونا: زخم تازہ ہو جانا، کوئی گزشتہ صدمہ یا حادثہ یاد آنا۔ آلائش: غلاظت، گندگی۔

کہہ گیا جو نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ اس نے یہ بھی لحاظ نہ کیا کہ وہ علی احمد کا طالب علم رہ چکا ہے۔
لیکن علی احمد نے اس کی باتوں پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ چند لمحے خاموش رہ
بعد گویا ہوا۔

"مجھے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ حالات نے تمہاری شخصیت کو مسخ کر
انارکی کی طرف جا رہے ہو۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔ مجھے خوف ہے تم اپنی ذات سے انتقام لی
کہیں معاشرے سے انتقام لینا نہ شروع کر دو۔ یہ بڑا خطرناک رجحان ہے۔ تم ذہین نوجوان
ذہین نوجوان کسی قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔"

سلمان جیسے اب تھک گیا تھا۔ اس عرصے میں چائے کی کئی پیالیاں پی چکا تھا اور
سگریٹ پر کش لگا رہا تھا۔

اس نے نڈھال ہو کر صوفے کی پشت سے پیٹھ ٹکا دی اور خاموشی سے پروفیسر علی
باتیں سنتا رہا۔

"تم مجھے اپنا کچھ وقت دے سکتے ہو؟" علی احمد نے پوچھا۔

"میرے پاس وقت کا کوئی مصرف نہیں۔ جتنا وقت چاہیں دے سکتا ہوں۔"

"پرسوں شام کو تم میرے پاس آ جاؤ۔ میں تم کو ایک جگہ لے چلوں گا۔"

سلمان نے پوچھا۔ "کوئی خاص پروگرام ہے؟"

"یہ تم کو وہیں پہنچ کر معلوم ہو گا۔"

سلمان نے انکار نہ کیا اور آنے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔
خاصی بھیگ چکی تھی اور سلمان کو دور جانا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور باہر جانے کے لیے درواز
جانب بڑھا۔

سلمان حسب وعدہ پروفیسر علی احمد کے گھر پہنچا۔ وہ اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دونوں
میں زیادہ وقت نہیں گزارا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے باہر سڑک پر
بڑی خوشگوار شام تھی۔ دونوں کو سڑک پر چہل قدمی کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ راستے میں
نے سلمان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ وہ خاموشی میں ڈوبا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سلمان سوچ ر

مسخ: صورت بگڑنا۔ انارکی: بے نظمی، لاقانونیت۔ مصرف: استعمال۔

علی احمد اسے نہ معلوم کہاں لیے جا رہا ہے۔ نہ اسے منزل مقصود کا پتہ تھا نہ یہ خبر تھی کہ وہ کس لیے
جا رہا ہے؟

علی احمد ایک خوبصورت کوٹھی کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے کوٹھی کو
غور سے دیکھا اور پھاٹک کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سلمان بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔
ڈرائنگ روم میں جا کر دونوں نے دیکھا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے جو کئی ٹولیوں میں بٹے
ہوئے گفتگو میں مصروف تھے۔ سلمان ان کی بات چیت سے صرف اس قدر اندازہ لگا سکا کہ کوئی
جلسہ ہونے والا ہے۔

جلسے کی نوعیت کیا تھی۔ کیوں بلایا گیا تھا؟ کس لیے بلایا گیا تھا؟ اسے کچھ علم نہ تھا۔ نہ ہی اس
نے علی احمد سے اس کے بارے میں کچھ پوچھا۔

ٹھیک آٹھ بجے سب اٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے جس میں جلسے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ
کمرہ خوب کشادہ تھا۔ بیچ میں لمبی میز پڑی تھی جس کے چاروں طرف وارنش سے جھلکتی ہوئی
اسپرنگ دار کرسیاں تھیں۔ ہر کرسی کے مقابل میز پر سفید کاغذ اور پنسلیں رکھی تھیں۔ کمرے کی
فضا کچھ ٹیکنی کلر قسم کی تھی۔ شیشے کی رنگین دیوار گیریوں کے پیچھے بجلی کے بلب روشن تھے۔ ان
سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ روشنی میں دروازوں اور کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے پردے
جھلملا رہے تھے۔

سلمان بھی سب کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے نظر بھر کر صفدر بشیر کو دیکھا جو اس اجتماع کا روح رواں تھا۔ یہ کوٹھی اسی کی تھی۔ اس
کی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔ وہ ہونٹوں میں دبے ہوئے پائپ پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ وہ
مضبوط اور بھرے بھرے جسم کا طویل قامت اور خوش شکل نوجوان تھا۔ وضع قطع سے اچھا خاصا
انٹلکچوئل لگتا تھا۔

کمرے میں علی احمد اور سلمان کے علاوہ تین بے روزگار گریجویٹ، سرکاری اسپتال کا ایک
ریٹائرڈ ڈاکٹر، ایک جونئیر کلرک اور دو مقامی کالجوں کے طالب علم تھے۔ ان کے چہروں پر دھندلی

وارنش: گاڑھا سیال مادہ جسے فرنیچر وغیرہ چمکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ٹیکنی کلر: رنگارنگ، مختلف رنگوں کا مجموعہ جس میں ہر رنگ الگ
الگ نظر آئے۔ دیوار گیری: دیوار میں لگانے کا لیمپ۔ روح رواں: کرتا دھرتا۔ طویل قامت: لمبے قد کا۔ انٹلکچوئل: دانشور۔

دھندلی لکیروں کا جال بکھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں بجھتے چراغوں کی جھلملاہٹ تھی۔

❁ ❁ ❁

صفدر بشیر انگلستان سے چند مہینے پہلے واپس آیا تھا۔ وہ کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر
اچانک گھر سے ایک روز تار ملا جس میں اس کے باپ کے انتقال کی اطلاع تھی۔ ان کی موت
قلب بند ہونے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ پی ڈبلیو ڈی میں چیف انجینئر تھے۔ انہوں نے ترکے میں
لاکھ روپے بینک بیلنس کے علاوہ بہت بڑی جائداد بھی چھوڑی تھی۔

باپ کا ترکہ چار بھائی بہنوں میں تقسیم ہوا تو صفدر بشیر کو کوٹھی کے ساتھ ساتھ ایک
سے زائد روپیہ بھی حصے میں ملا۔

اس رقم کے متعلق صفدر بشیر عرصے تک غور کرتا رہا۔ باپ کے ملنے والے ایک صنعت
کے مشورے پر پہلے پہل اس نے سوچا کہ ٹیکسٹائل مل لگانے کی کوشش کرے یا کوئی ایسا کار
کرے کہ لاکھ کے کئی لاکھ ہو جائیں۔ شادی کرے گھر بسائے اور آسائش کی زندگی بسر کرے۔
کاروبار کی طرف اس کی طبیعت مائل نہ ہوئی۔

دوسرا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرے اور انگلستان میں مستق
رہائش اختیار کرے۔

مگر وہ انگلستان نہ گیا اور خدمت خلق کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ وہ با
کارکن بھی رہ چکا تھا اور عقیدے کے اعتبار سے کٹر نیشنلسٹ تھا۔ ایک زمانے میں وہ نیشنل اسٹوڈنٹ
آرگنائزیشن کا سرگرم رکن بھی رہ چکا تھا اور ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں عملی طور
شریک ہو کر جیل بھی جا چکا تھا۔ فی الحال اس کا ارادہ سیاست میں براہ راست حصہ لینے کے بجائے
سماجی بہبود کا کام کرنے کا تھا۔

صفدر بشیر نے اپنے ان عزائم کا چند مخلص دوستوں سے ذکر کیا۔ انہوں نے اپنے احباب
ملنے جلنے والوں سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کیا اور یوں ستمبر کی اس خوشگوار رات کو دس ہم خیا
افراد ایک جگہ مل بیٹھے تھے۔

جلسے کی کارروائی کا آغاز صفدر بشیر کی تقریر سے ہوا۔

ترکہ: ورثہ۔ آسائش: عیش و آرام۔ کٹر: پکا۔ نیشنلسٹ: قوم پرست، وطن پرست۔ سماجی بہبود: معاشرتی اصلاح، معاشرے کی بہتری

اس کا لہجہ صاف ستھرا تھا۔ انداز خطیبانہ تھا۔ اس نے سب سے پہلے ان مقاصد پر روشنی ڈالی
جن کے پیش نظر جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں انگلستان کے سماجی کارکنوں اور فلاحی
تنظیموں کی سرگرمیوں کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بتایا کہ کس طرح برطانوی نوجوان اور
دوسرے شہری مختلف نوعیت اور مختلف ساخت کی انجمنیں اور ادارے قائم کر کے اپنے ملک اور قوم
کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ان کے عزائم اور بے لوث جدوجہد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے
ملک کے عوام کے سماجی اور اقتصادی مسائل پر روشنی ڈالی۔ ان کے صبر آزما رہن سہن، پس ماندگی
اور زبوں حالی کے اسباب بیان کیے۔ آخر میں سب سے اپیل کی کہ اس کار خیر میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔
اس کی مدد کریں۔

صفدر بشیر کی تقریر دلچسپ اور اثرانگیز تھی۔ حاضرین نے اس کی باتیں توجہ اور انہماک سے
سنیں۔ متاثر بھی ہوئے۔ اپنے اپنے طور پر اظہار خیال بھی کیا۔ لیکن کسی نے صفدر بشیر کے نقطہ نظر
سے اختلاف نہیں کیا۔ ہر مقرر نے اسے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ سب کی خواہش تھی کہ کچھ نہ
کچھ ضرور کیا جائے اور عملی طور پر کیا جائے۔

رات کے ساڑھے دس بجے تک جلسے کی کارروائی جاری رہی۔ سلمان تمام عرصہ خاموش بیٹھا
رہا۔ اس نے کسی مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ وہ پوری توجہ سے ہر بات سنتا رہا اور آہستہ آہستہ
سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ اس گلابی دیواروں والے کمرے میں جہاں گہری نارنجی روشنی پھیلی تھی اور
خوش رنگ ریشمی پردے آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے، یہ سارا ہنگامہ بڑا دلچسپ لگ رہا تھا۔

جلسہ برخاست ہوا تو ایک مختصر سی تنظیم قائم ہو چکی تھی۔ تنظیم کا نام فلک پیما رکھا گیا اور
اتفاق رائے سے یہ بھی طے کیا گیا کہ فلک پیما کا ہر رکن اسکائی لارک کہلائے گا۔ نام میں یہ تنوع اور
انفرادیت صفدر بشیر کے مغرب زدہ ذہن کی پیداوار تھی۔ اسکائی لارکوں کا جماعتی نشان سفید پھول
تجویز کیا گیا اور اسے پاکیزہ اور صاف ستھرے ماحول کی علامت قرار دیا گیا۔

فلک پیما کے ارکان کی تعداد سر دست دس رکھی گئی۔ یعنی وہ تمام افراد جنھوں نے جلسے میں
شرکت کی تھی۔ جلسہ ختم ہوا تو سب کو بھوک لگ رہی تھی۔ صفدر بشیر نے رات کے کھانے کا بھی
بندوبست کیا تھا۔ سب لوگ کانفرنس روم سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں پہنچے جہاں میز پر کھانا لگایا

کم مائیگی: غربت۔ زبوں حالی: بری حالت۔ اسباب: وجوہات۔ اثرانگیز: متاثر کن۔ تنوع: رنگ برنگی، گوناگونی۔

جا چکا تھا۔

کھانا بہت سادہ تھا۔ نہ اس میں کوئی تکلف تھا نہ کسی خاص اہتمام سے کام لیا گیا تھا۔ یہ
تھی کہ سب نے بے تکلفی سے کھانا کھایا۔ ایک دوسرے سے جو اجنبیت تھی کھانے کی میز پر
تک دور ہو گئی۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ علی احمد کی تجویز پر فلک پیما کے ہر رکن نے کھڑے ہو کر
تعارف کرایا۔ بڑی دلچسپ اور پر لطف باتیں سننے میں آئیں۔ خوب قہقہے لگے۔ ماحول اور خو
ہو گیا۔ اسی نشست میں یہ بھی طے پایا کہ دوسرے روز نو بجے شب کو فلک پیما کا دوسرا اجلاس ہو
جائے جس میں ہر رکن لازمی طور پر شریک ہو۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد صفدر بشیر کی اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر فلک پیما کے تمام ارکان
اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئے۔

سلمان اس رات دیر تک جاگتا رہا۔ وہ جلسے سے خاصا متاثر ہو کر لوٹا تھا۔ بہت عرصے بعد
بے ترتیب اور اجڑی ہوئی زندگی میں ہلچل اور سرخوشی محسوس کر رہا تھا۔

مقررہ پروگرام کے مطابق دوسرے روز رات کے نو بجے صفدر بشیر کی کوٹھی پر فلک
اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں لمبی چوڑی تقریریں نہیں ہوئیں۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر
نے کی جو عمر میں سب سے بڑا تھا۔ اجلاس میں فلک پیما کے اغراض و مقاصد اور تنظیمی ڈھانچے کا
خاکہ پیش کیا گیا جسے صفدر بشیر نے تیار کیا تھا۔ اس پر بحث و مباحثہ ہوا اور ضروری ترمیم کے بعد
متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔

ایجنڈے کی دوسری شق کا تعلق فلک پیما کی رکنیت سے تھا۔ صفدر بشیر نے بریف کیس
رکنیت کے فارم نکالے اور صدر کے حوالے کر دیے۔ صدر نے فارم تقسیم کر دیے۔ ہر ا
لارک نے فارم پڑھا اور خانہ پوری کرنے کے بعد دستخط کر دیے۔ ہر رکن نے سینے پر ہاتھ رکھ کر
عہد بھی کیا کہ پوری دیانت داری اور خلوص دل سے ملک اور قوم کی خدمت کرے گا۔ فلک پیما کے
اغراض و مقاصد کا پورا پورا احترام کرے گا۔ انفرادی خواہشات نظر انداز کر کے تنظیم کے بنیادی
اصولوں کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہے گا۔

ترمیم: تبدیلی، کمی بیشی۔ شق: حصہ۔

اس کے بعد عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ صفدر بشیر کو صدر، فہیم اللہ کو نائب صدر،
علی احمد کو سیکرٹری جنرل اور ڈاکٹر زیدی کو خازن منتخب کیا گیا۔ چھ ارکان پر مشتمل ایک مجلس عاملہ
بھی منتخب کی گئی۔ صدر، نائب صدر، سیکرٹری جنرل اور خازن اس کے مستقل رکن تھے۔ اسکائی
لارکوں نے تالیاں بجا کر انہیں مبارک باد دی اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

اجلاس میں صفدر بشیر کی اس تجویز کو بھی منظور کر لیا گیا کہ جو ارکان برسر روزگار ہیں اور یہ
سمجھتے ہیں کہ ان کی ملازمت فلک پیما کی سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے وہ مناسب سمجھیں تو
ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لیں۔

ہر اسکائی لارک کے لیے ۸۰ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کیا گیا۔ صفدر بشیر نے فلک پیما کے
ضروری اخراجات کے لیے بیس ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ آئندہ بھی
تنظیم کے فنڈ کے واسطے رقم مہیا کرتا رہے گا۔

اجلاس میں ابتدائی پروگرام کے طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسکائی لارک مختلف بستیوں کا دورہ
کریں۔ عوام سے مل کر ان کے بنیادی مسائل معلوم کریں اور ان کی روشنی میں ہفتے بھر بعد اپنی اپنی
رپورٹ آئندہ اجلاس میں پیش کریں تاکہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کام کا آغاز کیا جائے۔

❊ ❊ ❊

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ اسکائی لارکوں کی ٹولیاں عوامی رابطے کی مہم پر مختلف علاقوں
کے دوروں پر نکل گئیں۔

انہوں نے اپنے اپنے علاقے کے رہنے والوں کے ساتھ گھل مل جانے کی کوشش کی۔ ان
سے بات چیت کی۔ ان کے سماجی اور اقتصادی مسائل معلوم کیے۔

اسکائی لارکوں کی رہائش کا بندوبست صفدر بشیر ہی کی کوٹھی میں کیا گیا جس میں وہ تنہا رہتا تھا۔
کوٹھی کے ایک حصے میں فلک پیما کا ہیڈ کوارٹر بھی قائم کیا گیا۔ کوٹھی کا قدیم نام رونق منزل تھا۔ اسے
تبدیل کر دیا گیا اور نیا نام قطب نما رکھا گیا۔

فلک پیما کا ہفت روزہ اجلاس حسب معمول رات کے وقت رکھا گیا۔ اس روز ہر اسکائی لارک
نے اپنی اپنی رپورٹ پیش کی۔ ان رپورٹوں پر رات گئے تک بحث ہوتی رہی۔ ان کا باقاعدہ تجزیہ کیا گیا
اور یہ طے کیا گیا کہ عوام کو سب سے پہلے ان کے شہری اور بنیادی حقوق سے آگاہ کیا جائے، باشعور

بنایا جائے۔

اس مقصد کے لیے تین اہم فیصلے کیے گئے۔

تعلیم بالغاں کا آغاز کیا جائے۔

دار المطالعے قائم کیے جائیں۔

ہر بستی اور محلے کے چوراہوں اور گلیوں کے نکڑ پر چھوٹے چھوٹے عام جلسے کیے جائیں [illegible]
مختصر تقریروں کے ذریعہ عام فہم انداز میں عوام کی ذہنی تربیت کی جائے۔

اجلاس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تین تین ارکان پر مشتمل تین گروپ [illegible] دیے گئے۔ ڈاکٹر زیدی کو تینوں گروپوں کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اس کے سپرد یہ ذمے داری کی گئی [illegible] گروپ کے کام کا جائزہ لے اور اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے مناسب مشورے [illegible]

کام کا آغاز عام جلسوں سے ہوا۔ اس گروپ کا سربراہ خود صفدر بشیر تھا۔ وہ فلک پیا کا [illegible] اچھا مقرر تھا۔ بات کہنے کا اسے سلیقہ تھا۔ بات اس ڈھنگ سے کہتا کہ لوگ توجہ اور دلچسپی [illegible] اپنی دل نشیں تقریروں سے جلد ہی وہ عوام میں مقبول ہو گیا۔

دوسرے گروپ کا انچارج علی احمد تھا۔ وہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا [illegible] پوری تندہی کے ساتھ فلک پیا کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے گروپ میں سلمان کے علاوہ اسکائی لارک بھی طالب علم تھا۔

اس گروپ کے سپرد تعلیم بالغاں کا کام تھا۔

❁ ❁ ❁

یہ سنیچر کی شام تھی۔ علی احمد بڑا سا تختہ سیاہ اور پیٹرومیکس لیے، سلمان اور اپنے [illegible] ساتھی اسکائی لارک کے ہمراہ ایک پس ماندہ بستی میں پہنچا۔ لوگوں نے انہیں حیرت اور استعجاب [illegible] دیکھا۔ انہوں نے خاموشی سے ایک نیم پختہ دیوار کے ساتھ تختہ سیاہ لٹکایا۔ پیٹرومیکس روشن [illegible] لوگوں کے اکٹھا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے گرد خاصا ہجوم ہو گیا۔ علی اح[illegible] تعلیم کی اہمیت پر مختصر تقریر کی۔ اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ کتنے ہی لوگ اسی وقت تعلیم [illegible] کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

تعلیم بالغاں: بڑوں کی تعلیم۔ دار المطالعے: لائبریریاں۔ عام فہم: آسان۔ تندہی: محنت۔ پس ماندہ: کم ترقی یافتہ۔

علی احمد نے روایتی طریق تعلیم سے گریز کیا۔ جدید اور آسان طریقہ اختیار کیا اور اسی روز پہلا سبق بھی شروع کر دیا۔

وہ ایک مشفق استاد کی طرح نرم لہجے میں بول رہا تھا۔ "دیکھئے میرے ہاتھ میں یہ چھڑی ہے۔" اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی چھڑی اٹھا کر لوگوں کو دکھائی۔ "اب میں تختہ سیاہ پر اس چھڑی کی الٹی شکل بناتا ہوں۔"

اس نے بورڈ پر کھریا سے "ل" کی شکل بنائی۔ لوگوں کو مخاطب کیا۔ "اس الٹی چھڑی پر میں نے ایک ڈنڈا لگا دیا۔ دیکھ رہے ہیں نا آپ؟ اس کو کہتے ہیں لا۔ یہی کھانا لا۔ پانی لا۔ تو صاحب یہ ہو گیا لا۔"

ہجوم میں کھڑے ہوئے لوگ تختہ سیاہ پر کھریا سے بنی ہوئی "لا" کی شکل دیکھنے لگے جو گیس بتی کی روشنی میں جھلک رہی تھی۔ علی احمد خاموش کھڑا ان کے رد عمل کا مطالعہ کرتا رہا۔ سلمان اور دوسرے اسکائی لارک اس کے برابر بت بنے کھڑے تھے۔ منٹ بھر بعد اس نے تختہ سیاہ پر "لا" کے برابر کھریا سے ایک اور "لا" بنایا اور مسکرا کر بولا۔ "دیکھئے یہ ہو گیا لالا۔"

اس دفعہ سب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بلیک بورڈ کو دیکھا۔ علی احمد مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "لالا سے اور کچھ نہیں سمجھے گا۔ لالا یہی جو اپنے پٹھان بھائی ہوتے ہیں جو رات کے وقت دکانوں اور مکانوں کی چوکیداری کرتے ہیں۔ ہاں تو لالا کا مطلب اب آپ کی سمجھ میں آ گیا۔" قدرے توقف کے بعد وہ گویا ہوا۔

"ذرا اسے تین بار پڑھ تو لیجئے۔"

لوگوں نے اس زور سے تین بار لالا کا ورد کیا کہ ساری بستی گونج اٹھی۔ علی احمد نے اندازہ لگایا کہ لوگ دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ "کل ہم چٹائی بھی لیتے آئیں گے۔ اس وقت اگر آپ لوگ زمین پر بیٹھ جائیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

کئی آوازیں آئیں۔ "اس میں مہربانی کی کونسی بات ہے جی۔ یہ لیجئے۔" اور یکے بعد دیگرے سب زمین پر بیٹھ گئے۔

علی احمد نے تختہ سیاہ پر ایک اور "لا" لکھا اور حاضرین کو مخاطب کیا۔ "یہ ہو گیا لالا لا۔ یہ ہم اس وقت کہیں گے جب لالا سے کچھ مانگنا ہو۔ لالا لا۔" اس نے کئی بار اس جملے کو دہرایا۔ پھر بلیک بورڈ پر لالا لا سے پہلے ایک اور لا لکھا اور ہنس کر بولا۔

"اس دفعہ میں نہیں پڑھوں گا۔ آپ ہی میں سے کوئی صاحب پڑھنے کی کوشش کریں۔"

لمحہ بھر تک گہری خاموشی رہی۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے غور سے تختہ سیاہ کو دیکھا اور ایک بار کسی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "لا لالا لا۔ کیوں ماسٹر جی یہی ہوا نا؟" علی احمد اس ادھیڑ آدمی کے ماسٹر جی کہنے پر مسکرایا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"بالکل ٹھیک پڑھا آپ نے۔"

اسی وقت دو تین آوازیں ابھریں۔ "پڑھ تو جی ہم نے بھی لیا تھا پر کہتے ہوئے ڈر لگا۔"

علی احمد نے ان کی حوصلہ افزائی کی غرض سے کہا۔ "یہ تو آپ نے برا کیا۔ جو سمجھ میں آیا فوراً کہیے۔ ڈرنے اور جھجکنے سے کام نہیں چلے گا۔ یاد رکھیے جو غلط نہیں پڑھے گا وہ کبھی صحیح نہیں پڑھ سکتا۔" اس نے سب سے لا لالا لا کا جملہ پانچ مرتبہ بلند آواز سے پڑھوایا۔

اس روز کے لیے صرف اتنا ہی سبق تھا۔ جب وہ پڑھائی ختم کر چکا تو سب نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگے۔ وہ ایک ایک بات کا تسلی بخش جواب دیتا گیا۔

سلمان سب کو اچنبھے سے دیکھتا رہا۔

اس وقت اسے اور بھی زیادہ تعجب ہوا جب انہوں نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ پڑھائی کے لیے وہ نہ صرف جگہ کا بندوبست کریں گے بلکہ چندہ کر کے گیس بتی اور چٹائیوں کا انتظام بھی کریں گے۔ سلمان کا خیال تھا کہ بجائے دلچسپی لینے کے لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے۔ اسی خوف کے باعث وہ بستی میں داخل ہوتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اول تو انہیں اپنی جہالت اور پس ماندگی کا احساس ہی نہیں اور اگر تھوڑا بہت ہے تو وہ اس گمراہی سے نکلنا نہیں چاہتے۔ وہ ان کیڑوں کی طرح ہیں جو گندگی میں زندہ رہتے ہیں۔ اسی میں جنم لیتے اور اسی میں مر کھپ جاتے ہیں۔

دوسرے روز وہ علی احمد کے ساتھ شام کو وہاں پہنچا۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ بستی کے موڑ پر کئی آدمی کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ تینوں کو دیکھ کر خوشی سے مسکرائے۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر سلمان کی بغل میں دبا ہوا بورڈ اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا۔ دوسرے نے پیٹرومیکس لے لیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔

"ماسٹر جی! آپ لوگ یہ بورڈ اور بتی اب نہ لایا کریں۔ ہم نے سب بندوبست کر لیا ہے۔"

حوصلہ افزائی کرنا: ہمت بڑھانا۔ اچنبھا: حیرت۔

تینوں نے بستی میں جا کر دیکھا، واقعی انہوں نے ہر چیز کا انتظام کر لیا تھا۔ پڑھائی کے واسطے جو جگہ بنائی گئی تھی وہ ایک مکان سے ملحق سائبان تھا۔ یہاں کل تک ایک تانگے والے کا گھوڑا بندھتا تھا۔ اب گھوڑے کا تھان کہیں اور بنا دیا گیا تھا۔ اس اصطبل کو سب نے مل کر دن بھر میں اس طرح محنت اور لگن سے صاف کیا تھا کہ کہیں سے بھی یہ نہ معلوم ہو تا کہ یہ جگہ کبھی گھوڑے کی لید اور پیشاب سے آلودہ رہ چکی ہے۔ اصطبل کی دیواروں پر چونے کی سفیدی تھی جس پر ایک تختہ سیاہ لٹک رہا تھا۔ اس کے برابر ہی معمولی قسم کی میز اور کرسیاں رکھی تھیں۔ میز کے ایک طرف پیٹرومیکس تھا جس کی تیز روشنی میں سفید دیواریں جھلک رہی تھیں۔ پڑھنے والوں کے لیے فرش پر کھجور کی چٹائیاں بچھی تھیں۔

سلمان نے یہ اہتمام دیکھا تو بڑا متاثر ہوا۔

اس روز علی احمد نے دوسرا سبق پڑھایا۔ اس میں صرف نقطوں کے استعمال سے ابتدائی سبق آگے بڑھایا گیا تھا۔ اس نے انگلیوں میں کھریا دبائی اور تختہ سیاہ پر شکلیں بنانے لگا۔

تالا، بالا، پالا

لالا تالا لا

لالا بالا لا

پالا سے کوئی موزوں جملہ نہیں بنتا تھا۔ لہٰذا علی احمد نے صرف اس کا مفہوم سمجھایا۔

کل جو لوگ پڑھنے آئے تھے ان کی حیثیت تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آج مختصر سے اسکول کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کے طلبا کی تعداد بائیس تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں نوجوان تھے۔ ادھیڑ تھے اور ایسے بوڑھے بھی تھے جن کی لمبی لمبی سفید ڈاڑھیاں تھیں۔ سب نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، دست کار، کاری گر، ریڑھی پر سامان رکھ کر پھیری لگانے والے اور چھوٹے موٹے دکان دار۔

تین ہی چار روز میں طلباء کی تعداد بڑھ کر چالیس تک پہنچ گئی۔ ابھی یہ تعداد اور بڑھتی مگر علی احمد نے مزید طلبا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مشکل یہ تھی کہ نئے آنے والوں کی خاطر سابقہ سبق بار بار دہرانا پڑ رہے تھے۔

تھان: اصطبل۔

طلبا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علی احمد، سلمان اور دوسرے اسکائی لارک کو بھی تعلیم بالغ کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ دن کے وقت ہیڈ کوارٹر میں طریقہ تعلیم پر لیکچر دیتا شام کو عملی تربیت کے لیے انہیں بستی کے اسکول میں لے جاتا اور باری باری سبق پڑھانے کا موقع بھی دیتا چند ہی روز میں وہ اس قابل ہوگئے کہ علی احمد نے قریب کی بستیوں میں ان دونوں کو بھی تعلیم بالغاں کے مرکزوں پر لگادیا۔ یہ دونوں مرکز ان بستیوں کے لوگوں نے موجودہ مرکز سے متاثر ہو کر کھولے تھے اور علی احمد کے پاس وفد کی صورت میں آکر درخواست کی تھی کہ وہاں بھی تعلیم بالغاں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

سلمان بڑی تندہی اور لگن کے ساتھ فلک پیما کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ ہر روز مقررہ وقت پر جاتا اور پوری توجہ سے اپنے مرکز کے طلباء کو پڑھاتا۔

اس کام میں اب اسے ایک خاص لطف مل رہا تھا۔ وہی احساس لذت تھا جو انسان میں ایثار کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

(۳)

جس روز عدالت سے نوشا کو سزا ہوئی ٹھیک اسی روز انشورنس کمپنی کے اگریمنٹ فارم پر ماں کے دستخط ہوئے۔ کمپنی کے ڈاکٹر نے طبی معائنہ کیا اور اسے صحت مند قرار دیا۔ ضروری کارروائی پوری ہوئی۔ نیاز نے پالیسی کی پہلی قسط ادا کی اور اس کی اہلیہ کی زندگی کا ۵۰ ہزار روپے کا بیمہ ہوگیا۔

نوشا کی ماں سوچ رہی تھی کہ عقد ثانی کر کے اس نے غلطی نہیں کی۔ اس دفعہ بھی اسے چاہنے والا شوہر ملا تھا جو اس کی بہتری کا خواہاں تھا۔ ہر طرح کی ناز برداری کرتا تھا۔ اس کی دونوں اولادیں بھی اطمینان سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔

انو دودھ پی پی کر خوب موٹا ہوگیا تھا۔ اس کے گال سرخ پڑگئے تھے۔ البتہ وہ سلطانہ کی طرف سے پریشان تھی۔ سلطانہ چپ چپ رہتی۔ اس کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ ماں اس کا دکھ جانتی تھی لیکن اس نے کبھی اس کے زخموں کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی

ایثار: دوسروں کے فائدے کے لئے خود نقصان اٹھانا۔ عقد ثانی: دوسرا نکاح۔ خواہاں: خواہش مند۔

کہ کسی طرح اس کے ہاتھ پیلے کر دے اور وہ اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ مگر یہ بات نیاز سے کہتے ہوئے جھجکتی تھی۔ حالانکہ نیاز کا رویہ اب سلطانہ کے ساتھ کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں تھا۔

گھر میں بہر حال سکون اور اطمینان تھا اور اس کے لیے نوشا کی ماں نیاز کی ممنون تھی۔ وہ اب اس کا بے حد خیال رکھتی۔ سویرے ہی سویرے اٹھ کر اس کے لیے غسل خانے میں نہانے کا انتظام کرتی۔ اجلا تولیہ، منجن اور صابن سنبھال کر رکھتی۔ جوتوں پر پالش کرتی۔ پہننے کے لیے کپڑے نکالتی۔ ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکتی۔ کسی کپڑے میں مرمت کی ضرورت ہوتی تو سی کر درست کرتی۔ جتنی دیر میں نیاز غسل خانے سے نہا کر نکلتا وہ ناشتا تیار کر دیتی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نیاز کے دکان جانے سے قبل ناشتا نہ تیار ہو گیا ہو۔ وہ گھر سے نواب بن کر نکلتا تھا۔ دوست احباب مذاق میں چھیڑتے۔

"ابے نیاز تو چھیلا بن گیا ہے۔"

"سالے پر جوانی چڑھ رہی ہے۔"

واقعی اب اس کا رنگ بھی نکھر گیا تھا۔ چال ڈھال میں نرالی سج دھج پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ سب کچھ بیوی کی بدولت تھا جس سے اسے انسیت بھی تھی اور نفرت بھی۔ اور یہ دونوں جذبے بیک وقت کام کر رہے تھے۔ کبھی وہ اس کی محبت سے اتنا سرشار ہو جاتا کہ جی چاہتا کہ ساری زندگی اسی کے ساتھ گزار دے۔ اسے اس عورت کی ضرورت تھی جس نے اس کی زندگی سنوار دی تھی۔ لیکن اس محبت میں پچاس ہزار روپے کا نقصان تھا اور اتنی بڑی رقم وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پچاس ہزار کے لیے ہی اس نے سب کچھ کیا تھا اور اس کے بل بوتے پر آئندہ کے بڑے بڑے منصوبے تیار کئے تھے۔ اس کے علاوہ سلطانہ تھی۔ وہ اس کی بھرپور جوانی اور دل کش چہرہ دیکھتا تو سینے میں الاؤ دہکنے لگتا۔

نیاز کا وقت اسی کش مکش میں گزر رہا تھا۔ شادی کرنے سے پہلے جو پروگرام بنایا تھا اس کے متعلق اب وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے خود علم نہیں تھا کہ آئندہ کیا کرے گا۔ وہ روزانہ دکان پر تنہائی میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرتا مگر جب گھر پہنچتا تو سارے ارادے مکڑی کے جال کی طرح تار تار ہو جاتے۔

عام طور پر وہ رات کے نو بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا۔

ممنون: شکر گزار۔ چھیلا: مراد کم عمر نوجوان، شوخ۔ انسیت: محبت۔ تذبذب: سوچ بچار۔ تار تار: ٹکڑے ٹکڑے۔

نیاز جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوتا بیوی اٹھ کر دروازے پر آجاتی۔ مسکرا کر کہتی۔

"آپ تو بڑی دیر لگادیتے ہیں۔ سارا کھانا ٹھنڈا مٹی ہو گیا۔"

وہ نیاز کے ہاتھوں میں دبا ہوا سامان لیتی۔

وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ وہ اسے کرسی پر بٹھا کر تولیے
پیشانی اور گردن کا پسینہ پونچھتی۔ خود اپنے ہاتھ سے اس کا جوتا اتارتی اور پیروں کے نیچے چو
دیتی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے باہر چبوترے پر جاتا۔ وہاں لوٹے میں پانی ہوتا اور صابن دانی موجود ہو
بیوی باورچی خانے میں جاکر کھانا گرم کرتی۔ نیاز کو میٹھی چیزوں سے رغبت تھی۔ وہ ہر
کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور تیار کرتی۔

دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ سلطانہ اور اتو عام طور پر سر شام ہی کھانا کھا کر اپ
بستروں پر سونے کے لیے چلے جاتے تھے۔ نیاز مزا لے لے کر کھانا کھاتا اور سوچتا جاتا۔ ابے نیاز کہا
اس عورت نے تیرے چار چاند لگادیئے۔ بیٹا ایسے عیش تو تم نے باپ کے زمانے میں بھی نہیں کیے

❁ ❁ ❁

ایک روز گیارہ بجے دن کو نیاز کسی ضرورت سے دکان سے اٹھ کر گھر آیا۔ اس وقت سلا
بالکل اکیلی تھی۔

ماں کسی رشتے دار کی عیادت کے لیے گئی تھی۔ ویسے عام طور پر اب وہ کہیں آتی جاتی نہ تھ
اس دن محض اتفاق تھا کہ وہ گھر پر سلطانہ کو تنہا چھوڑ گئی۔ نیاز نے پہلے تو بیوی کو تلاش کیا۔ جب
کہیں نظر نہ آئی تو سلطانہ کے پاس گیا۔

وہ پلنگ پر گم صم بیٹھی تھی۔

نیاز اس کی پشت پر جاکر کھڑا ہو گیا۔ پوچھا۔ "سلطانہ تمہاری اماں کہاں ہیں؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "خالہ دلبری کے پاس گئی ہیں۔ سنا ہے ان کی طبیعت بہت خراب ہے"

نیاز کچھ کہنے ہی جارہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سلطانہ کی پیٹھ پر پڑ گئی۔

اس کا کرتا مسک گیا تھا اور اندر سے اس کی گوری گوری جلد جھلک رہی تھی۔ نیاز بے

رغبت: شوق، پیار۔ سر شام: شام ہوتے ہی۔ چار چاند لگانا: مزہ و عیش کرانا۔ عیادت: تیمارداری۔ مسک جانا: زور پڑنے کی وجہ سے کپڑ
تھوڑا سا پھٹ جانا۔

ہو گیا۔ ذرا دیر تک سانس روکے اس کی نرم نرم جلد دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے دریافت کیا۔

"تم چپ چپ کیوں بیٹھی ہو؟"

"سر میں درد ہے۔" سلطانہ نے حیلہ جوئی سے کام لیا۔

"لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔" نیاز نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے۔ سلطانہ سر
سے پیر تک کانپ گئی۔ اس نے اپنا بدن سمیٹا اور ایک طرف کھسک کر بولی۔

"آپ تکلیف نہ کریں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ کھسیانا ہو کر بولا۔ "تم مجھ سے اس قدر کترانے کیوں لگی ہو؟"

وہ اس کی بات کا جواب کیا دیتی خاموش بیٹھی رہی۔

نیاز نے اصرار کیا۔ "بولو کیا بات ہے؟"

"کاہے کے لیے؟"

"یہی کہ تم مجھ سے دور دور رہتی ہو۔"

سلطانہ کو غصہ تو بہت آیا۔ لیکن وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔

"کیا مطلب؟"

"تم مجھ سے کچھ ناراض ہو؟"

"نہیں! آپ کو وہم ہو گیا ہے۔"

نیاز نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اور بے قابو
ہو گیا۔

اس نے جھک کر بے اختیار سلطانہ کا ایک رخسار چوم لیا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پلنگ سے نیچے اتر آئی۔ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے گھورنے لگی۔

نیاز نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو سلطانہ نے اس کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ رسید کیا۔

غضب ناک ہو کر بولی۔

"آپ کو شرم نہیں آتی۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو اچھا نہ ہو گا۔"

وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

یانا: شرمندہ۔ کترانا: بچنا۔ تڑاق سے: زور سے۔

لیکن نیاز نے معاملے کو الٹا سمجھنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا۔ سلطانہ اس لیے سخت ناراض ہے کہ اس کے بجائے اس نے ماں سے شادی کیوں کی؟ وہ ذرا دیر تک چپ چاپ دالان میں کھڑا رہا پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

دکان پر جا کر اس نے طے کیا کہ اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو سلطانہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ رات کو وہ گھر واپس آیا تو دوپہر کے واقعے سے کسی قدر سہما ہوا تھا۔ مگر جب بیوی کے رویے میں فرق نہ پایا تو اس نے سوچا، معلوم ہوتا ہے سلطانہ نے ماں سے اس کی بے جا حرکت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس کے اس مغالطے کو اور بھی تقویت پہنچی کہ سلطانہ کے دل میں ابھی تک اس کے لیے گنجائش ہے۔

اس نے رات ہی کو طے کیا کہ کل ہی ڈاکٹر موٹو سے ملے گا۔

❀ ❀ ❀

نیاز پروگرام کے مطابق ڈاکٹر موٹو سے نہ مل سکا۔ گھر سے نکلتے ہی سردار سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ بڑا چلتا پرزہ قسم کا آدمی تھا۔

وہ پسنی کے راستے غیر ملکی اشیاء اسمگل کر کے لاتا تھا۔

سردار ملتے ہی بولا۔ "کچھ سودا وودا کرتے ہو؟"

نیاز کا ایک بار پہلے بھی اس سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ مگر وہ سودا ایک دلال کی معرفت ہوا تھا۔ اس لیے وہ ذرا ہچکچایا۔

"لے لو نہیں تو بعد میں پچھتاؤ گے۔ اچھی رقم بن جائے گی۔"

نیاز نے دریافت کیا۔ "مال کس قسم کا ہے؟"

"سگریٹ ہیں۔"

سگریٹ کا سودا اس نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ بے دلی سے بولا۔ "بھئی سگریٹ کا کام تو میں کرتا نہیں۔"

سردار نے ہنس کر کہا۔ "تم کاروبار میں ابھی کچھ دن مجھ سے ٹریننگ لو۔ تم کو بازار کا پتہ ہی نہیں ہے۔ آج کل شہر میں سگریٹ مل کہاں رہی ہے۔" نیاز نے سوچا اگر سگریٹ کی شہر میں قلت ہے

بے جا: غیر ضروری، فضول۔ مغالطہ: غلط فہمی۔ تقویت: طاقت، تسلی۔ مڈبھیڑ: آمنا سامنا، ملاقات۔ چلتا پرزہ: چالاک۔

تب تو اچھی رقم نکل آئے گی۔

"اچھا چلو مال دکھاؤ۔" نیاز نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

سردار نے وہیں سے تانگا لیا۔ اس میں سوار ہو کر دونوں ہوٹل پہنچے۔ سردار وہیں ٹھہرا تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر مال دکھایا۔ سگریٹ کے پیکٹ پانچ بکسوں میں بھرے تھے۔

دو ہزار میں سودا طے ہو گیا۔ نیاز اسے گھر لے آیا۔ بیوی سے رقم لی اور سردار کو دو سو روپے بیعانہ بھی دے دیا۔ طے ہوا کہ مال رات کو لے کر وہ خود اس کی دکان پر آئے گا اس کے جانے کے بعد نیاز کے لیے اب دو ضروری کام رہ گئے۔ سب سے پہلے اس نے محمد خاں کو تلاش کیا۔ وہ اس کا واقف کار تھا اور پولیس کا قابل اعتماد اور پرانا مخبر تھا۔ انچارج تھانہ سے نیاز کبھی نہیں ملا۔ ہمیشہ محمد خاں کے توسط سے بات کرتا تھا انچارج کوئی ہو اس کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔

محمد خان کو اس نے سو روپے دیئے اور مطمئن ہو کر تھانے سے باہر آ گیا۔ بازار جا کر اس نے سگریٹ فروشوں سے معاملے کی بات چیت کی۔

سگریٹ کی سخت قلت تھی۔ مال کے اچھے دام لگے۔ کچھ دکاندار اس قدر ضرورت مند تھے کہ انہوں نے کچھ رقم پیشگی بھی دے دی۔

دس بجے کے قریب سردار ایک تانگے میں سگریٹوں سے بھرے ہوئے بکسے لے کر آ گیا۔

نیاز نے مال سنبھالا۔ پوری رقم ادا کی اور سردار کو ایک پیالی چائے پلا کر رخصت کر دیا۔

دوسرے روز دوپہر سے پہلے پہل تمام بکسے خالی ہو گئے۔ سگریٹ کے پیکٹ دکانوں پر پہنچ گئے۔ اس سودے میں اسے ہزار روپے سے زائد مل گئے۔ نیاز بہت خوش تھا کہ بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا سودا مل گیا۔ زیادہ بھاگ دوڑ بھی کرنا نہیں پڑی۔ دکان میں مال رکھ کر خطرہ بھی مول لینا نہیں پڑا۔

اس روز وہ سرِ شام ہی دکان بند کر کے گھر پہنچ گیا۔ بیوی اور انو کو ساتھ لے کر سنیما چلا گیا۔

سلطانہ گھر پر تنہا رہ گئی۔ اس نے تنہائی میں بے قرار ہو کر سوچا۔ اس وقت سلمان آ جائے تو کتنا اچھا ہو۔

بڑی سہانی رات تھی۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے۔ شیشم کے پتے آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ وہ کئی بار دالان سے نکل کر صحن میں آئی۔ کھلے آسمان کے نیچے اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ ہوا میں رچی ہوئی آمد بہار کی مہک محسوس کی اور گلی میں

ابھرنے والی راہ گیروں کی چاپ پر کان لگا دیئے کہ شاید ان میں سلمان بھی شامل ہو۔

(۴)

سلمان نے جھاڑن سے تختہ سیاہ صاف کیا اور کلاس کی جانب مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے کچھ چٹائیوں پر ۱۳۶افراد بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے تیز دھوپ سے سنولائے ہوئے تھے۔ جسم پر بو... لباس تھے جن سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ یہ اس کے شاگرد تھے۔

سلمان نے سب پر ایک نظر ڈالی اور اونچی آواز سے بولا۔ "آج آپ لوگوں کا امتحان ہوگا۔"

کسی نے دبی زبان سے پوچھا۔ "امتحان؟"

سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔ "جی ہاں! میں بورڈ پر جملے لکھوں گا اور ہر ایک سے باری با... پڑھواؤں گا۔ جس سے میں کہوں گا وہی پڑھے گا۔ کوئی بیچ میں نہیں بولے گا۔"

سلمان تختہ سیاہ پر کھریا سے لکھتا اور باری باری سب سے پڑھواتا۔ بعض شاگردوں نے بڑ... فر فر پڑھ دیا۔ بعض کو کسی قدر دقت پیش آئی۔ مگر ہر شخص نے جملے پڑھ ڈالے۔ اسے بے حد... ہوئی۔ ابھی پورا کورس ختم ہونے میں بارہ سبق باقی تھے۔ مگر اس عرصے میں وہ اچھا خاصا پڑھ لینے قابل ہو گئے تھے۔ ان میں ذوق و شوق بھی بہت تھا۔ اس امتحان میں بھی ہر شخص بڑھ چڑھ کر... لے رہا تھا۔ ان کی دلچسپی دیکھ کر اس نے بلیک بورڈ پر زیادہ مشکل جملے لکھے۔ کچھ نے روانی کے ساتھ کو پڑھا۔ کچھ اٹک کر رہ گئے۔ یہ سلسلہ بھی کچھ دیر چلتا رہا۔ آخر وہ نثر ختم کر کے نظم پر آ گیا۔

عین اس وقت علی احمد بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اکثر اپنے گروپ کے اسکائی لار کوں کی سرگر... کا معائنہ کرنے آتا تھا۔ ان میں جو خامی دیکھتا اس پر ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتا اور ا... کرنے کی کوشش کرتا۔

اس وقت سلمان بورڈ کی طرف منہ کئے لکھنے میں مصروف تھا۔ علی احمد چپ چاپ ایک طر... کھڑا ہو گیا۔

وہ ہمیشہ اسی طرح خاموشی سے آتا تھا۔

چاپ: قدموں کی آواز۔ جھاڑن: صفائی کا کپڑا۔ فر فر: تیزی سے۔

سلمان جب تختہ سیاہ کے سامنے سے ہٹا تو سب نے دیکھا اس پر یہ شعر درج تھا۔

چمکنے سے بجلی کے تھا وہ سماں

ہوا میں اڑیں جیسے چنگاریاں

اس نے جس شاگرد کی جانب اشارہ کیا اس نے اٹھ کر فوراً شعر پڑھ دیا۔ سلمان نے ایسے ہی کئی اور سادہ اور عام فہم اشعار بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھوائے۔ اشعار لکھتے لکھتے اچانک اسے سلطانہ کی یاد آ گئی اور اس کی یاد کے ساتھ ہی وہ خوابوں میں بھٹکتا دور نکل گیا۔ اب وہ ایسے اشعار لکھنے لگا جن کو پڑھتے ہوئے لوگ اٹکنے لگے۔ ایک بار تو خاصی گڑبڑ ہو گئی۔ اس نے بلیک بورڈ پر لکھا۔

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل

پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل

یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

سلمان نے جس شاگرد سے پڑھنے کے لیے کہا تھا اس نے پہلا مصرعہ تو روانی سے پڑھ دیا۔ دوسرے مصرعے نے خاصا پریشان کیا۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ چہرے پر چگی ڈاڑھی تھی اور دیکھنے میں مریل سا نظر آتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے سلمان سے پوچھا۔

"ماسٹر جی! لالہ تو سمجھ میں آ گیا وہی جو آپ نے پہلے دن پڑھایا تھا۔ پر یہ شہناز کون ہے؟"

پیچھے سے کسی من چلے نے اسے چھیڑا۔ "بوٹا کی بہن شہناز اور کون؟ وہی جو پرلی گلی میں رہتی ہے۔"

فوراً ہی ایک اور آواز آئی۔ "یہ سالا جھوٹ بولتا ہے۔ ابے یہ تو صاف کلکتے والی شہناز ہے۔"

کسی بوڑھے نے جل کر اسے ڈانٹا۔ "کیا بات کر رہا ہے لمڈے؟ کلکتے والی تو گوہر جان تھی۔ یہ کوئی اور ہوگی۔"

یہ تبصرہ سن کر سلمان پریشان ہو گیا۔ علی احمد نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا۔ سلمان نے نظم کے اس بند کو فوراً جھاڑن سے مٹا دیا اور ایک آسان شعر لکھا۔

سماں: نظارہ، منظر۔ میخانہ: شراب خانہ۔ شہناز: بہت زیادہ ناز و ادا والی۔ لالہ رخ: حسین۔ کاشانہ: رہنے کی جگہ، گھر۔ وحشت دل: دل کی دیوانگی / آوارگی۔ چگی ڈاڑھی: جسکی ڈاڑھی کے بال کم ہوں۔ مریل: بہت کمزور۔ من چلا: شوخ۔ لمڈا: لڑکا۔

بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ
ہجر کی شب اور آخرِ شب

ابھی اس نے کسی سے پڑھنے کا اشارہ بھی نہ کیا تھا کہ ایک نوجوان نے اٹھ کر بڑی سادگی سے کہا "ماسٹر جی! آخری شب کی 'ی' چھوٹ گئی ہے۔" اس نے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس طرح گردن اونچی کر کے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ اب ہم تو ماسٹر جی کی بھی غلطیاں پکڑ لیتے ہیں۔ سلمان اس وار سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک بوڑھے نے اٹھ کر پوچھا۔

"ماسٹر جی! یہ ہجر کی شب کیا ہووے ہے؟"

اسی وقت کسی نوجوان نے ٹوکا۔ "چاچا بیٹھ جا۔ یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

دوسرا اس سے بھی دو قدم آگے گیا۔ "اَبے یہ عاشق معشوق کی باتیں ہیں۔" اس نے کان پر ہاتھ رکھا اور زوردار نعرہ لگایا۔

"ہائے مدھو بالا۔ پلادے شربت وصل کا پیالا۔"

اس بات پر خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے اٹھ کر احتجاج کیا کہ جس نوجوان نے بالا والی بات کہی ہے اسے سزا کے طور پر فوراً کلاس سے نکال دیا جائے۔ مگر وہ نکلنے پر کسی طور پر تیار نہ تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اس نے صرف شعر پڑھا تھا۔ گالی نہیں بکی تھی۔ کچھ اس کے حمایتی بھی پیدا ہو گئے۔ اس طرح دو ٹولیاں بن گئیں اور ایک دوسرے کے خلاف شور مچانے لگیں۔ سلمان گھبرا گیا۔

فوراً ہی علی احمد سامنے آ گیا۔ اس نے انہیں سمجھا بجھا کر کلاس کو قابو میں کیا اور دیر تک تختۂ سیاہ پر عام فہم اور دلچسپ جملے لکھ لکھ کر پوچھتا رہا۔

اس رات سلمان اور علی احمد تعلیم بالغاں کے مرکز سے دیر میں لوٹے۔ راستے میں علی احمد نے سلمان کو سمجھایا کہ جن لوگوں کو وہ پڑھاتا ہے وہ بہت پس ماندہ اور پچھڑے ہوئے ہیں۔ فلک پیا کا مقصد فی الحال یہ ہے کہ انہیں اتنا علم سکھا دیا جائے کہ وہ کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کی ذہنی نشو و نما مطالعے سے ہو گی، جو بعد کا مرحلہ ہے۔

سلمان چپ رہا۔

بیت گئی: گزر گئی۔ ہجر: جدائی۔ شربتِ وصل: مراد ملاقات۔ پچھڑے ہوئے: مراد کم علم۔

علی احمد نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے رومانٹک موڈ نے تو پوری کلاس کو رومانٹک بنا دیا تھا۔"

سلمان پہلے ہی شرمندہ تھا۔ اس جملے پر اور شرمندہ ہو گیا۔ اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ خاموشی سے علی احمد کا طنز جھیل گیا۔

❁ ❁ ❁

فلک پیا کا ماہانہ اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر زیدی نے ہر گروپ کے بارے میں رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے تجزیے سے یہ اندازہ ہوا کہ علی احمد کا گروپ سب سے زیادہ کامیاب اور موثر ثابت ہو رہا تھا۔ دارالمطالعہ قائم کرنے والے گروپ کا کام افسوس ناک حد تک سست اور غیر موثر تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ فی الحال ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا تھا۔ وہ ایسی بستی میں تھا جہاں کی بیشتر آبادی بالکل ان پڑھ تھی۔ دارالمطالعہ ہر وقت خالی رہتا۔ کبھی کبھار کوئی آتا تو صرف رسالوں اور اخباروں کی تصاویر دیکھ کر چلا جاتا۔ لہٰذا اجلاس نے یہ فیصلہ کیا کہ دارالمطالعہ گروپ ختم کر دیا جائے اور اسے تعلیم بالغاں گروپ میں مدغم کر دیا جائے۔

تعلیم بالغاں کے ساتھ ساتھ تقریروں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ صفدر بشیر اپنے گروپ کے دو ساتھی لڑکوں کے ہمراہ روزانہ کسی پس ماندہ بستی میں جاتا اور اچھا شہری بننے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے اور تعلیم کی اہمیت پر زور دیتا۔ توہم پرستی اور فرسودہ رسم و رواج سے پیدا ہونے والی سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتا۔ انھیں ترک کرنے اور ان کے خلاف موثر طور پر جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا۔ وہ عام فہم انداز میں ان کی ذہنی تربیت کرتا۔ ان کا سیاسی اور سماجی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتا۔

ہر شام وہ کسی چوراہے یا گلی کے نکڑ پر کھڑا ہو جاتا۔ اپنی تقریر شروع کرتا۔ اس کی تقریر سننے کے لیے لوگ اکٹھا ہوتے۔ دلچسپی اور توجہ سے اس کی باتیں سنتے اور اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ جاتے۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد صفدر بشیر یہ محسوس کرنے لگا کہ ان جلسوں کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی حیثیت مجمع گیر عطائی معالج یا دوا فروش کی مانند ہے جو اپنی لچھے دار اور پر لطف باتوں سے لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کی جیبوں سے رقم نکلوانے کا گر جانتا ہے۔

صفدر بشیر اپنی کوششوں کے بارے میں اسی انداز سے سوچ رہا تھا۔

مدغم کرنا: باہم ملا دینا۔ توہم پرستی: مراد پرانے خیالات کو ماننا۔ فرسودہ: پرانے۔ مجمع گیر: مجمع لگانے والا۔ عطائی: وہ شخص جس نے کسی فن کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی ہو۔ لچھے دار: مزیدار / پُر پیچ باتیں۔ گر: فارمولا، کسی کام کے کرنے کا خاص طریقہ کار۔

وہ عوام میں جس تبدیلی کے دیکھنے کا خواہاں تھا کہیں نظر نہ آتی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر زید
اپنی رپورٹ میں اس کے گروپ کی کوششوں کو سراہا تھا اور یہ موقف اختیار کیا تھا کہ تحریک
بالغاں کو کامیاب بنانے میں صفدر بشیر اور اس کے گروپ کے دوسرے اسکائی لارکوں کی تو
نے بڑی حد تک زمین ہموار کی ہے۔

❁ ❁ ❁

شہر کے پس ماندہ اور نشیبی علاقوں میں ناگہاں ٹائی فائیڈ کی وبا پھوٹ پڑی۔ تعلیم بالغا
مرکزوں میں طلبا کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگی۔ ہر طرف بیماری کا زور تھا۔ صورت حال
تشویشناک تھی۔

صفدر بشیر نے فوراً فلک پیما کا ہنگامی اجلاس بلایا اور یہ تجویز پیش کی کہ اس کا گروپ بھی
جائے۔ ڈاکٹر زیدی کی سربراہی میں ایک نیا گروپ تشکیل دیا جائے جو ٹائی فائیڈ کے مریضوں
امداد مہیا کرے۔ اس تجویز کو صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر اتفاق رائے سے منظور کرا
فلک پیما کے فنڈ سے پانچ ہزار روپے ابتدائی اخراجات کے لیے منظور کیے گئے۔ ڈاکٹر زیدی کی،
لیے چار اسکائی لارک دیئے۔

سلمان نے بھی اس سلسلے میں ایک تجویز پیش کی اور وہ یہ تھی کہ تعلیم بالغاں کا کام چونکہ
کو ہوتا ہے لہٰذا اس گروپ میں کام کرنے والوں کو دن میں اپنے وقت کا کچھ حصہ طبّی امداد
دینا چاہیے۔ تجویز معقول تھی اور ہنگامی حالات میں نہایت مناسب تھی۔ چنانچہ اسے بھی
کر لیا گیا۔

صفدر بشیر نے سلمان کے اس جذبے کی دل کھول کر داد دی۔

جلد ہی فلک پیما کی جانب سے ٹائی فائیڈ کے مریضوں کے لیے ایک متاثر علاقے میں طبّ
کا مرکز کھول دیا گیا۔ بڑے جوش و خروش اور لگن سے طبّی امداد کا کام شروع ہوا۔ اسکائی ا
سویرے ہی سویرے ہیڈ کوارٹر سے نکلتے اور رات گئے لوٹتے۔

وہ مریضوں کو دوا دیتے۔ ان کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے۔ بیماری کے خلاف احتیاطی
اختیار کرنے کے طریقے بتاتے۔ گندگی سے پرہیز اور صفائی پر زور دیتے۔ وہ ہر کام ڈاکٹر زید

زمین ہموار کی: مراد بنیاد قائم کی۔ ناگہاں: اچانک۔ وبا: وہ بیماری جو ہوا کے خراب ہونے سے پھیلتی ہے۔ نزاکت: نازک ہونا۔

ہدایت اور مشورے سے کرتے۔

ڈاکٹر زیدی ان دنوں اس قدر مصروف رہتا کہ سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اکثر رات کو طبّی
مرکز میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ ذرا آنکھ لگتی کہ اطلاع ملتی فلاں مریض کی حالت نازک ہے۔
وہ فوراً اس کے پاس پہنچتا۔

کچھ عرصے بعد یہ اندازہ ہو گیا کہ ایک ڈاکٹر سے کام نہ چلے گا۔ ڈاکٹر زیدی کی کوشش سے دو
ڈاکٹروں کی رضاکارانہ خدمات حاصل کی گئیں۔ دونوں نیک دل اور خدا ترس تھے۔ ان میں خدمت
خلق کی لگن بھی تھی۔ اب فلک پیما نے دو طبّی مراکز اور کھول دیئے تھے۔ ہر مرکز کا انچارج ایک
ڈاکٹر تھا۔

ان کیمپوں کے اخراجات کے لیے مزید پانچ ہزار کی رقم منظور کی گئی۔ شہر کے سرکاری اور
خیراتی اسپتالوں کا انتظام انتہائی ناقص تھا اور ان سے بھی زیادہ افسوس ناک رویہ بیشتر پرائیویٹ
پریکٹس کرنے والے ڈاکٹروں کا تھا۔ لہٰذا مریض فلک پیما کے طبّی امداد کے مرکزوں میں علاج
کرانے کو ترجیح دیتے۔

ہر وقت وہاں مریضوں کا ہجوم رہتا۔

❁ ❁ ❁

ٹائی فائیڈ کی وبا رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ مگر اس سلسلے میں فلک پیما نے جو کام کیا اس نے اسکائی
لارکوں کو پس ماندہ علاقوں اور بستیوں میں بہت مقبول بنا دیا۔

آئندہ اجلاس میں جب ہر گروپ کے کام کا جائزہ لیا گیا تو یہ تجویز سامنے آئی کہ اب چونکہ
ٹائی فائیڈ کی وبا ختم ہو چکی ہے لہٰذا طبّی امداد کا گروپ توڑ دیا جائے۔ لیکن بعض اسکائی لارکوں نے اس
کی شدید مخالفت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس گروپ کو برقرار رکھا جائے اور کسی بستی میں جگہ حاصل
کر کے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کیا جائے۔ اس منصوبے میں چونکہ اخراجات زیادہ تھے اس لیے متفقہ
طور پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کئی گھنٹے تک بحث جاری رہی۔ آخر رائے شماری ہوئی اور اکثریت اس
بات کے حق میں نکلی کہ اسپتال ضرور قائم کیا جائے۔

اسپتال کے لیے سب سے پہلے ایک قطعہ اراضی حاصل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مقصد

رضاکارانہ: بغیر معاوضہ / قیمت کے اپنی خدمات ملک و قوم کے لئے پیش کرنا۔ قطعہ اراضی: زمین کا ٹکڑا۔

کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی جس نے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر ایک ایسی جگہ منتخ
سڑک کے کنارے تھی اور اس کے نقطہ نظر سے نہایت موزوں تھی۔ دوسرے ہی دن فل
ایک وفد متعلقہ حکام سے ملا۔ حکام سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ آخر بہ
دھوپ کے بعد ایک قطعہ اراضی کا الاٹ منٹ مل گیا۔ مگر اس قطعہ اراضی کے ساتھ مشکل
کہ اس پر چند خاندان ناجائز طور پر قابض تھے اور ایک مدت سے وہاں آباد تھے۔ وہ اسے خالی کر
کسی طور پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی بے دخلی کا حکم نامہ جاری کیا گیا تو لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو
خاصی نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ فوراً فلک پیا کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا جس میں یہ طے کی
سلمان اپنا اثر و رسوخ کام میں لائے۔ اس لیے کہ اس علاقے میں تعلیم بالغاں کا جو مرکز قائم تھ
انچارج سلمان ہی تھا۔

دوسرے ہی روز سلمان نے اپنے شاگردوں سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ ماسٹر جی کا
کس طرح خالی جا سکتی تھی۔ دوبارہ اس مسئلے کی جانب توجہ دلانے کی نوبت نہ آئی۔ پوری ب
لوگوں کے سر ہو گئی کہ پلاٹ خالی کرو۔ منت سماجت بھی کی اور دھمکی بھی دی کہ پلاٹ خالی نہ
ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

وہ لوگ تعداد میں تھوڑے تھے۔ بستی کے ہزاروں افراد سے دشمنی مول نہیں لے
تھے۔ آخر انہوں نے جگہ خالی کر دی۔ بستی والوں نے دوسری جگہ ان کے مکانات تعمیر کر
لیے چندہ جمع کیا۔ پھر سب نے خود ہی مل جل کر پہلے ہی کی طرح جھگیاں اور نیم پختہ مکانات
کر لیے۔ یہ سارا کام آناً فاناً ہوا۔ نہ کوئی کھلبلی مچی نہ ہنگامہ ہوا، سب کام اطمینان اور سکون سے ہو
اسکائی لارکوں نے ایک روز جا کر دیکھا تو پلاٹ خالی تھا۔ ملبہ تک صاف کر دیا گیا تھا۔
زمین سرما کی ہلکی بسنتی دھوپ میں اجلی اجلی نظر آ رہی تھی۔ جگہ کا مسئلہ حل ہو گیا تو اسپتال کی
کام زیر بحث آیا۔

فنڈ میں صرف چھ ہزار روپے رہ گئے تھے۔ صفدر بشیر نے مزید دس ہزار روپے دیے۔
رقم بھی اسپتال کے لیے کم تھی۔

نقطہ نظر: خیال / اندازہ۔ بے دخلی: اخراج، نکالنا۔ اثر و رسوخ: تعلقات۔ آناً فاناً: دیکھتے ہی دیکھتے۔ چٹیل: صاف میدان جہاں
درخت نہ ہوں۔

اسکائی لارکوں نے ایک اجلاس میں مالی مشکلات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ اسپتال کی تعمیر کا
ام خود اپنے دست و بازو سے انجام دیا جائے۔
اس اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ علاقے کے عوام سے اسپتال کی تعمیر کے لیے چندہ
لے کی کوشش کی جائے۔ لیکن کئی اسکائی لارکوں نے تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اختلاف رائے کے
اعث اس تجویز پر اجلاس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اسے آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا۔ البتہ اسکائی
رکوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ علاقے کے رہنے والوں سے بات چیت کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانے کی
شش کریں کہ اگر چندے کی مہم شروع کی جائے تو اس کی کامیابی کے کس قدر امکانات ہیں۔

❁ ❁ ❁

اتوار کی صبح صفدر بشیر کی کوٹھی پر ایک جھلکتی ہوئی کیڈلک آ کر رکی۔ ایک ادھیڑ آدمی کار کا
روازہ کھول کر باہر آیا۔ اس کا جسم کسی قدر بھاری بھر کم تھا، سر کے بال اڑے ہوئے تھے، چہرے پر
ی تھی، آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا۔ اپنی آن بان اور وضع قطع سے وہ خاصا معزز لگتا تھا۔
وہ آہستہ آہستہ چھڑی کے سہارے چلتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہوا اور صفدر بشیر سے ملنے
خواہش ظاہر کی۔
صفدر بشیر اس وقت کوٹھی میں موجود تھا۔
ڈرائنگ روم میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اجنبی نے صفدر بشیر سے اپنا تعارف کرایا۔
اس کا نام خان بہادر فرزند علی تھا۔ اس کے پاس ہزاروں ایکڑ زرعی اراضی اور جائداد تھی۔ یہ
رکہ املاک تھی جو اس نے اپنے کلیم کی بنیاد پر الاٹ کرائی تھی۔ زمین داری کے ساتھ ساتھ اس نے
یمی کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کی مستقل رہائش بھی شہر ہی میں تھی۔ وہ خاندانی رئیس تھا۔
اس کا باپ بھی خان بہادر تھا۔ مگر تاج برطانیہ کی گراں قدر خدمات انجام دینے اور تمام تر
داری اور جاں نثاری کے باوجود سر کا خطاب حاصل کرنے کا ارمان دل میں لیے دنیا سے رخصت
گیا تھا۔

خان بہادر فرزند علی نے ملاقات کا مقصد یہ بتایا کہ وہ چندے کی صورت میں فلک پیا کی مالی
کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی کچھ تجاویز بھی تھیں۔ مسئلہ چونکہ اہم تھا لہٰذا سینئر

بان: شان و شوکت۔ وضع قطع: شکل و صورت۔ متروکہ املاک: چھوڑی ہوئی جائیداد۔

اسکائی لارکوں سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ صفدر بشیر نے علی احمد، فہیم اللہ اور ڈاکٹر ز
ڈرائنگ روم میں بلالیا۔ خان بہادر نے ان کے سامنے امداد کی پیش کش کی اور اس خواہش
کہ اسے اپنی تجاویز تمام ارکان کے سامنے پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ یہ بات فلک پیا
کے خلاف تھی۔ مگر صفدر بشیر کی سفارش پر خان بہادر کی درخواست منظور کر لی گئی۔

تمام اسکائی لارک اتفاق سے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔ لہٰذا اسی وقت فلک پیا کا ہ
بلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تمام اسکائی لارک کانفرنس روم میں جمع ہو گئے۔ خان بہادر بھی
کے ہمراہ کمرے میں پہنچ گیا۔ اجلاس کی صدارت کے لیے علی احمد کا نام تجویز کیا گیا جو
لارکوں کی تائید سے منظور کر لیا گیا۔ علی احمد صدر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا تو صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر خان بہادر فرزند علی کا
لارکوں سے تعارف کرایا اور اس کی مالی پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خان بہادر اس
اجلاس کے سامنے کچھ تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جب صفدر بشیر اپنی بات کہہ کر بیٹھ گیا تو خان بہادر نے کھڑے ہو کر صدر سے اجازت
کر گلا صاف کیا۔ رومال سے چہرے کا پسینہ خشک کیا۔ چشمہ آنکھوں پر درست کیا۔ اس تیاری
تقریباً ایک منٹ صرف کیا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کی آواز
اور لہجے میں نرمی تھی۔ بات کرتے وقت وہ بار بار اپنی گردن کو ایک خاص انداز سے خم دیتا تھا۔

اس نے سب سے پہلے فلک پیا کے فلاحی کاموں کی تعریف و توصیف کی۔ اسکائی
خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی۔ وہ اس وقت بڑے سرپرستانہ انداز میں بول رہا تھا۔ بار بار
کے ہلکے ہلکے کش لگاتا اور سامنے بیٹھے ہوئے اسکائی لارکوں کو ایسی نظروں سے دیکھتا
درس گاہ کے طالب علم ہیں، جن کا تجربہ محدود اور مشاہدہ زندگی کے ابتدائی مراحل میں
اسکائی لارکوں نے اس کی باتوں پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ نہ صرف سن و سال
بڑا تھا بلکہ خاصا باوقار بھی نظر آرہا تھا۔

خان بہادر اپنی بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے رکا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا
نکالا اور اسکائی لارکوں کے روبرو پیش کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ کی

رکھ رکھاؤ: سلیقہ۔ خاطر خواہ: خواہش کے مطابق۔ سن و سال: مراد عمر و تجربہ۔

تعمیر کرنا چاہتی ہے اور اس کے لیے اسے مالی امداد کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں میری جانب سے
یک حقیر پیش کش ہے۔ یہ بیس ہزار کا چیک ہے۔"

خان بہادر نے بیس ہزار پر خاص طور پر زور دیا اور اسکائی لارکوں کو اس طرح گردن اونچی کر
کے دیکھا کہ وہ چٹان کی طرح پرشکوہ نظر آنے لگا۔

اس نے بیس ہزار کا چیک صدر کو دیا۔ لمحہ بھر تک خاموش کھڑا رہا۔ اب اس کے چہرے پر
ڑی سنجیدگی چھا گئی تھی۔ اس نے سگار پر لمبا کش لگایا اور اسکائی لارکوں سے خطاب کرتے ہوئے
ں گویا ہوا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ ضرور اسپتال تعمیر کر لیں گے۔ آپ میں وہ جذبہ و عمل پایا جاتا
ہے جس سے زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دیے جا سکتے ہیں۔"

اچانک اس نے اپنا لہجہ بدل دیا۔ گردن کو اپنے مخصوص انداز میں خم دیا۔ "مگر آپ اسپتال
لائیں گے کس طرح؟ میرا مطلب اس کے اخراجات سے ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔
ومت کی امداد یا ذاتی فنڈ اور یہ دونوں ہی صورتیں فی الحال ممکن نہیں۔" خان بہادر فرزند علی نے
ار کے دو چار کش لگائے۔ سامنے بیٹھے ہوئے اسکائی لارکوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور سلسلہ کلام
اری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی تنظیم نے اس مسئلہ پر کیا سوچا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں میری
ک تجویز ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ دیکھیے بنیادی بات یہ ہے کہ اسپتال کے
راجات کے لیے ایک مستقل آمدنی کا وسیلہ ہونا ضروری ہے۔ کیوں نہ آپ ایسا کریں کہ اسپتال
کے نام پر دوائیں امپورٹ کرنے کا لائسنس حاصل کر لیں۔ یہ لائسنس تو بہرحال آپ کو حاصل
نا ہی پڑے گا۔ مگر اس میں اتنا اور کرنا پڑے گا کہ لائسنس اسپتال کی ضروریات سے زیادہ ہو۔ کم از
دوگنا ہونا چاہیے۔ دواؤں کا جو فاضل کوٹا بچے اسے بازار میں بہت اچھی قیمت پر فروخت کیا جا سکتا
ہے۔ میرا مطلب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔"

اس نے بلیک مارکیٹ میں دوائیں فروخت کرنے کی بات کہنے سے حتی الوسع احتراز کیا۔
رف مسکرا کر اسکائی لارکوں کو دیکھا۔ "امپورٹ لائسنس اور دواؤں کی فروخت کے بارے میں

پرشکوہ: رعب دار، شان و شوکت والا۔ طائرانہ: سرسری۔ فاضل: بچ جانے والا۔ حتی الوسع: جہاں تک ہو سکے۔ احتراز: پرہیز۔

آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ البتہ یہاں ایک با
وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ دواؤں کی فروخت سے جو منافع ہوگا اس میں ۵۰
اس پارٹی کو دینا پڑے گا جو آپ کے لیے امپورٹ لائسنس مہیا کرے گی اور دوائیں فروخت کر
بھی ذمہ دار ہوگی۔ اس لیے کہ یہ کام آپ لوگوں کے بس کا نہیں۔"

اس کی تجویز سن کر اسکائی لارکوں نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ کمرے کی فضا میں ار
پیدا ہوا۔ مگر کسی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔ خان بہادر
بدلی ہوئی فضا کو محسوس کیا اور بڑے شگفتہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

"ممکن ہے کہ آپ لوگ میری اس تجویز پر چونکیں کہ یہ شخص کیا بک رہا ہے۔ ہمیں
مارکیٹنگ کی ترغیب دے رہا ہے۔" اس دفعہ وہ کھل کر مسکرایا۔ "ہے تو بھئی یہ بلیک مارکی
مگر صاحب کبھی کبھی یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ سر سید مرحوم کو اپنے مشن کے لیے طوائفوں س
چندا ملا تھا۔ مولویوں نے بڑا شور مچایا کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ اس کا استعمال قطعی غیر شرعی
سر سید اگر ان کی باتوں سے مرعوب ہو جاتے تو جناب آج یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نظر نہ
جس نے سچ پوچھئے تو برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی بصیرت اور بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔
غالب نے غالباً اسی موقعے کے لیے کہا تھا۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اس نے اسکائی لارکوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ "کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نیک کام کے لیے
کبھی برائی کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔"

خان بہادر نے ذرا دیر کے لیے خاموشی اختیار کی۔ سگار سے تھوڑا سا شغل کیا اور فاتحانہ
سے سر اونچا کر کے تمام اسکائی لارکوں کے رد عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اسکائی لارکوں
کشیدگی کا احساس زائل ہو رہا تھا۔ ان کے چہرے سوچتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں خا
چھائی تھی۔ خان بہادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور لہجے میں شفقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔
"جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کچھ کام کروں۔ بھاگ دوڑ کرنا اب میرے بر
بات نہیں۔ عمر پچپن سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ مگر کام کرنے کا حوصلہ ضرور ہے۔ آپ لوگ

ارتعاش: بے چینی، سنسناہٹ۔ مضمر: چھپی ہوئی، پوشیدہ۔ کشیدگی: کھنچاؤ، رنجش۔ زائل ہونا: دور ہونا، کم ہونا۔

مجھے اپنا مشیر بنا لیں۔ پھر دیکھئے میں کیسے اس تنظیم کو چلاتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ یاد رکھئے۔ ہر کام
کے لے روپیہ بہت بڑی قوت ہے۔ تنظیم بنا لینا آسان ہے، مگر اس کا چلانا بہت مشکل ہے۔ بغیر فنڈ
کے کوئی جماعت یا تنظیم نہیں چلتی۔ بہر حال میں نے آپ کے سامنے ایک مخلصانہ تجویز پیش کی
ہے۔ اب جو جی چاہے آپ لوگ فیصلہ کریں۔ آپ کو اختیار ہے۔ وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے ؂

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں

"بس مجھے یہی عرض کرنا تھا۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی۔ میں نے خلوص دل اور نیک نیتی
سے اپنی معروضات پیش کر دیں۔"

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ سگار پر کش لگاتا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر
خاموشی چھائی رہی۔ پھر کئی اسکائی لارکوں نے صدر سے بولنے کی اجازت چاہی۔ مگر اس نے کسی کو
کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ خان بہادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "خان بہادر صاحب! ہم آپ کے
قیمتی مشوروں کے لیے بے حد ممنون ہیں۔ اب ہمیں اس بات کا موقع دیجئے کہ ہم اس کے تمام
پہلوؤں پر غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

خان بہادر نے کہا۔ "آپ اپنے فیصلے سے مجھے کب تک مطلع کر سکیں گے؟"

"مجھے یقین ہے کہ اسی اجلاس میں کچھ نہ کچھ ضرور طے ہو جائے گا۔"

وہ بولا۔ "اگر آپ مجھے بھی بحث میں حصہ لینے کا موقع دیں تو مجھے اپنا نقطہ نظر سمجھانے
میں سہولت ہوگی۔"

علی احمد نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے
کہ میں ایسی اجازت نہ دے سکوں گا۔ یہ بے ضابطہ بات ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اپنی بات بڑی
وضاحت کے ساتھ بیان کر دی۔ اب اس سے زیادہ وضاحت کی اور کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔"

خان بہادر فرزند علی نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ رات کے نو بجے آنے کا وعدہ کر کے رخصت
ہو گیا۔ صفدر بشیر نے تمام اسکائی لارکوں کی جانب سے اس کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی کے گیٹ تک
چھوڑنے گیا۔

نیک و بد: اچھائی برائی۔ معروضات: معروضہ کی جمع، گزارشات۔ بے ضابطہ: قانون کے خلاف، قاعدہ کے خلاف۔

اس کے جانے کے بعد اجلاس کی کاروائی ازسر نو شروع کی گئی۔ صدر نے خان بہادر
پر اسکائی لارکوں کو اظہار رائے کی دعوت دی۔ وہ بہت دیر سے بولنے کے لیے بے چین تھ
بار ہی کئی اسکائی لارکوں نے بولنا شروع کر دیا۔ اس طرح اجلاس میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ وہ
بول رہے تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو خان بہادر کے ہم خیال تھے اور وہ بھی تھے جو اس
مخالفت کر رہے تھے۔ اجلاس کا رنگ بگڑتا جا رہا تھا۔ علی احمد نے بڑی مشکل سے صورت حال
میں کیا اور بحث کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک اسکائی لارک اگر تجویز کی حمایت میں
دوسرے کو مخالفت میں بولنے کا موقع دیا جاتا۔ پھر بھی بار بار مداخلت کی جاتی۔

اس بحث سے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اسکائی لارکوں کی اکثریت خان بہادر کی ہم خیال۔
میں سلمان پیش پیش تھا۔ وہ اس وقت بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں نہ صر
بات پر زور دیا کہ خان بہادر کی تجویز قبول کر لی جائے بلکہ جذبات کی رو میں اور بھی بہت کچھ
تقریر کرتے کرتے ایک بار اس نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو دواؤں کی چور بازاری پر اعتراض ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ہمیں بینکوں
پڑے، سرمایہ داروں کی تجوریاں توڑنا پڑیں، جاگیروں کے محلوں پر ڈاکہ ڈالنا پڑے تو ہمیں ا
بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں روپیہ چاہیے۔ غریب اور پس ماندہ عوام کی فلاح و بہبود کے
ان کی بھلائی کے لیے۔ ہم اس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہمارا نصب انہیں بلند اور ہمارا
عظیم ہے۔ ہمیں جھوٹی اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کس طرح جلد
اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ ہمیں وقت کی اہمیت کسی حال میں بھی فراموش نہیں
چاہیے۔"

وہ دیر تک اسی انداز میں بولتا رہا۔ اس نے تقریر ختم کی تو اس کے ہم خیال اسکائی لارکوا
زور زور سے تالیاں بجائیں۔

فلک پیما کا یہ اجلاس سہ پہر کو شروع ہوا تھا اور شام تک جاری رہا۔ اسکائی لارکوں نے ا
سہ پہر کی چائے بھی کانفرنس روم ہی میں پی اور اجلاس کی کارروائی جاری رکھی۔ بڑی گرماگرم

ہوئی۔ جب شام کا دھندلکا کوٹھی کے در و دیوار پر پھیل گیا اور کانفرنس روم کی دیوار گیریوں سے
نارنجی شعاعیں پھوٹنے لگیں تو علی احمد بولنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ آنکھوں میں
سکون تھا۔ اس نے جذبات سے عاری نرم اور شگفتہ لہجے میں اپنی تقریر شروع کی۔

"اسکائی لارک ساتھیو! میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ
ایک عام اسکائی لارک کی حیثیت سے۔ یہ میری انفرادی رائے ہو گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکائی
لارکوں نے خان بہادر فرزند علی کی تجویز کے بنیادی مقصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ خان بہادر
کاروباری قسم کے آدمی ہیں۔ روپے سے روپیہ پیدا کرنا ان کا مقصد حیات ہے۔"

سلمان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بھی خان بہادر کے بارے میں کسی قسم کی خوش
فہمی نہیں ہے۔ ہم ان کو فرشتہ نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ دیکھنا چاہیے۔۔۔۔"

علی احمد نے سلمان کو آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "میں اسکائی لارک سلمان احمد سے
درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیں۔" سلمان نے اسے مشتعل کرنے کی
کوشش نہیں کی اور خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ علی احمد نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خان بہادر کا مقصد حیات زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنا ہے، یعنی
اپنی ضروریات سے بہت زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ خواہش ایک مجرمانہ فعل ہے۔ اس
کا مطلب ہے دوسروں کے گھروں سے روشنی چھین کر اپنے ایوانوں میں چراغاں کرنا۔ غریبوں کے
پسینے سے جھلکتی ہوئی کاروں کے لیے پیٹرول مہیا کرنا۔ لاکھوں انسانوں کے لیے برہنگی اور اپنے لیے
اطلس و کمخواب۔" علی احمد کا لہجہ بتدریج تیکھا ہوتا گیا۔ اس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہو گئی۔ "یہ محنت
کا استحصال ہے۔ ڈاکہ زنی ہے۔"

اسکائی لارکوں میں سنسنی پھیل گئی۔ وہ سحر زدہ انسانوں کی طرح خاموش بیٹھے علی احمد کو دیکھتے
رہے جواب اونچی آواز سے بول رہا تھا۔

"خان بہادر سے ہمارا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری راہیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف
ہیں۔ وہ فلک پیما کو اپنے مقاصد کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے دواؤں کی بلیک مارکیٹ ہو گی اور خان

عاری: خالی۔ ایوان: محل۔ برہنگی: بے لباسی۔ اطلس و کمخواب: ریشمی کپڑے۔ بتدریج: آہستہ آہستہ۔ گھن گرج: مراد تیزی اور جوش۔
استحصال: ظلم۔ آلہ کار: ذریعہ، وسیلہ۔

بہادر کے مشوروں پر یوں ہی عمل ہوتا رہا تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اسپتال میں دواؤں
بجائے رنگین پانی کی بوتلیں نظر آئیں گی۔ دوائیں چور بازار میں پہنچ جایا کریں گی اور بیماریوں
بے سہارا اور محتاج انسان سسک سسک کر دم توڑتے رہیں گے۔" علی احمد نے ہاتھ اٹھا کر
شہادت سے بلندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس تجویز کے پس پردہ فلک پیا کی تباہی دیکھ رہا ہوں۔ اسکائی لارکوں کا عبرت
انجام" اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود تھا۔

"کیا ضروری ہے کہ فلک پیا ایک شان دار اسپتال تعمیر کرے جس کے کثیر اخراجات
نہ صرف بلیک مارکیٹنگ بلکہ بعض اسکائی لارکوں کے مطابق ڈاکہ زنی اور لوٹ مار تک کی جا
اس کا اشارہ براہ راست سلمان کی جانب تھا۔

"جناب من! یہ رابن ہڈ کے شاہ رچرڈ کا عہد نہیں ہے جب چند امیروں کو لوٹ کر
غریبوں کی مدد کی جاتی تھی۔ یہ علم و آگہی کا دور ہے۔ سائنس اور جمہوریت کا دور ہے۔ آج ان
اپنے مسائل کا بخوبی ادراک ہے۔ وہ اس کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ جو لوگ ان مسائل کا حل
جانتے وہ دہشت گردی اور لاقانونیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بہت سے نوجوان
ہو کر اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ یہ گمراہ کن رجحان ہے یہ تباہی کا راستہ ہے۔"

علی احمد نے تمام اسکائی لارکوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے
گویا ہوا۔ "جہاں تک خان بہادر کا تعلق ہے میں ان کے ساتھ اس حد تک تعاون کرنے کا مشورہ
گا کہ وہ اسپتال کی تعمیر کے لیے جو چندہ دے رہے ہیں اسے قبول کر لیا جائے اور ان کی تجویز
کر دی جائے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی تجویز منظور نہ کی گئی تو وہ فلک پیا کو چندہ د
آمادہ نہ ہوں گے۔ یہی ان کے خلوص اور نیک نیتی کی آزمائش ہو گی۔ مجھے اس سے زیادہ اور کچھ
کہنا۔ میں نے اپنی رائے کا پوری دیانت داری سے اظہار کر دیا۔ فیصلہ آپ سب مل کر کریں گے۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

علی احمد نے اجلاس کی فضا بدل دی۔

چنانچہ رائے شماری کی بھی ضرورت نہ پڑی۔

پس پردہ: پیچھے۔ عبرت ناک: مراد انتہائی برا۔ آگہی: شعور۔ ادراک: علم، سمجھ۔ رائے شماری: ووٹنگ۔

تمام اسکائی لارکوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اجلاس ختم ہوا تو اسکائی لارکوں کے
چہروں پر اطمینان اور سکون تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر جانے کی
تیاریاں کر رہے تھے۔

❊ ❊ ❊

رات کے نو بجے تھے۔

خان بہادر کی کار فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر کے سامنے ایک بار پھر نمودار ہوئی۔ وہ مسکراتا ہوا
ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

صفدر بشیر، علی احمد اور فہیم اللہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ خان بہادر نے کچھ دیر تک اِدھر اُدھر
کی گفتگو کی پھر حرفِ مطلب پر آ گیا۔

"کہیے کیا فیصلہ ہوا آپ کے اجلاس میں؟"

صفدر بشیر نے جواب دیا۔ "خان بہادر صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی تجویز پر عمل
نہیں کر سکیں گے۔ البتہ اگر آپ اسپتال کی تعمیر کے لیے ہماری مالی امداد کرنا چاہیں تو ہم آپ کے
بے حد ممنون ہوں گے۔"

خان بہادر کا چہرہ فق ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "ایسی صورت میں سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا کہ
مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

علی احمد نے نہایت خاموشی سے بیس ہزار کا چیک نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ "یہ چیک
حاضر ہے۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔"

خان بہادر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے برا ماننے
کی بات نہیں۔ روپیہ بڑی محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ مجھے یہ حق تو دیں گے کہ اگر میں کسی
مقصد کے لیے چندہ دوں تو یہ بھی دیکھوں کہ میری رقم صحیح کام پر صرف ہو رہی ہے یا نہیں۔ پھر
آپ یہ بھی غور کریں کہ بیس ہزار بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔"

"یہ حق آپ سے کون چھین سکتا ہے۔" علی احمد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "اگر آپ فلک
پیا کے پروگرام سے متفق نہیں ہیں تو پھر کسی تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

چہرہ فق ہونا: چہرے کا رنگ اڑنا۔ صرف: استعمال۔ متفق: ہم خیال۔

"اوہو! آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ آپ کے پروگرام سے تو مجھے سو فیصد اتفاق ہے۔ لیکن جس طرح آپ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اس سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ بھئی آپ لوگوں نے میری تجویز پر معلوم ہوتا ہے جذباتی انداز سے غور کیا ہے۔ ورنہ اسے منظور کرنا بڑی عجیب سی بات لگتی ہے۔"

صفدر بشیر نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس سے قبل فہیم اللہ بول پڑا۔ "خان بہادر صاحب! آپ کی تجویز کے ہر پہلو پر اجلاس میں غور کیا گیا اور جو فیصلہ ہو چکا ہے، اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"صاحب! بات کچھ میری سمجھ میں آئی نہیں۔" خان بہادر نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔

فہیم اللہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خان بہادر کو دیکھا اور کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔

"معاف کیجیے آپ کی سمجھ میں یہ بات آ بھی نہیں سکتی۔ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے طریقے میں بنیادی فرق ہے۔"

خان بہادر کی پیشانی پر بل آ گیا۔

فہیم اللہ کی بات اسے سخت ناگوار گزری۔ ذرا دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے چیک اٹھا کر اطمینان سے بریف کیس میں رکھا اور شگفتہ مزاجی کے اظہار کے طور پر زبردستی مسکرا کر گویا ہوا۔

"بھئی آپ لوگ ماشاء اللہ نوجوان ہیں۔ تازہ خون ہے۔ اب یہ آپ کی مرضی، میری بات مانیں یا نہ مانیں۔"

وہ زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ چند ہی منٹ بعد اٹھ کر چلا گیا۔

(۵)

نیاز ان دنوں سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ ہوا یہ کہ ملٹری ڈپو سے ڈسپوزل کا کچھ سامان نکلا۔ جو کے نیلام میں وہ بھی گیا۔ اس میں اونی کمبلوں کی ایک بڑی لاٹ تھی۔ بولی خلاف توقع اونچی گئی۔ نیاز گھر سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اسے یہ لاٹ خریدنا ہے۔ وہ بولی بڑھاتا چلا گیا۔ اٹھارہ ہزار میں پوری لاٹ اس کے نام چھوٹ گئی۔

شگفتہ مزاجی: خوش اخلاقی۔ لاٹ: مقدار / تعداد۔ اونچی گئی: مراد بڑھ گئی، زیادہ ہو گئی۔

وہ خوشی خوشی سارا مال ٹرکوں میں بھر کر دکان پر لایا۔ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کمبلوں کے اچھے دام مل جائیں گے۔

لیکن جب اس نے بنڈلوں کو کھولا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سارے کمبل بوسیدہ اور گلے ہوئے تھے۔ ذرا سا دباؤ پڑتا تو کاغذ کی طرح مسک جاتے۔ ڈپو کے جس اسٹور میں کمبل رکھے تھے وہاں نشیب تھا۔ برسات کا سارا پانی اسٹور کے اندر کسی نہ کسی طور داخل ہو گیا۔ کمبل عرصے تک اس میں پڑے پڑے گل گئے تھے۔ منافع تو ایک طرف رہا لاگت نکلنے کے لالے پڑ گئے۔ دو ایک دلالوں کو اس نے مال دکھایا۔ وہ بازار میں نمونہ لے کر گئے اور چپ چاپ دکان پر لا کر ڈال گئے۔ کوئی کوڑیوں کے مول بھی کمبلوں کو لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نیاز کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔

وہ ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ چند ہی روز میں اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ پیشانی پر سیاہ لکیریں ابھر آئیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں ایک روز وہ گھر پہنچا تو خلاف معمول بیوی کو دالان میں نہ پا کر اسے تعجب ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سہ پہر سے اس کی طبیعت گڑبڑ ہے۔ وہ اس وقت کمرے میں لیٹی تھی۔ نیاز نے جا کر دیکھا۔ تیز بخار تھا۔ حرارت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بیوی کے سرہانے کھڑے کھڑے نیاز نے سوچا کہ اب اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا ہے جس پر وہ عرصہ دراز سے غور کر رہا تھا۔

بظاہر اس نے بیوی سے دل جوئی کی باتیں کیں اور تسلی دے کر ڈاکٹر موٹو کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر مطب بند کر کے جانے ہی والا تھا۔ اس وقت کوئی مریض موجود نہ تھا۔ کمپاؤنڈر بھی جا چکا تھا۔ دونوں نے تنہائی میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کیں۔

معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ اب نیاز کو معاہدے کے مطابق ایک ہزار روپے پیشگی ادا کرنا تھے۔ جسے مہیا کرنا فی الحال اس کے لیے مشکل تھا۔ ان دنوں اس کا سارا سرمایہ کمبلوں کے علاوہ دو ایک اور سودوں میں بھی پھنسا ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کچھ مہلت چاہی تو اس نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

"نہیں بھئی پیشگی رقم پہلے ملنی چاہیے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہوگا۔"

اس انکار پر نیاز سٹ پٹا کر رہ گیا۔ اس نے ڈاکٹر کو اپنی مالی پریشانیاں بتائیں۔ منت سماجت کی تو

مسک جانے: پھٹ جاتے۔ نشیب: گہرائی۔ لالے پڑنا: مشکل ہونا۔ کوڑیوں کے مول: کم قیمت پر۔ دل جوئی: تسلی۔ سٹپٹانا: پریشان ہونا۔

وہ ذرا نرم پڑا اور بڑی مشکل سے مہینہ بھر کی مہلت دی۔ مگر ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وقت پر نہ ملی تو وہ انجکشن لگانا بند کر دے گا۔

نیاز اسی وقت ڈاکٹر موٹو کے ہمراہ گھر آیا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کی نبض دیکھی۔ ٹمپریچ تشویش کی قطعی کوئی بات نہ تھی۔ موسمی بخار تھا۔ دو ایک روز میں علاج معالجے کے بغیر صحت یاب ہو جاتی۔ مگر ڈاکٹر نے ایک عجیب و غریب بیماری کا نام لے کر مرض کو پیچیدہ اور خط بتایا۔ اس کی تشخیص کے مطابق مریضہ کا جگر بالکل خراب ہو چکا تھا اور آنتوں میں زخم پڑ گئے اس نے مریضہ کے سامنے ہی نیاز کو مشورہ دیا کہ علاج پابندی سے ہونا چاہیے ورنہ جان کا خطرہ علاج کے لیے اس نے انجکشنوں کا کورس تجویز کیا۔ پہلا انجکشن اسی وقت لگایا اور مریضہ کو ہدایہ کہ پانی کم پیئے۔ غذا میں نمک کا استعمال زیادہ کرے اور جسمانی مشقت سے پرہیز کرے۔

دو تین روز میں سلطانہ کی ماں کا بخار اتر گیا۔ طبیعت سنبھلنے لگی۔

ڈاکٹر موٹو ہر چوتھے روز آکر خود اپنے ہاتھ سے انجکشن لگاتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مری طبیعت کچھ عرصہ تک ٹھیک رہی۔ لیکن اچانک پھر بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے کچھ پیٹنٹ دوائیں کیں جن سے کسی قدر افاقہ ہو گیا۔

مگر وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے سخت مشقت کی عادی تھی۔ ڈاکٹر کے کرنے کے باوجود گھر کے کام کاج میں دلچسپی لیتی۔ لیکن ذرا سا جسمانی کام کرنے کے بعد سانس پھول جاتی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا۔ وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑتی۔ دیر تک طبیعت میں نہ آتی۔

ایک روز اس نے دبی زبان سے اپنی بگڑتی ہوئی حالت کا نیاز سے تذکرہ کیا۔

وہ خفگی سے بولا۔ ”تم کو وہم ہو گیا ہے۔“

”آپ کو کیا پتہ میری کیا حالت ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ ڈاکٹر کیسا علاج کر رہا ہے۔ طب سنبھلنے کے بجائے دن بدن گرتی جا رہی ہے۔“

”تم ہمیشہ کی شکی ہو۔ ہر وقت الٹی سیدھی باتیں سوچا کرتی ہو۔ مجھے تو کہیں سے تم حالت بگڑتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ پہلے سے اب صحت اچھی ہے۔ یوں وہم کا علاج تو

پیچیدہ: مشکل۔ پیٹنٹ: مستند۔ افاقہ: آرام۔

لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔“

وہ زچ ہو کر بولی۔ ”میں کیسے بتاؤں کہ میری کیا حالت ہے؟“

نیاز غصے سے آنکھیں نکال کر چیخا۔ ”تو پھر خیراتی اسپتال چلی جاؤ۔ تم کو تو وہیں کے علاج سے آرام ملے گا۔“

لمحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دیکھو آج کل میں یوں ہی ایک چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔ تم خواہ مخواہ مجھے پریشان نہ کرو۔ ورنہ کہیں اپنا منہ کالا کر کے چلا جاؤں گا۔ پھر بیٹھی جس سے چاہے علاج کراتی رہنا۔“ اس کی دھمکی سن کر وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔

اس نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

نیاز تھوڑی دیر بیٹھا غصے سے بڑبڑاتا رہا۔ پھر اٹھ کر گھر سے باہر جانے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ بار بار انگلیوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا۔ اسے جاتے دیکھ کر بیوی نے ٹوکا۔

”اتنی رات گئے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

وہ جھلا کر بولا۔ ”جہنم میں!“

وہ اٹھ کر اس کی جانب بڑھی۔ ”آپ کو میری قسم جو گھر سے باہر گئے۔“

نیاز کے قدم دروازے تک پہنچتے پہنچتے سست پڑ گئے۔ وہ اس کے قریب پہنچی اور بازو تھام کر کمرے میں لے آئی۔

نیاز روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر بستر پر لیٹ گیا۔ بیوی سرہانے بیٹھی دیر تک اس کا سر دباتی رہی۔

اس واقعے کے بعد اس نے نیاز سے اپنی گرتی ہوئی صحت کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ علاج کا سلسلہ جاری رہا۔

انجکشن لگتے رہے اور اس کا جسم سرسوں کی طرح پیلا پڑتا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے۔

اس کا دم بولا جاتا اور اختلاجی کیفیت طاری ہو جاتی۔

زچ ہونا: تنگ ہو جانا۔ سناٹے میں آنا: گھبرا کر دم بخود / خاموش ہو جانا۔ دم بولانا: جی گھبرانا، وحشت ہونا۔ اختلاجی کیفیت: بے چین ہونے کی حالت۔

❁ ❁ ❁

علاج کرتے ہوئے چوتھا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ نیاز کو ڈاکٹر کی رقم کی فکر تھی۔ وہ ایک
روپے دے تو سکتا تھا مگر اتنی رقم نکل جاتی تو اس کی دکان ٹھپ ہو جاتی۔ ان دنوں وہ دو ڈھائی
روپے کے لوٹ پھیر سے کاروبار چلا رہا تھا۔ نیاز کی پریشانی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ رہ رہ کر سوچ
ڈاکٹر نے انجکشن لگانا بند کر دیئے تو بہت برا ہو گا۔ پریمیم کی پہلی قسط جو اس نے کئی ہزار روپے
صورت میں انشورنس کمپنی کو ادا کی تھی، ڈوب جائے گی۔ بغیر انجکشنوں کے بیمے کی پالیسی جا
رکھنا فضول تھا۔

وہ اسی ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ خان بہادر فرزند علی کی فرم کا کارندہ ایک شام نیاز کے
آیا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ خان بہادر کو کسی دلال کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ نیاز کے
خاصی بڑی تعداد میں کمبل موجود ہیں۔ خان بہادر کمبلوں کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہے۔

دوسرے ہی روز وہ خان بہادر فرزند علی سے خود ملا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔
شاندار دفتر میں بٹھا کر اس نے نیاز کو نہایت پر تکلف چائے پلائی۔ پاس رکھی ہوئی فائل کھول کر
ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکالا اور نیاز کو دکھا کر بولا۔ "میرے پاس پانچ ہزار کمبلوں کی سپلائی کا یہ سرکا
آرڈر ہے۔ اگر معاملہ پٹ جائے تو آپ کا سارا اسٹاک نکلوا دوں گا۔"

نیاز نے فوراً کہا۔ "تو پھر سوچنا کیا ہے۔ کچھ ایسا بھاؤ لگا دیجئے کہ مجھے بھی دو پیسے مل جائ
میں سارا مال دینے کو تیار ہوں۔"

خان بہادر نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "دیکھئے میں کمبل خود نہیں خریدوں گا۔ آپ کا
میرے توسط سے جائے گا۔ ریٹ طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے ٹینڈر میں دس رو
فی کمبل کا ریٹ دیا تھا۔ گورنمنٹ نے وہ ریٹ منظور کر کے سپلائی کا آرڈر جاری کر دیا ہے۔"

نیاز کی سمجھ میں خان بہادر کی پوری بات نہ آئی۔ "حکومت تو آپ کو دس روپے فی کمبل
حساب سے پے منٹ کرے گی۔ مگر آپ مجھے کیا دیں گے؟"

خان بہادر کو مزید وضاحت کرنا پڑی۔ "دیکھئے اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے
میں آپ سے کمیشن لوں۔ مگر میں کمیشن پر سودا کرنا نہیں چاہتا۔ میری شرائط یہ ہوں گی کہ ا

دکان ٹھپ ہو جاتی: مراد دکان کا کام متاثر ہوتا۔ کارندہ: ملازم۔ خندہ پیشانی سے: خوش اخلاقی سے۔ معاملہ پٹنا: معاملہ طے ہونا

سپلائی سے جو منافع ہو گا اس کے تین حصے دار ہوں گے۔ میرا اور آپ کا چالیس چالیس فیصد کا برابر کا
حصہ ہو گا۔ بیس فی صد کا حصے دار وہ سرکاری افسر ہو گا جس کے ذریعہ یہ ٹینڈر منظور ہوا ہے اور جس
سے آئندہ سپلائی میں بھی مدد ملے گی۔ اب جیسا آپ مناسب سمجھیں وہ طے کر لیں۔"

نیاز نے سوچا سودا تو بہت اچھا ہے۔ کئی ہزار روپے سیدھے سیدھے بچتے تھے۔ اس کے لیے تو
کمبلوں کو نکالنا ہی ایک مصیبت تھی۔ کہاں اتنا بڑا منافع۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی خوشی پر قابو
پایا۔ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ "مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے اور کوئی شرط ہو تو وہ بھی بتا دیجئے۔"
خان بہادر نے ہنس کر کہا۔ "یہی بنیادی شرط ہے اور کوئی چھوٹی موٹی قانونی شرط ہوئی، وہ ہم
معاہدے کرتے وقت طے کر لیں گے۔"

نیاز کو بڑی مسرت تھی کہ اتنا اچھا سودا اس قدر آسانی سے طے ہو گیا۔ دونوں نے سپلائی کے
متعلق کچھ کاروباری باتیں کیں اور یہ طے کیا کہ جلدی ہی معاہدہ کر لیا جائے۔ نیاز گھر واپس آ گیا۔
اس روز وہ خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت جو غبار چھایا رہتا تھا رفع ہو گیا۔

چند روز بعد معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ سرکاری افسر کے حصے کا اس میں تذکرہ نہ تھا۔ اسے
اخراجات کی فاضل مد میں ڈال دیا گیا۔ نیاز نے معاہدے کی نقل لے کر جیب میں رکھی تو کچھ ایسا
محسوس ہوا جیسے اس کی جیبیں نوٹوں کی گڈیوں سے بھر گئیں ہیں۔ اس وقت خان بہادر اسے بھلا
مانس اور فرشتہ خصلت معلوم ہوا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ خان بہادر چاہتا تو اس کی مجبوری سے
پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اصل لاگت سے بھی کم قیمت پر کمبل خرید کر اچھی رقم پیدا کر سکتا تھا۔

اس سپلائی کی نوعیت یہ تھی کہ شدید بارشوں کے باعث پنجاب اور سندھ میں زبردست
طغیانی آ گئی تھی۔ سیلاب سے بستیاں اجڑ گئیں۔ لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔ ہر طرف وبائی امراض
پھیل گئے۔ لوگ دھڑا دھڑ بیمار پڑ رہے تھے۔ حکومت نے ان کی امداد کے لیے جگہ جگہ ریلیف کیمپ
کھول دیئے تھے۔ سیلاب زدگان کے لیے جن اشیا کی فوری ضرورت تھی، ان میں کمبل بھی شامل
تھے۔ ان کی سپلائی کے لیے ٹینڈر طلب کئے گئے۔ ریلیف کمیٹی کا جو افسر ٹینڈر منظور کر رہا تھا، اس سے
خان بہادر کے مراسم نکل آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں بات کچھ اس ڈھب سے چلی کہ اسی وقت

غبار: رنج، ملال۔ رفع ہونا: دور ہونا، ختم ہونا۔ فاضل مد: مراد دیگر اخراجات۔ بھلا مانس: شریف۔ فرشتہ خصلت: فرشتوں جیسی عادت
ریلیف کیمپ: بحالی کے کیمپ۔ مراسم: میل جول۔ ڈھب: طریقہ، انداز۔

معاملہ پٹ گیا۔

خان بہادر اور نیاز دونوں معاہدہ ہو جانے کے بعد اپنی اپنی جگہ بہت مطمئن تھے۔ لیکن منظوری کے لیے نمونے کا کمبل بھیجا گیا تو کچھ عرصے کے لیے وہ پریشانی میں ضرور پڑ گئے۔ اس کہ اگر نمونہ مسترد ہو جاتا تو ان کا سارا پروگرام ریت کے محل کی طرح بیٹھ جاتا۔ لیکن نمو نامنظوری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جو افسر اسے منظور کر رہا تھا اس کا سپلائی میں بیس فیصد مناف چنانچہ فوراً ہی نمونے کی منظوری آگئی اور مال سپلائی ہونا شروع ہو گیا۔

گلے ہوئے بوسیدہ کمبل نیاز کی دکان سے نکل نکل کر ریلیف کیمپوں میں پہنچنے لگے اور پر حال سیلاب زدگان میں تقسیم کر دیے جاتے۔

ہفتہ بھر کے اندر سپلائی کا کام ختم ہو گیا۔

پندرہ روز بعد خان بہادر نے اپنے اثر و رسوخ سے بل منظور کرا لیا۔ کمبلوں کا سارا ر وصول ہو گیا۔ اصل رقم اور خرچ نکال کر ۲۵ ہزار کا منافع ہوا۔ دس دس ہزار روپے خان بہا نیاز نے لے لیے اور پانچ ہزار روپے معاہدے کی رو سے ریلیف کمیٹی کے متعلقہ افسر کو پہنچادیے جس نے ٹینڈر کے ساتھ نمونہ بھی منظور کیا تھا۔

❁ ❁ ❁

اس روز نیاز بے حد خوش تھا۔

اس نے بازار سے مٹھائی اور پھولوں کے گجروں کے علاوہ بیوی کے لیے بھی کئی سوغا خرید اور مسرت سے جھومتا ہوا گھر کی جانب چل دیا۔ گھر میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ بیو پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔

قریب ہی سلطانہ بیٹھی تھی۔

نیاز نے نزدیک جا کر دیکھا۔ بیوی دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچے بے سدھ لیٹی تھی۔ ا رنگ لیمپ کی روشنی میں ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کے نشانات تھے۔ چہرے کی کھال کا تناؤ کم پڑ گیا تھا وقت وہ خاصی سن دراز نظر آ رہی تھی۔

بے سدھ: بیہوش۔ سن دراز: زیادہ عمر کی۔

نیاز نے اپنی مالی پریشانیوں کے باعث اب تک اس کی حالت پر زیادہ توجہ نہ دی تھی۔ اب جو اے غور سے دیکھا تو اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔

وہ اسے بد صورت اور کھپٹ معلوم ہوئی۔

اس نے نفرت سے سوچا۔ اب تو اس عورت کو مر ہی جانا چاہیے۔ یہ مرجھایا ہوا مریل جسم اس کے لیے بالکل ناکارہ ہو چکا ہے۔

اس نے قریب بیٹھی ہوئی سلطانہ کو دیکھا۔ اس کے گداز جسم کا ایک ایک خم پھڑک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص دل کشی تھی۔

بے خیالی میں ایک بار سلطانہ نے نظریں اٹھا کر نیاز کی جانب دیکھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کنول ا طرح کھل گئیں۔ وہ اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ آہستہ سے دریافت کیا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

"اچھی خاصی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔"

"شام کو نہائی ہوں گی۔" نیاز نے قیاس آرائی کی۔

سلطانہ نے فوراً تردید کی۔ "جی نہیں۔ انہیں تو اکثر ایسا ہی دورہ پڑتا ہے۔ کہتی ہیں، سینے میں لیف ہوتی ہے۔"

نیاز نے مزید گفتگو نہیں کی۔

وہ فوراً گھر سے نکل کر سیدھا ڈاکٹر موٹو کے پاس پہنچا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں مجرمانہ لمہ تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ تاخیر کے لیے معذرت کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

"ڈاکٹر صاحب سال بھر کے بجائے پہلے ہی معاملہ صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا مگر تم راضی نہ ہوئے۔ یوں بھی دیر کرنے میں خطرہ ہے۔"

نیاز اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! جیسی آپ کی مرضی۔ میں اب اس سلسلے میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

اس روز ڈاکٹر نے مریضہ کی حالت کے بارے میں اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ کچھ ضروری ہدایات بھی دیں جن پر عمل کرنے کے لیے وہ بار بار تاکید کرتا رہا۔

کھپٹ: بد صورت۔ گداز: نرم، ملائم۔ قیاس آرائی کی: خیال کا اظہار کیا۔ تردید: انکار، نفی۔

فصل ہفتم

(۱)

سرما کی کہر آلود رات تھی۔ دس بج چکے تھے۔ کانفرنس روم میں تمام اسکائی لارک مو
تھے۔ فلک پیا کا ماہانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے تنظیم کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ ا
کے بعد اسپتال کی تعمیر کے منصوبے پر بحث شروع ہوئی جسے بعض ترامیم کے ساتھ منظور کرلیا
اسپتال کی تعمیر کے لیے جو گروپ بنایا گیا اس میں سب ہی اسکائی لارک شریک تھے۔ ا
گروپ کا سربراہ محمد علیم تھا۔ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں کچھ عرصہ کام کر چکا تھا۔ تعمیر کے کام
اسے عملی تجربہ تھا۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ سب سے پہلے محمد علیم پلاٹ کا سروے کرے گا۔ ا
نقشہ بنوائے گا اور جب یہ کام ہو جائے تو کدالیں، بیلچے اور ایسا ہی دوسرا ساز و سامان کرائے پر ل
جائے اور اسکائی لارک خود اسپتال کی نیو کھودنا شروع کردیں۔

دوسرے روز محمد علیم دو اسکائی لارکوں کے ساتھ سویرے ہی سویرے پلاٹ کا سر
کرنے گیا۔ مگر یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ پلاٹ کے گرد قد آدم چار دیواری موجود تھی۔ ایک چ
ٹین کا سائبان تھا۔ مشرقی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس پر ایک بورڈ آویزاں تھا۔ بورڈ پر بڑے بڑ
حروف میں لکھا تھا۔ "نورانی مسجد۔"

محمد علیم نے سوچا شاید غلطی سے کسی دوسری جگہ آگیا ہے۔ مگر جب اس نے دونوں اسکا
لارکوں کے ہمراہ گھوم پھر کر معائنہ کیا تو یہ عقدہ کھلا کہ کسی نے اسپتال کی زمین پر راتوں

کہر آلود: دھندلی۔ سروے: جائزہ، پیائش۔ نیو: بنیاد۔ بھونچکا: حیران۔ قد آدم: انسانی قد کے برابر۔ سائبان: چھپر۔ عقدہ
ظاہر ہونا۔

بنادی ہے۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ دونوں اسکائی لارک بھی چکرا گئے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ مسجد کس
نے بنوائی؟ کیوں بنوائی؟ اب افقی سرحدوں پر روشنی پھیلنے لگی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دن کی
آمد آمد تھی۔ بسنتی دھوپ آہستہ آہستہ بلندیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ بستی میں ملی جلی آوازیں ابھر
رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے کام دھندے پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان تینوں کو چار دیواری
کے قریب حیرت کے عالم میں کھڑے دیکھ کر کچھ لوگ ادھر بھی آگئے۔ مسجد دیکھ کر وہ بھی اچنبھے
میں پڑگئے۔

ایک بوڑھا بولا۔ "دس بجے جب میں دکان سے لوٹا تو میدان بالکل صاف تھا۔ رات بھر میں نہ
جانے کس نے مسجد کھڑی کردی۔ اللہ میاں نے فرشتے بھیجے ہوں گے اور تو سمجھ میں کچھ آتا نہیں۔"

فوراً ہی اس کے برابر کھڑا ہوا شخص گویا ہوا۔ "یار نبی جان، تو بھی کمال کرتا ہے لو بھئی آج تک
ہم نے سنا نہیں کہ فرشتے آکر مسجد بناگئے۔ یہ تو کچھ اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔"

وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی اثنا میں برابر والی گلی سے ایک شخص تہبند
درست کرتا ہوا نکلا اور ان لوگوں سے کہنے لگا۔ "اب کیا دیکھ رہے ہو۔ رات کو دیکھتے یہاں کیا ہو
رہا تھا۔" اس نے سڑک کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہاں تین چار ٹرک کھڑے تھے۔ ان میں
سے سامان نکال نکال کر دبادب دیواریں کھڑی کی جا رہی تھیں۔"

"یہ کے بجے رات کی بات ہے جی؟"

"میں کارخانے سے واپس آرہا تھا۔ تین بج رہا ہوگا۔ اماں خدا جھوٹ نہ بلوائے پچاسیوں آدمی
لگا ہوا تھا۔"

"تو یار میرے تو نے ان سے پوچھا تو ہوتا۔"

"میں تھکا ہارا آرہا تھا میں نے کہا نہ جانے بھئی یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"اذان تو فجر کی میں نے بھی سنی تھی اور امامی نے تو نمازیوں کو بھی مسجد سے نکلتے دیکھا تھا۔ مگر
اکھاڑا تھا کہ اپنے محلّے کا تو اس میں کوئی تھا نہیں۔ نہ جانے کون لوگ تھے؟"

"یارو! اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔"

"ہاں جی! یہ سب اس کی قدرت کے کرشمے ہیں۔"

اچکو: حیران، پریشان۔ ماجرا: قصہ۔ افقی سرحدیں: مراد مشرق کی جانب۔ اچنبھے میں پڑگئے: حیران رہ گئے۔

وہ سب اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ علیم کے لیے اب وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ وہ دونوں اسکائی لارکوں کے ہمراہ ہیڈ کوارٹر واپس آیا اور صفدر بشیر کو فوراً اس واقعے کی رپورٹ دی۔ لہٰذا لارکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کسی کو بھی محمد علیم کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ صفدر بشیر نے گیر لیا۔ کار نکالی اور علی احمد کے ہمراہ صورت حال معلوم کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

واپس آکر اس نے فلک پیا کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اسکائی لارکوں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ محمد علیم کی اطلاع کی اس نے تصدیق کی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس سلسلے میں کیا کاروائی کی جائے۔ نوجوان اسکائی لارکوں میں بڑا جوش پایا جاتا تھا۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔

صفدر بشیر اور علی احمد پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے جو دیکھا تھا، اس کی وہ ایک ایک تفصیل بتا چکے تھے۔ مگر اسکائی لارکوں کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ مسجد بنی کیسے اور کس نے بنوائی؟ اجلاس میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اسی دوران کوٹھی کے ایک ملازم نے صفدر بشیر کو اطلاع دی کہ ٹیلیفون آیا ہے۔ صفدر بشیر نے جا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے خان بہادر کی آواز ابھری۔

"میں خان بہادر فرزند علی بول رہا ہوں۔"

صفدر بشیر نے پوچھا۔ "مزاج تو اچھا ہے۔ فرمائیے اس وقت ٹیلیفون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

"بھئی ایک بہت نازک مسئلہ سامنے آگیا ہے۔"

صفدر بشیر نے دریافت کیا۔ "کیا مسئلہ آگیا؟"

خان بہادر کی آواز آئی۔ "میں نے سنا ہے کہ جس زمین پر آپ اسپتال بنانا چاہتے تھے اس پر اہل محلہ نے مسجد تعمیر کر لی ہے۔"

"محلے کے لوگ تو قطعی لاعلمی ظاہر کر رہے ہیں۔ میں خود وہاں گیا تھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی۔"

خان بہادر کے ہنسنے کی آواز ریسیور میں سنائی دی۔ "بھئی غلط اطلاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا ایک وفد صبح سے میرے پاس بیٹھا ہے۔"

صفدر بشیر گھبرا کر بولا۔ آپ کے پاس وفد آیا ہے؟"

"جی ہاں! میں نے عرض کیا نا کہ وہ تو صبح سے یہاں موجود ہے۔"

"تو پھر ایسا کیجیے کہ آپ ان لوگوں کو میرے پاس بھیج دیں۔ اس وقت فلک پیا کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ہم اسی مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی موجودگی میں مسئلے کو سلجھانے میں آسانی ہو جائے گی۔"

"میرا کہا مانئے تو اب اس خیال کو ترک ہی کر دیجئے۔ اس لیے کہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ شہر کے تین علمائے دین سے مسجد کی تعمیر کے شرعی ہونے کا فتویٰ لیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ میں بھی ابھی وفد کے ہمراہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل کر آرہا ہوں تاکہ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو خبردار کر دیا کہ نقص امن کا خطرہ ہے۔ لہٰذا اس نے پولیس کا پہرہ لگانے کا بھی وعدہ کر لیا ہے۔"

اس دھمکی پر صفدر بشیر کو سخت غصہ آیا۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "مگر یہ ساری کاروائی کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔"

خان بہادر بڑے اطمینان سے گویا ہوا۔ "بھئی وہ ہوا یہ کہ انہوں نے مجھے غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"بہرحال اس وقت تک جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا میں درخواست کروں گا کہ آئندہ اس مسئلے میں آپ دلچسپی نہ لیں تو مناسب ہو گا۔" صفدر بشیر نے مشورہ دیا۔

خان بہادر برہم ہو کر بولا۔ "کیا کہا آپ نے؟ یعنی میں اس مسئلے میں دلچسپی نہ لوں۔ بات ذرا سوچ سمجھ کر منہ سے نکالا کیجیے۔ واہ صاحب واہ! آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ یہ بھی خوب کہی۔ اجی آپ سے تو صرف صاحب سلامت ہی ہے۔ اگر میرا حقیقی بھائی بھی مجھ سے یہ بات کہتا تو بخدا میں اس کا منہ نوچ لیتا۔ جناب یہ دینی معاملہ ہے۔ میں تو اس کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

ابھی وہ اپنے جذبہ ایمانی کے اظہار میں نہ جانے اور کیا کیا لن ترانی کرتا لیکن صفدر بشیر نے اس کی بات کاٹ کر فوراً معذرت کی۔ "معاف کیجئے آپ میری بات کا مطلب قطعی غلط سمجھے۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔"

شرعی: مذہب اور شریعت کے عین مطابق۔ ضبط: برداشت۔ لن ترانی کرنا: ڈینگ مارنا۔

"بہر حال آپ کا کچھ بھی مطلب ہو۔ ایک بات ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ مسئلہ بہت
ہے۔ آپ لوگ تو اب اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں۔"

خان بہادر نے اپنا لہجہ کچھ نرم کیا۔ "یہ میرا برادرانہ مشورہ ہے۔ پھر آپ لوگ بھی تو
مسلمان ہیں۔ کچھ اپنے ایمان ہی کا پاس کیجئے۔ اسپتال تو حکومت بھی بنوا دیتی ہے۔ مسجدیں
بنواتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کی حرارت اور اسلام کا سچا جذبہ ہوتا ہے۔"

صفدر بشیر نے کسی جھنجلاہٹ کا اظہار کئے بغیر جواب دیا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ آ
رائے پر عمل کریں۔ آپ کے ان بیش بہا مشوروں کا بہت بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔" اس نے
رکھ دیا۔

کانفرنس روم میں واپس پہنچ کر اس نے صدر سے اجازت لی اور اسکائی لارکوں کو بتایا کہ
ہوا ہے اس کے پیچھے خان بہادر کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ ٹیلیفون کی گفتگو سے اس نے یہی اند
تھا۔ پھر اس نے خان بہادر کی دھمکی سے بھی سب کو آگاہ کر دیا۔ اس کی ذاتی رائے اس سلسلے میں
کہ فلک پیا کو خان بہادر کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا منہ توڑ جواب دیا جا

کئی جوشیلے اسکائی لارکوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان میں سلمان بھی تھا۔ ا
ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "اگر رات بھر میں چار دیواری کھڑی کی جاسکتی ہے تو ایک ہی را
اسے مسمار کر کے برابر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

فہیم اللہ نے، جو اسکائی لارکوں میں بڑا معاملہ فہم سمجھا جاتا تھا اور مزاج کے اعتبار سے
جذباتی قسم کا نوجوان تھا، فوراً کھڑے ہو کر سلمان سے کہا۔

"استغفراللہ، آپ مسجد شہید کریں گے۔"

فہیم اللہ کی اس بات پر سلمان کے آگ ہی تو لگ گئی۔ جھلا کر بولا۔ "آپ اس گھر
مسجد کہہ رہے ہیں۔ کل چند شر پسند فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو کر نماز پڑھنا شروع
اور دروازے پر مسجد کے نام کا کتبہ لگوا دیں تو کیا آپ ان کے دعوے کو تسلیم کر کے اس مک
دست بردار ہو جائیں گے؟ اسکائی لارک فہیم اللہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ قانون بھی کوئی

پاس: لحاظ۔ بیش بہا: قیمتی۔ مرعوب ہونا: رعب میں آنا۔ منہ توڑ: مراد بھرپور۔ مسمار کرنا: گرانا۔ معاملہ فہم: معاملات کو سمجھ
لگنا: سخت غصہ آنا۔ شر پسند: فسادی۔ دست بردار ہونا: الگ ہونا۔

یہ اور اس کی خلاف ورزی جرم ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر کسی کی نجی ملکیت پر اس طرح قبضہ نہیں
جا سکتا۔"

فہیم اللہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "لیکن اس طرح لوگوں کے مذہبی جذبات مشتعل
جانے کا اندیشہ ہے۔"

اسی وقت ایک اور اسکائی لارک نے کہا۔ "اس کے علاوہ نقص امن کے پیش نظر پولیس کا
ر بھی شاید لگ گیا ہے۔"

سلمان اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا۔ "اگر یہ تجویز پسند نہیں تو ہم اس چار دیواری کے سامنے
ک ہڑتال کریں گے۔" اس کی تائید میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"یہ تجویز بالکل ٹھیک ہے۔"

"بھوک ہڑتال بڑا موثر حربہ رہے گا۔"

فہیم اللہ ان کا جوش و خروش دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کی حمایت میں علی احمد اٹھ کر کھڑا
گیا۔

اس نے سلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے یہ بہت نازک مسئلہ ہے۔ اس میں جذباتی
ماسے کام نہیں چلے گا۔ اگر ہم نے بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم اٹھایا تو اس کے نتائج خطرناک بھی
سکتے ہیں۔ مجھے آپ کے جذبات کا پورا پورا احساس ہے۔ میں اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔ میرے
یال میں یہ سب کچھ سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے۔ یہ ہماری خودداری کو چیلنج ہے۔" لمحہ بھر
کر وہ بولا۔ "اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے
ت کا تعاون حاصل کریں۔ ہمارا ایک وفد شہر کے اعلیٰ حکام سے ملے۔ ان کو صورت حال سے
کرے۔ مناسب کارروائی کا مطالبہ کرے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا بھی اندازہ لگانا چاہیے
تی کے لوگوں کا اس سلسلے میں کیا ردعمل ہے۔ ان کی ہمدردی اور تعاون حاصل کئے بغیر ہماری
لئے ہزاروں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

علی احمد کا سلجھا ہوا انداز بیان، اس کی شخصیت کا دبدبہ اور صورت حال کا تجزیہ، ان سب باتوں
ل کر اسکائی لارکوں کو خاصا متاثر کیا۔ ان کے چہروں پر مشتعل جذبات کے بجائے سنجیدگی

ہڑتال۔ تائید: حمایت۔ موثر: اثر کرنے والا، کامیاب۔ حربہ: ہتھیار، مراد طریقہ۔ دبدبہ: رعب۔

چھانے لگی۔

کمرے میں ذرا دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر اسکائی لارک علی احمد کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔

آخر جب انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو سب علی احمد سے متفق تھے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ سلمان کو ہدایت کی گئی کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ بستی کے لوگوں کا رد عمل کیا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو کس انداز سے دیکھ رہے ہیں؟

❀ ❀ ❀

رات کے آٹھ بجے سلمان بستی میں پہنچا۔ تعلیم بالغاں کے مرکز میں کلاس کو سبق پڑھایا اور جب پڑھائی سے فراغت ہو گئی تو اس نے سب کو روک کر کہا۔

"مجھے آپ لوگوں سے آج کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فلک اس علاقے میں ایک اسپتال تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے ہم نے زمین بھی حاصل کر لی تھی۔ آپ سب نے مل کر اسے خالی کرانے میں ہماری مدد بھی کی تھی۔ مگر اس پر کچھ لوگوں نے راتوں رات ایک گھروندا بنا کر مسجد کا نام دے دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ اسپتال نہ بنے۔ ورنہ م ہی بنانی تھی تو کسی اور جگہ بھی بنائی جا سکتی تھی۔ اسپتال کی زمین پر اس طرح ناجائز قبضہ کرنے مقصد، آپ ہی بتایئے اور کیا ہو سکتا ہے؟"

اس نے سب پر ناقدانہ نظر ڈالی اور ان سے سوال کیا۔ "میں آپ لوگوں سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ظاہر ہے کہ اس مسئلے کا تعلق آپ سب سے ہے۔ یہ اسپتال آپ ہی لوگوں کے علاج معالجے کے لیے تعمیر کیا جا رہا ہے۔"

فوراً ہی کئی آوازیں ابھریں۔

"یہ ضرور کسی نے بدمعاشی کی ہے۔"

"یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اس میں یہاں کے رہنے والوں کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ تو سب باہر کے لوگوں کا کیا دھرا ہے۔"

"یہ چودھویں صدی ہے جی۔ ہمارے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ چودھویں صدی میں جو کچھ ہو جائے کم ہے۔ اب تو اللہ کے نام پر لوٹ مار ہونے لگی ہے۔ یہ لوٹ مار نہیں تو اور کیا ہے۔" بغیر

کچھ چوروں کی طرح مسجد بنا ڈالی۔ سالوں نے خدا کے گھر کو بھی مذاق بنا ڈالا۔"

"نہیں جی اس کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

"ہاں جی یہ تو بہت واہیات حرکت ہے۔"

ان باتوں سے سلمان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک ان سے اسی موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔

اسکول سے باہر آ کر اس نے دیکھا کہ چوراہے پر کئی گیس بتیاں روشن ہیں۔ ان کی تیز روشنی میں بہت سے لوگ فرش پر بچھی ہوئی دریوں پر بیٹھے ہیں۔ جلسہ غالباً ذرا ہی دیر قبل شروع ہوا تھا۔ وہ اسی طرف چلا گیا۔

قریب جا کر دیکھا۔ لمبی ڈاڑھی والا ایک مولوی تقریر کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی کرسی پر خان بہادر شیروانی پہنے، جناح کیپ لگائے، بڑی آن بان سے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ جلسے کی صدارت کر رہا تھا۔ سلمان کے ساتھ اس کے شاگرد بھی تھے۔ پانچ چھ سو افراد کا اجتماع تھا۔ مولوی ان سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو بھائیو! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ بہت بڑی بات ہے۔ جی ہاں بہت بڑی بات ہے۔ ایک زندگی تو کیا اگر ایک ہزار زندگیاں بھی نصیب ہوں تو خانۂ خدا کی حفاظت کے لیے قربان ہو سکتی ہیں۔ وہ کانپور والی مسجد کا واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کانپور کے غیور مسلمان سر سے کفن باندھ کر نکل آئے۔ جام شہادت نوش کرنے والوں کا یہ عالم تھا کہ ایک گرتا تھا دس بڑھتے تھے۔ اللہ اللہ کیا مسلمان تھے اور یہ مسجد شہید گنج کا واقعہ تو کل کی بات ہے۔ جن کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن تھی وہ یوں سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے کہ گولی چلانے والوں کے ہاتھوں میں رعشہ آ جاتا۔ کیا شان تھی ان مومنوں کی۔ دست قاتل بھی ہیبت سے لرزتا تھا۔ آج بھی کچھ لوگ آپ کے ایمان کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ کے جذبۂ ایمانی کی آزمائش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مسجد کو شہید کرنا چاہتے ہیں۔ خانۂ خدا کو نعوذ باللہ ڈھانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس مسجد کو شہید ہو جانے دیں گے؟ کیا آپ کا ایمان اس کو گوارا کر لے گا؟"

یہ کہہ کر وہ رک گیا اور حاضرین جلسہ کی جانب دیکھنے لگا۔ اچانک بہت سی ملی جلی آوازوں کا

آن بان: شان و شوکت۔ غیور: بہادر۔ رعشہ: کپکپی۔ ہیبت: خوف۔

شورا بھرا۔

"نہیں، ہر گز نہیں۔"

"ہر گز نہیں، ہر گز نہیں۔"

سلمان نے گھبرا کر دیکھا۔ شور مچانے والوں میں اس کے شاگرد بھی شامل تھے۔ وہ اس
قریب ہی بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے غضب ناک ہو رہے تھے۔ گردن کی رگیں تنی ہوئی تھ
مولوی پھر تقریر کرنے لگا۔

"برادرانِ اسلام! آپ کو خان بہادر فرزند علی صاحب کا ممنون ہونا چاہیے جن کی کو
سے یہ مسجد تعمیر ہوئی۔" اس نے برابر بیٹھے ہوئے خان بہادر کی طرف اشارہ کیا۔ خان بہادر
انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا سر ذرا سا جھکا لیا۔

"باری تعالیٰ نے ان کو دولت اور عزت کے ساتھ ساتھ ایک ایمان بھرا دل بھی عطا کیا۔
اب ان ملعونوں کو دیکھیے جو ان پر طرح طرح کے الزام لگا کر بدنام کر رہے ہیں۔ اس مسجد کو
کرنے کے درپے ہیں۔ آپ ان کو بتا دیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت ابھی باقی ہے۔
و مال کیا، ہم راہِ خدا میں سر بھی کٹا سکتے ہیں۔ سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرا سکتے ہیں۔" حاضرین
جوش میں آکر نعرہ تکبیر بلند کیا۔

"اللہ اکبر۔"

"اللہ اکبر۔"

ساری بستی نعروں کے شور سے گونج اٹھی۔ سلمان نے غور کیا کہ اس کے برابر بیٹھے ہ
لوگوں کے چہرے دہکنے لگے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وفورِ جذبات سے مٹھیاں بھنچی
تھیں۔ اس نے بدحواس ہو کر سوچا کہیں جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر اس کے شاگرد ہی اس کی م
نہ شروع کر دیں۔ اس نے خیریت اسی میں دیکھی کہ چپ چاپ جلسے سے اٹھ کر کھسک جائے۔

وہ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت اداس اور دل گرفتہ تھا۔ اس نے صفدر بشیر کو تمام باتوں کی رو
دی اور تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ یہ رات اس نے بڑی بے چینی اور دکھ میں بسر کی۔ رہ رہ
خیال آتا کہ جن کی بھلائی اور بہتری کی خاطر اسکائی لارک اپنی ہر مسرت تج کر جفاکشی کی زندگی

انکساری: عاجزی۔ دل گرفتہ: اداس، رنجیدہ۔ تج کر: مراد چھوڑ کر۔

کر رہے ہیں۔ وہی لوگ ایک کرائے کے مولوی کی باتوں میں آکر آج اسکائی لارکوں کے خلاف اپنی
نفرت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ عجیب تماشا ہے۔ ناانصافی اسکائی لارکوں کے ساتھ ہوئی اور وہی ملعون
اور مردود ٹھہرائے جا رہے ہیں۔ اور خان بہادر کو، جس کی سازش سے یہ سب کچھ ہوا، خراج
عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ مردِ مومن قرار دیا جا رہا ہے۔ اسے بستی کے لوگوں پر سخت غصہ آیا۔ اس
نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ گندے کیڑے گندگی ہی میں خوش رہتے ہیں۔ ان کی بھلائی کے لیے کچھ
کرنا، نیکی کر کے دریا میں ڈالنا ہے۔

جب وہ سوچتے سوچتے اس انتہا تک پہنچا تو اسے فلک پیا سراسر مسخرا پن اور اسکائی لارک احمق
اور چغد معلوم ہونے لگے۔

نیند آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت وہ
تنہا تھا اس کے ساتھ جو دوسرا اسکائی لارک مقیم تھا وہ اپنے کسی بیمار رشتہ دار کی عیادت کے لیے گیا
تھا اور اب تک لوٹا نہ تھا۔

(۲)

کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر گلابی جاڑوں کی شفاف چاندنی پھیلی تھی۔ سلمان دریچے کے
قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا نرم اور پرسکون تھی۔ اس میں آغازِ بہار کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک
تھی۔ چاند ایک اونچی عمارت کی منڈیر کے پیچھے سے ابھر رہا تھا۔ شبنم سے بھیگے ہوئے درختوں پر اس
کی زرد شعاعیں جھلملا رہی تھیں۔ رات مسکرا رہی تھی اور سلمان کا دل افسردہ تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے خوابناک نظروں سے جاگتی ہوئی رات کے دلآویز حسن کو دیکھتا رہا۔ اسی عالم
میں اسے سلطانہ یاد آگئی۔ وہ سیاہ آنکھوں والی دوشیزہ جو اس کے کندھے پر سر ٹکا کر رو پڑی تھی جسے
فلک پیا کی طوفانی سرگرمیوں میں وہ فراموش کر چکا تھا۔ اس نے سوچا نہ جانے وہ اس کے بارے میں
کیا سوچتی ہو گی؟ کیا کہتی ہو گی؟ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے، کیسی ہے؟ وہ دیر تک سلطانہ کے
متعلق سوچتا رہا۔

مسخرا پن: دل لگی، ہنسی مذاق۔ چغد: اُلو، بیوقوف۔ دریچہ: کھڑکی۔ منڈیر: کنارہ۔ دلآویز: دل کو لبھانے والا۔

دوسرے روز، دوپہر سے کچھ پہلے وہ نیاز کی دکان کی جانب گیا۔ دکان پر تالا لگا تھا۔ اس نے
قریب کے چائے خانہ میں ایک پیالی گرم چائے پی اور ریستوران سے نکل کر اس گلی میں داخل ہوا
جو نوشا کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اس روز وہ گلی اسے کچھ اجنبی سی معلوم ہوئی۔ گلی سے گزرتے
ہوئے اسے نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نوشا کے گھر کے سامنے پہنچا۔
وہی نیچی چار دیواری۔ وہی کھپریل کی چھت اور کبڑوں کی طرح جھکا ہوا شیشم کا پیڑ۔ ہر چیز اپنی جگہ
ویسی ہی تھی۔

نوشا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹکا مگر
فوراً ہی اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ آگے چلا گیا۔ گلی میں بہت دور تک جانے کے بعد
کچھ سوچ کر واپس آگیا ایک بار پھر وہ نوشا کے دروازے پر تھا۔ اس بار بھی وہ چپ چاپ وہاں سے
گزر گیا۔ یہ عجیب سا خوف تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ اس کا دل ہر بار زور سے دھڑکتا۔ طرح
طرح کے وسوسے پیدا ہوتے۔

جب وہ تھکا ہوا سا گلی سے نکل کر سڑک کی جانب مڑ رہا تھا تو اچانک نیاز سے آمنا سامنا ہوگیا۔
سلمان نے چاہا کہ اس کی نظر بچا کر چپکے سے گزر جائے۔ مگر نیاز نے اسے دیکھ لیا۔ بے تکلفی سے
مسکرا کر بولا۔ "اوہو! سلمان صاحب ہیں۔ بھئی آپ تو عید کا چاند ہوگئے۔ کہاں رہے اتنے دنوں؟"

سلمان سوکھا سا منہ بنا کر بولا۔ "کچھ دنوں کے لیے گھر چلا گیا تھا۔"

"جبھی میں نے کہا کہ یکایک کہاں غائب ہوگئے۔ خیریت تو ہے؟ کہیں نوکری دوکری تو
ملی؟"

"فی الحال تو تعلیم شروع کرنے کا ارادہ ہے۔"

وہ بڑے سرپرستانہ انداز میں بولا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہے۔ میں بھی ادھر بہت سے چکروں میں
گھرا رہا۔ کچھ تو کاروبار کا بکھیڑا تھا۔ پھر بیوی کی روز روز کی بیماری نے الگ جان عذاب میں کر دی۔
اور ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں نے شادی کر لی ہے۔"

سلمان نے مسکرا کر کہا۔ "مبارک ہو۔"

وہ بیزاری سے بولا۔ "ارے بھئی کہاں کی مبارک باد۔ کبھی فرصت سے ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا

ٹھٹکنا: حیرت سے اچانک رک جانا۔ بکھیڑا: مسئلہ، الجھاؤ۔

کہ کن چکروں میں پڑا ہوں۔ آج تو میں ۴ بجے دن کی گاڑی سے کوئٹہ جا رہا ہوں۔"

سلمان نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اس نے فوراً پوچھا۔ "کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟"

"جلد ہی آجاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر رکوں گا۔"

"تو پھر میں واپسی پر آپ سے ملوں گا۔"

"ضرور ملنا۔ تم سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

نیاز گلی میں مڑ گیا اور سلمان سڑک پر چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ نیاز اس سے ملنے کے لیے اتنا
اشتیاق کیوں ظاہر کر رہا ہے۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ ساتھ ہی سلطانہ کی ماں کی بیماری کی خبر سن کر اسے
تشویش پیدا ہوئی۔

اس نے اسی وقت طے کیا کہ نوشا کے گھر ضرور جانا چاہیے۔

وہ ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ کر سلطانہ سے ملنے کا پروگرام بناتا رہا۔ رات کو بستی کے اسکول گیا۔ مگر
اس روز سبق نہیں پڑھایا۔ اپنے شاگردوں کو سامنے دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو کل
رات کو جلسے میں گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے اور اسکائی لارکوں کو مردود اور ملعون قرار دینے
والے مولوی کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ یہ سب کمینے اور ذلیل ہیں۔ الو کے پٹھے ہیں۔ میں ان
کے لیے کیوں اپنا سر کھپاؤں؟"

اس نے سردرد کا بہانہ کیا اور ذرا ہی دیر بعد اسکول سے باہر چلا گیا۔ مگر ہیڈ کوارٹر کے بجائے
نوشا کے گھر کی جانب چل دیا۔

❁ ❁ ❁

رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ گلی کی چہل پہل اجڑنے لگی تھی۔ جانے کو تو وہ نوشا کے گھر پر پہنچ
گیا مگر نیاز کے خوف سے دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ سلمان تذبذب کے
عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسی اثنا میں سامنے سے ایک راہ گیر آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے
سلمان کو اندھیرے میں اس طرح کھڑا دیکھ کر مشتبہ نظروں سے گھورا۔ آگے جا کر بھی اس نے مڑ
مڑ کر دیکھا۔

سلمان گھبرا گیا۔ اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

اشتیاق: شوق، خواہش۔ عمل: وقت۔ تذبذب: سوچ بچار۔

اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد سلطانہ کی آواز ابھری۔ "کون ہے؟" کہیں دور سے بول رہی تھی۔ سلمان شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے ایک بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس دفعہ سلطانہ بیزاری سے بولی۔

"ارے بھئی کون ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟"

ساتھ ہی صحن میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی اسی طرف آرہا تھا۔ چاپ نزدیک آ گئی۔ سلمان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

دروازے کے بالکل قریب سے سلطانہ کی آواز ابھری۔ "کون ہے؟"

اب خاموش رہنا ناممکن تھا۔ سلمان نے آہستہ سے کہا۔ "میں ہوں سلمان۔"

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ دروازے کے اس پار چوڑیوں کی کی آواز آئی۔ ایک منٹ، دو منٹ، چار منٹ، خاصی دیر ہو گئی نہ کوئی آواز ابھری نہ دروازہ کھلا۔ سلمان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا وہ ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹائے، خاموش کھڑا انتظار کرتا رہے یا واپس چلا جائے۔ عین اس وقت جب وہ ناامید ہو چکا تھا آہستہ سے دروازے کی کنڈی کی آہٹ ہوئی۔ دروازے کا ایک پٹ چرچراتا ہوا تھوڑا سا کھل گیا۔

سلمان نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ اور کھول دیا اور دہلیز پر ایک قدم رکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ سلطانہ دروازے سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ سلمان نے محبت سے اس کی ٹھوڑی کو چھو لیا۔

سلطانہ نے پیچھے ہٹ کر سرگوشی کی۔ "اماں جاگ رہی ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے آپ آئے ہیں۔"

سلمان نے مڑ کر صحن کی جانب دیکھا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ باورچی خانے کی دیوار سے ملحق ایک اور کمرہ بن گیا تھا۔ اس میں روشنی ہو رہی تھی۔

سلطانہ نے اس کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ "اماں اس کمرے میں ہیں۔ وہیں چلے جایئے۔"

سلمان نے پوچھا۔ "نیاز کوئٹہ چلا گیا؟"

"ہاں! مگر آپ کو کس نے بتایا؟"

"وہ مجھے آج دوپہر ملا تھا۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "اچھا!"

زیادہ بات چیت کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سلمان فوراً نئے کمرے کی جانب چلا گیا کمرے میں جاکر اس نے دیکھا۔ سامنے پلنگ پر سلطانہ کی ماں لیٹی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ ہلدی مائل نظر آرہا تھا۔ اس کا جسم بہت لاغر ہو گیا تھا۔ وہ نحیف آواز سے بولی۔

"بہت دن بعد آئے۔ کیسے رہے؟"

وہ کمرے میں رکھی ہوئی کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے جواب دیا۔ "میں تو اچھا رہا مگر آپ نے اپنی کیا حالت بنا لی۔"

"پتہ نہیں کیا بیماری ہے۔ بس بیٹھے بٹھائے اچانک دورہ پڑتا ہے۔"

سلمان نے پوچھا۔ "علاج کس ڈاکٹر کا ہو رہا ہے؟"

"ڈاکٹر تو سنا ہے کہ بہت اچھا ہے۔ مگر میری حالت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ خدا معلوم اب تک کتنے انجکشن لگ چکے ہیں۔ آئے دن نہ معلوم کون کون سی دوائیاں آتی ہیں۔ مگر میرا حال جیسا ہے وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔"

سلمان نے غور سے اسے دیکھا۔ واقعی اس کی صحت بہت گر چکی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ بار بار ہانپنے لگتی۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر صاف معلوم ہوتا کہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہے۔ سلمان نے سوچا کہ وہ ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لے کر آئے گا اور ان سے معلوم کرے گا کہ آخر بیماری کیا ہے۔ اس کی حالت اتنی ابتر کیوں ہوتی جا رہی ہے؟" یہی سوچ کر اس نے کہا۔

"میرے ایک دوست ہیں۔ بڑے ہوشیار ڈاکٹر ہیں۔ میں کسی روز ان کو لے کر آؤں گا۔"

وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ "کوئی یہ تو بتا دے کہ آخر مرض کیا ہے؟ یہاں تو اب تک یہی پتہ نہیں چلا۔ ان سے کہتی ہوں کسی اور ڈاکٹر کو دکھاؤ تو ناراض ہوتے ہیں۔ وہ اس ڈاکٹر کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میرا اس پر یقین ہی نہیں رہا۔ جب اعتقاد نہ ہو تو علاج کیا خاک فائدہ کرے گا۔" وہ ایسی باتیں کرنے لگی جن سے ناامیدی جھلکتی تھی۔ سلمان نے تسلی دی۔ دل جوئی کی باتیں کیں۔

ہلدی مائل: ہلدی کے رنگ کا۔ نحیف: کمزور۔ ابتر: خراب۔ اعتقاد: یقین۔

سلطانہ نے یا تو ساری باتیں بتادی تھیں یا پھر ماں نے جان بوجھ کر اس رات کے با
تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا جب وہ وعدہ کرنے کے باوجود واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اس وقت ر
بیماری کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی سے مایو
ہے۔ سلمان نے حتی الوسع دلاسا دینے کی کوشش کی اور چلتے وقت وعدہ کیا کہ وہ ڈاکٹر زیدی
بہت جلد آئے گا۔

کمرے سے نکل کر صحن میں آیا۔ دیکھا، دالان کے کھمبے سے لگا کوئی اندھیرے میں ک
یہ سلطانہ تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بھی اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی۔ سلمان کو اس طرف جانے
نہ ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ صحن سے گزرتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا اور وہاں رک کر سلطانہ کا انتظ
لگا۔ سلطانہ دالان سے باہر نکلی۔ اس نے آنگن عبور کیا اور سلمان کے قریب پہنچ گئی۔ لو
دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر سلمان نے سلطانہ کا نرم نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
جذباتی انداز میں بھینچ لیا۔ آہستہ سے بولا۔

"میں پھر آؤں گا۔"

اس نے دبی زبان سے کہا۔ "دیکھئے آئیے گا ضرور۔"

سلمان نے جواب دینے کے بجائے اقرار میں گردن ہلادی۔ دروازہ کھولا اور باہر چلا گ

(۳)

فلک پیا کا ایک وفد علی احمد کی سرکردگی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ملا۔ وہ حال
تبدیل ہو کر اس شہر میں آیا تھا۔ وہ اونچے قد کا نوجوان افسر تھا۔ اس وقت سرمئی رنگ کا سو
ہونٹوں میں پائپ دبائے، بڑے وقار کے ساتھ بیٹھا تھا وفد کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے
بات چیت شروع ہوئی۔ علی احمد نے مسجد کا قضیہ اس کے سامنے پیش کیا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کی باتیں پوری توجہ سے سنیں۔ پائپ پر کش لگایا۔ ذرا

حتی الوسع: جہاں تک ہو سکا۔ آنگن: صحن۔ سرکردگی: سربراہی۔ وقار: عزت، جاہ و جلال۔ قضیہ: جھگڑا۔

پھر وفد کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "اچھا ہوا کہ آپ لوگ بھی آ گئے۔ کل خان بہادر
زند علی بھی ایک وفد کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔ دونوں فریقین کے بیانات میں نے سن
لیے ہیں۔ میں عنقریب اس کی تحقیقات کرنے والا ہوں۔"

علی احمد نے دریافت کیا۔ "کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مسجد کے نام پر تعمیر خان بہادر صاحب
کے ایما پر ہوئی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ان کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد علاقے کے لوگوں ہی نے
ہے۔ وہ صرف اپنی مذہبی فریضے کے تحت اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

علی احمد نے اسے مطلع کیا۔ "میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس تعمیر سے
قے کے لوگوں کا کوئی تعلق نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی اطلاع درست نہیں ہے۔ متعلقہ علاقے کے لوگوں ہی کا وفد
پاس آیا تھا۔ ان کے اس علاقے میں مکانات ہیں اور وہ ایک مدت سے وہاں آباد ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ سلمان نے جو اسکائی لارکوں کے وفد میں شریک تھا، ڈسٹرکٹ
ٹریٹ کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"خان بہادر نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ بستی کے لوگوں کو تو اس بات کا علم بھی نہیں
یہ صرف خان بہادر کی سازش ہے۔ وہ اس طرح اسپتال کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔
کو ان کے خلاف فوری کارروائی کرنی چاہیے۔ ورنہ مجبوراً ہم کو جوابی اقدام کرنا پڑے گا۔ یہ تو
سر دھاندلی ہے۔ مذہب کے نام پر ڈاکہ زنی ہے۔"

سلمان بالکل اس انداز سے بول رہا تھا گویا اسکائی لارکوں کے اجلاس میں تقریر کر رہا ہو۔ وہ
بھول گیا کہ شہر کے ایک اعلیٰ حاکم کے روبرو بات کر رہا ہے۔ جو سی ایس پی آفیسر تھا اور اپنے
انگریز آئی سی ایس افسروں کی روایات برقرار رکھنا چاہتا تھا جو نہتے مظاہرین پر گولیاں چلا کر اپنے
آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط کرتے تھے اور کلب میں وہسکی کا
گھا کر حقارت سے کہتے تھے۔

"آج پانچ حرام زادے مارے گئے۔"

سراسر: مکمل، پورے طور پر۔ نہتے: خالی ہاتھ۔

سلمان کی باتیں سن کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی گردن کو ا دیا اور پائپ پر کئی لمبے لمبے کش لگا کر بہت سا دھواں منہ سے اگل دیا۔ اس نے وفد کے ارکا نظروں سے دیکھا۔ "دیکھئے آپ لوگوں نے کوئی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو میں سب کو ا کر دوں گا۔ اس قسم کی دھمکیاں آپ لوگ وزیروں کو دیا کریں۔ اس لیے کہ ان کو آپ کے و ضرورت پڑتی ہے۔"

سلمان اس کی اس دھمکی پر بہت بھنایا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ مگر علی احمد نے اسے ا موقع نہ دیا۔ اس نے نوجوان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہا۔ "ہماری جانب سے دھمکی کا سوال نہیں ہوتا۔ ہم تو آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں اس قسم کی مجرمانہ کی سرکوبی کی جائے۔ ورنہ اس سے نہ صرف عوام میں اسلام کے خلاف بدظنی پیدا ہو گی بلکہ م کی حوصلہ افزائی ہو گی۔"

وہ بولا۔ "آپ مسئلے کو جس قدر معمولی سمجھ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ مسئلہ بے حد ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کس قدر جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اگر ا خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی تو آپ بھی الٹا حکام ہی کو موردالزام ٹھہرائیں گے۔"

اب وہ اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت چھا گئی تھی۔ بات کرنے ک سے یہ حقیقت صاف جھلکتی تھی کہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ محض الو کے پٹھے ہیں۔ اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اور نہ قانون کا کوئی احترام۔ اس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے

"بہر حال میں آج ہی اس معاملے کی تحقیقات کے لیے حکم جاری کر دوں گا۔ یوں نقص امن کے خطرے کے پیش نظر متاثرہ علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی ہے اور دروازے پر پولیس کا پہرہ لگوا دیا ہے۔ ضرورت پڑی تو پولیس فورس میں اور اضافہ کر دیا جا

یہ سیدھے سادے الفاظ میں وفد کو تنبیہہ دی گئی تھی۔

اس نے سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔

وفد کے ارکان جب باہر نکلے تو دل برداشتہ تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے قد آہستہ اٹھ رہے تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس بہت سی توقعات لے کر گئے تھے اور

سرکوبی: سزا دینا۔ بدظنی: برے خیالات۔ مفسد: جھگڑا کرنے والے۔ خشونت: سختی، غصہ۔ تنبیہ: خبردار کرنا۔

…نات کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہیڈ کوارٹر کی جانب جا رہے تھے۔

وفد کے ارکان میں جو اسکائی لارک سب سے زیادہ مضمحل اور نڈھال نظر آ رہا تھا وہ سلمان …وہ اس طرح تھکا ماندہ چل رہا تھا جیسے اس کی پشت پر منوں بوجھ لدا ہو۔ ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد …ی اس کا یہی حال رہا۔

علی احمد اپنی رپورٹ لکھنے چلا گیا۔

سلمان کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے زیادہ علی احمد پر تاؤ …ہا تھا جس نے بڑے اعتماد سے یقین دلایا تھا کہ حکومت اس معاملے میں ضرور کچھ نہ کچھ کارروائی …ے گی۔

سلمان سہ پہر تک لیٹا رہا اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔

❀ ❀ ❀

دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ کوٹھی کے باہر اسکول سے لوٹنے والے بچوں کا ملا …شور ابھر رہا تھا۔ سلمان کو یہ شور و غل بہت برا معلوم ہوا۔ اس نے کھڑکی کے قریب جا کر سڑک …لڑنے والے بچوں کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور غصے سے کھڑکی کے دونوں پٹ زور سے بند کر …یے۔

شام کو سلمان نے ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لیا۔ نوشا کے گھر پہنچا۔ ابھی تک سلطانہ کی ماں کی …بت سنبھلی نہیں تھی۔ دو روز قبل جو دورہ پڑا تھا اس سے نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ …ہال پڑی تھی اور رک رک کر گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ ڈاکٹر زیدی نے بڑی توجہ سے اس کا …ئنہ کیا۔ بیماری کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

نوشا کی ماں نے دریافت کیا۔ "ڈاکٹر صاحب! کوئی گھبرانے کی تو بات نہیں؟"

ڈاکٹر زیدی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں، آپ انشاء اللہ جلد اچھی ہو جائیں گی۔"

"مگر میری حالت تو دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اب بچوں …کلا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرّا گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اسے تشفی دی۔ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا جس سے مریضہ کو خاصی ڈھارس

…نڈھال: بہت زیادہ تھکا ہوا۔ اوٹ پٹانگ: فضول۔ ڈھارس بندھنا: ہمت بڑھنا، تسلی ہونا۔

بندھی۔ اس نے ایک کاغذ پر چند دوائیں لکھ کر دیں۔ ان کے استعمال کے متعلق ضروری ہدایات اور تاکید کرتے ہوئے بولا۔

"جس قدر جلد ہو سکے یہ دوائیں استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔"

وہ دبی زبان سے بولی۔ "مگر اس کے لیے مجھے اپنے ڈاکٹر سے بھی تو پوچھنا پڑے گا۔"

ڈاکٹر زیدی اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ پڑ گیا۔ وہ جواب دیے بجائے گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ نوشا کی ماں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ ڈاکٹر خیرات محمد کا علاج فوراً بند کر دیں ورنہ آپ کی زندگی خطر میں پڑ جائے گی۔"

نوشا کی ماں اور سلمان دونوں حیرت زدہ ہو کر ڈاکٹر زیدی کو دیکھنے لگے۔ کمرے میں چھا گیا۔ لیمپ کی لو ہوا کے تیز جھونکے سے بھڑکی۔ دیواروں پر پھیلی ہوئی پرچھائیاں جھومنے لگیں کمرے کی فضا آسیب زدہ معلوم ہونے لگی۔ مریضہ کا چہرہ گہرا زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں حلقوں اندر بے حس پڑی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ کسی لاش کی طرح بے جان آ رہی تھی۔

آخر اس ہیبت ناک سناٹے میں ڈاکٹر کی آواز ابھری۔ "مسٹر سلمان! اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

سلمان کھڑا ہو گیا نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا۔

"تم واپس آؤ گے؟"

سلمان کے پاس اب وقت بہت کم تھا۔ اسے تعلیم بالغاں کے مرکز جانا تھا۔ اس نے جوا دیا۔ "جی نہیں۔ اس وقت تو میں واپس نہیں آؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"کل تو آؤ گے؟"

"جی ہاں، کل دوپہر کو آؤں گا۔"

وہ اصرار کرنے لگی۔ "دیکھو آنا ضرور۔"

"نہیں، نہیں، میں ضرور آؤں گا۔"

دونوں کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گئے۔ آگے آگے ڈاکٹر زیدی تھا۔ سلمان اس

پیچھے چل رہا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہی اس نے چاروں طرف تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ سلطانہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ نے بڑی معصومیت سے اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھ لیا۔ سلمان مسکرا دیا۔

ڈاکٹر زیدی اور سلمان گھر سے نکل کر باہر گلی میں آ گئے۔ ڈاکٹر کچھ دیر تک اندھیری گلی میں خاموش چلتا رہا۔ اچانک اس کی بھاری آواز ابھری۔ وہ سلمان سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے تعجب ہے کہ مریضہ اب تک زندہ کیوں ہے۔ اسے تو بہت پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔"

"مگر یہ بیماری کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا بلکہ بڑا بے تکا سا سوال کیا۔ "تم بتا سکتے ہو کہ شوہر کے ساتھ مریضہ کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ چند ہی مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے پلٹ کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو یہ ان کی دوسری شادی ہے۔ ان کے شوہر کی عمر کیا ہو گی؟"

سلمان نے بتایا۔ "دیکھنے میں تو وہ خاصا جوان معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی عمر چالیس سے کم ہی ہو گی۔"

"مریضہ کی کچھ جائداد وغیرہ بھی ہے؟"

"نہیں۔" سلمان نے وضاحت کی۔

ڈاکٹر ذرا دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "تب تو مجھے اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "یہ ڈاکٹر خیرات محمد اس قدر بدنام ہے کہ اس کا نام سنتے ہی خواہ مخواہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل وہ مریضہ کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکا اور الٹے سیدھے انجکشن لگانا شروع کر دیئے۔ ان عطائی ڈاکٹروں کے علاج میں ہمیشہ جان کا خطرہ رہتا ہے۔"

سلمان ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے پہلے آپ کوئی خطرناک بات سوچ رہے تھے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے کچھ ایسی ہی بات سوچی تھی۔ بات یہ ہے کہ میں آٹھ سال تک پولیس اسپتال میں سرجن رہا ہوں۔ مجرموں سے میرا بہت عرصے تک واسطہ رہا ہے۔"

تجسس انگیز: تلاش ڈھونڈنے والی۔ بے تکا: فضول۔

سلمان نے اصرار کر کے پوچھا۔ "مگر یہ تو بتایئے، آخر مرض ہے کیا؟"

"مریضہ کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ دل کو خون سپلائی کرنے والی رگیں سکڑتی جارہی ہیں اور یہ تبدیلی اچانک رونما ہوئی ہے۔"

سلمان خوفزدہ ہو کر سوچنے لگا، یہ تو بہت خطرناک بیماری ہے۔

ڈاکٹر زیدی اسے پولیس اسپتال کے تجربات بتانے لگا۔ اس نے سلمان کو ایک بوڑھے کرنل کا واقعہ سنایا۔ جس کے جسم میں انجکشن کے ذریعہ پاگل کتے کا خون داخل کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ دیوانہ ہو گیا۔ ایک روز دیوانگی کے عالم میں اس نے ریوالور چلا کر خودکشی کرلی۔ اس واقعے کی تفصیلات بڑی ہیبت ناک تھیں۔ سلمان بار بار حیرت زدہ نظروں سے ڈاکٹر زیدی کو دیکھتا جس کا سر گنجا تھا اور آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہیڈ کوارٹر پہنچے اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہیڈ کوارٹر میں زیادہ دیر ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔ سلمان فوراً تعلیم بالغاں کے مرکز کی جانب چل دیا۔

اس روز بھی وہ جلد ہی پڑھا کر واپس آگیا۔ ان دنوں وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لے رہا تھا۔ فلک پیما کی سرگرمیوں کی جانب سے اس نے بے نیازی برتنا شروع کر دی تھی۔ اب وہ سلطانہ اور اس کے گھر کے متعلق زیادہ سوچا کرتا۔

کئی روز بعد وہ پھر نوشا کے گھر گیا۔ اس نے سڑک عبور کی اور جیسے ہی اس گلی میں داخل ہوا جو نوشا کے گھر کی جانب جاتی تھی، نیاز سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً لوٹا۔ اب نوشا کے گھر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اسکائی لارکوں کا ایک وفد وزیر داخلہ سے ملنے کراچی گیا ہے۔ اس کے بعد وہ اکثر ایسی اطلاعات سنتا رہا۔ حکام اور وزرا سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ اس عرصے میں مسجد کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری رہا۔ پرانی چار دیواری گرا کر نئی دیواریں کھڑی کی گئیں۔ اونچے اونچے ستون تعمیر کیے گئے۔ ان پر محرابیں بنائی گئیں۔ کام اس قدر تیز رفتاری سے ہو رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے مسجد کی عمارت ابھر کر سامنے آگئی اور حکام یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کارروائی کی جائے۔

آخر وہ دن بھی آگیا جب مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مسجد اس انداز سے بنائی گئی تھی کہ سڑک

...جانب جو حصہ تھا اس میں دس دکانیں نکالی گئیں۔ مسجد کی دیکھ بھال کے لیے ایک ٹرسٹ قائم ...گیا۔ جس کا تاحیات صدر خان بہادر فرزند علی تھا۔ پانچ ٹرسٹیوں میں خان بہادر کے دو بھتیجے تھے ...ر ایک داماد بھی شامل تھا۔

خان بہادر فرزند علی نے اس ٹرسٹ کو باقاعدہ رجسٹر کروالیا تھا۔

...دکانیں، چونکہ بازار کے رخ تھیں لہٰذا مسجد کی تعمیر سے پہلے ہی تگڑی پگڑی پر اٹھ گئیں۔

...ب تک مسجد کی تعمیر ہوتی رہی خان بہادر ہر روز اپنی جھلکتی ہوئی سبز رنگ کی کار میں وہاں آتا۔ ...ٹھیکیدار سے گفتگو کرتا۔ ضروری ہدایات دیتا اور جب اپنی کار کی جانب واپس جاتا تو ٹھیکیدار دوڑ کر ...ر کا دروازہ کھولتا۔ خان بہادر اندر بیٹھ کر سر کے خفیف اشارے سے مزدوروں اور ٹھیکیدار کے ...لام کا جواب دیتا۔

کار خراماں خراماں آگے بڑھ جاتی۔

⊛ ⊛ ⊛

اسکائی لارکوں میں پہلے پہل تو بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا مگر جوں جوں مسجد مکمل ہوتی گئی ان ...کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ ان میں جھنجھلاہٹ اور احساس شکست خوردگی پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اکثر ...پنے فرائض سے لاپرواہی برتتے اور چائے خانوں میں بیٹھے گھنٹوں فضول باتیں کرتے رہتے۔

اس زمانے میں فلک پیما کے تین اجلاس ایسے ہوئے جن میں کورم بھی پورا نہ ہو سکا۔ صدر کو ...ر کسی کارروائی کے مجبوراً اجلاس ملتوی کرنا پڑتے۔ یہ بڑا نازک اور حوصلہ شکن دور تھا۔ ایسا نظر آتا ...کہ جلد ہی فلک پیما کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اس مرحلے پر علی احمد نے جرأت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اس نے فوراً اسٹڈی سرکل قائم ... جس میں وہ زندگی کے بنیادی مسائل پر بحث کرتا۔ ان کا حل بتاتا۔ اسکائی لارکوں کے کام کی ...بتا اور ان کے نصب العین کی عظمت پر روشنی ڈالتا۔ ہر رات دس بجے جب تمام اسکائی لارک ...بچے اپنے مرکزوں سے واپس آتے تو کانفرنس روم میں اسٹڈی سرکل کی کلاس شروع ہوتی۔ ان ...میں زیادہ تر علی احمد لیکچر دیتا تھا۔ صفدر بشیر اور فہیم اللہ بھی مختلف موضوعات پر بولتے۔ پھر ان پر

...ی: بہت زیادہ۔ پگڑی: وہ رقم جو دکان یا مکان کرائے پر لیتے وقت اتارنی / مالکانہ حقوق حاصل کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ خفیف: ہلکا سا۔ ...ت ہونا: کمزور ہونا۔ کورم: ارکان کی وہ تعداد جن کی موجودگی سے جلسہ کی کارروائی جائز اور موثر ہو سکتی ہے۔ شیرازہ بکھرنا: ابتری پڑنا، ...ام مجلس۔ نصب العین: اصل مقصد۔

مباحثہ شروع ہوتا۔ ہر اسکائی لارک اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اظہار خیال کرتا۔ اپنی ذہنی تربیت کرتا اور معلومات میں اضافہ کرتا۔

ابتدا میں اسکائی لارک اسٹڈی سرکل میں بے دلی کے ساتھ شریک ہوتے۔ مباحثے میں حصہ لینے سے کتراتے۔ خاموش بیٹھے سگریٹ کے کش لگایا کرتے۔ مگر یہ بے تعلقی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہی۔ ان میں مطالعے کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ اب وہ چائے خانوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے لائبریری میں نظر آتے۔ علی احمد جو کتابیں تجویز کرتا ان کو پوری توجہ سے پڑھتے۔ ان کے نوٹ لیتے اور رات کو اسٹڈی سرکل میں شریک ہوتے تو بڑھ چڑھ کر بولتے۔

سلمان کا انداز فلک پیا کے جلسوں میں ہمیشہ جارحانہ ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے رویے میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر بات کرتا۔ اس کا لہجہ غیر جذباتی اور سلجھا ہوا ہوتا۔ بات میں وزن اور استدلال ہوتا۔ ان دنوں وہ اکثر رات گئے تک جاگتا رہتا۔ اس کی گردن میز پر جھکی ہوتی۔ سامنے کوئی کتاب ہوتی اور ٹیبل لیمپ کے شیڈ سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش ٹھوس اور تیکھے نظر آتے۔

اسٹڈی سرکل قائم ہونے کے چند ہی ہفتوں بعد فضا بدلنے لگی۔ اسکائی لارکوں میں پائی جانے والی شکست خوردگی اور بے حسی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔ علی احمد کے لکچروں نے ان میں نئی روح پھونک دی تھی۔ اب پھر وہ فلک پیا کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ مگر علی احمد ہنوز مطمئن نہیں تھا۔ اس نے اسکائی لارکوں کی بنیادی کمزوری کا سراغ لگا لیا تھا۔ چنانچہ جب فلک پیا کا اگلا اجلاس ہوا تو علی احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ اسکائی لارکوں کا ہیڈ کوارٹر صفدر بشیر کی کوٹھی سے منتقل کر کے کسی پس ماندہ بستی میں بنایا جائے۔

علی احمد نے جس وقت یہ تجویز پیش کی تو اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود رہ گیا۔ یہ جاڑوں کی رات تھی۔ باہر ہوائیں چل رہی تھیں۔ اسکائی لارک گرم کمرے میں بیٹھے تھے۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوار گیریوں سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہیٹر پر سماوار رکھا تھا جس سے قہوے کی مہکتی بھاپ نکل رہی تھی۔ کمرے کے اس خوبصورت

کترانا: بچنا۔ ذوق: شوق۔ جارحانہ: تیز۔ وزن: سنجیدگی۔ استدلال: دلیل، ثبوت۔ شکست خوردگی: مر دو ہارنے کا احساس۔ روح پھونکنا: کسی کام / چیز میں جان ڈالنا۔ ہنوز: ابھی تک۔ سماوار: پانی گرم کرنے کا برتن۔

ہوٹل میں اسکائی لارک گرم لباسوں میں ملبوس، سگریٹوں کے کش لگا رہے تھے۔ ان کو علی احمد کی تجویز بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ کئی اسکائی لارکوں نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی۔

علی احمد نے ان کے اعتراضات خاموشی سے سنے۔ جب تجویز کی مخالفت میں بولنے والا ہر اسکائی لارک اپنی بات کہہ چکا تو اس نے کھڑے ہو کر بڑے نرم اور سنجیدہ لہجے میں اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ اعتراضات کا جواب دیا۔ اس نے اسکائی لارکوں کو سمجھایا کہ ان میں مایوسی اور شکست خوردگی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسکائی لارکوں کو اسپتال کی زمین کے سلسلے میں ناکامی ہوئی۔ ایسی ناکامیوں سے تو آئندہ بھی سابقہ پڑے گا اور وہ ہر بار نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ جدوجہد کریں گے۔ اس احساس شکست خوردگی کی اصل وجہ کوٹھی کا رہن سہن ہے۔ جب تک اسکائی لارک عوام کے ساتھ مل جل کر نہیں رہیں گے نہ وہ ان کے مسائل سمجھ سکیں گے نہ ان کی نفسیات اور نہ ہی اپنے کام کی اہمیت۔

علی احمد آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اس نے اپنے لہجے میں زور خطابت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"انجینئر بننے کے لیے مشین کے کل پرزوں سے اور ڈاکٹر بننے کے لیے انسانی جسم کی ساخت اور ہر عضو کی بناوٹ سے پوری طرح آگاہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جب ایک انجینئر بگڑی ہوئی مشین درست کرتا ہے۔ جب ایک ڈاکٹر مریض کو موت کے منہ سے بچاتا ہے تو اس کی خوشی میں ایک مقدس جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ اسکائی لارکوں کا کام اور بھی زیادہ اہم ہے۔ وہ غریب عوام کے دکھ درد اور ان کی پسماندگی دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کو بہتر انسان بنانا چاہتے ہیں۔ ان کو زندگی کا قرینہ سکھانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک عظیم جدوجہد ہے۔ ان کی کامیابی ایک روح پرور جذبہ ہے۔ ان کی مسرت فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ آپ ان پیٹ بھرے پیشہ ور سیاستدانوں کی مثال اپنے سامنے نہ رکھیں جو زندگی کو دوربین سے دیکھتے ہیں۔ اپنے خدمت گاروں، ڈرائیوروں اور خانساماؤں کی بات چیت سے عوام کے مسائل کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاندار ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر باتیں بگھارتے ہیں۔ جلسوں میں جا کر زندہ باد کے نعرے لگواتے ہیں۔ وہ لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اقتدار اور دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسکائی لارکوں کی راہ ان سے قطعی مختلف ہے۔"

پسماندگی: غربت۔ قرینہ: طریقہ، سلیقہ۔

علی احمد لمحہ بھر کے لیے رکا۔ پھر اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیڈر(ی)
دولت سے بھی حاصل ہو جاتی ہے اور دولت کمانے کے نسخے تلاش کرنے کے لیے بازار(
'دولت کماؤ اور لکھ پتی بن جاؤ' قسم کی کتاب خریدنے کی بھی ضرورت نہیں۔ خان بہادر فرزند(
سے رجوع کیجیے۔ وہ دولت پیدا کرنے کا اچھا خاصا چلتا پھرتا اشتہار ہے۔"

زور کا قہقہہ بلند ہوا اور کانفرنس روم دیر تک گونجتا رہا۔

سلمان نے بلند آواز سے کہا۔ "وہ تو کفن کھسوٹ ہے۔"

"شائی لاک بھی برا خطاب نہیں۔" فہیم اللہ نے مسکرا کر کہا۔

"کیا خان بہادری کو آپ چھوٹا خطاب سمجھتے ہیں؟" صفدر بشیر نے بھی طنز کیا۔

علی احمد خاموش کھڑا زیر لب مسکراتا رہا۔ جب خاموشی ہو گئی تو اس نے پھر اپنی تقر(یر)
شروع کی۔

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسکائی لارک پیشہ ور لیڈر بننے کے بجائے اس کسان کی زندگی م(یں)
اپنی جدوجہد کا عکس تلاش کریں جو مٹی سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ زمین کیسی ہے؟ جو بنجر زمین کو زرخیز ا(ور)
چٹیل میدانوں کو لہلہاتی فصلوں میں بدل دیتا ہے۔ جو زمین کا سینہ چیر کر خوشہ گندم پیدا کرتا ہے۔"

علی احمد دیر تک تقریر کرتا رہا۔ اپنے موقف کی تائید میں اس نے ٹھوس دلائل پیش کیے
آخر اس کی تجویز منظور کر لی گئی۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے صفدر بشیر کی سرکردگی میں ایک
کمیٹی بھی مقرر کر دی گئی۔

صفدر بشیر نے دوڑ دھوپ کر کے ہفتے بھر کے اندر گمٹی کی مضافاتی بستی میں سستی قیمت
زمین بھی حاصل کر لی۔ یہ بہت بڑی بستی تھی اور ایک بنجر پہاڑی کے دامن میں آباد تھی۔ یہا(ں)
زیادہ تر فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی آبادی تھی۔ ان کے علاوہ گوالو(ں)
کے کچھ خاندان تھے۔ گمٹی میں تعلیم بالغاں کا مرکز قائم تھا اور کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ جب ش(ہر)
میں ٹائی فائیڈ کی وبا پھیلی تھی تو اسکائی لارکوں نے اپنا پہلا طبی مرکز یہیں بنایا تھا۔

نیا ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے منصوبے پر برابر کام ہوتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب (تم)
اسکائی لارک سویرے ہی سویرے اپنے پلاٹ پر پہنچ گئے۔ وہ خاکی نیکریں اور ملیشیا کی سرمئی قمیص(یں)

کفن کھسوٹ: مراد لوگوں کا مال کھا جانے والا۔ مضافاتی: قریبی۔

پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے چونے سے عمارت کی بنیاد کے نشان زمین پر ڈالے، کدالیں اٹھائیں اور
نیو کھودنا شروع کر دی۔

بستی کے لوگوں کے لیے جلد ہی وہ تماشہ بن گئے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے چاروں طرف ہجوم
ہو گیا۔ اس ہجوم میں بچے تھے، جوان تھے اور بوڑھے بھی تھے۔ عورتیں دروازوں سے گردنیں نکال
کر ان کو حیرت سے دیکھتیں۔ شروع شروع میں انہوں نے پیشہ ور معماروں اور کاریگروں کی بھی مدد
حاصل کی۔ وہ گمٹی ہی کے رہنے والے تھے اور ان میں سے بیشتر تعلیم بالغاں کے مرکز کے طالب علم
تھے۔ اپنے اپنے کام میں منجھے ہوئے راج اور مستری تھے۔ بڑھئی اور لوہار تھے۔ انہوں نے نہ صرف
رضاکارانہ طور پر ان کے ساتھ مل جل کر کام کیا بلکہ ان کی تربیت کا فرض بھی انجام دیا۔

چند ہی روز میں اسکائی لارکوں نے ان کی مدد سے عمارت کی نیو کھود ڈالی اور دیواریں کھڑی کرنا
شروع کر دیں۔ اسکائی لارک بڑی تن دہی اور لگن کے ساتھ کام کرتے۔ کوئی اینٹیں ڈھو ڈھو کر لا
رہا ہے۔ کوئی گارا بنا رہا ہے کوئی پاڑھ پر چڑھا ہے اور زور زور سے آوازیں دے رہا ہے۔ کوئی دیوار کی
چنائی کر رہا ہے۔ اس عالم میں واقعی وہ عجیب سے لگتے۔ ان کے بال بکھرے ہوتے، چہروں پر خاک
جمی ہوتی، آوازمیں بے ترتیبی ہوتی، خاص طور پر دوپہر کے وقت جب وہ پسینے میں ڈوبے ہوئے زمین
پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ تھرماس سے پانی نکال کر پیتے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سگریٹیں
سلگا کر لمبے لمبے کش لگاتے۔ اس وقت وہ بڑی بے تکلفی کے عالم میں ہوتے۔ بات بات پر قہقہے
لگاتے۔ ایک دوسرے کے کام پر تبصرہ کرتے۔ زیادہ تھک جاتے تو کسی دیوار کے سائے میں لیٹ کر
آنکھیں بند کیے خاموش پڑے رہتے۔

جب انہوں نے عمارت کی تعمیر شروع کی تھی اس وقت انہیں اپنا کام بڑا مضحکہ خیز اور عجیب
سا لگتا تھا۔ وہ گردنیں جھکا کر چلتے اور شرمائے شرمائے سے رہتے۔ مگر اب وہ جھجک جاتی رہی تھی۔ وہ
سینہ تان کر مشقت کرتے اور لاابالی پن سے ایک دوسرے کو چھیڑتے۔ کام کرنے میں اب ان کو
ایک خاص مسرت محسوس ہوتی۔ ایسی مسرت جس کی لذت سے وہ اب تک نا آشنا تھے۔

اسکائی لارکوں نے اس قدر محنت اور جاں فشانی سے تعمیر کا کام کیا کہ دیکھتے دیکھتے ایک عمارت

نیو: بنیاد۔ پیشہ ور معمار: مراد ماہر مستری۔ منجھے ہوئے: تجربہ کار۔ تن دہی: محنت۔ پاڑھ: بانس اور لکڑی سے بنا ہوا چبوترہ جس پر بیٹھ کر
مستری کام کرتے ہیں۔ مضحکہ خیز: مراد احمقانہ۔ مشقت: محنت۔ لاابالی پن: بے پروائی۔

زمین کے سینے سے ابھر کر سامنے آگئی۔ اس پر از بس ٹوز کی چھتیں تھیں۔ آٹھ بڑے بڑے کمرے تھے۔ ایک میں فلک پیما کا دفتر قائم کیا گیا اور اس کمرے کو، جو سب سے زیادہ کشادہ تھا، لائبریری اور جلسوں کے لیے وقف کر دیا گیا۔ پانچ کمرے اسکائی لارکوں کی رہائش کے لیے تھے۔ ایک کمرے میں ڈاکٹر زیدی نے معمولی سی ڈسپنسری بھی کھول دی۔

ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے مکمل ہوتے ہی تمام اسکائی لارک اس میں منتقل ہو گئے۔ یہ زندگی بڑی سادہ تھی۔ وہ سویرے اٹھ کر بستر درست کرتے۔ کمرے صاف کرتے۔ فلک پیما کے کام کے علاوہ ان کا بیشتر وقت لائبریری میں گزرتا۔ علی احمد اور صفدر بشیر روزانہ اسٹڈی سرکل میں کر لیتے۔ مہینے میں ایک دن انہوں نے چھٹی کا رکھا تھا۔ موسم خوشگوار ہوتا تو وہ کبھی کبھار شہر سے دور نکل جاتے اور کسی پر فضا مقام پر پک نک مناتے۔

بستی میں رہائش اختیار کرنے سے اسکائی لارکوں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس علاقے میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ہر اسکائی لارک شدت سے محسوس کرنے لگا کہ ان کے چاروں طرف غلاظت ہی غلاظت ہے۔ گندے پانی کی نکاسی کے لیے گلی میں نالیوں کا باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ گھروں کے پاس جگہ جگہ گڑھے تھے جن میں گندہ پانی جمع ہو کر سڑا کرتا۔ گلی کوچوں میں ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا رہتا۔ رات ہوتی تو بستی پر گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ راہ گیر رات کے وقت راستوں پر ٹھوکریں کھاتے کیچڑ پر پھسل کر گر پڑتے۔ قدم قدم پر گندے پانی کے گڑھوں میں گرنے کا خطرہ رہتا۔

ہر چند کہ یہ علاقہ میونسپلٹی کی حدود میں تھا مگر اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ فلک پیما کے ایک اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور یہ طے کیا گیا کہ اسکائی لارکوں کا ایک وفد ڈاکٹر زیدی کی رہنمائی میں میونسپلٹی کے متعلقہ افسروں سے ملے اور ان کو صورت حال سے آگاہ کرے۔

چند روز بعد فلک پیما کا وفد میونسپلٹی کے چیئرمین سے ملا۔ اس نے ان کے مطالبات سن کر کہا کہ شہر کی مضافاتی بستیوں کے لیے میونسپلٹی نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ بورڈ کے آئندہ اجلاس میں وہ اس منصوبے کو منظور کرانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے وفد کو یقین دلایا کہ منصوبے کی منظوری ملتے ہی مضافاتی بستیوں کا ترقیاتی کام تیزی سے شروع کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر زیدی نے وا

از بس: زیادہ تر۔ پر فضا: بارونق، سرسبز۔ غلاظت: گندگی۔

آخر اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

ہفتے بھر بعد میونسپل بورڈ کا اجلاس ہوا مگر مضافاتی بستیوں کا ترقیاتی منصوبہ پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ اجلاس میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ صورت حال اس قدر نازک ہو گئی کہ سیکرٹری کو ٹیلیفون کر کے پولیس کی امداد حاصل کرنا پڑی۔ چیئرمین کو اجلاس برخاست کر کے میز کے نیچے روپوش ہونا پڑا۔

اس ہنگامے کی ابتدا اعتراضات سے شروع ہوئی۔ پھر گالی گلوچ ہونے لگی جس نے بڑھ کر ہاتھا پائی کی صورت اختیار کر لی۔ جوتے ہوا میں پرندوں کی طرح اڑنے لگے۔ گریبان چاک اور بال پریشان ہوئے۔ ہر ممبر قیس عامری کے روپ میں اسٹیج کا ایکٹر نظر آنے لگا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ چند دکانوں کے الاٹمنٹ کا قضیہ تھا جو وائس چیئرمین نے اپنے بھائی کے نام الاٹ کرا دی تھیں۔ اس مرحلے پر ایک دوسرے کی عقدہ کشائیاں ہونے لگیں۔ کسی ممبر پر ٹھیکیداروں سے رشوت لینے کا الزام تھا۔ کسی نے گرلز اسکول کی استانیوں کی عصمتیں خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نے سسرالی عزیزوں کو ملازمتیں دلوا کر پورے پورے محکموں کو اپنی سسرال بنا دیا تھا۔ غرض کہ اس حمام میں سب ننگے تھے۔

فلک پیما نے کچھ عرصے تو چیئرمین کے وعدوں پر اعتماد کر کے انتظار کیا۔ مگر جب اسکائی لارکوں کو یہ معلوم ہوا کہ مضافاتی بستیوں کے ترقیاتی منصوبے کو تیار ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے ہیں اور آج تک بورڈ کے کسی اجلاس میں اسے پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تو فلک پیما کا ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا۔

اس اجلاس میں اتفاق رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ یہ کام اسکائی لارک خود ہی انجام دیں گے۔ چنانچہ ہفتہ صفائی منانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔

صفائی کا ہفتہ بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔

اسکائی لارکوں نے بستی کے بہت سے نوجوانوں کو رضاکاروں کی حیثیت سے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ مختلف اسکائی لارکوں کی سرکردگی میں کئی گروپ بنا کر نہایت سرگرمی اور تن دہی سے کام شروع کر دیا گیا۔

روپوش ہونا: چھپنا۔ قیس عامری: مجنوں۔ قضیہ: جھگڑا۔ عقدہ کشائی: راز کھولنا۔ حمام میں سب ننگے: سب ایک ہی برائی میں مبتلا۔

ہفتہ بھر کے اندر بستی کا حلیہ تبدیل ہو گیا۔

بستی بھر میں نالیاں کھود کر بڑے نالے سے ملادی گئیں۔ گڑھے پاٹ دیے گئے۔ گلیاں ہموار کر کے جگہ جگہ کوڑا رکھنے کے ڈرم رکھ دیے گئے۔ چار لالٹینیں خرید کر بستی کے مختلف کونوں پر لگادی گئیں جن کو ہر شام روشن کرنے اور کیروسن آئل سپلائی کرنے کا بندوبست ایک اسکاؤٹ لڑکے کے سپرد کیا گیا۔ یہ ڈیوٹی ہر مہینے بدلتی رہتی۔

بستی کے قریب جو خالی میدان تھا اسے صاف کر کے بچوں کے کھیل کود کے لیے ایک معمولی پارک کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ جن مکانوں کی دیواریں اور چھتیں شکستہ تھیں ان کی سب نے مل کر مرمت کی۔

ہفتہ بھر ہر شام کو حفظان صحت کے موضوع پر تقریریں کی گئیں۔

ہفتہ صفائی توقعات سے زیادہ کامیاب رہا۔ بستی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے الف لیلیٰ داستانوں کے کسی جن نے راتوں رات پرانی بستی کی غلاظت کھرچ کر نئی بستی بنادی ہے۔ اب گلیاں صاف ستھری نظر آتیں۔ رات کو اسٹریٹ لیمپوں کی روشنی درودیوار پر جھلکتی۔ اسکاؤٹ لڑکے اس مہم کی اس کامیابی پر بے حد مسرور تھے۔ ان میں کام کرنے کا جذبہ اور تیز ہو گیا تھا۔

(۶)

نیاز جس مقصد سے کوئٹہ گیا تھا حاصل نہ ہوا۔ لہٰذا وہ جلد ہی واپس آ گیا۔ ان دنوں اس کا مزاج چڑچڑا رہتا تھا۔ بات بات پر گالیاں بکتا۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوتی تو باؤلے کتے کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ گھر میں رہتا تو بستر پر گھنٹوں خاموش پڑا رہتا یا پھر بے چینی سے ٹہلتا رہتا۔ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ گردن جھکی ہوتی اور دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوتے۔

کوئٹہ سے واپسی کے بعد ہی اس میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ حالانکہ جب وہ کوئٹہ جا رہا تھا تو بڑا ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ واپس آیا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ خلاف معمول وہ اس دفعہ خالی ہاتھ گھر آیا تھا۔ وہ ہمیشہ سوغاتوں سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئٹہ میں اس کے ساتھ کوئی

داغ بیل ڈالنا: کسی کام کی ابتدا کرنا۔ شکستہ: ٹوٹی پھوٹی۔ حفظان صحت: صحت کی حفاظت۔ بشاش: خوش۔ سوغات: مراد تحفہ۔

غمگین واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک آدھ بار بیوی نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو اس نے بے رخی سے جھڑک دیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ رات کا وقت تھا۔ نیاز کچھ ہی دیر قبل دکان سے گھر واپس آیا تھا۔ وہ بستر پر چپ چاپ لیٹا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ پاس ہی تخت پر بیوی بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ اس روز اس کی طبیعت ذرا سنبھلی ہوئی تھی۔ دوپہر کو غسل بھی کیا تھا اور اس وقت خوب بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ جسم سے عطر کی تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ وہ پہلو بدلتی تو ریشمی لباس کی سرسراہٹیں ابھرتیں۔ لیمپ کچھ ایسے رخ سے رکھا تھا کہ پوری روشنی اس کے چہرے پر نہیں پڑ رہی تھی۔ روشنی اور سایوں کے اس امتزاج میں اس کے رخساروں کی زردی دھندلی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کے نشانات مٹ گئے تھے۔

کمرے میں انگیٹھی سلگ رہی تھی۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ روشنی دیواروں پر پھیلی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ باہر دسمبر کی سرد راتوں کا مہیب سناٹا چھایا تھا۔ شیشم کے پتے رک رک کر کھڑکھڑاتے اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی۔

بیوی نے اونی شال سینے کے نیچے ڈھلکا کر اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نیاز کا بازو جھنجوڑ کر بولی۔ "کیا سو رہے ہو؟"

نیاز نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ بیوی ایک خاص ادا سے مسکرائی۔ مگر نیاز اس کی جانب توجہ دیے بغیر بیزاری سے بولا۔

"دیکھو اس وقت پریشان نہ کرو۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

بیوی کے دل پر گہرا چرکا لگا مگر وہ جھیل گئی اس دفعہ اس نے اپنا نصف جسم اس کے سینے پر جھکا دیا اور بڑے پیار سے بولی۔ "ناراض ہو مجھ سے؟"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "افوہ! بھئی حد ہو گئی۔ خدا کے لیے تم مجھے اسی طرح پڑا رہنے دو۔"

یہ دوسرا چرکہ تھا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر وہ شکوہ کرنے کے انداز میں بولی۔ "آخر تم کو ہو کیا گیا ہے؟ لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔" اس کے لہجے سے خوشامد جھلک رہی تھی لیکن نیاز ذرا بھی نہ پسیجا۔ اس کی جانب دیکھے بغیر گویا ہوا۔

امتزاج: ملاپ۔ مہیب: ہیبت ناک۔ چرکا: زخم، ٹھیس۔ پسیجنا: نرم پڑنا، رحم کھانا۔ گویا ہوا: بولا۔

"جاؤ تم اپنے بستر پر لیٹو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اس نے منہ پھیر کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ وہ جل بھن کر رہ گئی۔ اس نے محسوس
کہ کمرے کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے۔ حبس سے اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اس نے گہری سانس لی
اور دل گرفتہ ہو کر سوچنے لگی۔ کیا واقعی اب اس میں کوئی دلکشی نہیں رہی؟ بیماری نے دیمک
طرح چاٹ کر اسے کھوکھلا کر دیا ہے اور اس کھوکھلے جسم سے نیاز کو ذرا بھی دلچسپی نہیں یا پھر وہ
پریشان ہے۔ وہ بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ ایک شوہر کے ساتھ زندگی کے بارہ سال گزار
خاصی آزمودہ کار ہو گئی تھی۔ پہلا شوہر زندگی بھر اس کا مرید رہا۔ وہ اسے نت نئے حربوں سے
زلف گرہ گیر کا اسیر کئے رہی۔ اس کا جی چاہا کہ نیاز کو آزما کر دیکھے۔ یہ بڑا خطرناک اقدام تھا۔
اس وقت وہ ہر خطرہ مول لینے پر آمادہ تھی۔ اس نے سلطانہ کو آواز دی۔

"سلطانہ، اے سلطانہ!"

سلطانہ اپنے کمرے سے بولی۔ "جی اماں!" وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔

ماں نے کہا۔ "ذرا یہاں تو آؤ۔"

کچھ ہی دیر بعد پھر دروازہ کھولنے کی آواز ابھری، صحن میں چاپ سنائی دی۔ سلطانہ آ رہی تھی
کمرے کے باہر سے اس کی آواز آئی۔ "اماں!"

ماں نے کہا۔ "دروازہ کھلا ہے۔ چلی آؤ۔"

سلطانہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ اس وقت سردی سے تھر تھرا رہی تھی۔ ماں نے ا
اپنے پاس بٹھالیا۔ پوچھا۔ "کیا انو سو گیا؟"

"وہ تو سر شام ہی سو گیا تھا۔"

ماں بولی۔ "دل گھبرا رہا تھا۔ سوچا تم سے کچھ باتیں کروں۔ شاید دل بہل جائے۔"

سلطانہ نے گردن گھما کر نیاز کی جانب دیکھا جو پیٹھ موڑے خاموش پڑا تھا۔ ماں ادھر اُدھر
باتیں کرنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد نیاز کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر اپنی
کھجانے لگا۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہیں۔ انگیٹھی میں ابھی تک انگارے دہک رہے
گہری سرخ روشنی میں سلطانہ کے چہرے کی دلکشی نکھر گئی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں شبنم کے قطر

جہاں دیدہ: جس نے دنیا دیکھی ہو۔ آزمودہ کار: تجربہ کار۔ مرید: مراد تابعدار۔ زلف گرہ گیر کا اسیر: مراد عاشق / فرمانبردار۔

جھلملا رہے تھے۔ ترو تازہ رخساروں پر برسات کی سہانی شاموں کی شفق پھیل گئی تھی۔

نیاز نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں ملتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔ "ارے یہ سلطانہ کب آئی؟"

وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

بیوی نے جواب دیا۔ "ذرا ہی دیر پہلے آئی ہے۔"

"اس سردی میں اسے باہر نکلنے کی کیا سوجھی؟"

سلطانہ سر جھکا کر پان لگانے لگی۔ وہ اس سے نظریں ملاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اس نے جب بھی
اس کی جانب دیکھا اسے نیاز کی آنکھوں میں شکار پر جھپٹنے والے تیندوے کی سی تیز چمک نظر آتی۔ وہ
نامعلوم خوف سے تھرا کر رہ جاتی۔

بیوی نے نیاز سے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟"

"کل ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ آج کل طبیعت کچھ گڑبڑ ہی رہتی ہے۔"

"میں تم سے خود یہی کہنے والی تھی کل یاد کر کے ڈاکٹر کے پاس چلے جانا۔"

"فرصت مل گئی تو ضرور جاؤں گا۔"

اس نے پیار سے ڈانٹا۔ "فرصت تو تم کو کبھی نہیں ملے گی۔ تم نے اپنی جان کے ساتھ
جھگڑے ہی اتنے لگا رکھے ہیں۔ مگر کچھ اپنا بھی تو خیال رکھو۔ واہ بھئی اچھی مصروفیت ہے۔ ڈاکٹر کے
پاس جانے تک کا وقت نہیں ہے۔" نیاز اس کی باتوں پر بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر سلطانہ اٹھ کر جانے لگی۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ کہنے
لگی۔ "ابھی ایسی کون سی زیادہ رات ہوئی ہے۔"

سلطانہ بولی۔ "نیند آ رہی ہے۔"

"تیری آنکھوں میں تو چراغ جلتے ہی نیند آ جاتی ہے بیٹھ، چلی جانا۔"

دراصل وہ چاہتی تھی کہ سلطانہ ابھی نہ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ سلطانہ کے جاتے ہی نیاز
کروٹ بدل کر منہ پھیر لے گا۔

نیاز کی یہ بیزاری اس کے لیے بڑی اذیت ناک تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی ذات میں

شفق: سرخی جو سورج کے طلوع اور غروب ہوتے وقت آسمان پر پھیل جاتی ہے۔ تیندوا: چیتے کی قسم کا ایک جانور۔ چراغ جلتے ہی: مراد شام

نیاز کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ وہ اپنی دل کشی اور بچی کھچی جوانی تک کھو چکی ہے۔ وہ بوڑھی بدصورت ہو گئی ہے۔ یہ احساس اس کے سینے میں نشتر بن کر چبھ گیا۔ یہ ایسا دکھ تھا جسے برداشت کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

❁ ❁ ❁

انگیٹھی میں انگارے دہکتے رہے۔ سلطانہ کے چہرے پر شفق پھوٹتی رہی۔ اس کے ح جادو جاگتا رہا۔ باہر ہوا سردی سے بلبلاتی رہی۔

کہر آلود رات چپ چاپ کھڑی تھی۔

اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر موٹو آیا تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں شال اچھی طرح اپنے جسم کے چاروں طرف لپیٹی اور دیوار کی جانب منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ نیاز اٹھ باہر گیا اور ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لایا۔ وہ اس وقت سیاہ اوور کوٹ پہنے تھا اور بڑا لحیم شحیم نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر نے کہا۔ ”معاف کرنا نیاز۔ میں ایک کیس دیکھنے چلا گیا سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں۔“

”انجکشن کل بھی لگ سکتا تھا۔ آپ نے اس جاڑے پالے میں خوامخواہ تکلیف اٹھائی۔“

ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ”ارے بھئی ہمیں کہاں آرام نصیب۔ اپنا پیشہ ہی ایسا ٹھہرا۔“ وہ دیوار قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور نیاز کی جانب مڑ کر دیکھنے لگا۔ ”کمرہ تو خوب گرم ہے۔“ اس وقت بڑا بشاش نظر آ رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ سہ پہر ہی کو نیاز نے اسے ایک ہزار روپے کی دوسری قسط دی تھی۔

سلطانہ کی ماں خاموش بیٹھی ڈاکٹر کی باتیں سنتی رہی۔ ڈاکٹر نے ذرا ہی دیر بعد اپنے چرمی بیگ کے اندر سے سرنج نکالی اور انجکشن لگانے کے واسطے اس میں دوا بھرنے لگا۔ نیاز خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر کی پشت اس کی جانب تھی۔ سامنے دیوار پر ڈاکٹر کا سایہ بڑا ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ دوا سے بھری ہوئی سرنج لے کر مریضہ کے پاس گیا۔ مسکرا کر پوچھا۔

”کہیے طبیعت کیسی ہے؟“

”آج تو ذرا بہتر ہے۔“

ڈاکٹر تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ”اب آپ کی طبیعت انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

لحیم شحیم: موٹے جسم والا، موٹا تازہ۔

نے سرنج والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ہاتھ ادھر کیجیے۔ میں انجکشن لگا دوں۔“

”ڈاکٹر صاحب میں انجکشن نہیں لگواؤں گی۔“

پہلی بار اس نے انجکشن لگوانے سے انکار کیا تھا۔ ڈاکٹر بے نیازی سے ہنس کر بولا۔ ”کیوں، خیریت تو ہے۔ یہ آج آپ کو کیا سوجھی؟“

”نہ جانے کیوں انجکشن لگوانے سے میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا جو دیوار کی جانب منہ موڑے بیٹھی تھی۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”آپ کو خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ کہیں انجکشن سے طبیعت خراب ہوتی ہے۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”لائیے ہاتھ ادھر کیجیے۔ گھبرائیے نہیں۔ اب زیادہ انجکشن نہیں لگاؤں گا۔“

مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اب میں انجکشن نہیں لگواؤں گی۔“

نیاز کو اس کے انکار پر سخت غصہ آیا۔ ”خواہ مخواہ کی باتیں نہ کرو۔ انجکشن لگواؤ۔“

”میں نے کہہ دیا کہ اب میں کوئی علاج نہیں کراؤں گی۔“

نیاز نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔ مگر ڈاکٹر نے اسے اشارہ سے منع کر دیا اور نرمی سے بولا۔ ”دیکھیے انجکشن کا ناغہ ہو گیا تو یہ آپ کے مرض کے واسطے بہت برا ہو گا۔ میں تو اتنی رات گئے سردی میں آپ کی خاطر یہاں آیا اور آپ ہیں کہ انجکشن لگوانے سے انکار کر رہی ہیں۔ یہ تو ٹھیک بات نہیں۔“ وہ ابھی تک غیر سنجیدہ تھا۔ مسکرا مسکرا کر بات کر رہا تھا۔

مگر جب وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئی تو ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ اس میں دبے دبے خوف کا احساس بھی شامل تھا۔ اب اصرار کرنا فضول تھا۔ اس نے سرنج خالی کر کے چرمی بیگ کے اندر رکھی اور نیاز سے مخاطب ہوا۔

”معلوم ہوتا ہے اب یہ گھبرا گئی ہیں۔ بھئی ان کو کچھ روز کی چھٹی ملنی چاہیے۔“ اس دفعہ اس نے مریضہ کو مخاطب کیا۔ ”لیجیے اب تو خوش ہو جائیے!“

وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

ڈاکٹر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ نیاز بھی اس کے ہمراہ چلا گیا۔

دونوں خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا سناٹا تھا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کی آہٹ سنسان رات میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ گھر سے کچھ دور آگے جا کر ڈاکٹر نے نیاز سے کہا۔

"پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ایک خاص اسٹیج پر پہنچنے کے بعد مریض کا مزاج ایسا ہی ضدی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب! یہ تو اس نے بڑی خراب حرکت کی ہے۔"

"تم اس بات کا کچھ خیال نہ کرو۔ مریضہ کو کچھ وہم ہو گیا ہے۔ یہ عورتیں تو شکّی مزاج ہوتی ہی ہیں۔ اس شک کو تم ہی دور کر سکتے ہو۔ دیکھو زبردستی نہ کرنا۔ ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔"

"کہیں اسے کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا؟"

ڈاکٹر کے دل میں بھی چور تھا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نیاز کی بات سن کر اس کے بدن میں خفیف سی لرزش ہوئی۔ آہستہ سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ فی الحال ایسی کوئی بات نہیں" اس کی آواز میں دبی دبی تھرتھراہٹ تھی۔

"پچھلے دنوں میں کوئٹہ گیا تھا۔ کہیں میری غیر موجودگی میں کسی ڈاکٹر کے پاس نہ چلی گئی ہو۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انجکشن لگوانے سے آج اس نے پہلی بار انکار کیا ہے۔ مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے سوچتا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلتے رہے۔ کہر کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے وہ سنسان رات میں بھوتوں کی طرح ڈراؤنے نظر آ رہے تھے۔ پھر سناٹے میں ڈاکٹر کی آواز ابھری۔

"میرا خیال ہے کہ تم کو ایسی بات نہیں سوچنا چاہیے۔ جب تک کوئی بہت ہی ہوشیار ڈاکٹر نہ ہو اسے شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ بہر حال تم چوکنا رہو کہ وہ اسپتال نہ جائے اور نہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرے۔ احتیاط کرنا ہر حال میں ضروری ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے گلی کی نکڑ پر پہنچ گئے۔ سامنے سڑک پر ڈاکٹر کی کار کھڑی تھی۔ دونوں اس کے قریب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے نیاز سے مصافحہ کیا اور کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

نیاز واپس گلی میں چلا گیا۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ بیوی کے انکار نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ اس پریشانی میں خوف اور غصے کا امتزاج تھا۔

وہ جھنجلایا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ نیاز تھکا ہوا سا جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش پڑا رہا۔ پھر چین نہ آیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیوی کو مخاطب کیا۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "کیا؟" اس نے جان بوجھ کر تغافل برتا۔ اس بے نیازی پر نیاز کو اور تاؤ آیا۔ بگڑ کر بولا۔

"تمہارا سر۔"

وہ نرم لہجے میں بولی۔ "تمہارا تو لڑنے کو دل چاہ رہا ہے۔ کئی روز سے تم پر بھوت سوار ہے۔"

اس نے شال سنبھالی۔ تخت سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ نیاز اس وقت غصے میں بھرا بیٹھا ہے۔ وہ اس سے الجھنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب اسی میں خیریت ہے کہ وہ بستر پر جا کر لیٹ جائے۔

نیاز لمحہ بھر تو اسے گھورتا رہا، پھر بگڑ کر بولا۔ "میں کہتا ہوں، تم نے آج انجکشن کیوں نہیں لیا؟"

"انجکشن لگوانے سے مجھے ہول آتا ہے۔"

"اور میں جو اتنا پیسہ علاج پر برباد کر چکا ہوں۔"

"تو اب مت برباد کرو۔"

نیاز زچ ہو کر بولا۔ "انجکشنوں کا پورا کورس تو تم کو لینا ہی پڑے گا میں اس کی پیشگی رقم دے چکا ہوں۔"

وہ تنک کر بولی۔ 'واہ یہ بھی اچھی رہی۔ چاہے میں ان کو لگوا کر مر ہی کیوں نہ جاؤں۔ مگر تمہاری رقم وصول ہو جائے۔"

"میں کہتا ہوں کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو۔" اس دفعہ نیاز کا لہجہ کسی قدر دھیما تھا۔

تغافل: غفلت، لاپروائی۔ ہول: خوف، ڈر۔

وہ بھرّائی ہوئی آواز سے بولی۔ ’’خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں کوئی علاج نہیں کروں گی۔ خدا کی ذات میں بڑی قوت ہے۔ زندگی ہے تو یوں ہی اچھی ہو جاؤں گی۔‘‘ کہتے کہتے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

نیاز کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ جل کر بولا۔ ’’عجیب اُلو کی پٹھی عورت سے سابقہ پڑا ہے۔‘‘

نیاز نے پہلی بار گالی دی تھی۔ بیوی کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ چیخ کر بولی۔ ’’دیکھو زبان سنبھال کر بات کرو۔ مرنے والا مر گیا۔ وہ اپنی جگہ۔ کبھی گالی دینا تو درکنار مجھ تو کر کے بھی بات نہیں کی۔‘‘ یہ سلطانہ کے باپ کا ذکر تھا اور اس کے ذکر سے نیاز ہمیشہ جھنجلاتا تھا۔ اس وقت تو وہ یوں بھی جلا ہوا تھا۔ تڑپ کر بولا۔

’’اسی سالے بھڑوے نے تو تمہارا دماغ خراب کیا ہے۔‘‘

’’مرے ہوئے کو گالی دیتے تم کو شرم نہیں آتی۔‘‘

نیاز زور سے چیخا۔ ’’بس زبان بند کر۔ جتنا منع کرو اسی قدر حرامزادی سر پر چڑھے چلی جا رہی ہے۔ تیری تو۔‘‘ اس نے ایک گندی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

’’اچھا تو اب تم مجھ پر ہاتھ بھی اٹھاؤ گے۔‘‘

نیاز نے کئی گالیاں دیں۔ اور اس کے منہ پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کیا، پھر دوسرا، تیسرا اس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا۔ وہ خاموش کھڑی مار کھاتی رہی۔ نیاز نے اس کی کمر پر کئی لاتیں ماریں۔ شور سن کر سلطانہ ننگے پیر بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دیکھا، ماں فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی اور نیاز اس کے قریب کھڑا خچر کی مانند زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خونخوار ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ سلطانہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ جلدی سے جا کر ماں کو فرش پر سے اٹھایا۔ اس کے بال خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ مردے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ نچلے ہونٹ سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ لیمپ کی میلی میلی زرد روشنی میں بڑی ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔

نیاز نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ کھونٹی پر لٹکا ہوا کوٹ اتار کر پہنا۔ گلے میں مفلر لپیٹا

آواز گلوگیر ہو گئی: آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ سابقہ: واسطہ۔ تن بدن میں آگ لگنا: سخت غصہ آنا۔ کف: تھوک، جھاگ۔

اور تیز قدموں چلتا ہوا کمرے کے باہر چلا گیا۔ سلطانہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ اس نے آنگن میں بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سنی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

سلطانہ نے ماں کو سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک رک کر سانس لے رہی تھی۔ جسم درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ سلطانہ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر رونے لگی۔

ماں کئی منٹ تک بے ہوش پڑی رہی۔ سلطانہ اس کے قریب بیٹھی آہستہ آہستہ روتی رہی۔ آخر ماں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بڑی نحیف آواز سے بولی۔ ’’سلطانہ‘‘

سلطانہ نے جلدی جلدی دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے۔ دریافت کیا۔ ’’اب کیسی طبیعت ہے اماں؟‘‘

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گہری سانس بھری۔ پھر اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ’’رو کیوں رہی ہے میری بچی!؟ میری قسمت میں یوں ہی لکھا تھا۔‘‘ سلطانہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے اس کے سینہ پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❁ ❁ ❁

نیاز نے ساری رات دکان میں جاگ کر گزاری۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ اس کے پاس اوڑھنے بچھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ دکان میں ایک پرانا فوجی اوورکوٹ پڑا تھا جسے اس نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ مگر جوں جوں رات ڈھلتی گئی سردی شدت اختیار کرتی گئی۔ اس سردی سے اس کا پلیتھن نکل گیا وہ تمام رات جاگتا رہا۔ بیوی کو گالیاں دیتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔

دوسرے روز بھی وہ گھر نہیں گیا۔

تیسرے روز شام کے وقت انّو دکان پر آیا۔ اسے دیکھ کر نیاز نے دل میں دبی دبی مسرت محسوس کی۔ ان تین دنوں میں اس کی جو اہمیت گھٹ گئی تھی اور جسے سوچ سوچ کر اسے بیوی پر رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا، اب بحال ہو چکی تھی۔ اس نے بڑے روکھے پن سے پوچھا۔

’’کیسے آیا یہاں؟‘‘

کڑاکے کی سردی: بہت زیادہ سردی۔ پلیتھن نکلنا: کچومر نکلنا، مراد سردی کی وجہ سے حالت بہت خراب ہوئی۔

انو خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اماں نے بلایا ہے۔"

نیاز نے دل ہی دل میں کہا اب حرامزادی کو پتہ چلا۔ ابھی کیا ہے۔ چند روز بعد سالی خود ب
ہوئی آئے گی۔ یہی سوچ کر اس نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اپنی اماں سے کہہ دینا کہ اس گھر سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"انو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں
خوف تھا اور چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ نیاز نے اسے خاموش دیکھ کر زور سے ڈانٹا۔ "ابے اب میر
سر پر کیوں کھڑا ہے۔ جا کے کہہ دینا اس حرامزادی سے کہ میں اب کبھی اس گھر پر پیشاب بھی
کروں گا۔" لمحہ بھر کے لیے وہ رکا اور آنکھیں نکال کر زور سے دھاڑا۔

"ابے جا رہا ہے یا کچھ لے کر جائے گا۔"

وہ گالیاں دیتا ہوا انو پر جھپٹا۔ وہ سہما ہوا چپ چاپ دکان سے باہر چلا گیا۔

انو کے جانے کے بعد نیاز گردن اونچی کر کے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ اسے
تھا کہ اب بیوی خود منانے آئے گی۔ اسی خیال سے وہ دکان سے نکل کر کہیں گیا بھی نہیں۔ بے
سے بیٹھا بیوی کا انتظار کرتا رہا۔ رات دبے قدموں آ کر کوچہ و بازار پر چھا گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔
جب پہر رات ہو گئی اور راستوں پر سناٹا چھا گیا تو اس کا انتظار شدید ہو گیا۔ مگر بیوی تو
آئی البتہ ڈاکٹر موٹو کا کمپاؤنڈر آ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے بلوایا تھا۔ نیاز کی طبیعت پریشان تھی۔ اس
کمپاؤنڈر کو ٹالنا چاہا۔ مگر وہ گیا نہیں۔ زور دے کر بولا۔

"ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ انہیں اپنے ساتھ لانا۔ بڑا ارجنٹ کام ہے۔"

نیاز نے زیادہ حیل و حجت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خاموشی سے اس کے ہمراہ چلا گیا۔
اس وقت تنہا تھا۔ نیاز کے پہنچتے ہی اٹھ کر عقبی کمرے میں چلا گیا۔ نیاز کو اپنے ساتھ آنے کا
کیا۔ یہ مختصر سا کمرہ تھا۔ اس کی چھت بھی نیچی تھی۔ اندر دھندلا سا بلب روشن تھا۔
روشنی میں دونوں بڑے پراسرار نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"میں کئی روز سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

نیاز نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ رضامند نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر کا چوڑا چکلا چہرہ لمحہ بھر کے لیے پریشان ہو گیا۔ "یہ تم نے بہت بری خبر سنائی۔ بھئی کسی
ح سے مناؤ۔"

"وہ کسی طرح مانتی ہی نہیں۔ اسی بات پر میرا اس سے جھگڑا بھی ہو گیا۔ میں تو تین روز سے
ر بھی نہیں گیا۔"

ڈاکٹر اور پریشان ہو گیا۔ اس نے کسی قدر ناراض ہو کر کہا۔ "میں نے تم کو منع بھی کیا تھا۔ پھر
ی تم باز نہ آئے۔ یہ تم نے بڑی غیر دانش مندی کا ثبوت دیا۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ اسے نہیں جانتے۔ وہ بڑی ضدی عورت ہے۔"

"اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ تم کسی نہ کسی طرح اسے منانے کی کوشش کرو۔ یہ بہت قیمتی
ن ہے۔ اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔" ڈاکٹر نے نیاز کو نظر بھر کر دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھا
ا ڈاکٹر نے کہا۔ "تم ابھی گھر جاؤ اور پری کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرو۔" اس کا لہجہ اچانک
ہو گیا۔

"تم بھی کیسے مرد ہو۔ ایک عورت تمہارے قابو میں نہیں آتی۔"

نیاز روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر بولا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب میں اب اس کے پاس
اؤں گا نہیں۔"

ڈاکٹر نے بگڑ کر کہا۔ "نہ جاؤ۔ مگر میری ایک ہزار کی تیسری قسط دے دو اور جا کر موج کرو۔"

"دیکھیے ڈاکٹر صاحب بات یہ ہے۔۔۔۔"

ڈاکٹر نے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"بات وات سے کام نہیں چلے گا۔ انجکشن زبردستی نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے لیے تو مریضہ کو
مادہ کرنا ہی پڑے گا۔ اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو علاج بند کر دو اور کہیں تم اس خیال میں ہو کہ اتنے
ے انجکشنوں سے اس کا کام تمام ہو جائے گا تو یہ تمہارا مغالطہ ہے۔ اس میں زبردست قوت مدافعت
ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک قبرستان میں ایک عدد قبر الاٹ کرا چکی ہوتی۔"

نیاز کے لیے اب انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً کہنا پڑا۔ "اچھی بات ہے۔ جیسا
پ کہہ رہے ہیں، وہی کر دوں گا۔ مگر اب آپ یہ جھنجھٹ جلد ہی صاف کر دیجیے۔"

دانش مندی: بے عقلی۔ قوت مدافعت: مراد بیماری سے بچنے کی طاقت۔ جھنجھٹ: جھگڑا، الجھن۔

ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھر آئی۔ مسکرا کر بولا۔ "یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ جاڑا ختم ہو
سے پہلے ہی میں اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔"

اس کی آنکھوں کی چمک اور خونخوار ہو گئی۔ جھکی ہوئی چھت والے اس تنگ کمرے میں ا
موٹو اپنے بھاری بھر کم جسم کے ساتھ ڈریکولا کی مانند خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

⊛ ⊛ ⊛

نیاز ڈاکٹر کے مطب سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ مگر دونوں
کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ نیاز چپ چاپ بستر پر بیٹھ گیا اور یہ سوچنے لگا کہ بیوی سے کس طرح با
چھیڑی جائے۔ وہ نظریں نیچی کئے خاموش بیٹھی تھی۔ لیمپ کی پیلی پیلی روشنی میں اس کے چہر
نصف حصہ نظر آ رہا تھا جس کی زردی سے اس کے رخساروں پر ایک روغنی چمک پھیلی ہوئی تھی۔

نیاز کئی منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ بیوی نے اس کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس ک
حرکت نیاز کو بہت شاق گزری۔ وہ جھنجلا کر اٹھا اور اپنا ٹرنک کھول کر اس میں سامان رکھنے لگا۔
نے کھونٹیوں پر سے کپڑے اتارے۔ پلنگ کے نیچے سے جوتے اور چپلیں نکالیں۔ ان کو پرانے
میں لپیٹا۔ الماریوں سے کاغذات اور ضرورت کی دوسری اشیاء نکالیں اور ہر چیز سنبھال سنبھال
ٹرنک میں رکھنے لگا۔

وہ چپ بیٹھی اس کی ہر حرکت دیکھتی رہی۔

کئی بار اس کا جی بھی چاہا کہ اس سے پوچھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اسے
سے بات کرتے ہوئے جھجک معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ نیاز اس طرح
سامان اٹھا کر گھر سے نہ جائے۔

بات یہ تھی کہ بیماری نے اسے اپاہج بنا دیا تھا۔ اب وہ گھر میں بیٹھ کر محنت مزدوری کرنے
بھی قابل نہ رہی تھی۔ نیاز کے جانے کے بعد گھر کا دھندا کس طرح چلے گا؟ سارے اخراجات
طرح پورے ہوں گے؟ یہ احساس بڑا لرزہ خیز تھا۔

وہ اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھی کہ اچانک نیاز نے اسے مخاطب کیا۔ "میرا وہ دھو
چشمہ کہاں ہے؟"

مطب: دواخانہ۔ شاق: ناگوار۔ دھندا: کام کاج۔ لرزہ خیز: مراد پریشان کر دینے والا۔ غلطاں و پیچاں: الجھی ہوئی، پریشان۔

بیوی نے گردن گھما کر دیکھا۔ نیاز کھلے ٹرنک پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی پیٹھ بیوی کی جانب تھی۔
"یہ اس وقت دھوپ کے چشمے کی کون سی ضرورت پڑ گئی؟" بیوی کے لہجے میں مصالحت کا
رنگ تھا۔ نیاز کو شاید بیوی سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس نے فوراً پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔
"تمہیں معلوم ہو تو بتا دو۔"

وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ "یہ اتنی رات گئے تم سارا سامان کیوں الٹ
پلٹ رہے ہو؟"

اس دفعہ اس نے بیوی کی جانب نہیں دیکھا۔ پژمردہ لہجے میں بولا۔ "اب میں یہاں سے اپنا
...کالا کر کے جا رہا ہوں۔ تم من مانی کرنا۔ کوئی تم کو ستانے والا نہیں ہوگا۔" صاف لفظوں میں اب
گلہ کرنے لگا تھا۔

"تھوڑے دن اور صبر کر لو۔ نہ میں اس دنیا میں رہوں گی نہ تم کو اس طرح گھر چھوڑ کر جانا ہوگا۔"
اس کے بعد شکوہ شکایت کا دفتر کھل گیا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "قسم
خدا کی۔ تم نے میرا سارا پروگرام ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ تمہیں کیا پتہ کہ میں کیا کیا سوچ رہا تھا۔"

"کبھی تم نے مجھ سے کچھ بتایا بھی۔ اس قابل ہی نہیں سمجھتے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلے تم اچھی ہو جاؤ تو کچھ بات کروں۔ اب بات
نکل گئی ہے تو لو سن لو۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطانہ کسی طرح اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ میں سب سے
پہلے اس فرض سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کی بیوی کی سب سے بڑی
خواہش ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے سلطانہ کا بیاہ کر دے۔ اس وقت وہ اس کی اس کمزوری سے فائدہ
اٹھانا چاہتا تھا۔ نیاز کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ بیوی یہ بات سنتے ہی چونک پڑی۔ پہلے اس کے چہرے پر
تعجب ہویدا ہوا، پھر کسی دبی ہوئی مسرت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ جلدی سے بولی۔
"تم نے کوئی لڑکا دیکھا ہے؟"

مصالحت: صلح۔ پژمردہ: افسردہ، غمگین۔ ستیاناس کرنا: خراب کرنا، تباہ کرنا۔ سبک دوش ہونا: ذمہ داری پوری کرنا۔ استعجاب: حیرت۔

وہ سوچنے لگی۔ کیا واقعی نیاز کو سلطانہ کے بیاہ کی اس قدر فکر ہے یا وہ محض اسے خوش کر
کے لیے یہ بات کہہ رہا ہے؟ نیاز کے متعلق اس کے دل میں جو شبہات تھے رفتہ رفتہ مٹنے لگے تھے
"لڑکا میں نے دیکھ لیا ہے۔ نہر کے محکمے میں ملازم ہے۔ سوا سو روپے تنخواہ ہے لیکن اوپر
آمدنی اچھی ہو جاتی ہے میٹرک تک انگریزی پڑھا ہے۔ باپ پی ڈبلیو ڈی کا ٹھیکیدار ہے کھاتے پیتے
لوگ ہیں۔ میرے پرانے ملنے والے ہیں۔ ہزاروں روپے کا سامان مجھ سے لے چکے ہیں۔"
نیاز بڑے اطمینان سے جھوٹ بولتا چلا گیا۔

اس کی باتیں سن کر بیوی کو کسی قدر پشیمانی ہوئی کہ وہ اب تک نیاز کی نیت پر کیوں شک کرتی
رہی۔ ویسے وہ خاصی ہوشیار عورت تھی مگر تھی تو گھر کی بیٹھنے والی۔ سادگی میں مار کھا گئی۔ اشتیاق
بھرے لہجے میں بولی۔

"تم نے کبھی اس بات کا اشارہ تک نہیں کیا۔"

"پہلے تم اچھی تو ہو جاؤ۔ میں کل ہی رشتہ طے کیے لیتا ہوں۔ تم میں انتظام کرنے کی ہمت
ہے۔ روز تو تم پر بیماری کا دورہ پڑتا ہے۔ اب میں تو بیٹھ کر جہیز تیار کرنے سے رہا۔"

نیاز نے اور بہت سی تفصیلات بتائیں۔ وہ بچوں کی طرح ہنس ہنس کر ایک ایک تفصیل پوچھتی
رہی۔ پھر تو باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ نیاز اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اس کے بالوں
سے کھیلتا جا رہا تھا۔

دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔

⊛ ⊛ ⊛

ڈاکٹر موٹو انجکشن لگانے آیا۔ نیاز گھر پر موجود نہیں تھا۔ مگر بیوی نے بغیر کسی مزاحمت
انجکشن لگانے کی اجازت دے دی۔ وہ اب کسی طور نیاز کو ناراض ہونے کا موقع دینا نہیں چاہتی
تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہونے والی تھی۔ وہ ان دنوں صرف سلطانہ کے
کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی زردی مٹنے لگی تھی اور اس پر صحت مندی کے نشان
ابھر رہے تھے۔ اب وہ ہر وقت بشاش رہتی۔ بات بات پر ہنس پڑتی۔ بڑی تن دہی سے نیاز کی
بھال کرتی۔

کھاتے پیتے: مراد دولت مند۔ پشیمانی: شرمندگی۔

لیکن دوسرا انجکشن لگنے کے چند ہی گھنٹے بعد پھر دورہ پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ دھوپ میں
ی سلطانہ کے جہیز کا جوڑا کاٹ رہی تھی۔ باہر گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ شیشم کے درخت پر
کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ سلطانہ غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ پانی گرنے کی آواز رک رک
بھر رہی تھی۔ فضا میں سرگرمی اور ہلچل تھی۔

اچانک اس نے اپنے سینے میں سخت گھٹن محسوس کی۔ ساتھ ہی پہلو میں زور کی ٹیس اٹھی۔
نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

وہ بے حال ہو کر فرش پر گر گئی۔

تھوڑی دیر بعد سلطانہ غسل خانے سے باہر نکلی۔ اس نے دیکھا، ماں زخمی پرندے کی طرح
نا پر لوٹ رہی ہے۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر
کے پاس گئی۔ جسم چھو کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر
انہ بدحواس ہو گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اسی وقت انو آ گیا۔ سلطانہ نے اُسے فوراً ڈاکٹر موٹو کے
دوڑایا کہ اسے بلا لائے۔ وہ بے چینی سے ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگی۔

ذرا ہی دیر بعد انو نے واپس آ کر بتایا کہ ڈاکٹر گھر پر موجود تھا مگر آیا نہیں۔ کہنے لگا میں ایک
ض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ سلطانہ کو ڈاکٹر پر بہت غصہ آیا۔ ماں کی طبیعت اس وقت تک ذرا سنبھل
تھی۔ وہ اب آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آہستہ آہستہ
تی اور سینہ دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیتی۔

سہ پہر تک مریضہ کی حالت اس قابل ہو گئی کہ وہ آنگن سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور
بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ لیکن ابھی وہ اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ بات چیت کر سکے۔ کئی بار اس
بات کرنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر سینے کی ٹیسوں نے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اسی عالم میں
کی آنکھ لگ گئی۔

وہ شام تک پڑی سوتی رہی۔

رات کو اس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی۔ اس نے گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ پیا اور تکیے سے
کر اونچی ہو کر بیٹھ گئی۔ سلطانہ اس کا سر دبانے لگی۔ رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ سردیوں کی کہر
رات تھی۔ سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ نیاز ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ سلطانہ دیر تک بیٹھی ماں کا

سر دباتی رہی اور آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی رہی۔ بہت دیر بعد جب ماں کی آنکھ لگ
گئی تو سلطانہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے نیاز گھر میں آیا۔ اس وقت وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔
گہری نیند سو رہی تھی۔

نیاز نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ مگر جگانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ کپڑے تبدیل کیے
بستر پر لیٹ گیا۔

❀ ❀ ❀

سلطانہ کی ماں پر اب ہر دوسرے تیسرے روز دورہ پڑتا۔ سینے میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتیں۔ ڈا
موٹو ان دوروں کو رفع کرنے کی آڑ میں انجکشن پر انجکشن لگاتا رہا۔ وہ عام طور پر رات گئے آ
آتے ہی مریضہ کا حال پوچھتا۔ تسلی دیتا۔ سرنج میں دوا بھر کر انجکشن لگاتا اور اپنا چرمی بیگ ہاتھ
لٹکائے گھر سے باہر نکل جاتا۔

سنسان گلی میں اس کے قدموں کی آواز دور تک سنائی پڑتی۔

ایک روز سویرے ہی سویرے سلطانہ کی ماں کے سینے میں شدید درد اٹھا۔ وہ بے حال ہو
فرش پر گر پڑی۔ دن میں کئی بار اس پر غشی کا دورہ پڑا۔ ان دنوں نیاز کسی کام کے سلسلے میں کراچی
ہوا تھا۔ سلطانہ نے ماں کی حالت بگڑتے دیکھی تو فوراً ڈاکٹر موٹو کو بلوایا۔ وہ آتو گیا مگر کوئی دوا
دی۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ طبیعت خود بخود سنبھل جائے گی۔

شام کو سخت دورہ پڑا۔ آنکھیں پھر گئیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ بتیسی بیٹھ گئی۔ سلطانہ
نے ماں کا یہ حال دیکھا تو رو رو کر آنکھیں سجالیں۔ صبح سے اس کے منہ میں کھیل تک نہیں گئی
دن بھر کا فاقہ اور یہ پہاڑ سا غم۔ اس کا چہرہ کملا گیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے پاگلوں کی ط
گھر میں ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔

پھر اسے خود ہی خیال آیا۔ جلدی سے اٹھ کر وضو کیا۔ جزدان سے قرآن شریف نکالا اور
کے سرہانے بیٹھ کر سورہ یٰسین کی تلاوت کرنے لگی۔

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی میں ماں بستر پر آنکھیں بند کیے پڑی

آنکھیں پھرنا: آنکھوں کے ڈیلے پلٹ جانا۔ کھیل: مراد پانی کا قطرہ۔ جزدان: مراد غلاف۔

کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ قریب ہی کرسی پر انو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا
پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بار بار سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھتا جو دھندلی دھندلی روشنی میں لاش کی
ح بے جان نظر آرہی تھی۔

کمرے کے سوگوار سکوت میں سلطانہ کی آواز آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے
ہچکیاں لے کر رو رہا ہے۔ کوئی بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ لیمپ بھڑک کر بجھ جائے گا۔
ے میں قبر کی سی تاریکی چھا جائے گی۔ دروازہ آہستہ سے کھلے گا اور موت کا فرشتہ اندر آجائے گا۔

سلطانہ نے سورہ یٰسین پڑھتے پڑھتے محسوس کیا کہ باہر آنگن میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا
چاپ رک رک کر ابھر رہی تھی۔ سلطانہ کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ اس نے خوف زدہ نظروں
دروازے کی جانب دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کواڑ سے لگا اندھیرے میں کھڑا ہے۔

اچانک اس کی آواز گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ رک گئی۔ کمرے میں ہیبت ناک خاموشی چھا گئی۔
سلطانہ کو گھورنے لگا۔ وہ سہمی ہوئی پتھر کے مجسمے کی طرح چپ بیٹھی تھی۔

اسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ پلنگ آہستہ آہستہ چرچرایا۔ ساتھ ہی ماں کی نحیف آواز

"سلطانہ!"

سلطانہ نے جلدی سے گردن گھما کر ماں کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے دیوار کو تک رہی
سلطانہ فوراً تخت سے اتر کر ماں کے پاس پہنچی۔ سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔

رات کے آٹھ بجے تک ماں کی طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ وہ اب آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔
اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ماں کے چہرے سے مردنی مٹ چکی تھی۔ اب وہ قدرے بہتر
رہی تھی۔

ماں نے باتیں کرتے کرتے ایک بار سلطانہ کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور لمحہ بھر تک بغور
تکا۔ پھر اس نے گہری سانس بھری اور انو سے مخاطب ہوئی "بیٹا جا کر آپا کنیز کو بلا لا۔ کہنا اماں
یا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔ اپنے ساتھ ہی ان کو لے کر آنا۔"

انو سعادت مند بچے کی طرح اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ سوچنے لگی۔ اس وقت اماں

مردنی: موت کے آثار۔

نے خالہ کنیز کو کیوں بلایا ہے؟ وہ ہمیشہ ان کے نام سے چڑتی تھیں۔ اچانک اتنی مہربان کیوں ہو گ
تھوڑی دیر بعد انو ایک ادھیڑ عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا جسم بھ
داہنے گال پر سیاہ مسا تھا جو بھونرے کی طرح چہرے پر بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دہانہ چوڑا تھا
میں پان کی گلوری دبی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سلطانہ کی ماں کو نظر بھر کر د
قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اے اب کیسی طبیعت ہے؟"

سلطانہ کی ماں نے جواب دیا۔ "بس اچھی ہی ہے۔ زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔"

"اے ہے، کیا اول فول بک رہی ہو۔ نہ وقت دیکھتی ہو نہ گھڑی۔ جو منہ میں آیا بھڑ
دیا۔ دشمنوں کے منہ میں خاک۔ تم کیوں زندگی کے دن کاٹنے لگیں۔ اللہ میاں تم کو اپنے بچو
سہروں کی بہار دیکھنا نصیب کرے۔ اے بیماری ہی تو ہے۔ کون نہیں بیمار پڑا۔ اچھی ہو جاؤ گ
کیوں چھوٹا کرتی ہو۔" وہ روانی سے بولتی رہی۔

سلطانہ نے جھنجلا کر سوچا۔ یہ لپ جھپنی تو گھنٹوں پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ پان چباتی ج
اور ہاتھ مٹکا مٹکا کر بولتی رہے گی۔ اسے بھوک بھی شدت سے لگ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ
کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماں تکیے سے کمر ٹکائے آپا کنیز سے باتیں کرتی رہی۔

سلطانہ کی ماں نے باتوں باتوں میں پوچھا۔ "آپا! حشمت آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"وہیں بجلی گھر میں ہے۔ اب تو بڑا اچھا کاریگر ہو گیا ہے۔ تین روپے روز ملنے لگے ہ
کے علاوہ پرائیویٹ کام سے کبھی دو کبھی ڈھائی کما لاتا ہے۔ ماشاء اللہ اس وقت سب بھائیوں
مزے میں ہے۔"

سلطانہ کی ماں کچھ دیر خاموش بیٹھی دیوار کو تکتی رہی، پھر بغیر اس کی جانب دیکھے
پوچھا۔ "کہیں اس کا رشتہ بھی طے کیا۔ ایک زمانہ میں تم گھر گھر لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔

"کل ہی ایک جگہ سے بات آئی تھی۔ مگر لڑکی مجھے پسند نہیں آئی۔ ہاتھی کی سونڈ ک
تھی اس کی۔"

دہانہ: منہ کا سوراخ۔ اول فول بکنا: فضول باتیں کرنا۔ بھڑ سے: جلدی سے۔ لپ جھپنی: بہت باتونی۔ ہاتھی کی سونڈ کی سی ناک:
بھدی ناک۔

سلطانہ کی ماں نے کہا۔ "اے لڑکی تھی یا کوئی ہتھنی۔" دونوں کو ہنسی آگئی۔
ذرا دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر سلطانہ کی ماں کی آواز ابھری۔ "آپا میری سلطانہ کو
...ن کے لیے لو گی؟"

آپا کنیز نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے اس طرح دیکھا جیسے یقین نہیں آیا ہو۔ مسکرا کر
...ہ "میں نے تو ہمیشہ تم سے کہا کہ گھر کا لڑکا ہے۔ دیکھا بھالا ہے۔ کوئی عیب نہیں۔ کسی فعل میں
...ہ ایک ذرا رنگ سانولا ہے تو مرد کا کیا روپ رنگ دیکھنا۔ کماؤ پوت ہونا چاہیے۔ بیوی کو اچھی
...ر کھے۔ حشمت کو تم جانتی ہی ہو۔ نگوڑا لڑکا کاہے کو ہے، لڑکیوں سے گیا گزرا ہے۔ کیا مجال کسی
...رف نظر اٹھا کر بھی دیکھ لے۔" وہ اپنے منجھلے بیٹے کی خوبیاں گناتی رہی اور سلطانہ کی ماں چپ
...اس کی باتیں سنتی رہی۔

جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو سلطانہ کی ماں نے کہا۔ "دیکھو آپا! میں اب زندگی سے ناامید ہو چکی
...نہ جانے کس وقت آنکھ بند ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں سلطانہ میری زندگی ہی میں اپنے گھر بار
...ہ جائے ورنہ قبر میں میری روح بلکتی رہے گی۔" یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار رونے لگی۔

"اے کیسی باتیں کر رہی ہو۔ جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔"

"نہیں آپا! اب میں بچوں گی نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے اس فرض سے
...ش ہو جاؤں۔"

"تم کہو تو میں کل ہی لڑکے کو لے آؤں۔ نکاح پڑھوا لو۔ رخصتی چاہے بعد میں کر دینا۔"
سلطانہ کی ماں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جس قدر جلد وہ سلطانہ کے فرض سے فارغ ہو جائے
اچھا ہے۔ وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا وہ نیاز کی واپسی کا
...رکرے یا اس کے آنے سے پہلے ہی نکاح کر دے؟ یہ بھی ممکن تھا کہ نیاز اس رشتے کو نامنظور
...ے جب سے اس نے چند پیسے کما لیے تھے وہ اپنے خاندانی ہونے کا جھنڈا گاڑنے لگا تھا۔
اور حشمت کا باپ سرکاری اسکول میں چپراسی تھا۔ وہ نچلے طبقے کا آدمی تھا۔ ویسا ہی اس کا
...کن تھا۔ یہی سوچ کر اس نے حشمت کی ماں سے کہا۔
"کل کونسی تاریخ ہے؟"

...یہاں پیار سے کہا گیا ہے۔ منجھلا: درمیان والا۔

"چاند کی ۱۳ تاریخ ہے۔"

"نہیں بھئی یہ ۳، ۱۳، ۲۳ ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد تم حشمت
کے ساتھ قاضی اور گھر کے چند لوگوں کو لے کر آجاؤ۔" نوشا کی ماں نے اپنا عندیہ دیا۔

"اچھی بات ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

دونوں اس سلسلے میں باتیں کرنے لگیں۔ سلطانہ کی ماں کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ بڑ
آہستہ بول رہی تھی۔ آپا کنیز کی بات بات پر باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ بڑی خوش نظر آرہی تھ
اس کے گال کا سیاہ مسا بار بار روشنی میں آجاتا تو بھونرے کے پر لرزتے ہوئے معلوم ہوتے۔
اثناء میں اتو حشمت کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔

حشمت نے سلطانہ کی ماں کو سلام کیا اور دیوار کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر خاموشی سے
گیا۔ وہ اس وقت گہرے نیلے رنگ کی پتلون اور ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ گردن میں اونی
لپٹا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں ماں کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں۔ جسم مضبوط تھا۔

سلطانہ کی ماں نے گردن موڑ کر حشمت کی طرف دیکھا اور بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔
اس کالے کلوٹے کے قابل تو نہ تھی۔ اسے تو کسی محل میں بیاہ کر جانا چاہیے تھا۔ وہ تو شہزادی
اس نے گہری سانس بھر کر دل میں کہا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کوئی اچھا بر مل جائے۔ مگر اللہ کی
یہی تھی۔ سلطانہ کی قسمت ہی میں یہ کالا دھیمر لکھا تھا۔

حشمت کے آنے کے بعد سلطانہ کی ماں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ادھر ادھر کی
کرنے لگی۔ حشمت گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت ماں کو بلانے آیا تھا۔ اس کا گھر
کا آنا جانا بہت کم تھا۔ آپا کنیز، سلطانہ کی ماں کی سگی رشتہ دار نہیں تھی۔ بہت دور کا ننھیالی رشتہ
ویسے آپس میں میل جول بھی کم تھا۔ سلطانہ کے لیے وہ کئی بار اشاروں اشاروں میں کہہ چکی
دوسروں کے ذریعے بھی پیغام بھجوایا مگر ہر بار سلطانہ کی ماں نے انکار کر دیا۔

آپا کنیز کچھ دیر بعد حشمت کے ساتھ اٹھ کر چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد ماں کر
اکیلی لیٹی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ سلطانہ کا رشتہ تو اس نے حشمت کے ساتھ طے کر دیا مگر
دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آپا کنیز مزاج کی بہت تیز ہے۔ بڑی بہو سے آئے دن

باچھیں کھلنا: بہت خوش ہونا۔ کالا دھیمر: کالا آدمی، مراد بدصورت۔

ئی رہتی ہے۔"

وہ خاموش بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ اس اثناء میں سلطانہ کمرے میں آگئی۔ وہ اس کے لیے
دودھ کا پیالہ لے کر آئی تھی۔ اس نے ماں کو دودھ پلایا اور بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ چند
لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر سلطانہ نے پوچھا۔

"اماں! اب کیسی طبیعت ہے؟"

وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں بچوں گی نہیں۔"

"خدا کے لیے اماں ایسی باتیں نہ کرو۔ ہمارا بیٹھا ہی کون ہے۔ لے دے کے ایک تمہارا دم
ہے۔" سلطانہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"ہاں بیٹی! یہی سوچ رہی تھی کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ اتو پھر بیٹا ذات ہے۔ مجھے تو سب
سے زیادہ تیرا خیال رہ رہ کر ستاتا ہے۔" ماں نے دلدوز آہ بھری اور سر اوپر اٹھا کر بولی۔

"یا اللہ! ان لاوارثوں کا تو ہی نگہبان ہے۔"

سلطانہ نے جلدی سے کہا۔ "ایسی باتیں نہ کرو اماں۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔" اس کی آواز
بھرائی اور وہ بے اختیار رو پڑی۔

ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ "رو نہیں بیٹی!" اور اس کے سر پر آہستہ آہستہ
ہاتھ پھیرنے لگی۔ سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سسکیاں بھرتی رہی۔ ماں نے نحیف
لہجے میں کہا۔ "تو رونے بیٹھ گئی۔ مجھے تو تجھ سے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" اس نے گہری
سانس بھری۔ "میں تیری ماں بھی ہوں، باپ بھی اور سہیلی بھی۔ میرے علاوہ تیرا اور کون بیٹھا
ہے۔ بہت سی باتیں جو مجھے تجھ سے نہیں کہنی چاہئیں وہ بھی کہنا پڑتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں یہ
نہیں چاہتی کہ میرے بعد تو اس گھر میں اکیلی رہ جائے۔ کوئی اتنا بھی نہیں کہ تمہارے سر پر ہاتھ
رکھے۔ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہوں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ کوئی بھی تو اپنا نہیں۔"

سلطانہ خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔

ماں کی آواز آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آپا کنیز نے آج پھر حشمت کا پیغام دیا
ہے۔ نوشا بھی گھر میں مستری ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے ہر مہینے کما لیتا ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی عیب

جھگڑا ہونا۔ دل گرفتہ: افسردہ، غمگین۔ دل دوز: دل پر اثر کرنے والی۔

نظر نہیں آیا۔ سیدھا اور سعادت مند لگتا ہے۔"

سلطانہ نے گھبرا کر سوچا۔ ہائے اللہ، یہ اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ وہ تو ایک نمبر چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ پچھلی گرمیوں ہی کی تو بات ہے۔ وہ اس کے گھر میلاد شریف میں گئی تھی۔ میلاد پڑھنے کے بعد اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ وہ پانی پینے کے لیے گھڑونچی کی طرف گئی۔ وہ کالا کالا بھوت کی طرح دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ کمبخت اندھیرے میں نظر بھی تو نہیں آتا۔ اس زور سے پکڑ کر دبایا کہ چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ منہ سے کیسی سڑی ہوئی بو آ رہی تھی۔ حرامزادے نے سارا تھوک گالوں پر چپڑ دیا۔ سلطانہ کو سخت کراہت محسوس ہوئی۔

ماں کہتی رہی۔ "میں نے تو رشتہ منظور کر لیا ہے۔ آپا کنیز تو کل ہی قاضی کو لانا چاہتی تھی، میں نے پرسوں عشاء کے بعد کا وقت رکھا ہے۔"

سلطانہ کے سینے پر جیسے کسی نے زور سے پتھر دے مارا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے ماں کو دیکھا جو تکیے سے پشت ٹکائے رک رک کر بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ آنکھیں بجھتے چراغوں کی طرح دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ بات کرتے کرتے وہ رک کر ہانپنے لگتی۔

ماں بیٹی کی نظریں ایک بار ملیں اور ماں نے محسوس کیا کہ بیٹی کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں۔ اس کے غم کو وہ جانتی تھی اور جب اس کی شدت اس نے محسوس کی تو بیٹی کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا۔ سلطانہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ زخمی گائے کی طرح اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ماں کو تکنے لگی۔

ماں نے اچانک پوچھا۔ "سلمان بہت دنوں سے نہیں آیا؟"

سلطانہ اب خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے دبی زبان سے کہا۔ "انّو کہتا تھا وہ آج کل بہت مصروف ہیں۔"

"نہیں بیٹی! وہ بڑے گھر کا لڑکا ہے ہم غریبوں کی اسے کیا پرواہ۔ کہیں روزگار سے لگ گیا ہوگا۔ کھاتا کماتا، عیش کرتا ہوگا ہمارا اس سے کیا میل جول۔ ٹاٹ کا پیوند ٹاٹ ہی میں لگتا ہے۔"

سعادت مند: فرمانبردار۔ چھٹا ہوا بدمعاش: بڑا بدمعاش۔ گھڑونچی: لکڑی کا وہ چوکھٹا جس پر گھڑے رکھتے ہیں۔ چپڑ دیا: لگا دیا۔ کراہت: نفرت، گھن۔ مردنی چھانا: موت کے آثار ظاہر ہونا۔

سلطانہ سر جھکا کر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "آپ ان کو بلا کر بات تو کیجیے۔"

"اب بات کرنے کا وقت ہی کہاں رہ گیا ہے۔"

"اس وقت تو مل جائیں گے۔ انّو کو بھیج کر بلا لیجیے۔"

"انّو اتنی رات گئے کیسے جائے گا۔ بچہ ہے اسے ڈر لگے گا۔" ماں نے عذر پیش کیا۔

سلطانہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "میں اس کے ساتھ چلی جاؤں؟"

ماں نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ سلطانہ کی ماں نہیں سہیلی ہے۔ کوئی بیٹی اپنی ماں سے ایسی بات نہیں کہہ سکتی اور جب بیٹی نے منہ پھوڑ کر اس سے سب کچھ کہہ ہی دیا اسے اب کیا کرنا چاہیے؟ وہ اسے ایک نامحرم کے پاس جانے کی اجازت دے دے؟ یہ تو بڑی بے حیائی کی بات ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ میرے اللہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے؟ ان پریشانیوں نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ نہیں، اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن میری بچی تو رو رو کر برا حال کر لے گی۔ زندگی بھر مجھے کوسنے دے گی۔ کہے گی اپنا دل چاہا تو خصم کر کے بیٹھ گئی۔ سوتیلا باپ لا کر سر پر بٹھا دیا۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اپنی بیٹی کے سامنے گناہ گار ہے۔

سلطانہ نے ماں کو خاموش دیکھ کر کہا۔ "اماں تم ناراض تو نہیں ہو گئیں؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

ماں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔ "نہیں میری بچی!" اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ سلطانہ اس کے دل کی دھڑکن صاف سن رہی تھی۔ اس کا سینہ بار بار غبارے کی طرح تن کر سمٹ جاتا۔

ماں ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔ "جاؤ انّو کو جگا کر اپنے ساتھ لے لو۔ مگر دیکھو، جلدی آ جانا۔ اکیلے میں میرا دل بڑا گھبرائے گا۔ جب تک تم آؤ گی نہیں میں جاگتی رہوں گی۔"

سلطانہ نے آہستہ سے کہا "اچھا!"

اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ پلنگ سے اتر کر نیچے آ گئی۔ جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو ماں نے ایک بار پھر ٹوکا۔

"دیکھو جلدی آ جانا۔"

نامحرم: غیر، اجنبی۔ کوسنے دینا: برا بھلا کہنا۔ خصم: شوہر۔ دل بلیوں اچھلنا: بہت بے تاب ہونا۔

سلطانہ نے ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "نہیں، اماں میں جلدی آجاؤں گی۔"
ماں نے دیکھا، سلطانہ کے چہرے پر سرخی آگئی تھی۔ اس کی آنکھیں مسرت سے ستار
طرح جھلملا رہی تھیں۔ اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ اس نے جسم ڈھیلا کر دیا اور تکیے پر سر ر
کروٹ بدل لی۔

⊛ ⊛ ⊛

جاڑوں کی رات تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ راستوں پر اکادکا راہ گیر نظر آرہے تھے۔
سلطانہ اپنے چھوٹے بھائی انو کے ہمراہ فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر پر پہنچی تو دس بج چکے تھے۔ سلما
وقت لائبریری میں بیٹھا مطالعے میں غرق تھا۔

اچانک باہر انو کی آواز سنائی دی۔

وہ اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ سلمان باہر آیا۔ انو کے ساتھ سلطانہ کو اتنی رات گئے د
حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ارے تم؟"

سلطانہ نے رسان سے کہا۔ "آپ تو اب آتے ہی نہیں۔ میں نے سوچا۔ چلو میں ہ
چلوں۔"

وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "میں آج کل بے حد مصروف ہوں۔ ذرا بھی فرصت
ملتی۔ اماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب تو روز دورہ پڑنے لگا ہے۔"

سلمان نے سوچا اس طرح باہر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔ اس نے سلطانہ
"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اندر گیا۔ ڈاکٹر زیدی سے ڈسپنسری کی کنجی لی اور باہر آکر سلطانہ اور ا
ساتھ ڈسپنسری پر پہنچا۔ قفل کھولا۔ اندر جا کر موم بتی روشن کی۔

انو کی موجودگی میں سلطانہ اس سے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ سلمان نے ا
پریشانی جلد ہی بھانپ لی۔ اس نے الماری سے ایک اور موم بتی نکالی اور سلطانہ کے ہمراہ پچھلے
میں چلا گیا۔ اس میں ایک لمبی میز تھی۔ سلمان نے سلطانہ کو کرسی پر بٹھایا اور موم بتی روشن

رسان: نرمی، محبت۔

ر دی۔ روشنی ہوتے ہی کمرے کی سفید دیواریں جھلکنے لگیں۔
سلطانہ سیاہ برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ موم بتی کی پوری روشنی
اس کی دلکشی نکھر گئی تھی۔ لانبی لانبی پلکوں کے سائے میں اس کی آنکھیں گھنے درختوں سے
ہوئی جھیلوں کی طرح شفاف نظر آرہی تھیں۔

سلمان لمحہ بھر تک اس کے تابندہ چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ اتنی رات گئے
یہاں آئیں؟"

وہ آہستہ سے بولی "میں اس وقت یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا
؟" اس نے نگاہیں اٹھا کر سلمان کی جانب نہیں دیکھا۔

سلمان تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ کسی ایسی بات کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دراصل اب تک اس
سلطانہ کے متعلق سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ اس کی بات کا کیا
ب دے۔ اسے خاموش پاکر سلطانہ کا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا۔ اس نے رک رک
ہا۔

"اب شاید مجھے اس طرح گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ملے۔"

"کیوں؟" سلمان نے پوچھا۔

سلطانہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اماں میری شادی کر رہی ہیں۔"

سلمان کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ "کب؟"

"پرسوں رات کو۔"

اسے پھر بھی یقین نہ آیا۔ "ارے اتنی جلدی!" وہ زیر لب مسکرایا۔ "یہ ویسی ہی شادی تو نہیں
و ایک بار پہلے ہو رہی تھی۔"

سلطانہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ سلمان کی بات اسے پسند نہ آئی۔ اس نے قدرے
لہجے میں کہا۔

"وہ اور بات تھی۔ آپ اس کی وجہ بھی جانتے ہیں۔"

لمحہ بھر وہ خاموش رہی۔ پھر بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ اماں کی طبیعت دن بدن گرتی جا رہی

تذبذب: سوچ بچار، فکر۔

ہے۔ بار بار کہتی ہیں کہ میں اب بچوں گی نہیں۔ چاہتی ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے میرا بیاہ کر دیں۔ وہ اپنی زندگی سے بڑی ناامید ہو چکی ہیں۔ آپ نے ادھر ان کو دیکھا نہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر کلیجہ پھٹتا ہے۔"

سلطانہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور گردن جھکالی۔ موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ سوگوار نظر آ رہا تھا۔

سلمان نے خاموش نظروں سے سلطانہ کے غمگین چہرے کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ یہ بھولی بھالی معصوم لڑکی جو سرما کی اس سنسان رات کو اس سے ملنے آئی ہے، اسے پسند ہے۔ وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ لیکن کیا وہ اس کے لیے فلک پیا چھوڑ سکتا ہے؟ اس جماعت کو جس میں شامل ہونے کے بعد اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی ڈگر بدل دے گا۔ یہ زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی لگن تھی جس میں اس کے ارمان، اس کی خوشیاں اور اس کے غم پھیل کر لاکھوں انسانوں میں بٹ گئے تھے۔ یہ ایک اسکائی لارک کی زندگی تھی جس کا نصب العین خدمت خلق تھا۔ عوام کی بھلائی، بہتری کے لیے سرگرم عمل رہنا۔ پس ماندگی اور استحصال کے خلاف جدوجہد کرنا۔

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ سلطانہ سے شادی کرنے کے بعد وہ اسکائی لارک نہ رہ سکے گا۔ اسے فلک پیا چھوڑنا پڑے گا۔ وہ ایک بیوی کا شوہر بن جائے گا۔ پھر اسے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ملازمت کرنا پڑے گی۔ چند سال بعد وہ باپ بن جائے گا۔ اس کے اخراجات بڑھ جائیں گے۔ اس کو اور زیادہ کمانا پڑیں گے۔ ایک بچہ، دوسرا بچہ، کئی بچے۔ آمدنی، زیادہ آمدنی۔ یہ سلسلہ ساری زندگی چلتا رہے گا۔ صبح سے شام تک ایک ہی فکر، ایک ہی چکر۔ دنیا میں کروڑوں انسان ہوتے ہیں اور اسی چکر میں ساری عمر پھنسے رہتے ہیں۔ اور ایک روز، ایک بیوی کو، چند بچوں کو، بچوں کے بچوں کو روتا، بلکتا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں۔

زندگی کائنات کی طرح وسیع ہے۔ ہر لمحہ ہر گھڑی ارتقا پذیر ہے۔ وہ اس قدر محدود نہیں ہو سکتی۔ تو کیا وہ اس لڑکی کو، جس کے لیے کبھی رویا بھی تھا، پاگلوں کی طرح پریشان رہا تھا، دوسرے کو سونپ دے؟ کیا مضائقہ ہے۔ زائد سے زائد یہی ہوگا کہ وہ اس کی زندگی کی ایک المناک

کلیجہ پھٹنا: صدمہ / تکلیف ہونا۔ نصب العین: اصل مقصد۔ استحصال: ظلم، زیادتی۔ دنیا سے سدھارنا: مر جانا۔ ارتقا پذیر: ترقی کی راہ پر گامزن۔ مضائقہ: ہرج۔

یاد بن جائے گی۔ اور ایسی یادیں اسی وقت حملہ آور ہوتی ہیں جب زندگی میں جدوجہد نہیں رہتی۔ جب آدمی تھک جاتا ہے۔ اپنی ذات کے حصار میں قید ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے سامنے تو بہت بڑا پروگرام ہے۔ اتنا بڑا پروگرام کہ اگر ایسی کئی زندگیاں ملیں تب بھی اس کا مشن ختم نہیں ہوگا۔

دیر تک کمرے میں گہری خاموشی رہی۔ پھر اسی گہری خاموشی میں سلطانہ کی آواز ابھری۔

"ایسا لگتا ہے کہ میں نے یہاں آکر آپ کو پریشان کر دیا۔"

سلمان کا سلسلہ خیالات منقطع ہو گیا۔ اس نے چونک کر کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

سلمان نے پوچھا۔ "جس کے ساتھ اماں نے تمہارا رشتہ طے کیا ہے وہ کیا کرتا ہے؟"

"بجلی گھر میں مستری ہے۔"

"تمہارا رشتے دار ہے؟"

"ہاں!" سلطانہ نے مختصر جواب دیا۔

"اماں کو پسند ہے؟"

"کہتی تو وہ یہی ہیں۔"

سلطانہ بغیر سوچے سمجھے سلمان کے ہر سوال کا جواب دیتی چلی گئی۔ سلمان نے ذرا دیر تک سوچا۔ پھر اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس سے شادی کر لو۔"

سلطانہ کو ایسا محسوس ہوا گویا کمرے میں جلتی ہوئی موم بتی کی لو بھڑک کر بجھ گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف تاریکی کا جال پھیل گیا ہے اور اس گھپ اندھیرے میں وہ آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی ہے، اترتی جا رہی ہے۔ اس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ وہ دم بخود بیٹھی رہی۔

سلمان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ ہم دونوں ہی کے لیے بہتر ہے۔"

سلطانہ نے دل گرفتہ ہو کر سوچا۔ میں یہاں کیوں آئی؟ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کم سے کم یہ تو نہ سنتی جس نے اس کا کلیجہ چیر ڈالا۔ یا اللہ! یہ کیسی تکلیف ہے؟ یہ کیسا دکھ ہے؟ میں کیا کروں؟ ہائے میں کیا کروں؟ اس نے محسوس کیا کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ کہیں وہ لڑکھڑا کر گر نہ

پڑے۔ گھبرا کر وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور اکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب میں چلوں گی۔"

سلمان نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نرم لہجے میں بولا۔

"دیکھو سلطانہ بات یہ ہے۔" لیکن سلطانہ نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔ آہستہ سے کہا۔

"بات تو اب ختم ہو چکی۔"

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے سلمان کو تکنے لگی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ سلمان کے ق
گئی اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں لے لیا۔ جھکی اس کی پیشانی کو چوما اور
ہو گئی۔ نہ وہ روئی نہ اس نے زبان سے ایک لفظ نکالا۔ چپ چاپ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ ا
اونگھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

سلطانہ نے اسے اپنے ساتھ لیا اور ڈسپنسری سے باہر جانے لگی۔ سلمان اس کے پیچھے پیچھ
رہا تھا اس نے کہا۔

"چلو میں تم کو گھر تک چھوڑ آؤں۔ رات بہت گزر چکی ہے۔"

سلطانہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ "نہیں، میں اس سرد رات میں آپ کو ت
نہیں دینا چاہتی۔" اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔

سلطانہ چپ چاپ باہر آ گئی۔

دونوں بہن بھائی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ سناٹا تھا۔ رات اور بھیگ چکی تھی۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ د
کے جسم سردی سے کانپ رہے تھے۔

سنسان کوچہ و بازار سے گزرتے ہوئے دونوں محلے کی گلی میں داخل ہوئے۔ اچانک کتوں
زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ رات کے پر ہول سناٹے میں، ان کی آواز بڑی ڈراؤنی م
ہو رہی تھیں۔

دونوں سہم کر رہ گئے۔

پر ہول: خوفناک۔

گھر کے قریب پہنچ کر سلطانہ نے دیکھا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہے۔ اس کا دل زور زور سے
دھڑکنے لگا۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ گھر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ ماں
کے کمرے میں روشنی تھی۔ وہ سیدھی وہیں پہنچی۔

ماں تکیے پر سر رکھے خاموش پڑی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور ایک ہاتھ پلنگ کے
نیچے جھول رہا تھا۔

وہ جھپاک سے قریب پہنچی۔ اس نے ماں کا ہاتھ اٹھایا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے
حواس ہو کر کہا۔

"اماں، اماں!"

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسی طرح خاموش پڑی رہی۔

سلطانہ نے گھبرا کر ماں کے جسم کو ہلایا اور بے قرار ہو کر چیخنے لگی۔

"اماں، اماں! میری اماں! منہ سے تو بولو۔" ماں اب کیا بولتی۔ وہ تو کب کی مر چکی تھی۔ سلطانہ
ئارہ گئی۔ اس کو آواز دیتی رہ گئی۔ اس نے پہنچنے میں دیر کر دی۔

فصل ہشتم

(۱)

اسکائی لارکوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔

شہر کی پس ماندہ بستیوں میں تعلیم بالغاں کے پانچ مرکز قائم تھے۔ دو دارالمطالعہ ڈسپنسری صرف ایک تھی۔ مگر صبح سے شام تک اس پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کئی کئی میل مریض آتے۔ ڈاکٹر زیدی کو سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اکثر راتوں کو لوگ گہری نیند سے کر کے اسے اپنے ہمراہ لے جاتے۔ مگر اس کی پیشانی پر کبھی شکن تک نہ آئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اور کبھی کبھی تو کپڑے تبدیل کئے بغیر مریض کو دیکھنے چلا جاتا۔ اس حلئے میں وہ ڈاکٹر کے بجائے میلیا لگتا۔ اسے ڈاکٹر تسلیم کرنے میں اکثر مریضوں کو مشکل سے یقین آتا۔

ان اداروں کے علاوہ فلک پیا نے دستکاری اور گھریلو صنعت کو فروغ دینے کے لیے انڈسٹریل ہوم بھی کھولا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک میں مرد دست کار اور کاریگر کام کرتے اور دوسرا خواتین کے لیے تھا۔ اس میں بیوہ اور لاوارث عورتوں کو تربیت بھی دی جاتی اور ان گھریلو مصنوعات بھی تیار کرائی جاتیں۔

انڈسٹریل ہوم کا بنا ہوا مال بازار میں فروخت کیا جاتا فلک پیا کا پروگرام تھا کہ شہر بازار میں انڈسٹریل ہوم کی جانب سے ایک شوروم کھول دیا جائے جہاں مصنوعات کی نمائش اور ان کو فروخت بھی کیا جائے۔ اس طرح دکان داروں کو جو کمیشن دیا جاتا تھا وہ بچ جاتا۔

سرگرمیاں: مصروفیات، کام کاج۔ دارالمطالعہ: لائبریری۔ کان میلیا: کان صاف کرنے والا۔ دست کار: ہنرمند۔ شوروم: مرو

عملی جامہ نہ پہن سکی۔

ہوا یہ کہ ایک روز کوئی دو بجے شب کو ایک شخص ڈاکٹر زیدی کے پاس آیا۔ ڈاکٹر آدھ گھنٹہ ہی کسی مریض کو دیکھ کر آیا تھا اور تھکا ہارا بے خبر سو رہا تھا۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ آنکھیں ملتا ہوا نسری میں گیا۔ ایمرجنسی دواؤں کا بیگ اٹھایا اور اس شخص کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کا چہرہ ڈھلتی کے چاند کی طرح زرد تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا اور جلدی جلدی بول رہا تھا۔ اس کی باتوں ڈاکٹر نے اندازہ لگایا کہ کسی عورت کا کیس ہے۔ مریضہ اس کی بیوی تھی اور اس کی حالت بہت ب تھی۔

ڈاکٹر زیدی نے جا کر دیکھا۔ مریضہ ایک سیلے ہوئے تنگ و تاریک کمرے میں بوسیدہ چٹائی پر سدھ پڑی تھی۔ کمرے میں چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی میں وہ لاش کی مانند بے جان نظر آ رہی ۔ اس کے بال دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ منہ سے سفید جھاگ نکل ے تھے۔

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا۔ اس نے کوئی زہریلی چیز کھا کر خودکشی کی کوشش تھی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا۔ اس نے مریضہ کا معائنہ کیا تو اس کا خیال درست نکلا۔ نے مریضہ کے شوہر سے پوچھا۔

"تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"جھگڑا وگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔" اس شخص کی بات میں ذرا بھی جھجک اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

ڈاکٹر نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا۔ "پھر اس نے زہر کھانے کی کیوں کوشش کی؟"

اس کا زرد چہرہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثر سے سیاہ پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو اہٹ میں جلدی جلدی گردش دے کر کہا۔ "زہر؟" لمحہ بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ "نہیں صاحب! یہ زہر تو کھا ہی نہیں سکتی۔" یہ بات اس نے بڑے اعتماد سے کہی تھی۔

"تو پھر آج اس نے کیا کھایا ہے؟"

ڈاکٹر کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ جھجکنے لگا۔ اس کی ہچکچاہٹ سے زیدی کو ایک بار پھر شبہ

پہنانا: عمل میں لانا۔ بے سدھ: بے ہوش۔

ہوا کہ یہ ضرور خود کشی کا کیس ہے۔ اسے ضرور اس کا علم ہے اور چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔

"بتاتے کیوں نہیں اس نے کیا کھایا ہے؟"

اس شخص کا چہرہ مردے کی طرح خاکستر نظر آنے لگا۔ وہ ڈاکٹر سے نظریں نہ ملا سکا۔ ملزموں کی طرح گردن جھکا کر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور حلق سے اس طرح نکل رہی تھی جیسے سسکیاں بھر رہا ہو۔ اس نے جو بات بتائی اسے سن کر ڈاکٹر زیدی لرز کر رہ گیا۔

وہ شخص چار مہینے سے بے روز گار تھا۔ پہلے کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ عام تخفیف کے چھانٹی کے زمانے میں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اب تک نہ تو اسے ملازمت ملی تھی اور نہ اتنا سرمایہ تھا جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیتا۔ پرسوں صبح سے دونوں میاں بیوی مسلسل فاقہ کشی کر رہے تھے۔ مگر سب سے زیادہ پریشانی شیر خوار بچے کی جانب سے تھی جس نے دودھ کے لیے ماں کی چھاتیوں کو نوچ نوچ کر زخمی کر دیا تھا۔ آج شام وہ قرض ادھار کا بندوبست کرنے گیا تو واپس آکر دیکھا۔ بیوی بار بار قے کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ جب بچے نے بہت زیادہ پریشان کیا اور اس کا بلکنا اس سے دیکھا نہ گیا تو وہ کوڑا ڈالنے والے ڈرم میں سے کھانے کی اشیا ڈھونڈ کر لائی تھی اور ان کو کھایا بھی تھا۔ اس کے بعد اس کی یہ حالت ہو گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اس شخص کو دیکھا جو ملزموں کی طرح گردن جھکائے شرمسار کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سانپ کے پیٹ کی طرح مٹیالا نظر آرہا تھا۔ دیوار کے قریب اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر گندے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک بچہ لاش کی مانند پڑا تھا۔ طاق میں رکھا ہوا چراغ بار بار بھڑکتا۔ روشنی سے آنکھ مچولی کرتا۔ کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ اچانک خوفناک چیخیں بلند ہونے والی ہیں۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دوا دی۔ اس کی جیب میں اس وقت پانچ روپے تھے، وہ بھی اسے دے دیے اور واپس ہیڈ کوارٹر آگیا۔ بستر پر لیٹا دیر تک مریضہ اور اس کے شوہر کے متعلق غور کرتا رہا۔ مہینے کے آخر میں جب اس نے فلک پیما کے اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کی تو اس واقعے کا خاص طور پر ذکر کیا۔

خاکستر: مٹی کے رنگ کا۔ تخفیف: کمی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر زیدی نے یہ تجویز پیش کی کہ چھوٹے پیمانے پر ایک امدادی بنک قائم کیا جائے جس سے آسان قسطوں اور منافع کی بہت معمولی شرح پر ضرورت مندوں کو قرضے دیئے جائیں تاکہ وہ کوئی کاروبار شروع کر سکیں۔ اس تجویز کو اسکائی لارکوں نے پسند کیا اور یہ طے کیا گیا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو بنک کے قیام کے لیے منصوبہ تیار کرے۔

ہفتے بھر کے اندر ہی اندر کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ صفدر بشیر نے اس مقصد کے لیے فلک پیما کو مزید ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ امدادی بنک قائم ہو گیا۔

فلک پیما کا کام جس قدر وسیع ہوتا جا رہا تھا اسکائی لارکوں کی مصروفیت بھی اسی قدر بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر اسکائی لارک کو کئی کئی شعبوں میں کام کرنا پڑتا۔ چنانچہ مجلس عاملہ کے سامنے یہ تجویز زیر بحث آئی کہ اسکائی لارکوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ بہت سے نوجوان اس کے لیے آمادہ تھے۔ وہ باشعور اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسکائی لارکوں کی تعداد بڑھا کر پندرہ کر دی جائے۔ اس سے زیادہ تعداد بڑھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ صفدر بشیر اب تک پچاس ہزار روپے فلک پیما کے فنڈ کے لیے دے چکا تھا۔ تنظیم اس پر زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ چندے کے ذریعہ فنڈ مہیا کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر اس کے لیے ہنوز کسی مہم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ فلک پیما کو اپنے منصوبوں کے لیے روپے کی ضرورت تھی جو روز بروز شدید ہوتی جا رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

فلک پیما کی مجلس عاملہ سنجیدگی سے فنڈ کے مسئلے پر غور کر رہی تھی کہ ایک رات خان بہادر کے آنے کی اطلاع ملی۔

اسکائی لارکوں کو اس کی آمد پر سخت حیرت ہوئی۔ صفدر بشیر اور علی احمد نے لائبریری میں خان بہادر سے ملاقات کی۔

یہ مارچ کی ایک خوشگوار رات تھی۔ اس وقت نو بج چکے تھے۔ خان بہادر ہلکے پھلکے لباس میں تھا۔ حسب معمول اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ خوش مزاج بننے کی کوشش کر رہا تھا جس سے اس کے انداز میں تصنع پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک خاص برانڈ کی سگرٹیں لایا تھا جو بازار میں نایاب تھیں۔ اس نے دونوں اسکائی لارکوں کو اصرار کر کے اپنی سگریٹ پلائی اور لائٹر نکال کر ان کو سلگایا بھی۔ یہ لائٹر خالص سونے کا بنا ہوا تھا اور اس پر

ایک قیمتی پکھراج جڑا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں پکھراج جھلملاتا تو کمرے میں ستارے جگمگانے لگتے
خان بہادر نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی لائٹر سے کیا۔

مگر علی احمد کو ان باتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ خان بہادر کے آنے سے پیشتر وہ
سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ تیار کر رہا تھا اور یہ سوچ کر آیا تھا کہ خان بہادر سے جلد ہی چھٹکارا
حاصل کر لے گا صفدر بشیر کچھ اور بھی زیادہ اس کی باتوں سے اکتایا ہوا تھا۔ آخر اس نے خان بہادر کی
بات کاٹ کر کہا۔

"معاف کیجیے خان بہادر صاحب! ٹھیک ساڑھے نو بجے ہماری ایک میٹنگ ہے۔"

خان بہادر جہاں دیدہ اور صحبت یافتہ آدمی تھا۔ اس نے ایک ہی جملہ سے اندازہ لگا لیا کہ دونوں
زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔

"بھئی میں کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔"

صفدر بشیر نے حیرت سے پوچھا۔ "یعنی؟"

خان بہادر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنا بریف کیس کھولا۔ چیک
بک نکالی اور پچیس ہزار کا چیک کاٹ کر صفدر بشیر کے سامنے ڈال دیا۔ دونوں اسکائی لارک غور
چیک دیکھنے لگے۔ خان بہادر مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

"یہ آپ کی امانت ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ آج میں نے سوچا اسے واپس
پہنچا دوں۔"

علی احمد نے سوچا کہ خان بہادر اس وقت ضرور کوئی نیا چکر چلانے آیا ہے۔ اس نے
نظروں سے خان بہادر کو دیکھا جو بلاوجہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے انداز سے خوشامد صاف جھلک رہی
تھی۔ علی احمد نے دریافت کیا۔

"اس کے ساتھ جو شرائط ہوں وہ بھی لگے ہاتھ بتا دیجیے تا کہ ہم جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکیں"
خان بہادر قہقہہ مار کر بے تکلفی سے بولا۔ "بھئی آپ لوگ تو میری طرف سے بڑے بد
معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیے مسجد کا مسئلہ خالص دینی تھا اور ایک سچے مومن کی حیثیت سے میرا یہ فرض

پکھراج: ایک قیمتی پتھر۔ جہاں دیدہ: تجربہ کار۔ صحبت یافتہ: محفلوں میں بیٹھنے والا۔ کفارہ: گناہ یا غلطی کا بدلہ۔ لگے ہاتھ: ساتھ ہی۔ بد
برا خیال رکھنے والے۔

تھا" علی احمد نے اسے آگے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔
"بہتر ہوگا کہ اس وقت ہم اس مسئلے پر بات نہ کریں۔"

خان بہادر کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ "چلیے اس کے متعلق گفتگو نہیں ہوگی۔ میں تو صرف یہ بتانا
چاہتا تھا کہ آپ لوگ میرے متعلق کسی بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں۔" وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے پر تلا
ہوا تھا۔ مگر دونوں اسکائی لارک اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اور اس قضیے پر اس وقت قطعی بات
کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس دفعہ صفدر بشیر بیچ میں بول پڑا۔ "اس بات کو تو فی الحال آپ چھوڑ ہی دیں۔"
"بہت بہتر۔ اس کے بارے میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔"

علی احمد نے کہا۔ "آپ نے اپنی شرائط نہیں بتائیں۔" وہ چاہتا تھا کہ خان بہادر کھل کر بات
کرے تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے اور اس پچیس ہزار روپے کی پیشکش
سے اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

"بھئی میری کوئی شرط ورط نہیں ہے۔" خان بہادر نے کہا۔ "جیسا کہ میں پہلی ملاقات میں
عرض کر چکا ہوں کہ جو آپ کی تنظیم کا پروگرام ہے وہی میں چاہتا ہوں۔ خدا کا خوف ابھی دل میں
باقی ہے اس لیے دل میں خدمتِ خلق کا بھی جذبہ ہے۔ تھوڑی بہت جو زندگی رہ گئی ہے چاہتا ہوں کہ
اسے عوام کی خدمت میں گزار دوں۔"

علی احمد نے کہا۔ "بڑا نیک جذبہ ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خندہ تھا۔

خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "بس آپ لوگوں کے تھوڑے سے تعاون
کی ضرورت ہے۔" اس کے لہجے میں عجز تھا۔

صفدر بشیر نے فوراً پوچھا۔ "کس قسم کا تعاون؟"

"بات یہ ہے کہ آج سے تقریباً تین ماہ بعد یعنی مئی میں میونسپل بورڈ کے انتخابات ہو رہے
ہیں۔ میں اس حلقے سے امیدوار ہوں۔ ویسے میرا اپنا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا۔ آپ ہی جیسے بعض کرم
فرماؤں کا اصرار ہے کہ میں انتخابات میں ضرور حصہ لوں۔ مجبوراً مجھے آمادہ ہونا پڑا۔" خان بہادر
بڑا آہستہ بول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ "سارا پروگرام بن چکا ہے۔ مگر آپ کے

زہر خندہ: (زہر خند) وہ ہنسی جو غصے یا طنز کے طور پر ہو۔

تعاون کے بغیر یہ پروگرام ادھورا ہے۔"

صفدر بشیر نے مسکرا کر کہا۔ "ہمارے تعاون کے بغیر بھی آپ الیکشن لڑ سکتے ہیں۔"

"آپ لوگوں کا تعاون ضروری ہے۔ آپ کی تنظیم نے اس علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے جو کچھ کیا ہے اور جس قدر آپ لوگوں کی یہاں عزت ہے اسے کون نہیں جانتا۔ بلکہ اگر یہ بات کو آپ خوشامد نہ تصور کریں تو میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ گنٹی کے رہنے والے تو آپ کی پرستش کی حد تک عزت کرتے ہیں۔ اور وہ بے جا بھی نہیں۔ آپ کے کارنامے اسی جذبے کے مستحق ہیں۔"

علی احمد نے کہا۔ "دیکھئے خان بہادر صاحب! فلک پیا کا فی الحال کوئی سیاسی پروگرام نہیں۔ اس لیے اگر آپ ہم کو ان کاموں میں نہ گھسیٹیں تو بہتر ہے۔"

"میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ہمدردی مجھے مل جائے۔ یہی بہت ہے۔" بہادر نے چیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "فی الحال آپ میرا یہ نذرانہ قبول کرلیں۔ آ بھی جو کچھ ہو سکا خدمت کرتا رہوں گا۔"

علی احمد نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ "یہ تو آپ ایک طرح کی فلک پیا کو رشوت دے ہیں۔"

"نہیں صاحب! یہ رشوت کیسے ہو سکتی ہے؟"

صفدر بشیر نے کہا۔ "چلئے رشوت نہ سہی۔ فلک پیا کے تعاون کی قیمت تو بہر حال آپ رہے ہیں۔"

علی احمد نے صفدر بشیر کی تائید کی۔ "اور اگر یہ تعاون کی قیمت ہی ہے تو معاف کیجئے خان صاحب! آپ نے بہت کم قیمت لگائی۔ میں اس پر احتجاج کروں گا۔"

خان بہادر دونوں کی باتوں سے سخت چکرایا۔ گھبرا کر بولا۔ "آپ لوگ مجھے غلط سمجھ ہیں۔ میں تو پورے خلوص کے ساتھ آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

دونوں اس کے خلوص کو ایک بار آزما چکے تھے۔ وہ تجربہ ان کے لیے کافی تھا۔ لہٰذا ان کو بہادر کی باتوں پر ذرا بھی اعتبار نہ آیا۔ علی احمد نے کہا۔

"دیکھئے خان بہادر صاحب! آپ کاروباری آدمی ہیں۔ اس بات سے تو آپ انکار نہیں کر

کوشش بھی کریں تب بھی آپ کسی مسئلہ کو کاروباری انداز سے دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔"

صفدر بشیر نے کہا۔ "اور آپ تو بڑے منجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔ یہ صلاحیت خدا کسی کو کم ہی ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک کامیاب تاجر بننا چاہوں تو کبھی نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے مخصوص ٹمپرامنٹ کی ضرورت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔" وہ بڑی روانی بول رہا تھا۔

خان بہادر بہت سٹپٹایا۔ مگر وہ اتنی جلد ہتھیار ڈالنے والا اسامی نہیں تھا۔ اس نے صفائی پیش نے کی کوشش کی۔ "اگر آپ حضرات نے تعاون کیا اور خدا کا فضل شامل رہا تو میں میونسپلٹی کا ممبر ہو جاؤں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ میں عوام کی کس خلوص اور نیک نیتی سے خدمت کرتا ہوں۔"

"آپ کے خلوص کا تو ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔" صفدر بشیر نے طنز کیا۔

علی احمد نے بھی معاف نہ کیا۔ فوراً ہی وار کیا۔ "اور آپ کی نیت پر کون کافر شبہ کر سکتا ہے۔ پ کے ایسے مرد مومن کی نیت پر تو شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

خان بہادر پرانا گھاگ تھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ بات بننے کے بجائے بگڑتی جا رہی ہے۔ اس نے پینترا بدلا۔ چہرہ باوقار بنا کر بولا۔

"دیکھئے یہ بات تو آپ لوگ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی جماعت یا تنظیم کا کوئی سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ آپ انتخابات میں کسی نہ کسی امیدوار کی مدد تو ضرور ہی کریں گے۔ اگر وہ امیدوار آپ مجھے ہی مان لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری ذات سے آپ کو فائدہ ہی پہنچے گا۔"

علی احمد نے کہا۔ "یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فلک پیا کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ پچیس ہزار کی رقم تو بہت تھوڑی ہے۔ میں اس پر پہلے ہی احتجاج کر چکا ہوں۔"

خان بہادر نے جواب دیا۔ "پچیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اس سے آپ ایک بہتر دفتر تعمیر کر سکتے ہیں۔ یہ عمارت تو آپ کی تنظیم کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔ یہاں بجلی تک تو ہے نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔ بہر حال آپ کی بات کا احترام بھی ضروری ہے۔ چلئے ۳۰ ہزار روپے کا چیک کاٹے دیتا ہوں۔"

علی احمد بولا۔ "نہیں خان بہادر صاحب یہ تو بہت کم قیمت لگائی آپ نے۔ کچھ اور بڑھائیے

گھاگ: تجربہ کار۔ پینترا بدلنا: رخ بدلنا، انداز بدلنا۔ شایانِ شان: قابل، لائق۔

بولی۔" خان بہادر نے اس کے طنز پر زیادہ توجہ نہ دی اب وہ قطعی کاروباری موڈ میں آگیا
"جناب ۳۰ ہزار روپے میں آپ دو اچھے خاصے اسکول قائم کر سکتے ہیں جن کو قاعدے سے
جائے تو پانچ ہزار ہر ماہ آسانی سے کمائے جا سکتے ہیں۔ اس رقم سے سال بھر بعد آپ دو نئے اسکو
کھولنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

صفدر بشیر نے کہا۔ "خان بہادر صاحب آپ کے اس قیمتی مشورے کا بہت بہت شکریہ۔
پیا کے اس وقت پانچ تعلیمی مرکز قائم ہیں۔ فی الحال مزید مرکز کھولنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہما
سامنے ان سے بھی زیادہ اہم تجاویز ہیں جن پر فوری طور پر کام شروع کرنے کی ضرورت ہے۔"

خان بہادر نے رقم اور بڑھا دی۔ "میں آپکا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے
ہوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ مانئے تو سب
پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گنٹی میں گوالوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو
دوڑ دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم
ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے
خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی
ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں
یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ "میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میر
مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہئے کیسی لاجواب اسکیم ہے؟" اس نے داد طلب نظروں سے دو
کو دیکھا۔

علی احمد نے فوراً جواب دیا۔ "آپ کی سوجھ بوجھ کا تو میں پہلی ہی ملاقات میں قائل ہو گیا
اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا زرخیز دماغ عطا کیا ہے۔ ضرورت پڑی تو ان بیش بہا مشوروں کے لیے
ضرور آپ کو زحمت دیں گے۔ مگر خان بہادر صاحب یہ چالیس ہزار کی رقم بھی کم ہے۔"

خان بہادر نے ۵ ہزار اور بڑھا دئے۔ دونوں اسکائی لارکوں نے اس رقم کو بھی قبول کر
سے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر حیل وحجت کرنے کے بعد خان بہادر ۵۰ ہزار تک پہنچ گیا۔
"یہ میرا آخری آفر ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ مگر اس کے لیے یہ بنیادی شرط

ڈیری فارم: دودھ دینے والے جانور پالنے کی جگہ۔ بیش بہا: قیمتی۔ زحمت: تکلیف۔ حیل وحجت: بحث، تکرار۔

ر آپ کے تمام ممبر الیکشن میں میرے رضاکاروں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ان کو اس کام کا
ئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ آفر قبول کر لینا چاہیے۔ ۵۰ ہزار کی رقم بہت
ری ہے۔ اگر آپ اسپتال ہی تعمیر کریں تو اس رقم سے ایک شاندار عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ یہ جو
پ نے اسپتال بنا رکھا ہے، معاف کیجئے یہ تو بالکل کباڑ خانہ معلوم ہوتا ہے کہیں سے بھی تو اسپتال
ہیں لگتا۔

علی احمد نے ایک لمحہ بھی اس کی پیش کش پر غور کرنے کے لیے ضائع نہ کیا۔ فوراً بولا۔ "ہمیں
سوس ہے کہ ہم صرف پچاس ہزار کی رقم کے عوض آپ کے ساتھ تعاون نہ کر سکیں گے۔"

خان بہادر کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ "صرف پچاس ہزار!" وہ سخت بھنّایا ہوا
بمشکل اس کی زبان سے نکلا۔ "آخر آپ لوگ کتنی رقم چاہتے ہیں؟"

دونوں اسکائی لارکوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی چھائی
ی۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ کمرے میں سکوت تھا۔ خان بہادر بے چینی سے پہلو بدل
ہا تھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ گلے کی رگیں تن گئی تھیں۔ چہرے کی وہ شگفتگی مٹ گئی تھی
ں سے وہ ہنس مکھ اور بشاش نظر آتا تھا۔ رخساروں کی دبیز کھال لٹکنے لگی تھی وہ بہت بوڑھا لگ
ہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"کم از کم دو لاکھ تو آپ کو دینا چاہیے۔"

"دو لاکھ!" خان بہادر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ جھنجلا کر کہا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ
ں میونسپلٹی کی ممبری کے بجائے سونے کی کان کھودنے جا رہا ہوں۔"

علی احمد اس کی جھنجلاہٹ سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "خان بہادر
صاحب! ہمارا تو یہی خیال ہے۔"

وہ بہت چکرایا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

صفدر بشیر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہمیں تو خان بہادر صاحب یہ سیدھی سادی
رقم معلوم ہوتی ہے۔"

خان بہادر نے بلند آواز سے کہا۔ "بھئی وہ کیسے؟" ابھی تک وہ حیرت زدہ تھا۔

کباڑ خانہ: ٹوٹا پھوٹا سامان رکھنے کی جگہ۔ بھنانا: غصے میں آنا۔ شگفتگی: تازگی۔ دبیز: موٹی، مضبوط۔

علی احمد نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ بہت صاف سی بات ہے۔ دیکھئے نا، جب آپ میونسپل بورڈ کے ممبر بن جائیں گے تو آپ آسانی سے اپنے بھتیجے اور بھانجوں کے نام سے ٹھیکے لے سکتے ہیں۔ اگر ہر سال دو تین ٹھیکے بھی مل گئے تو دو لاکھ کما لینا کوئی مشکل نہیں۔ پھر آپ تو پانچ سال ممبری کریں گے۔ بیس پچیس لاکھ بھی آپ ایسے تجربہ کار شخص نے نہ پیدا کئے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ رشوتوں سے جو رقم ملے گی وہ علیحدہ رہی۔ کوشش کی جائے تو کمائی کی اور بھی بہت سی صورتیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔"

علی احمد بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔ خان بہادر کا چہرہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔

علی احمد نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کسی فیکٹری یا کارخانے پر دس بارہ لاکھ روپے لگانے سے تو یہ کہیں اچھا پروجیکٹ ہے کہ میونسپلٹی کی ممبری حاصل کی جائے۔ بلکہ خدا توفیق دے تو چیئرمین بننے کی بھی جوڑ توڑ کرنی چاہیے۔ پھر تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

خان بہادر سے ضبط نہ ہو سکا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کیا آپ مجھے اتنا خود غرض اور بد کردار سمجھتے ہیں؟ میں ایک معزز شہری ہوں۔ میں اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

علی احمد نے تسلی دیتے ہوئے رسان سے کہا۔ "خان بہادر صاحب! کاروبار میں اس طرح جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا پھر آپ تو ماشاء اللہ بڑے منجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ! بزنس سے میونسپلٹی کے الیکشن کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

صفدر بشیر کے لیے اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا وہ حقیقت پسند نوجوان تھا۔ کئی سال تک یورپ اور انگلستان میں رہ چکا تھا گفتگو میں بے جا رسمی تکلفات اور چناں چنیں کا قائل نہ تھا۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا "تو پھر یہ پچاس ہزار روپے کی رقم آپ فلک پیا کو کیوں پیش کر رہے ہیں؟ کیا آپ اسکائی لارکوں کو ضمیر فروش اور ایکسپلائٹر سمجھتے ہیں؟ آپ کا ابتدا ہی سے ہمارے ساتھ یہی رویہ رہا ہے۔ مگر ہم نے کبھی آپ کی باتوں پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس لیے کہ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے انداز میں بنیادی فرق ہے۔ آپ کے نزدیک دولت، زندگی کی سب سے بڑی قوت ہے

حقیقت پسند: سچائی کو پسند کرنے والا۔ بے جا: فضول۔ چناں چنیں: تکرار، ایسا ویسا۔ ضمیر فروش: بے غیرت۔

وہ ہم انسانی محنت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دولت، تبادلہ جنس کا ایک ذریعہ ہے اور محنت سے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اس نے اس محنت ہی کے ذریعے ہیبت ناک دریاؤں کے رخ بدل دیے۔ مہیب پہاڑوں کا غرور توڑ دیا۔ سمندر کو اپنا مطیع کر لیا اور اب چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔"

صفدر بشیر بڑی روانی سے بول رہا تھا بالکل اسی طرح، جس طرح وہ خطیبانہ انداز میں جلسوں سے خطاب کرتا تھا۔

خان بہادر گھبرا کر بولا۔ "آپ تو نہ معلوم کیسی باتیں کرنے لگے۔ میرا مطلب تو صرف اس قدر ہے۔۔۔"

صفدر بشیر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا مطلب ہم پر بخوبی واضح ہو چکا ہے۔ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے ساتھ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں دو ٹوک بات کہہ دی۔

خان بہادر نے مزید بات چیت نہ کی۔ سگریٹ لائٹر روشن کیا اور پچیس ہزار کا چیک اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ چیک جلنے لگا۔ بڑا سا شعلہ روشن ہوا کمرے کی دیواریں جھلملائیں۔ چیک جل کر خاکستر بن گیا۔

جھلملاتی ہوئی دیواریں دھندلی پڑ گئیں۔

خان بہادر نے اپنا خوبصورت بریف کیس اٹھایا۔ دونوں سے رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔

جب اس کی چاپ دور ہو کر معدوم ہو گئی تو صفدر بشیر نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور تھکا ہوا سا آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں ستانے کے سے انداز میں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے خان بہادر سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی رپورٹ تیار کی اور لائبریری سے اٹھ کر سونے کے لیے چلے گئے۔

⊛ ⊛ ⊛

قطع کلام کرنا: کسی کی بات کاٹنا۔ دو ٹوک بات کہنا: صاف صاف بات کہنا۔ ستانا: آرام کرنا۔

علی احمد اور صفدر بشیر کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے فلک پیما کا اجلاس منعقد ہوا اور رپورٹ پر
دیر تک بحث ہوتی رہی۔

تمام اسکائی لارکوں نے متفقہ طور پر ان دونوں کے اقدام کو سراہا اور خان بہادر کی سخ
مذمت کی۔ اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ فلک پیما کو میونسپلٹی کے انتخاب میں اس حلق
سے اپنا امیدوار کھڑا کرنا چاہیے۔ مگر کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکا۔ اجلاس دوسرے دن بھی جاری رہا اور یہ
تجویز زیر بحث رہی۔

اسکائی لارکوں کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ فلک پیما کو کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لی
چاہیے۔ جو لوگ الیکشن لڑنے کے حق میں تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر انتخابات میں حصہ نہ ل
گیا تو خان بہادر یا اسی قبیل کے لوگ میونسپلٹی کے ممبر بنیں گے جو خدمت خلق کی آڑ میں ناجا
طریقے پر عمل کریں گے۔

دو روز کی طویل بحث کے بعد اسکائی لارک آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ فلک پیما صرف اسی حلق
سے الیکشن کے لیے اپنا امیدوار کھڑا کرے۔ اس لیے کہ شہر کے دوسرے حصوں میں ان کے کام ک
رفتار ہنوز سست تھی۔

اس کے علاوہ فنڈ کی کمی تھی۔ کام کرنے والے بھی زیادہ نہیں تھے۔

فلک پیما کے امیدوار کی نامزدگی کے لیے تین اسکائی لارکوں کے نام پیش کیے گئے۔ صفدر بشی
علی احمد اور ڈاکٹر زیدی۔ لیکن رائے شماری شروع ہونے سے پہلے ہی علی احمد نے اپنا نام واپس لے
لیا۔ وہ الیکشن میں حصہ لینے کے حق میں تھا مگر خود امیدوار بننا نہیں چاہتا تھا۔ ووٹنگ ہوئی اور ۲ کے
مقابلہ میں ۱۰ کی اکثریت سے ڈاکٹر زیدی کو منتخب کر لیا گیا۔ اسے منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ
تھی کہ اس حلقے میں وہ بے حد ہر دلعزیز تھا۔

نامزدگی کا اعلان ہونے کے بعد اسکائی لارکوں نے دیکھا کہ صفدر بشیر کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ و
اس وقت کسی قدر بے چین نظر آرہا تھا۔ بار بار پائپ پر لمبے لمبے کش لگا کر بہت سا دھواں فضا م
اگل دیتا۔

مگر ڈاکٹر زیدی کی کامیابی پر سب سے پہلے اسی نے مبارک باد پیش کی۔

مذمت کی: برائی کی۔ قبیل: قسم۔ ہر دلعزیز: جس کو سب پسند کریں۔

(۲)

اسکائی لارکوں نے اپنی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ میونسپلٹی کے انتخابات کی تیاریاں
ی شروع کر دیں۔

اس مہم کا آغاز انہوں نے باقاعدہ منصوبے کے تحت کیا۔ روزانہ کسی نہ کسی چوراہے پر ان کا
سہ ہوتا اسکائی لارکوں کی جوشیلی تقریروں نے ہر طرف دھوم مچادی۔ لوگ ان کی باتیں توجہ
ر دلچسپی سے سنتے اور ان کے جلسوں میں جوق در جوق شامل ہوتے۔

انتخابی مہم کا انچارج علی احمد تھا۔ وہ نت نئے پوسٹر بناتا۔ پمفلٹ لکھتا۔ ہینڈ بل تیار کرتا۔
کائی لارکوں کو نئے نئے نعرے دیتا پانچ پانچ منٹ کی چھوٹی چھوٹی تقریریں لکھ کر دیتا۔ یہ تقریریں
ٹریٹ کارنر میٹنگ کے لیے ہوتیں۔ ہوتا یہ کہ اسکائی لارک کسی بھی گلی کے نکڑ پر یا سڑک کے
ارے کھڑے ہو جاتے۔ پہلے وہ اونچی آوازوں سے نعرے لگاتے۔ جب مجمع ہو جاتا تو مختصر سی
زیر کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ڈاکٹر زیدی کو انتخابی نشان "مشعل" الاٹ ہوا تھا۔ چنانچہ
دھیری راتوں میں وہ جتھے بنا کر مشعل بردار جلوس نکالتے۔ مشعلوں کو سروں سے اوپر بلند کر کے
رے لگاتے۔

"ہاتھ میں ہاتھ دو۔"

"روشنی تیز کرو، تیز کرو۔"

"ووٹ دیتے وقت مشعل کو یاد رکھیے۔"

"مشعل غریبی اور پس ماندگی کے اندھیرے میں آپ کی رہبر و رہنما ہے۔"

سلمان کی کوشش سے انتخابی مہم کے لیے تعلیم بالغاں کے مرکزوں سے خاصی بڑی تعداد
ں ایسے رضاکار مل گئے تھے جو جلسے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے نہایت جوش و خروش سے
رے لگاتے۔ مخالف امیدواروں کے کارکن رخنہ اندازی کرتے یا جھگڑا فساد کرنے کی کوشش
تے تو اسکائی لارکوں کی حمایت میں وہ سینہ سپر ہو جاتے۔ ڈاکٹر زیدی اور خان بہادر فرزند علی کے
لاوہ میونسپل بورڈ کے انتخابات میں اس حلقے سے ایک امیدوار اور بھی تھا اس کا نام عبدالحمید تھا۔ وہ

ق در جوق: گروہ کے گروہ۔ جوش و خروش: گرم جوشی۔ رخنہ اندازی کرنا: رکاوٹ ڈالنا۔ سینہ سپر ہونا: ڈٹ جانا۔

چھچھورا سا ادھیڑ آدمی تھا۔ نیلام کرنے والوں کی طرح ایک بات کئی کئی بار دہراتا۔ اور بات بات پر قہقہہ لگاتا۔ پچھلے سال تک وہ محکمہ سول سپلائی میں بڑا عہدے دار تھا۔ مگر رشوت خوری کے اسکینڈل میں ملوث ہونے کے باعث ملازمت سے مستعفی ہو گیا تھا۔ سرکاری حلقوں میں ابھی تک اس کا اثر و رسوخ تھا۔ ملازمت چھوٹ جانے کا اسے ذرا ملال نہ تھا۔ بینک میں اس کا ۵ لاکھ روپیہ موجود تھا شہر میں چار شاندار کوٹھیاں تھیں۔ کئی کارخانوں میں اس کے حصے تھے اور ایک آئل مل کا منیجنگ ڈائریکٹر تھا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر خان بہادر کے مقابلے میں اس کا پروپیگنڈا ہلکا تھا۔

خان بہادر اپنی انتخابی مہم پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ اس کے کارکن جھلکتی ہوئی کاروں پر آتے اور ووٹروں کو خریدنے کے لیے نت نئے ریٹ مقرر کرتے۔ جوں جوں انتخابات کی تاریخیں قریب آتی جا رہی تھیں ووٹوں کا ریٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر بستی میں ٹھیکیدار مقرر کر دیے تھے جن کے ایجنٹ ووٹوں کا سودا کرنے میں مصروف تھے۔

کاغذات نامزدگی منظور ہو چکے تھے اور ہر امیدوار نے انتخابی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں عبدالحمید کی حمایت میں ووٹروں پر سرکاری حکام دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس حلقے کے جو بااثر لوگ تھے ان کو آئے دن تھانوں میں بلایا جاتا اگر وہ عبدالحمید کی مخالفت کرتے تو پولیس کے افسران، ان کے خلاف مقدمے قائم کرنے کی دھمکی دیتے۔ غنڈوں کے ذریعے ان کو پریشان کرتے۔ جو لوگ سرکاری ملازم تھے ان کو اپنے محکمے کے افسروں کی جانب سے ہدایتیں دی گئی تھیں کہ عبدالحمید کی ہر طرح سے مدد کریں۔

خان بہادر نے فی ووٹ دس روپے تک کا ریٹ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے تین انتخابی دفتر قائم تھے جن میں آئے دن ضیافت ہوتی۔ دیگیں چڑھتیں۔ بڑی فیاضی سے مرغن کھانے کھلائے جاتے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے تھے اور سیدھے سادے لوگوں کو چکمہ دینے کا گر جانتے تھے، خان بہادر نے انہیں چھانٹ چھانٹ کے اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔ ان کی یومیہ اجرت مقرر تھی اور ۵ روپے سے ۱۵ روپے تک کا ریٹ تھا۔ اس کے علاوہ ووٹروں کو دکانوں کی الاٹمنٹ اور ملازمتیں دلوانے کا لالچ بھی دیا جاتا۔

خان بہادر خود بھی حلقے کا دورہ کرتا۔ اس کی شاندار کار نمودار ہوتی تو اس کے اہالی موالی بڑی

چھچھورا: بد تمیز۔ ملال: افسوس۔ ضیافت: دعوت۔ فیاضی: سخاوت۔ چکمہ: دھوکا۔ گر: فن، ہنر۔ اہالی موالی: نوکر چاکر۔

مستعدی سے لپک کر کار کا دروازہ کھولتے۔ زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ خان بہادر ہونٹوں میں موٹا سا سگار دبائے، ونسٹن چرچل بنا بڑے ٹھسے سے کار سے نیچے اترتا۔ اس کے آگے پیچھے تنخواہ دار کارکن ہوتے۔ ان کے ہجوم میں گھرا ہوا وہ گلی کوچوں کا چکر لگاتا۔ لوگوں سے ملتے وقت ضرورت سے زیادہ انکساری کا مظاہرہ کرتا۔

اسکائی لارکوں کا طریقہ کار بہت سیدھا سادا تھا۔ وہ موٹا جھوٹا لباس پہنتے، ہاتھوں میں تھیلے ہوتے جن میں پوسٹروں، ہینڈ بلوں اور پمفلٹوں کے علاوہ گڑ اور چنے بھی ہوتے۔ ہر محلے کے لیے علیحدہ گروپ تھا۔ وہ صبح تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہوتے اور چائے کی ایک ایک گرم پیالی پی کر چاق چوبند ہو جاتے۔ سویرے ہی سویرے ہر گروپ کی میٹنگ ہوتی۔ ہر روز کے کام کا پروگرام مرتب کیا جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ہیڈ کوارٹر سے نکل جاتے۔ وہ میلوں پیدل چلتے۔ عام لوگوں کے ساتھ فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے۔ ان کے ساتھ حقے پر کش لگاتے۔ بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ ان کا دکھ درد سنتے۔ ان کے جو چھوٹے موٹے کام ہوتے انہیں انجام دینے کی کوشش کرتے۔ بھوک لگتی تو کسی درخت کے سائے تلے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے اپنے تھیلوں سے چنے اور گڑ نکال کر کھاتے۔ ڈٹ کر پانی پیتے اور تازہ دم ہو کر آگے چل دیتے۔

فلک پیما کی سرگرمیاں طوفان کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کی انتخابی مہم نے ہر طرف ہل چل برپا کر دی تھی۔ اس کے پاس یوں تو کل ۱۵ کارکن تھے مگر وہ بلا کے کام کرنے والے تھے۔ ایک ایک اسکائی لارک کئی کئی محاذوں پر کام کر رہا تھا۔ ہر کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ کہیں بھی گڑبڑ نہ ہوئی۔ تعلیم بالغاں کے مرکزوں میں روزانہ کلاسیں ہوتیں۔ انڈسٹریل ہوم میں گھریلو مصنوعات کی پیداوار بڑھ گئی تھی۔ اس کے تیار کیے ہوئے سامان کی بازار میں مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔

امدادی بینک کا کام اطمینان بخش تھا۔ حسابات باقاعدگی سے آڈٹ کیے جاتے۔ بینک کے سلسلے میں کسی قسم کی شکایت اب تک نہیں ملی تھی۔ علاقے کے بہت سے لوگ اس کے قرضوں کے ذریعے بے روزگاری سے نجات پا چکے تھے۔

فلک پیما کی ان بڑھتی ہوئی سرگرمیوں میں سلمان پیش پیش تھا۔ ہر طرف اسی کا چرچا تھا وہ ان

[illegible]: تیزی۔ ٹھسا: غرور، نخرہ۔ چاق چوبند: ہوشیار۔ پھسکڑا مار کر: آلتی پالتی مار کر، پاؤں پھیلا کر۔ بلا کے: زبردست۔ محاذ: جگہ۔ [illegible]: اچھے طریقے سے۔ گھریلو مصنوعات: گھر کی بنی ہوئی اشیاء۔

دنوں دیوانہ وار کام کر رہا تھا۔ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے چند گھنٹے اسے رات کو سونے
لیے ملتے۔ ہفتوں شیو تک کرنے کا ہوش نہ رہتا۔ وہ روزانہ سویرے ہی سویرے اپنے گرد
میٹنگ کرتا اور دھوپ نکلنے سے پہلے ہی کام پر نکل جاتا جگہ جگہ تقریریں کرتا۔ پوسٹر لگاتا۔ لو
میں ہینڈ بل بانٹتا۔ ان سے تبادلہ خیال کرتا اور رات کو پابندی سے تعلیم بالغاں کے مرکز میں
لیتا۔ اس عرصے میں ایک روز بھی وہ غیر حاضر نہیں رہا۔

رات گئے ہیڈ کوارٹر لوٹتا تو دن بھر کے کام کی پوری رپورٹ پیش کرتا۔ ان دنوں فلک پ
اجلاس بھی ہوتے۔ سلمان ہر اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتا۔ بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ ل
ان مصروفیات کے علاوہ فلک پیما کی جانب سے اسے یہ بھی ہدایت ملی کہ وہ صفدر بشیر
ساتھ مزدوروں کی یونین میں کام کرے۔ یہ ٹریڈ یونین کچھ ہی دنوں پہلے قائم ہوئی تھی اور اس
قیام میں فلک پیما کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے قیام کی صورت یہ ہوئی کہ مزدور آئے دن اپنی کو
کوئی شکایت لے کر آتے اور اسکائی لارکوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت تک
کی کوئی باقاعدہ یونین نہ تھی۔ ایک آدھ بار ایسی کوشش بھی کی گئی مگر مالکان نے طرح طرح کے
کنڈوں سے اسے ختم کرا دیا۔ لہٰذا فلک پیما کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ مزدوروں کی
یونین بنا کر اسے رجسٹر کرا لیا جائے۔

اس کے تمام عہدے دار مزدور ہی تھے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے فلک پیما نے صفدر ب
مقرر کیا تھا۔ مگر جب یونین کا کام بڑھنے لگا تو سلمان کی ڈیوٹی بھی یونین میں لگا دی گئی۔ اس
میں بھی سلمان پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

سلمان جس قدر سرگرم اسکائی لارک بنتا جا رہا تھا صفدر بشیر اسی قدر بے حس اور لاپرواہ
تھا۔ اس کے انداز میں بے نیازی آ گئی تھی۔ اس کی یہ بے نیازی اسکائی لارک اس وقت سے مح
کر رہے تھے جب سے ڈاکٹر زیدی اس کے مقابلے میں میونسپل بورڈ کے انتخابات کے لیے فلک
امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔

اب وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ بیشتر وقت لائبریری میں نظر آتا یا اپنے کمرے میں سوتا رہتا۔ ا

دیوانہ وار: دیوانوں کی طرح۔ ہتھ کنڈا: چالاکی، عیاری۔

ان دنوں بے حد سنجیدہ نظر آتا۔ وہ بات چیت بھی کم کرتا۔ اکثر اپنے سینٹر سے غیر حاضر رہتا
س سے کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی اور ہیڈ کوارٹر میں اس کے خلاف شکایات آتیں۔ آخر فلک پیما کے
ک اجلاس میں صفدر بشیر کی بڑھتی ہوئی بے عملی اور غیر ذمہ دارانہ روش کا محاسبہ کیا گیا۔ اس کے
لاف چارج شیٹ پیش کی گئی اور یہ وضاحت طلب کی گئی کہ کیوں نہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی
جائے۔

صفدر بشیر، فلک پیما کا نہ صرف صدر تھا بلکہ اس کا بانی اور روح رواں بھی تھا۔ یہی وہ بنیادی
باب تھے جن کے پیش نظر جنرل سیکرٹری علی احمد نے دوسرے اسکائی لارکوں کی رائے سے
لاف کیا اور یہ مشورہ دیا کہ فی الحال صفدر بشیر کو وارننگ دے دی جائے۔

علی احمد کی تجویز منظور کر لی گئی۔ صفدر بشیر کو وارننگ دی گئی کہ آئندہ وہ اپنے فرائض کی جانب
ے غفلت نہیں برتے گا۔ صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور یقین دلایا کہ وہ
ذمہ دار اسکائی لارک کی حیثیت سے اپنے فرائض مستعدی اور دیانت داری سے انجام دے گا۔

اس یقین دہانی کے بعد کچھ عرصے تک صفدر بشیر نہایت سرگرمی سے کام کرتا رہا۔ مگر اس کی
نیازی رفتہ رفتہ پھر سر ابھارنے لگی۔ اسکائی لارک اس کے اس رویے کو محسوس کر ہی رہے تھے
کہ اسی دوران میں صفدر بشیر نے ایک ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی جس سے اسکائی لارکوں میں اس
خلاف بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔

صفدر بشیر کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی نوعیت یہ تھی کہ ایک روز اسکائی لارکوں نے گمٹی
ایک بڑے جلسہ عام کا انتظام کیا۔ اس جلسے کے لیے وہ کئی روز سے پبلسٹی کر رہے تھے۔ پوسٹر
ئے گئے۔ ہینڈ بل تقسیم کیے گئے۔ اسٹریٹ کارنر میٹنگوں کے ذریعے مسلسل اعلان کیا گیا۔ جلسہ
ں بہت بڑا اجتماع تھا۔ لوگ دور دور سے چل کر جلسے میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔
ئی لارک اپنی اس کامیابی پر بے حد شاداں تھے۔

جلسے کا خاص مقرر صفدر بشیر تھا۔ وہ اپنے خطیبانہ انداز کے باعث علاقے میں بے حد مقبول
وہ جوش میں آ کر بولتا تو حاضرین کا تنفس تیز ہو جاتا۔ گردن کی رگیں تن جاتیں۔ آنکھوں میں

روش: طور طریقہ۔ محاسبہ: باز پرس، پوچھ گچھ۔ چارج شیٹ: فرد جرم۔ تادیبی کارروائی: تنبیہی طور پر کوئی سزا دینا یا ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔
رواں: کرتا دھرتا۔ تنفس: سانس کی رفتار۔

سرخی دوڑ جاتی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے۔ اس کی تقریر میں یہ سحر تھا کہ اگر جلسہ گاہ میں بھی گڑبڑ مچ جاتی اور وہ مائیک پر آ جاتا تو چشم زدن میں جلسہ قابو میں آ جاتا۔ اس کی تقریر کی تکنیک یہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز کا حجم بڑھاتا جاتا۔ اسی رفتار سے اس میں روانی پیدا ہوتی جاتی اور جب یہ خوب بڑھ جاتا تو اس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہو جاتی۔ اس کا لہجہ الہامی معلوم ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر چیز پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ صرف ایک چیز زندہ ہے۔ ایک آواز اور صرف ایک آواز اور وہ آواز صفدر بشیر کی ہوتی۔ حاضرین جذبات سے بے قابو ہو کر نہایت جوشیلے نعرے لگاتے۔ بار بار تالیاں بجاتے۔ لیکن ایسی جذبات انگیز تقریریں وہ کسی بڑے اجتماع میں کرتا تھا اور اس روز ایسا ہی بڑا اجتماع تھا۔

جلسے کا آغاز ڈاکٹر زیدی کی تقریر سے ہوا۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور بات سمجھا کر کہنے کا عادی تھا۔ وہ دھیمے لہجے میں سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ جلسے میں بد دلی سی پائی جاتی تھی۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈائس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہر آنکھ صفدر بشیر کی تلاش میں تھی اور صفدر بشیر اس وقت ایک بار میں بیٹھا اسکاچ سے شغل کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ ذہنی طور پر پریشان تھا اور اسکا لارکوں سے چھپ کر کبھی کبھی شراب پی لیتا تھا۔ جب بھی وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوتا تو شغل بادہ نوشی کرتا اور اس سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح اس نے ذہنی سکون حاصل کرنے کا ایک بہانہ پیدا کر لیا تھا۔

وہ اسی عالم میں جلسے میں آ گیا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی وہ ڈائس پر پہنچا جلسے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ بکھرا ہوا مجمع اکٹھا ہونے لگا۔ لوگ صفدر بشیر کی تقریر کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ ایک ہیرو کی طرح اٹھ کر مائیک کے سامنے آیا۔ حاضرین نے اس کی آمد کا پرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ صفدر بشیر نے اپنی تقریر شروع کی۔

”دوستو! ساتھیو! جی چاہتا ہے آج آپ سے کھل کر باتیں کروں۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حاضرین کی طرف دیکھا۔

سحر: جادو۔ چشم زدن میں: دیکھتے ہی دیکھتے۔ گھن گرج: کڑک۔ الہامی: مراد انتہائی غیر معمولی۔ بادہ نوشی: شراب پینا۔ نشے میں دھت: نشے سے چور۔ ہمہ تن گوش ہونا: مکمل توجہ کے ساتھ سننا۔

”اس اجتماع کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہاں بہت سے پھوے اکٹھا ہو گئے ہیں۔“

حاضرین نے چونک کر بے چینی سے پہلو بدلے۔ صفدر بشیر کہتا رہا۔ ”جی ہاں کچھوے، ایسے کچھوے جنھوں نے اپنے پیر سمیٹ کر پیٹ کے اندر کر لیے ہیں اور گردن نکالے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں کوئی مداری ہوں اور ابھی کوئی شعبدہ دکھاؤں گا۔“

اس نے ہچکی لی۔ ذرا سا ڈگمگایا اور حاضرین کو گھورنے لگا۔ جلسے میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ ابھر رہی تھی۔ کچھ لوگ ہونق کی طرح صفدر بشیر کا منہ تک رہے تھے۔

صفدر بشیر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کچھوؤں کی چال چلنے کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ سائنس کی ترقی کا عہد ہے۔ آج ایک شخص ریڈیو سے تقریر کرتا ہے اور تمام دنیا کے لوگ اس کو سن سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر دیکھ سکتے ہیں۔ بولتے ہوئے حرکت کرتے ہوئے ہر انداز میں ہر عالم میں۔ جناب ترقی کی اس دوڑ میں آپ کہاں ہیں؟ افسوس تو یہی ہے کہ آپ کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں۔ یہ گمراہی جرم ہے۔ آپ کچھوے نہ سہی، حضرت عیسیٰ کی بھیڑیں ہیں، جس کا جی چاہتا ہے ہانک کر لے جاتا ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا اسی طرف نکل گئے۔“

جلسے میں اب گڑبڑ کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ لوگوں کو اس کا انداز تخاطب سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ ہرگز کچھوے اور بھیڑیں بننے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ وہ ہاتھ اونچے کر کے اس طرح ہلا رہے تھے گویا ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

”پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے۔“

دوسری طرف سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ”ابے گھاس کھا گیا ہے؟“

کچھ نوجوان باقاعدہ مرغ کی بولی بولنے لگے۔

”ککڑوں کوں، ککڑوں کوں۔“

اب مختلف سمتوں سے صفدر بشیر پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ وہ ذرا سنبھلا۔ پریشان ہو کر بولا۔ ”دیکھیے میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ بول رہا ہوں۔“

ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور اس کے بعد قہقہوں کی آواز دیر تک جلسے میں گونجتی رہی۔

جلسہ درہم برہم ہو رہا تھا۔ لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔

مداری: تماشا کرنے والا۔ شعبدہ: تماشا، جادو۔ ہونق: بیوقوف، احمق۔ انداز تخاطب: مخاطب کرنے کا طریقہ۔ آوازے کسنا: مذاق اڑانا۔

علی احمد قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے صفدر بشیر کا دامن پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ تمام اسکائی لارک جلسے کا یہ عالم دیکھ کر بدحواس ہو گئے تھے۔ صفدر بشیر تقریر کرنے پر بضد تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ نشے کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ اب اس نے اول فول بکنا شروع کر دیا تھا اور یہ تمام آوازیں لاؤڈ اسپیکر سے نکل نکل کر گونج رہی تھیں۔ حاضرین جلسہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ علی احمد نے گھبرا کر ایمپلی فائر بند کر دیا۔ لاؤڈ اسپیکر خاموش ہو گیا۔ اسکائی لارکوں نے بڑی مشکل سے صفدر بشیر کو بٹھایا۔

اب علی احمد جلسے کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے فوراً سلمان کو اشارہ کیا۔ وہ مائک پر پہنچ گیا بیٹری کا سوئچ کھول دیا گیا۔ جلسہ گاہ میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر سلمان کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ حاضرین سے معذرت کر رہا تھا۔ سلمان نے ان کو بتایا کہ صفدر بشیر ایک عرصے سے بیمار ہیں۔ دن بھر ان کو تیز بخار رہا۔ چونکہ حاضرین کو ان کی تقریر سننے کا بے حد اشتیاق تھا لہٰذا ان کو بخار کی حالت میں یہاں لایا گیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ سرسامی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

سلمان نے یہ سب کچھ اس انداز سے کہا کہ بات بن گئی۔ ورنہ اس روز صفدر بشیر نے اسکائی لارکوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

اس افسوس ناک حادثے نے اسکائی لارکوں کو صفدر بشیر کی جانب سے سخت برگشتہ کر دیا۔ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں اس کے خلاف سخت تادیبی کاروائی کرنے کا مطالبہ کرنے والے تھے صفدر بشیر نے اس دوران میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کا ایک اور ثبوت دیا۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ جوبلی ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ نے چار مزدوروں کو برطرف کر دیا۔ یونین۔ انتظامیہ کی یک طرفہ کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور یہ دھمکی دی کہ چاروں مزدوروں ہفتے بھر کے اندر واپس نہ لیا گیا تو ہڑتال کر دی جائے گی۔

مالکان نے یونین کا مطالبہ مسترد کر دیا اور برطرف شدہ مزدوروں کی ملازمت بحال کر سے صاف انکار کر دیا۔ اسی روز مزدور یونین کا جلسہ ہوا۔ اس میں صفدر بشیر اور سلمان دونوں شریک ہوئے۔ جلسے میں ہڑتال کا نوٹس دینے کی قرارداد پیش کی گئی۔ سلمان نے قرارداد کی پوری پوری

اول فول بکنا: فضول / بیہودہ باتیں کرنا۔ اشتیاق: شوق۔ سرسامی کیفیت: تیز بخار کی حالت جس میں مریض اول فول بکنا شروع کر دیتا ہے۔
برگشتہ: ناراض، خلاف۔

حمایت کی۔ مگر صفدر بشیر ہڑتال کا مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مزدوروں کی تنظیم ابھی مضبوط نہیں ہوئی لہٰذا کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے۔ لیکن مزدوروں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ انہوں نے صفدر بشیر کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور ہڑتال کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔

ہڑتال کے دوسرے دن مزدوروں نے کارخانے کے سامنے مظاہرہ کیا۔ ان مزدوروں کو روکنے کی کوشش کی جو ڈیوٹی پر جانا چاہتے تھے۔ کارخانے کے جنرل مینجر نے فوراً پولیس بلوائی۔ مگر نہ کوئی ہنگامہ برپا ہوا نہ گڑبڑ۔ مظاہرین پرامن تھے۔ ہڑتال بہت کامیاب جا رہی تھی۔ منتظمین کو یہ پر امن مظاہرہ خطرناک معلوم ہوا۔ چنانچہ انہوں نے سہ پہر کو اپنے کچھ غنڈے بھیج کر بلوہ کرا دیا۔ پولیس نے ہنگامے پر قابو پانے کے لیے مزدوروں پر بار بار لاٹھی چارج کیا۔ اس لاٹھی چارج سے آٹھ مزدور زخمی ہو گئے۔ مظاہرین کو منتشر ہونا پڑا۔ اسی روز کارخانے کے گرد و نواح کے علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔

اس تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے رات کو یونین کا ہنگامی جلسہ طلب کیا گیا۔ اس روز یونین کے دفتر پر پولیس کے چھاپہ مارنے کا خطرہ تھا اور کچھ گرفتاریوں کی افواہ بھی گرم تھی اس لیے صفدر بشیر اس جلسے میں شریک ہونا نہ چاہتا تھا۔ یوں بھی اسے یونین کے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ فلک پیما کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس نے ایک بار زور بھی دیا تھا کہ اسکائی لارکوں کو مزدور تحریک میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ انہیں اپنی سرگرمیاں صرف سماجی بہبود کے کاموں تک محدود رکھنا چاہیے۔ وہ فلک پیما کو صرف ایک فلاحی تنظیم کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

سر شام ہی وہ ہیڈ کوارٹر سے اپنی کوٹھی چلا گیا اور یونین کے جلسے میں شرکت نہیں کی۔ جلسے سے غیر حاضری کے لیے اس نے بیماری کا عذر پیش کیا۔ مگر اسکائی لارکوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ خان بہادر فرزند علی کے ساتھ اس شب بادہ و ساغر کا لطف اٹھا رہا تھا۔

صفدر بشیر کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے نے اسکائی لارکوں کو مشتعل کر دیا۔ ان کے مطالبے پر فلک پیما کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ صفدر بشیر جلسے میں موجود تھا۔ وہ ایک ملزم کی طرح خاموش بیٹھا پائپ پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ نہ اس نے کسی سے بات کی نہ کسی بے چینی کا مظاہرہ کیا۔ پتھر کے مجسمے کی طرح چپ بیٹھا رہا۔

مشتعل: غصہ دلانا۔ عذر: بہانہ۔ بادہ و ساغر: شراب۔

جلسے کی صدارت فہیم اللہ کر رہا تھا۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی تو سلمان نے صفدر بشیر
کے خلاف چارج شیٹ پیش کی۔ بہت سے الزامات کے علاوہ اس کے خلاف سب سے بڑا چارج یہ
کہ وہ خان بہادر فرزند علی سے ساز باز کر کے فلک پیما کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ صفدر بشیر نے
سنگین الزامات سنے تو غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہ فلک پیما کا صدر تھا۔ اس کا بانی تھا اور اسے
باقاعدہ تحریک کی شکل دینے میں اس نے ساٹھ ہزار روپیہ دیا تھا۔ سخت جدوجہد کی تھی اور عیش
عشرت کی زندگی تج کر روکھی پھیکی بے مزہ زندگی اختیار کی تھی۔ فلک پیما کے خلاف سازش کرنے
الزام عائد کر کے اس کے ساتھ سخت زیادتی کی گئی تھی۔ یہ بات کبھی اس کے ذہن میں بھی نہیں
آئی تھی۔ اسے فلک پیما سے صرف اس قدر شکایت تھی کہ ڈاکٹر زیدی کے بجائے میونسپلٹی کے
انتخابات میں اسے فلک پیما کا امیدوار کیوں نامزد نہیں کیا گیا۔ وہ خود کو ڈاکٹر زیدی سے زیادہ بہتر اور
مستحق امیدوار سمجھتا تھا۔ اسکائی لارکوں نے یہ فیصلہ کر کے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ جہاں
تک خان بہادر کے ساتھ ساز باز کرنے کا سوال تھا صفدر بشیر کو خود بھی خان بہادر سے شدید نفرت
تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ اس شام جب وہ فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر سے اپنی کوٹھی کی جانب
جا رہا تھا تو راستے میں خان بہادر مل گیا اور اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں خان بہادر نے الیکشن
کے متعلق اس سے گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس نے خان بہادر کی کوئی حوصلہ افزائی
نہیں کی۔

چارج شیٹ پیش کرنے کے بعد سلمان نے یہ مطالبہ کیا کہ صفدر بشیر کو صدر کے عہدے
فوری طور پر معطل کر دیا جائے اور اس کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کر کے سخت کارروائی کی جائے۔
صدر نے صفدر بشیر کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا۔ مگر وہ غصے سے اس قدر بے تاب
ہو رہا تھا کہ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا اور احتجاجاً اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا۔
صفدر بشیر کے چلے جانے کے بعد بھی اجلاس کی کارروائی جاری رہی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد
صفدر بشیر کا ڈرائیور آیا۔ وہ جنرل سیکرٹری علی احمد کے نام ایک خط لایا تھا۔ یہ صفدر بشیر کا استعفیٰ تھا
اس نے فلک پیما سے علیحدگی اختیار کرنے کی درخواست کی تھی۔
علی احمد کو یہ علم نہیں تھا کہ جذبات کی رو میں وہ اتنی دور نکل جائے گا۔ اس نے استعفیٰ پڑھ کر

سازباز: سازش۔ تج کر: چھوڑ کر۔

اسکائی لارکوں سے اپیل کی کہ فی الحال اس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں
اس پر غور کیا جائے۔ اس تجویز کو مان لیا گیا اور صفدر بشیر کے استعفے پر اس روز کوئی بحث نہ ہوئی۔

(۳)

مئی کی شروع تاریخیں تھیں۔ میونسپلٹی کے انتخابات میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔ تمام
دن لو چلتی۔ آسمان پر گہرا زرد غبار چھایا رہتا۔ درختوں کے پتے جھلس گئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں
جسم موم بتی کی طرح پگھلتے تھے۔ پہر دن گزرتے ہی شہر میں سناٹا پڑ جاتا۔ دوپہر تک کوچہ و بازار
سنسان ہو جاتے۔

گرمیوں کی ایک ایسی ہی سنسان دوپہر تھی۔ علی احمد کمرے میں بیٹھا ایک نیا انتخابی پوسٹر تیار کر
رہا تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر سلمان داخل ہوا۔ اس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما
رہا تھا۔ بالوں پر گرد کے ذرات بکھرے تھے۔ بدن پسینے سے شرابور تھا۔ علی احمد نے گردن موڑ کر اس
کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔

"کیا خبر لائے ہو اسکائی لارک سلمان؟"

سلمان نے ہاتھ میں دبا ہوا تھیلا میز کے ایک کونے پر رکھ دیا اور چہرے سے پسینہ پونچھتے
ہوئے گویا ہوا۔ "ابھی ابھی ایک بڑی شاندار خبر ملی ہے۔"

"شاندار خبر ہے تو ضرور سناؤ۔"

"ایک حریف تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔"

علی احمد چونک پڑا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا؟"

"عبدالحمید تو اڑن چھو ہو گیا۔" سلمان اس وقت بڑی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ "آج اس
نے کاغذات نامزدگی بھی واپس لے لیے۔"

لمحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔ "کہئے ہے نا، زوردار خبر۔ اب تو صرف خان بہادر ہی
میدان میں رہ گیا ہے اور وہ بھی کیا؟" یہ کہہ کر سلمان نے قہقہہ لگایا۔ مگر اس اطلاع پر علی احمد نے

تمازت: گرمی۔ اڑن چھو ہونا: بھاگ جانا۔

کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے اس طرح خاموش پا کر سلمان کو کسی قدر تعجب ہوا۔ ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ "بھئی یہ تو کچھ اچھی خبر نہیں ہے۔"

سلمان حیرت سے چونک پڑا۔ "کیوں؟"

"میرے اندازے کے مطابق اسے دو ہفتے پہلے ہی انتخابات سے دست برداری کا اعلان کر دینا چاہیے تھا۔ مجھے خود حیرت تھی کہ عبدالحمید ابھی تک کیوں ڈٹا ہوا ہے؟"

سلمان اس کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟"

علی احمد اسے سمجھانے لگا۔ "تم نے غالباً غور نہیں کیا کہ عبدالحمید کے بیٹھ جانے سے فائدہ کسے پہنچے گا۔ اگر عبدالحمید الیکشن لڑتا تو خان بہادر کے ووٹ تقسیم ہو جاتے۔ اس کے زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایسا طبقہ ہے کہ جو کسی بھی وقت جذباتی نعروں سے گمراہ ہمارا مخالف بن سکتا ہے۔ اس کے طبقاتی کردار کا یہی تقاضا ہے۔ یہ ناقابل اعتماد طبقہ ہے۔ اس ڈانواں ڈول اور ڈھلمل یقین کہ اس پر قطعی انحصار نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور سلمان سے دریافت کیا۔ "یہ تو بتاؤ صفدر بشیر کس عالم میں ہے؟"

سلمان نے مختصر جواب دیا۔ "مجھے ان کے متعلق کوئی خاص اطلاع نہیں۔ صرف اتنا کہ اب وہ کثرت سے شراب پینے لگے ہیں اور ان کا مزاج بھی بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔"

علی احمد کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس خبر سے اسے بہت صدمہ پہنچا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "وہ اپنی جذباتیت اور خود پسندی کا شکار ہو گیا۔ ہائے بے چارہ صفدر بشیر" ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سلمان سے کہا۔

"عبدالحمید کی کنارہ کشی کسی صورت میں ہمارے لیے مفید نہیں۔ اس کے سارے ووٹ بہادر کے حق میں جائیں گے۔ فلک پیا کی جڑیں کہیں مضبوط ہیں تو وہ علاقے کے غریب اور لوگ ہیں۔ کارخانوں کے مزدور ہیں جو ہمارے پکے ووٹ ہیں۔ ہمیں یونین میں اپنا کام تیز چاہیے۔ یوں بھی اب ہمیں اپنی انتخابی مہم زیادہ تیز کرنا پڑے گی۔"

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہا۔ علی احمد نے سگریٹ کا پیکٹ

ایک سگریٹ سلمان کو دی۔ دوسری اپنے ہونٹوں میں دبائی اور اسے سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر لو کے جھکڑ غراتے ہوئے چل رہے تھے۔ قریب کے اصطبل میں بندھا ہوا گھوڑا بار بار ہنہنا رہا تھا۔ سنسان دوپہر میں اس کی آواز کسی پاگل کی چیخوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے خان بہادر نے عبدالحمید کو تگڑی رقم دی ہے ورنہ وہ آسانی سے بیٹھنے والا امیدوار نہیں تھا۔ بہر حال خان بہادر کی پوزیشن اب کسی قدر مضبوط ہو گئی ہے۔" وہ سلمان کی اطلاع پر تبصرہ کرتا رہا۔ چند منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

گفتگو ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی۔

سلمان نے اپنا تھیلا اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ علی احمد پوسٹر تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سکوت ہو گیا۔ باہر لو کے جھکڑوں کی سرسراہٹیں ابھرتی رہیں۔ کمرے کا لکڑی کا ایک پٹ آہستہ آہستہ بجتا رہا۔

علی احمد کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ دوسرے ہی دن عبدالحمید کی جانب سے جاری کئے جانے والے بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ نظر آنے لگے۔ ان پوسٹروں میں عبدالحمید نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ خان بہادر کے حق میں انتخابات سے دستبردار ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ووٹروں سے اپیل کی تھی کہ وہ خان بہادر کی پوری طرح حمایت کریں۔

اس اعلان کا فوری رد عمل یہ ہوا کہ خان بہادر کے حامیوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ بڑھ چڑھ کر کام کرنے لگے۔ چند ہی روز بعد انہوں نے جلسہ عام کا بندوبست کیا۔ یہ انتخابی مہم کے سلسلے میں خان بہادر کی جانب سے پہلا جلسہ تھا۔ اس سے قبل وہ عام جلسہ کراتے ہوئے ڈرتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں جلسہ ناکام نہ ہو جائے اور رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہے۔ اس کے کارکنوں کے حوصلے اور پست ہو جاتے۔

جلسہ کامیاب بنانے کے واسطے بہت زور و شور سے تیاریاں کی گئیں۔ ہر طرف قد آدم پوسٹر لگائے گئے۔ خان بہادر کی دو جیپیں رات گئے تک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے جلسے کا اعلان کرتی رہیں۔

ان تیاریوں کو دیکھ کر اسکائی لارکوں میں بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ فلک پیا کے ایک اجلاس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ خان بہادر کے جلسے کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ چند جوشیلے اسکائی لارک اس حد تک کمر بستہ تھے کہ جلسے گاہ کے اندر گھس کر بجلی کے تار کاٹ دیے جائیں۔ ہڑبونگ مچا کر جلسہ درہم برہم کرنے کی کوشش کی جائے۔

مگر علی احمد نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔

اس نے کہا کہ اسکائی لارک اپنے مخالفین کو قوت کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں دیں گے تو اپنی صفوں کو حریف کے خلاف کبھی مستحکم نہ بنا سکیں گے۔ انہیں اپنی کمزوریوں کا اندازہ نہ ہو سکے گا۔ اس کے نزدیک یہ بزدلی کی نشانی تھی۔ علی احمد اور بعض دوسرے اسکائی لارکوں کی مخالفت پر اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔

⊛ ⊛ ⊛

خان بہادر نے جلسے پر خوب روپیہ صرف کیا تھا۔

پنڈال دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ چپے چپے پر رنگ برنگے برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ شہ نشین کئی گز اونچی بنائی گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف زرتار پردوں کی محرابیں تھیں۔ بیچ میں فانوس لٹک رہے تھے۔ دبیز قالینوں کا فرش تھا جس پر صدر کے لیے ایک اونچی کرسی تھی۔ اس پر سرخ مخمل کا غلاف تھا۔ ہوا چلتی تو زرتار پردے لہراتے۔ ہر طرف ستاروں کی افشاں بکھر جاتی۔ شہ نشین دور سے آراستہ بارہ دری کی طرح شاندار نظر آتی۔

جلسے کا انتظام رفعت علی دل گیر کے سپرد تھا۔ وہ پستہ قد کا ادھیڑ آدمی تھا۔ چہرے پر چگی ڈاڑھی لمبی، کاکلیں اور ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھایا ہوا عصا۔ اس حلیے میں وہ ان صوفیوں کی طرح نظر آتا تھا جن کو محفل سماع کی زینت کے لیے خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔ جو قوالوں کو پیسہ کوڑی تو دیتے نہیں البتہ عالم وجد میں اس طرح بے خود ہو جاتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ لیکن دل گیر کا تصوف اور کشف و کرامات سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ یہ وضع قطع اس نے محض اپنی شخصیت کو باوقار بنانے کے لیے اختیار کی تھی۔

کمر بستہ: آمادہ، تیار۔ مستحکم: مضبوط۔ پنڈال: مراد جلسے کی جگہ۔ پستہ قد: چھوٹے قد کا۔ چگی ڈاڑھی: کم بالوں والی ڈاڑھی۔ کاکل: زلف، لٹ۔ عصا: لاٹھی۔ عالم وجد: دیوانگی کی حالت، بیخودی کی حالت۔ تصوف: پیری فقیری۔ کشف: غیب سے کسی چیز کا علم ہونا۔

دلگیر جلسوں کو کامیاب بنانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ویسے پیشے کے اعتبار سے وہ درزی تھا۔ شہر میں اس کی دکان بھی تھی۔ مگر الیکشن کے دنوں میں وہ انتخابات لڑانے اور انتخابی جلسے کرانے کا کام بھی کرتا تھا اور ہمیشہ ٹھیکے پر کرتا تھا۔ ایک زمانے میں اس کی باقاعدہ ٹولی تھی جن میں نعرہ لگانے والے، نعرہ اٹھانے والے، تالیاں بجانے والے اور ایسے مضبوط غنڈے بھی تھے کہ اگر کسی نے ذرا بھی جلسے میں گڑبڑ کی تو فوراً اس کی گردن دبوچ لیتے۔ مگر اب اس کی ٹکڑی منتشر ہو گئی تھی۔ البتہ پرانی ساکھ باقی تھی۔

جلسہ شروع ہونے کا جو وقت مقرر تھا رفعت علی دل گیر اس سے گھنٹہ بھر پہلے ہی جلسہ گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے پنڈال کا گھوم پھر کر باقاعدہ معائنہ کیا۔ اس کے ہمراہ ۲۵ افراد کی ٹیم تھی۔ دل گیر نے ہر ایک کو مختلف مقامات پر تعینات کیا۔ نعرہ لگانے والوں کو ہدایتیں دیں کہ پہلے کون ابتدا کرے گا اور اس کے بعد کس طرح سب مل کر نعرہ لگائیں گے۔ تالیاں پیٹنے والے کس موقع پر تالیاں بجائیں گے۔ جب تک وہ سگنل نہیں دے گا نہ کوئی نعرہ لگائے گا نہ تالیاں بجائی جائیں گی۔

وہ ایک روز قبل باقاعدہ ریہرسل بھی کرا چکا تھا۔ مگر اس کے بیشتر کارکن اناڑی تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے وہ انہیں بار بار ہدایتیں دے رہا تھا اور ڈانٹتا بھی جا رہا تھا۔ "دیکھو بے! کسی نے الٹی سیدھی حرکت کی تو دھیلا نہیں دوں گا۔" ان کے ریٹ کچھ اس طرح مقرر تھے۔

نعرہ لگانے والے فی کس پانچ روپے۔

نعرہ اٹھانے والے فی کس دو روپے۔

تالیاں بجانے والے فی کس ایک روپیہ۔

اس کے علاوہ دلگیر نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جو بہت زوردار اور جوشیلے نعرے لگائے گا اسے انعام بھی ملے گا۔

ان تیاریوں سے فارغ ہونے کے بعد دلگیر نے غنڈوں کی ڈیوٹیاں مقرر کیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر وہ خان بہادر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

شام ہی سے لوگ جلسہ گاہ میں پہنچنا شروع ہو گئے۔ خان بہادر کی آمد سے پہلے ہی پنڈال کھچا کھچ بھر گیا۔ ہزاروں کا اجتماع تھا۔ حاضرین میں بڑی تعداد خان بہادر اور اس کے حامی کارخانہ

ٹکڑی: جماعت، گروہ۔ اناڑی: ناتجربہ کار۔ کھچا کھچ: بہت زیادہ۔

داروں کی فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تھی، جنہیں بسوں میں بھر بھر کر جلسہ گاہ تک لایا گیا تھا۔ انہیں جلسے میں شرکت کرنے کے لیے باقاعدہ اوور ٹائم دیا گیا تھا۔

آٹھ بجنے سے کچھ دیر قبل خان بہادر فرزند علی کی کار جلسہ گاہ پر آکر رکی۔ اس کے کارکن چیلوں کی طرح کار پر جھپٹے۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ خان بہادر بڑے وقار کے ساتھ باہر آیا۔ کارکنوں اور عقیدت مندوں نے بڑھ بڑھ کر اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ دلگیر نے فوراً نعرہ لگانے والوں کو اشارہ کیا۔ فضا "خان بہادر زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگی۔

خان بہادر، کارکنوں اور عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں مسکراتا ہاتھ ہلاتا آگے بڑھا۔ خلقت اس پر اس طرح ٹوٹ رہی تھی کہ شہ نشین تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔

شہ نشین پر پہنچ کر خان بہادر فرزند علی نے جلسے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا بڑا اجتماع اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ مسرت سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ روشنیوں سے جگمگاتے پنڈال میں، ہار پھولوں سے لدا، وہ دولہا کی طرح سجا سجایا، مہمان خصوصی بنا ایک اونچی کرسی پر رونق افروز تھا۔ ہر نگاہ اس کی جانب اٹھی تھی اور ہر زبان پر اس کا تذکرہ تھا۔ اس حقیقت کا خان بہادر کو شدت کے ساتھ احساس بھی تھا۔

خان بہادر فرزند علی کے ساتھ نیاز بھی جلسے میں آیا تھا۔ اس نے یہ آن بان اور کروفر دیکھا تو خان بہادر کی شخصیت سے بہت مرعوب ہوا۔ اس کے سامنے دور تک انسانی چہرے ہی چہرے نظر آرہے تھے اور یہ سب خان بہادر کے حامی اور مددگار تھے۔ نیاز نے دل ہی دل میں کہا کہ واقعی خان بہادر فرزند علی بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ بار بار خان بہادر کی جانب دیکھتا جو اونچی کرسی پر کسی فرماں روا کی مانند فروکش تھا۔ اس کی گردن فخر سے اوپر اٹھی تھی۔ چہرے پر وقار اور گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ایک مقرر نے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اس نے خان بہادر کی شان میں خوب خوب قصیدہ خوانی کی۔ اس کے بعد کئی دوسرے مقررین نے تقریریں کیں۔ ہر تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ خان بہادر، عوام کا مخلص رہنما، سچا اور صالح مسلمان ہے۔ اس کے سینے میں ایمان کی حرارت اور غریبوں کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ ان کے

جھرمٹ: ہجوم۔ خلقت: عوام۔ سان گمان: وہم و خیال۔ رونق افروز تھا: بیٹھا ہوا تھا۔ آن بان، کروفر: شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹ۔ لب لباب: خلاصہ۔

ووٹوں کا صحیح حقدار ہے۔

قریب قریب ہر مقرر نے "نورانی مسجد" کی تعمیر کو خان بہادر فرزند علی کی گراں قدر خدمت اور ایمان افروز کارنامہ قرار دیا۔ انہوں نے خان بہادر کو عوام کا نمائندہ ثابت کرنے میں فصاحت و بلاغت کے وہ جوہر دکھائے کہ خان بہادر کے پیسے وصول ہو گئے۔

ان تقریروں کے دوران میں رفعت علی دل گیر اور اس کی ٹیم نے اس قدر جوش و خروش سے نعرے لگائے کہ جلسے میں زبردست گرمی پیدا ہو گئی۔ لیکن جوں جوں تقریر کرنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا خان بہادر کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے آج تک کسی جلسہ عام سے خطاب نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ گھر سے یہ سوچ کر چلا تھا کہ اپنی تقریر سے دھوم مچا دے گا۔ یہ تقریر اس نے ایک کہنہ مشق اخبار نویس سے لکھوائی تھی اور کئی روز تک بند کمرے میں ٹہل ٹہل کر اسے رٹا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر چہرے پر مختلف انداز سے تاثرات پیدا کرنے کی باقاعدہ مشق بھی کی تھی۔ ایک بار کنبے کے تمام افراد اور گھر کے تمام نوکروں کو اکٹھا کر کے ان کے روبرو تقریر کا ریہرسل بھی کیا تھا۔ مگر اب اتنا بڑا مجمع دیکھ کر وہ کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

آخر خان بہادر بولنے کے لیے کھڑا ہوا۔ تقریر شروع کرنے سے پیشتر اس نے پورا گلاس پانی پیا۔ سگار پر کئی لمبے لمبے کش لگائے۔ مگر وہ تقریر جو رٹ کر آیا تھا اس کے ذہن سے نکلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی یادداشت پر زور دے کر اسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے نعرہ بلند ہوا۔

"نعرہ تکبیر!"

اور اس کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے آوازیں آئیں۔

"اللہ اکبر۔"

"خان بہادر فرزند علی زندہ باد"

"خان بہادر فرزند علی زندہ باد"

ان نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ خان بہادر کی یادداشت بالکل جواب دے گئی۔ بدحواس ہو کر اس نے سگار کے دو تین لمبے لمبے کش لگائے۔ اس کے پیر آہستہ آہستہ کپکپا رہے تھے۔ تنفس تیز

فصاحت: خوش بیانی۔ بلاغت: کلام میں پختگی۔ کہنہ مشق: تجربہ کار۔ رٹنا: زبانی یاد کرنا۔

ہو گیا تھا اور سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آگیا تھا۔ اس نے اسی عالم میں تقریر شروع کر دی۔

"برادران اسلام! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے آپ سے صرف چند ضروری باتیں کہنی ہیں۔"

یہ دونوں جملے اس نے بڑی مشکل سے ادا کیے۔ اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔ مگر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں آپ لوگوں کا خادم ہوں۔ آپ لوگوں کی خدمت کر چاہتا ہوں۔"

اسے اپنی تقریر کا کچھ حصہ یاد آگیا۔ اس نے فوراً کہا۔ "لیکن یہ بات تو ہر امیدوار آپ سے کہ ہے۔ ہر ایک کے دل میں آپ کی خدمت کا جذبہ ہے۔ ہر ایک آپ کے غم میں گھلا جاتا ہے۔ تو پھ آپ میری بات پر یقین کیوں کریں؟ آپ کہیں گے کہ خان بہادر ووٹ لینے کے لیے یہ سب ڈھونگ رچا رہا ہے۔ وہ پرلے درجے کا عیار اور مطلبی ہے۔"

خان بہادر کی تقریر ایسے موڑ پر آگئی تھی جہاں سے گریز اختیار کر کے وہ حرف مطلب پر آ چاہتا تھا۔ اتفاق سے عین اس وقت رفعت علی دل گیر کے سر میں کھجلی ہوئی۔ اس نے سر کھجانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ ایک تالی بجانے والے کی نظر پڑ گئی۔ وہ سمجھا دل گیر سگنل دے رہا ہے۔ اس قریب بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی کو کہنی سے ٹہوکا دیا اور زور زور سے تالی بجانے لگا۔ اس کے دوسر ساتھی بھی تالی بجانے لگے۔

تالیوں کا شور سن کر مشرقی کونے پر کھڑے ہوئے نعرہ لگانے والے نے اپنی مستعدی ثبوت دیا۔ اس نے فوراً گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا۔

"سچ کا بول بالا۔"

"جلسے سے ملی جلی آوازیں ابھریں۔ "جھوٹے کا منہ کالا۔"

"دھاندلی بازی!"

"نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔"

"ووٹوں کی دلالی۔"

"نہیں چلے گی، نہیں چلے گی۔"

ڈھونگ رچانا: فریب دینا، مکاری کرنا۔ عیار: فریبی، مکار۔

حاضرین جلسہ بھی ان نعروں میں شریک ہو گئے۔ ان کی آواز کے شور سے جلسہ گاہ گونجنے
لی۔ یہ نعرے دراصل اسکائی لارکوں کے تھے اور خان بہادر کے کارکنوں نے انہیں کے خلاف
ستعمال کرنے کے لیے دل گیر کے گرگوں کو رٹائے تھے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ
خان بہادر جب اسکائی لارکوں کی مذمت کرے تو وہ یہ نعرے لگانا شروع کر دیں۔

خان بہادر نے یہ نعرے سنے تو گھبرا کر سوچا کہ جلسے میں گڑ بڑ ہو گئی۔ اس کی مخالفت میں نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ تقریر کا وہ حصہ جو اسے یاد آیا تھا، ذہن سے نکل گیا۔ دوسری طرف دل گیر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ خان بہادر کی نظروں سے بچتا پھر رہا تھا۔ غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔ "سالوں نے میری ناک کٹوادی۔ کسی حرام کے تخم کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ یارو! غضب ہو گیا۔"

غصے سے اس کی چگی ڈاڑھی بکری کی دم کی طرح ہل رہی تھی۔ نتھنوں سے سانس، شوں شوں کر کے نکل رہی تھی۔ اس وقت وہ اچھا خاصا ناٹک کا مسخرا نظر آ رہا تھا۔

خان بہادر غضب ناک ہو کر چیخا۔ "بعض لوگ جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔"

دل گیر نے دیکھا موقع غنیمت ہے۔ اس نے فوراً سگنل دیا اور جلسہ "اللہ اکبر" اور "خان بہادر زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگا۔

دل گیر کو سرخ رو ہونے کا موقع ملا تھا۔ اب وہ ایسے مقام پر کھڑا ہو گیا جہاں سے خان بہادر اسے دیکھ سکتا تھا۔ ان نعروں نے واقعی اثر کیا۔ خان بہادر جوش میں آ کر بولنے لگا۔ "میں اپنے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر میری خدمات آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ نورانی مسجد کس نے بنوائی؟"

شامت اعمال کسی دل جلے کی زبان سے نکل گیا۔ "مسجد کی دکانوں کی ڈیڑھ لاکھ پگڑی کس نے لی؟"

دل گیر کے گرگے چیلوں کی طرح اس شخص پر جھپٹے اور لاتیں اور گھونسے مارتے ہوئے جلسے

گرگے: شاگرد، چیلے۔ ناک کٹانا: رسوا کرنا، بدنام کرنا۔ ناٹک: ڈرامہ۔ مسخرا: ہنسی مذاق کرنے والا۔ سرخ رو ہونا: ذمہ داری نبھانا۔ شامت اعمال: بری قسمت۔

سے باہر لے جانے لگے۔

اس رویے پر حاضرین نے احتجاج کیا۔ جلسے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے غنڈوں کی گرفت سے اس شخص کو چھڑانے کی کوشش کی تو ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ پھر تو اس قدر ہنگامہ ہوا اور غل غپاڑہ ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا اسی طرف بھاگا۔ خان بہادر نے یہ عالم دیکھا تو وہ بھی بدحواس ہو گیا۔ چپکے سے شہ نشین سے اترا اور کارکنوں کے حلقے میں گھرا ہوا جلسے سے باہر آ گیا۔ کار منگوائی اور اس میں بیٹھ کر سیدھا گھر کی جانب چل دیا۔

بھگدڑ پڑنے کے بعد آناً فاناً پنڈال خالی ہو گیا۔ جلسہ گاہ میں الو بولنے لگا۔ اب صرف کارکن اور دل گیر شامیانے کے نیچے رہ گئے تھے۔ دل گیر سخت برہم نظر آ رہا تھا۔ اس کے کارکن سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ ان کے سامنے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ زیادہ تاؤ آتا تو ان پر برسنے لگتا۔

"ابے تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب میں خان بہادر کے پاس کس منہ سے جاؤں۔ یاد رکھو کسی سالے کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ میرا تو بیڑا غرق ہو ہی گیا مگر تم کو بھی نہیں بخشوں گا۔ ابے تم کو کس کس طرح سمجھایا۔ مگر سب نے اپنا حرامی پن دکھایا۔ یارو! ذرا تو عقل سے کام لیا ہوتا۔ تف ہے تم پر۔ اتنے ڈھو جوان ہو کر تمہاری یہ حرکتیں۔"

وہ دیر تک ان کو ڈانٹتا پھٹکارتا رہا اور بے چینی سے ٹہلتا رہا۔

رفعت علی دل گیر شرم کے مارے خان بہادر کے پاس نہ گیا۔ پنڈال سے نکل کر سیدھا دارز
خانے پہنچا۔

لیکن خان بہادر کو اس سے ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ اس نے جلسے کے درہم برہم ہو جانے کی ساری ذمہ داری اسکائی لارکوں پر عائد کی۔ وہ اپنے کارکنوں کے ساتھ بیٹھا سارا غصہ اسکائی لارکوں پر اتارتا رہا۔

کارکن بھی اس کی تائید کر رہے تھے۔

رات گئے تک خان بہادر کی کوٹھی پر یہی چرچا رہا۔ آئندہ کے لیے نئے انتخابی ہتھکنڈے اور اسکیمیں سوچی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ جوابی کارروائی کے طور پر اسکائی لارکوں کے ہر جلسے کو ہنگا

آناً فاناً: دیکھتے دیکھتے۔ تف: لعنت۔ ڈھو جوان: بھرپور جوان۔

ئی اور گڑبڑ کے ذریعے درہم برہم کرایا جائے۔

❁ ❁ ❁

اسکائی لارکوں نے بھی جلسہ عام کیا۔ حاضرین کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ ان میں جوش و
ش بھی تھا۔ سلمان تقریر کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ صاف ستھرا تھا۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ انتخابی
ے سلسلے میں تقریریں کرتے کرتے اب وہ خاصا منجھ گیا تھا۔ لوگوں کی نفسیات سمجھنے لگا تھا۔
رفتہ اس کا اپنا اسٹائل بنتا جا رہا تھا۔ وہ ایک کامیاب مقرر سمجھا جانے لگا تھا۔

سلمان نے دوران تقریر ایک بار آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی پریشان حالی کی بنیادی
یہ ہے کہ آپ کو اپنی قوت کا اندازہ نہیں۔ آپ اپنے حقوق اور ان کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔"
ان بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اچانک جلسے کے اندر سے کئی آوازیں ابھریں۔

"جھوٹ بولتا ہے۔"

"بہروپیا ہے۔"

"سب ووٹ مانگنے کا ڈھونگ ہے۔"

"ہم تقریر نہیں سنیں گے۔"

"واپس جاؤ، واپس جاؤ"

اس کے ساتھ ہی غل غپاڑہ ہونے لگا۔ چیخ چیخ کر بولنے والوں کی آوازوں کے ساتھ مرغوں
ئوں کی بولیاں بھی سنائی پڑ رہی تھیں۔ سلمان کسی قدر گھبرا گیا۔ یہ اس کے ساتھ پہلا اتفاق تھا۔
نے لوگوں سے خاموش رہنے کی درخواست کی تو شور مچانے والے اور بھی اونچی آواز سے چیخنے
۔ یہ آوازیں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

جلسے میں پہلے تو کچھ سراسیمگی پھیلی۔ کچھ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ پنجوں کے بل اونچے
اس طرف دیکھنے لگے جس طرف شور ہو رہا تھا یہ پندرہ بیس افراد کا غول تھا جس میں ہر شخص
اٹھا اٹھا کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر شور نہ مچا سکے۔ حاضرین میں سے کچھ نوجوان
اور ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ دنگا فساد کرنے لگے۔ یہی ان کے حق میں برا ہوا۔

یکایک ان پر چاروں طرف سے مار پڑنے لگی۔ کچھ تو یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی صاف نکل گئے۔
ن کو پکڑ لیا گیا ان پر دھڑا دھڑ جوتے پڑنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں ان کی اچھی خاصی مرمت ہو گئی۔

اسکائی لارکوں نے منت سماجت کی۔ بڑی مشکل سے ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد جلسہ پھر شروع ہو گیا اور رات گئے تک جاری رہا۔ سلمان نے اور بھی زیادہ جوش و خروش سے تقریر کی اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی یہ تقریر بڑی ولولہ انگیز تھی۔ لوگ بار بار نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں کی آوازیں رات کے سناٹے میں دور تک سنائی پڑ رہی تھیں۔

اسی رات فلک پیا کا اجلاس ہوا جس میں جلسے کے اندر ہونے والی گڑبڑ پر غور کیا گیا۔ اس لیے کہ یہ ابتدا تھی۔ اور آئندہ کے واسطے اسکائی لارکوں کو تنبیہہ بھی تھی۔ اجلاس میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ اسکائی لارک اس واقعے پر بہت برہم تھے اور اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

کمرے میں سگریٹوں کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ لیمپ کے چاروں طرف سرمئی غبار کا جال پھیل گیا تھا۔ اس کی روشنی دھندلی پڑ گئی تھی اور اس دھندلی روشنی میں اسکائی لارکوں کے چہرے پرچھائیوں کے مانند نظر آرہے تھے۔ فضا کچھ ایسی ہی دھواں دھواں تھی۔ ناگاہ دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی اسکائی لارکوں نے چونک کر دیکھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ صفدر بشیر کھڑا تھا۔ اس کے بال پٹ سن کے ریشوں کی طرح خشک تھے۔ پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔ چہرے کا رنگ خاکستری پڑ گیا تھا رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے درمیان اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

صفدر بشیر لمحہ بھر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اس کے قدموں کی آہٹ پختہ فرش پر کھٹ کھٹ ابھرتی رہی۔ وہ علی احمد کی پشت پر پہنچ کر چٹان کی طرح استادہ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں صفدر بشیر کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"جناب صدر اور اسکائی لارک ساتھیو! اس بے جا مداخلت کے لیے میں آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کے اجلاس میں مجھے اس طرح آنے کا کوئی حق نہیں۔ فلک پیا سے ایک جذباتی لگاؤ تھا جو مجھے یہاں کھینچ لایا۔ شاید آخری بار اسکائی لارکوں کو، ان کے ہیڈ کوارٹر اور اس کے در و دیوار کو دیکھ رہا ہوں۔"

صفدر بشیر ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ اس طرح بول رہا تھا جیسے ہانپ رہا ہو۔ "میں اس شہر

گلو خلاصی: رہائی۔ ولولہ انگیز: جوش بڑھانے والی۔ ناگاہ: اچانک۔ استادہ ہو گیا: کھڑا ہو گیا۔

بلکہ اس ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمام جائداد فروخت کر دی ہے اور لندن میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔"

اس کا خوبصورت چہرہ پت جھڑ کے پتوں کی طرح زرد پڑتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک دھندلی پڑ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے فخر ہے کہ میں فلک پیا کا ایک رکن رہ چکا ہوں اور مجھے دکھ ہے کہ جد و جہد کے اس سفر میں، میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکا۔ حالانکہ یہ میری زندگی کا آئیڈیل تھا۔ میں اب غبارِ کارواں ہوں۔ منزل سے بھٹکا ہوا، تھکا ہارا راہی ہوں۔ جس کا کوئی ہمراہی نہیں، جس کی کوئی منزل نہیں۔"

یہ کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ وہ بیماروں کی طرح نڈھال ہو رہا تھا۔

کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ ہر اسکائی لارک اداس اداس اور کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ دفعتہً علی احمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر تک وہ صفدر بشیر کے چہرے کو تکتا رہا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور بڑے جذباتی انداز میں صفدر بشیر کو بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

کچھ دیر تک دونوں اسی عالم میں کھڑے رہے۔ کمرے کی خاموشی میں دبی دبی سسکیوں کی آواز ابھری۔ صفدر بشیر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئی تھیں۔ سانس الجھی ہوئی تھی۔ علی احمد نے اس کی پیٹھ آہستہ آہستہ تھپکتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر جذباتی ہو۔ صفدر بشیر! ابھی تم بچے ہو۔"

صفدر بشیر اس کے شانے پر جھکا ہوا آنسو بہاتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اب میں چلوں گا۔"

علی احمد نے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

"ہوٹل! کوٹھی تو میں نے پچھلے ہفتے فروخت کر دی۔"

علی احمد نے اس دفعہ پیار سے اسے ڈانٹا۔ "کل ہوٹل سے اپنا سامان یہاں لے آنا۔"

غبارِ کارواں: قافلے کے چلنے سے اڑنے والی مٹی، مراد پیچھے رہ جانے والا۔

"لیکن میں تو لندن جا رہا ہوں۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے۔"

کئی اسکائی لارکوں کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

"صفدر بشیر لندن نہیں جا سکتے۔"

"صفدر بشیر یہیں رہیں گے۔"

صفدر بشیر مسکرانے لگا۔ اس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔ اسکائی لارکوں نے کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگایا۔

"صفدر بشیر زندہ باد!"

وہ اس وقت بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ صفدر بشیر کی کمی انہوں نے اس کی غیر حاضری میں شدت کے ساتھ محسوس کی تھی اور آج اسے پا کر اور اپنے درمیان دیکھ کر وہ خوشی سے کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح اچھل رہے تھے۔ سب نے صفدر بشیر کو گھیرے میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ علی احمد اور صفدر بشیر چائے کی پیالیاں سنبھال کر لائبریری میں چلے گئے۔

وہ چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

❀ ❀ ❀

دروازہ کھلا اور ریاض اندر داخل ہوا۔ وہ فلک پیا کا رکن نہ تھا کبھی کبھار آتا تھا اور کئی کئی دن ہیڈ کوارٹر میں ٹھہرا رہتا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ علی احمد کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اسی رشتے سے فلک پیا کے ساتھ اس کا رابطہ پیدا ہوا۔ وہ ہمیشہ قیام بھی علی احمد ہی کے ساتھ ہی کرتا تھا۔

صفدر بشیر بھی اسے جانتا تھا۔ مزدوروں کی یونین کے قیام میں ریاض نے بڑی مدد کی تھی۔ ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں وہ صفدر بشیر کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ صفدر بشیر کی کنارہ کشی اور علا... کی انتخابی مہم میں بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث ان دنوں یونین کی ذمہ داریاں ریاض نے

کھلنڈرے: نادان۔ کنارہ کشی: علیحدگی۔

...ال رکھی تھیں۔

صفدر بشیر نے چائے پیتے ہوئے ریاض سے دریافت کیا۔ "یونین کی سرگرمیوں کا کیا حال ہے؟"

ریاض نے بتایا۔ ہڑتال کی ناکامی کے بعد خاصی گڑبڑ رہی۔ مگر اب صورت حال پہلے سے ...ہے۔"

صفدر بشیر نے مسکرا کر کہا۔ "ریاض! تمہیں یقین ہے کہ صورت حال بہتر ہو جائے گی۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں اس میں شبہ ہے؟"

صفدر بشیر بے تکلفی سے بولا۔ "بات یہ ہے ریاض! یہ یونین وونین کی بات سچ پوچھو تو میرے ...ے نیچے نہیں اترتی۔"

"صفدر! کبھی تم نے سنجیدگی سے سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟" ریاض نے دریافت کیا۔

"نہیں! مگر میں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ فلک پیا کے ذریعے میں بہتر طور پر کام کر سکتا ہوں۔ ...ی یہ بھی چاہتا ہوں کہ فلک پیا کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے علیحدہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہے۔ ...ت میں علی احمد سے بھی کہہ چکا ہوں۔" صفدر بشیر نے علی احمد کو براہ راست مخاطب کرتے ...ے کہا۔

"علی احمد! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

علی احمد، جو اب تک خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سن رہا تھا، مسکرا کر بولا۔ "فلک پیا کے ...اس میں اس مسئلے پر بحث بھی ہو چکی ہے۔ بلکہ کئی اسکائی لارک اس مسئلے پر تمہارے ہم خیال بھی ...گر مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں۔ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔"

اچانک ریاض نے صفدر بشیر سے عجب ٹیڑھا سوال کیا۔ "صفدر بشیر! تم ایک لاکھ روپے سے ...تک جوا کھیلتے رہو گے؟"

صفدر بشیر بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "میں تمہاری بات کا مطلب ...جھ سکا۔ کیا تم اس کی وضاحت کرو گے؟"

ریاض بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "میرا مطلب ہے تم اپنے سرمائے سے کب تک فلک پیا ...ی کھینچتے رہو گے؟ ایک دن تمہارا اثاثہ ختم ہو جائے گا۔ پھر تم اپنی جائیداد بیچ دو گے۔ وہ بھی ختم ...ے گی۔ پھر کیا کرو گے؟ پھر گاڑی کس طرح چلے گی؟ کبھی تم نے اپنی جدوجہد کو اس رخ سے

بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک لاکھ یا چند لاکھ روپے سے اگر معاشرے میں تبدیلیاں آجائیں تو
یہ بہت آسان نسخہ ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور ہنس کر بولا۔ "سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ آخر تم
چاہتے کیا ہو؟"

صفدر بشیر نے مختصر سا جواب دیا۔ "ہماری جدوجہد غربت اور پس ماندگی کے خلاف ہے۔"

"مگر تم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ غربت اور پس ماندگی کیوں ہے؟
معاشرے میں یہ اونچ نیچ کیوں ہے؟ یہ امیر اور غریب میں فرق کیوں ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے اور
جب تک تم اس بنیادی سوال کی تہہ تک نہیں پہنچو گے بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہو گے۔"

علی احمد نے مسکراتے ہوئے ریاض کو مخاطب کیا۔ "کامریڈ! رات اب خاصی ہو چکی ہے اور
ایک ہی نشست میں اپنا انقلابی فلسفہ صفدر بشیر کو نہیں سمجھا سکتے۔" علی احمد گفتگو ختم کرنا چاہتا تھا
مگر ریاض اس کے لیے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے فوراً وضاحت کی۔

"اس مسئلے پر صفدر بشیر سے میری پہلے بھی بات چیت ہو چکی ہے۔ یہ غربت اور پس ماندگی
دور کرنا چاہتے ہیں اور اس جدوجہد میں محنت کشوں کی سیاسی قوت کو اہمیت بھی دینا نہیں چاہتے
حالانکہ ہر جدوجہد اور ہر تحریک، خواہ سیاسی ہو، سماجی ہو یا اقتصادی، بنیادی طور پر طبقاتی ہوتی ہے۔
یہ محنت کرنے والے اور محنت کا استحصال کرنے والے کے درمیان ایک مسلسل لڑائی ہے۔"

اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "جب سے انسانی معاشرے میں نجی ملکیت کے تصور نے جنم لیا اور اس
کے نتیجے میں طبقات وجود میں آئے، اس وقت سے یہ لڑائی جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے
گی جب تک طبقات ختم نہیں ہو جاتے۔ جب تک انسان کے ہاتھوں انسان کی لوٹ کھسوٹ ختم نہیں
ہو جاتی۔ اس لڑائی میں آپ کو کسی ایک فریق کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا۔ درمیان کا کوئی راستہ
نہیں۔ درمیان کا راستہ بند گلی کی مانند ہے۔"

علی احمد نے کہا۔ "ایسا نہیں ہے۔ کم از کم فلک پیما کے بارے میں تمہیں ایسی رائے نہیں رکھنی
چاہیے۔ اس کا کردار تعمیری ہے۔ اس کے ذریعے ہم عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ انہیں
پڑھنا سکھاتے ہیں۔ طبی امداد فراہم کرتے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم اور امدادی بنک کے ذریعے روزگار
مہیا کرتے ہیں۔ ہم عوام کے قریب جا رہے ہیں۔ ان سے دور نہیں بھاگ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ

سماجی: معاشرہ سے متعلق۔ اقتصادی: معاشی۔ استحصال: ظلم کرنا، حق مارنا۔

بلاشبہ روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تمہاری اس رائے سے قطعی اتفاق ہے کہ ہمیں اپنی
جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ محنت کشوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی صورت
میں جب کہ ہمارا سابقہ خان بہادر فرزند علی ایسے لوگوں سے ہے جو خدمت خلق کو دولت کمانے اور
اپنی برتری حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔"

خان بہادر کے ذکر پر صفدر بشیر نے پوچھا۔ "میونسپلٹی کا الیکشن کیسا جا رہا ہے؟ میں نے سنا ہے
خان بہادر کا حال بہت پتلا ہے۔"

علی احمد نے کہا۔ "تمہارا خیال درست ہے۔ ہمارے مقابلے میں اس کی پوزیشن بہت کمزور
ہے۔ اس نے جلسہ عام کیا تھا وہ بدنظمی کی نذر ہو کر ناکام ہو گیا۔ ہمارے جلسے میں بھی اس نے
کرائے کے غنڈوں سے گڑبڑ پیدا کرانے کی کوشش کی تھی۔ اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔ البتہ پیسہ
پانی کی طرح بہا رہا ہے۔"

کچھ دیر تک انتخابات ہی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی پھر تینوں پر نیند کا غلبہ ہوا۔
ریاض حسب معمول علی احمد کے ساتھ ٹھہر گیا۔ صفدر بشیر واپس نہیں گیا۔ وہ بھی ایک اسکائی
لارک کے ساتھ ٹھہر گیا۔

(۴)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر میں سب گہری نیند سو چکے تھے۔
اچانک ہیڈ کوارٹر کے صدر دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آوازیں ابھریں فہیم اللہ نے نیند سے
آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو بھونچکا رہ گیا۔ سامنے پولیس کا مسلح دستہ موجود تھا۔ انسپکٹر نے فہیم اللہ
کو بتایا کہ پولیس، ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لینے آئی ہے۔ پولیس والے علی احمد کے کمرے میں گھس گئے۔ اسے
اور ریاض کو انہوں نے نیند سے بیدار کیا اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت دونوں کو گرفتار کر لیا۔
ان پر ملک دشمن کارروائیاں کرنے اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینے کا الزام تھا۔
اس وقت تک دوسرے اسکائی لارک بھی بیدار ہو چکے تھے اور علی احمد کے کمرے میں پہنچ

حال پتلا ہونا: حالت خراب ہونا۔ بھونچکا: حیران۔

چکے تھے۔ صفدر بشیر نے وارنٹ گرفتاری دیکھنا چاہا تو انسپکٹر نے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ تھانے میں ملزموں کو دکھایا جائے گا۔ علی احمد نے بھی وارنٹ دکھانے پر اصرار کیا۔ مگر انسپکٹر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اور ریاض کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ صفدر بشیر اور ڈاکٹر زیدی نے ان کے ہمراہ چلنے کی بہت کوشش کی لیکن انسپکٹر کسی طرح رضامند نہ ہوا۔

پولیس کے جانے کے بعد اسکائی لارک دیر تک جاگتے رہے۔ علی احمد اور ریاض کی گرفتاری پر ان میں شدید غم و غصہ پھیل گیا تھا۔ صفدر بشیر تمام رات جاگتا رہا۔ صبح ہی صبح وہ ڈاکٹر زیدی کے ساتھ تھانے گیا۔ اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ علی احمد اور ریاض وہاں موجود نہ تھے۔ تھانے والوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ تمام دن وہ بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ حکام بالا سے ملے مگر کہیں سے یہ سراغ نہ ملا کہ دونوں کو گرفتار کر کے کہاں رکھا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے شام کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ دونوں سنٹرل انٹیلی جنس کی تحویل میں ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ کسی کو ان سے ملنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔

اسکائی لارکوں کو یہ اطلاعات ملیں تو وہ بہت مشتعل ہوگئے۔ ڈاکٹر زیدی نے سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طور ان کے جذبات کو سرد کر دیا لیکن علی احمد کی گرفتاری کا فوری ردِّ عمل یہ ہوا کہ اسکائی لارکوں نے اپنی انتخابی مہم اور تیز کر دی۔ انہیں یقین تھا کہ دونوں کی گرفتاری کے پیچھے خان بہادر کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اس لیے کہ انتخابی مہم کا نگرانِ اعلیٰ علی احمد تھا اور اس خوش اسلوبی سے اسے چلا رہا تھا کہ دولت اور ہر طرح کے وسائل کے باوجود انتخابات کا پانسہ اسکائی لارکوں کے حق میں پلٹتا جارہا تھا۔ ریاض، یونین کے ذریعے مزدور ووٹروں کو اسکائی لارکوں کی حمایت میں منظم کر رہا تھا۔ مزدور نہ صرف اسکائی لارکوں کے حامی تھے بلکہ ان کی انتخابی سرگرمیوں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لے رہے تھے۔ اس حلقے میں مزدور ووٹروں کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی بلکہ انتخابات کی ہار جیت کا انحصار بڑی حد تک مزدوروں کے ہی ووٹوں پر تھا۔

اسکائی لارکوں نے علی احمد اور ریاض کی گرفتاری کے بعد اپنے غم و غصے کو خان بہادر کے خلاف انتخابی مہم میں ڈھال دیا۔ وہ اب صفدر بشیر کی قیادت میں دیوانہ وار کام کر رہے تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے انتخابات کی فضا تیزی سے اسکائی لارکوں کے حق میں بدلنا شروع کر دی۔ اب ہر طرف اسکائی لارکوں کے امیدوار ڈاکٹر زیدی ہی کا چرچا تھا۔

خوش اسلوبی سے: اچھے طریقے سے۔ پانسا پلٹنا: رخ بدلنا، شکست ہوتے ہوتے فتح ہونا۔

اس صورت حال نے خان بہادر کو سخت پریشان کر دیا۔ اس نے گھبرا کر ووٹوں کی خریداری کا [illegible] بڑھا دیا۔ مگر یہ ہتھ کنڈہ بھی کامیاب ہوتا نظر نہ آرہا تھا۔ بات یہ تھی کہ اسکائی لارکوں نے اپنے زبردست انتخابی پروپیگنڈے سے انتخابات کو امیر اور غریب کی طبقاتی لڑائی میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے انقلابی نعروں نے حلقے کے عوام میں ہلچل مچادی تھی۔ ان کا سیاسی شعور بیدار کر دیا تھا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ووٹروں کی بھاری اکثریت غریب اور پس ماندہ تھی۔ خان بہادر سے ان کی نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اسکائی لارکوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگانے پر لوگوں نے غصے میں خان بہادر کے کارکنوں پر کئی بار ہلا بول دیا۔ کارکن اس قدر خوفزدہ ہوگئے کہ انہوں نے گلی کوچوں میں جانا چھوڑ دیا۔ وہ صرف بڑی بڑی سڑکوں پر منڈلاتے رہتے۔ ان کی انتخابی سرگرمیاں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

خان بہادر فرزند علی کو یہ اطلاعات برابر ملتی رہتیں۔ وہ چڑچڑا اور بدمزاج ہو گیا تھا۔ بات بات پر بھڑک اٹھتا، زور زور سے چیختا، کارکنوں پر برستا، مسلسل سگرٹ نوشی کرتا۔ چائے کی پیالیوں پر پیالیاں خالی کرتا۔ نیند بھی اسے کم آتی۔ چہرے پر ہر وقت پریشانی اور وحشت چھائی رہتی وہ آئے دن نت نئے منصوبے بناتا اور ان کے بارے میں اپنی انتخابی مہم چلانے والوں کے ساتھ گھنٹوں بات چیت کرتا۔

❁ ❁ ❁

رات کے دو یا ڈھائی بجے کا عمل ہوگا گمٹی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ دن بھر لو کے گرم جھکڑ چلتے رہے تھے مگر اب موسم کسی قدر خوشگوار تھا۔ شام کو ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی تھی اور اس وقت بھی آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہیڈ کوارٹر میں اسکائی لارک بے خبر سو رہے تھے۔ اچانک رات کے سناٹے میں شور بلند ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ اونچی آوازوں میں بول رہے ہیں۔

شور برابر بڑھتا گیا۔

صفدر بشیر کا کمرہ باہر کے رخ پر تھا۔ شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ذرا دیر تک وہ ان آوازوں

[illegible]: سیاسی سمجھ بوجھ۔ ہو کا عالم: ویرانی، مکمل خاموشی۔

کو چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

کمرے کے دوسرے سرے پر فہیم اللہ سو رہا تھا۔ صفدر بشیر نے اسے آواز دی۔ شور سے اس کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ دونوں نے کان لگا کر آواز کو سنا۔ مگر سوائے شور کے کچھ اور نہ سن سکے۔

شور اب بہت بڑھ گیا تھا۔ آوازیں عین ہیڈ کوارٹر کے سامنے بلند ہو رہی تھیں۔ اچانک سلمان دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ کئی اور اسکائی لارک بھی تھے۔ سلمان اس وقت سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہیڈ کوارٹر پر حملہ ہونے والا ہے۔"

حملے کی اطلاع سن کر سب گھبرا گئے۔ سلمان نے بتایا۔ "میں باہر احاطے میں سو رہا تھا۔ شور سن کر آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر دیکھا تو ہیڈ کوارٹر سے کچھ فاصلے پر بہت سے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ وہ اسکائی لارکوں کے خلاف اونچی آواز سے اشتعال انگیز باتیں کر رہے تھے میرا خیال ہے کہ ان کی تعداد پچاس سے اوپر ہی ہوگی۔"

اسی اثناء میں ڈاکٹر زیدی بھی کمرے میں آ گیا۔ اس نے بھی سلمان کی تائید کی۔ وہ بھی نیند سے اٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال خشک گھاس کی طرح کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ کمرہ اسکائی لارکوں سے بھر گیا۔ سب سہمے ہوئے تھے۔ ان کے بشرے سے پریشانی صاف عیاں تھی۔

ذرا ہی دیر بعد دروازہ توڑنے کی آواز سنائی دی۔ شور تیز ہو گیا۔ اب آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور چیخ چیخ کر اسکائی لارکوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ پھر اس شور و غل میں شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکاریں ابھرنے لگیں۔ ڈاکٹر زیدی نے بے قرار ہو کر کہا۔

"ڈسپنسری تباہ ہو گئی۔"

اسکائی لارک اور بھی زیادہ پریشان ہو گئے۔ شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں دھڑا دھڑ ابھرتی رہیں۔ شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پھر ہیڈ کوارٹر کا صدر دروازہ توڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس دفعہ بالکل سامنے سے حملہ ہوا تھا۔ اسکائی لارکوں کے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا پھر اندر رہ کر دروازے کی حفاظت کریں۔

نیند اچاٹ ہونا: نیند اڑ جانا۔ اشتعال انگیز: غصہ بڑھانے والی۔ بشرے: چہرے۔

وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ ان کے ذہن ماؤف ہو چکے تھے۔ وہ سخت پریشان تھے۔

اچانک صفدر بشیر سب کے بیچ سے گزر کر دروازے کی جانب لپکا۔ قبل اس کے کہ اسکائی لارک یہ غور کریں کہ وہ کیا کرنے والا ہے صفدر بشیر صدر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور دروازے کے بیچوں بیچ کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے حملہ آوروں کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

"بھائیو! پاگل مت بنو! اسکائی لارک تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ وہ تمہارے خادم ہیں۔ وہ تمہارے ہی لیے۔"

عین اس وقت اس کی کنپٹی پر ایک بڑا سا پتھر آ کر لگا۔ صفدر بشیر جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ خون کی ایک دھار کنپٹی سے نکل کر اس کے رخسار پر پھیل گئی۔ اس چوٹ پر توجہ دیئے بغیر اپنا ہاتھ بلند کیا۔

"بھائیو! اس دواخانے کو برباد نہ کرو۔ یہ ہزاروں نادار مریضوں کا سہارا ہے۔ تم۔۔۔۔" فوراً ایک لاٹھی اس کے سر پر پڑی۔ وہ شرابی کی طرح جھوم کر لڑکھڑا گیا۔ اس نے دروازے کا ایک پٹ پکڑ لیا اور اس کا سہارا لے کر ہانپنے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔

"لوگو! خدا کے لیے میری بات تو سنو۔ پاگل مت بنو۔"

مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ انہوں نے اس پر یلغار کی۔ چاروں طرف سے لاٹھیاں برسنے لگیں۔ صفدر بشیر نے گھبرا کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ دفعتاً کسی حملہ آور نے داہنی طرف سے جھپٹ کر بلّم سے حملہ کیا۔ بلّم کا تیز چمکتا ہوا پھل اس کے کپڑے چیرتا ہوا جسم کے اندر اترتا چلا گیا۔ صفدر بشیر بلبلا کر چیخا۔ "ہائے" اور لڑکھڑا کر گرنے لگا۔

سلمان اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور صفدر بشیر کو سنبھال لیا۔ وہ اس کے بازوؤں پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھولنے لگا۔ سلمان نے چاہا کہ وہ صفدر بشیر کو اٹھا کر اندر لے جائے مگر حملہ آوروں نے اتنا موقع نہ دیا انہوں نے اندھا دھند لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔

اب اسکائی لارکوں کے لیے ہیڈ کوارٹر کے اندر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ دونوں کو بچانے کے

ماؤف: کچھ سمجھ میں نہ آنا۔ نادار: غریب، محتاج۔ بلّم: بھالا، ایک ہتھیار کا نام۔

لیے وہ باہر نکل آئے۔

حملہ آوروں نے ان کو نرغے میں لے لیا اور ہر طرف سے بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔ وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے اور تکلیف سے بلبلا کر چیخ رہے تھے۔ ان کے جسموں سے خون پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے گہری دھند پھیلتی جا رہی تھی۔

حملہ آور وحشیوں کی طرح حملے کر رہے تھے۔ وہ بلّموں، نیزوں اور لاٹھیوں سے اسکائی لارکوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں شکاری چیتوں کی طرح چمک رہی تھیں اور چہرے بھوتوں کی طرح خوف ناک نظر آ رہے تھے۔

بستی بھر میں کھلبلی پڑ گئی تھی۔ ہر گھر میں جاگ ہو گئی۔

لوگ مکانوں کی چھتوں اور دروازوں پر سہمے ہوئے کھڑے تھے اور خوف زدہ نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں اسکائی لارکوں کے چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ مگر کوئی اس طرف نہ گیا۔

ہر شخص دم بخود تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ شور و غل سے دل دہلتا تھا۔

❁ ❁ ❁

اندھیری رات میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔

ہوا تیز تھی۔ دیکھتے دیکھتے شعلے بھڑک کر پھیلنے لگے۔ ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں آگ لگ گئی جس میں نادار مریضوں کا دواخانہ تھا۔ ضرورت مندوں کا امدادی بنک تھا۔ لائبریری تھی۔

یہ اسکائی لارکوں کا رین بسیرا بھی تھا۔ جو معاشرے سے غربت اور پس ماندگی مٹانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ جو خان بہادر فرزند علی کے زر خرید غنڈوں کے نرغے میں گھرے ہوئے نیزوں اور لاٹھیوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور زخموں سے نڈھال ہو کر گر رہے تھے۔

ہیڈ کوارٹر جل رہا تھا۔ الماریاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ شیشے، موم کی طرح پگھل رہے تھے۔ کتابیں چتا کی مانند بھڑک رہی تھیں۔ یہ امن کے پیامبر ٹالسٹائی کی لاش تھی۔ یہ شیکسپئر کا جنازہ تھا۔ یہ ارسطو کا فلسفہ تھا۔ غالب اور اقبال کی شاعری تھی۔ مارکس اور لینن کا انقلابی ذہن تھا۔ سب آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ عظیم مصنف، عظیم مفکر۔ انسانی ارتقاء کے علمبرداروں کے

نرغہ: گھیرا۔ دم بخود: حیران، پریشان۔ رین بسیرا: رات بسر کرنے کی جگہ۔ چتا: لکڑیوں کا وہ ڈھیر جس پر ہندو مردے کو جلاتے ہیں۔ مفکر:
ارتقاء: انسان کی بتدریج ترقی۔

فکر شعلہ بداماں تھے۔ کتابیں جل رہی تھیں۔ کتابیں تباہ ہو رہی تھیں۔ علم و فضل، دانش و
فن گریہ کناں تھے۔

ڈسپنری شیشوں کا انبار بن چکی تھی۔ بوتلیں ٹوٹ چکی تھیں۔ دوائیں بکھر کر سرخ و سیاہ دھبے بن گئی تھیں۔ ڈسپنری کے جلتے ہوئے در و دیوار چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"خان بہادر فرزند علی! تمہارا بول بالا ہو۔ تم امیر کبیر بنو۔ وزیر بنو۔ حاکم بنو۔ میونسپلٹی کے ممبر بنو۔ تم نے اپنے حریف کو روند ڈالا۔ وہ دیکھو ڈاکٹر زیدی زخموں سے نڈھال پڑا سسک رہا ہے۔"

ہیڈ کوارٹر کی عمارت جلتی رہی۔ شعلے اژدہوں کی طرح سرخ سرخ زبانیں نکال کر لپکتے رہے۔ بھڑکتے رہے۔ آسمان کی بلندی پر دور دور تک سرخ غبار پھیل گیا دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ ہر چیز جل رہی تھی۔ ہر چیز تباہ ہو رہی تھی اسکائی لارک زخموں سے بے حال تھے۔

حملہ آور کچھ دیر تک اسکائی لارکوں کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ پھر کسی جنگی مہم سے پلٹنے والے قدیم تاتاری حملہ آوروں کی طرح شور مچاتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ وہاں کئی ٹرک کھڑے تھے۔ سب ان پر سوار ہو گئے۔

انجن اسٹارٹ ہوئے اور ٹرک تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

ہیڈ کوارٹر کی جلتی ہوئی عمارت کے سامنے اسکائی لارک بے سدھ پڑے تھے۔

صفدر بشیر نہ جانے کب دم توڑ چکا تھا سلمان اکھڑی اکھڑی سانسیں بھر رہا تھا فہیم اللہ لاپتہ تھا۔

ڈاکٹر زیدی اور کئی دوسرے اسکائی لارک خون میں ڈوبے بے حال پڑے تھے۔

پولیس اس وقت پہنچی جب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر جل کر تباہ ہو چکا تھا۔

دہکتے ہوئے انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں خاک سے لتھڑی ہوئی صفدر بشیر کی لاش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ اپنے ہی خون میں ڈوب کر شفق رنگ ہو گیا تھا۔ نچلا ہونٹ لٹک رہا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بے نور نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جھلسی ہوئی دھواں دھواں عمارت کو تک رہا تھا۔

شعلہ بداماں تھے: مراد جل رہے تھے۔ گریہ کناں تھے: رو رہے تھے۔ بول بالا ہونا: ترقی ہونا۔ حریف: مخالف۔ شفق رنگ: سرخ۔

فصل نہم

(۱)

پہرے دار نے آہنی پھاٹک کھولا۔ دونوں بورسٹل جیل سے باہر آ گئے۔ یہ گرمیوں کی سہانی سلونی شام تھی۔ بحیرہ عرب سے آنے والی تیز سمندری ہوائیں سر سراتی ہوئی چل رہی تھیں آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے بوندا باندی ہو چکی تھی۔ بھیگے ہو۔ راستوں پر کہیں کہیں بارش اپنے نشان چھوڑ گئی تھی۔ دونوں جیل کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

نوشا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مگر آج اس کے ہمراہ راجہ نہیں پوکر تھا۔ گذشتہ سال کا ذکر ہے ایک ایسی ہی شام تھی۔ جیل کا بوڑھا ماسٹر پیٹھ موڑے تختہ سیاہ پر چاک سے پاکستان کا نقشہ بنا رہا تھا دفعتاً ایک طرف سے بکرے کی طرح زور زور سے ممیانے کی آواز ابھری۔ ماسٹر بدحواس ہو کر اس طرح اچھلا کہ اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ دھڑام سے کروٹ کے بل گرا۔ زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ماسٹر غضب ناک ہو کر اپنی انگلیاں مروڑ رہا تھا اس بات کی علامت تھی کہ کسی کی شامت آنے والی ہے۔ وہ جب مارنے پر آتا تو پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا تھا۔ اس نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے کلاس کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہ کچھ ایسا ہونق نظر آ رہا تھا کہ راجہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ ماسٹر نے اسے ہنستے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے بید اٹھایا اور چیل کی طرح جھپٹا۔ راجہ نے سراسیمہ ہو کر گردن جھکا لی۔ ماسٹر اندھا دھند بید مارنا شروع کر دئیے۔

"مردود، تجھے بکرا بننے کا بڑا شوق ہے۔ تجھے بکرا ہی بنا کے چھوڑوں گا۔" وہ سڑاک سڑاک بید مارتا اور ہر بار تال سر کے ساتھ کہتا۔ "بکرے کی بولی بول۔ بکرے کی بولی بول۔"

راجہ ذرا دیر تک تو مار کھاتا رہا، پھر تکلیف سے بلبلا کر چیخنے لگا۔ "میں نے بکرے کی آواز نہیں نکالی تھی۔"

ماسٹر نے پیترا بدل کے زناٹے کا ہاتھ گھمایا۔ "خبیث جھوٹ بولتا ہے۔"

راجہ نے صفائی پیش کی۔ "قسم اللہ کی ماسٹر صاحب میں نے بکرے کی آواز نہیں نکالی تھی۔"

"پھر کون تھا؟"

راجہ بات کہتے کہتے جھجک کر چپ ہو گیا۔ اسی وقت اس کے بازو پر سڑاک سے بید پڑا۔ وہ تلملا کر بولا۔ "ماسٹر صاحب پوکر تھا۔"

پوکر کا نام محمد علی تھا مگر سب اسے پوکر کہتے تھے۔ وہ ہمیشہ کلاس میں ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ حلق کے اندر سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ بغل میں ہاتھ رکھ کر زور زور سے بجاتا کتابیں غائب کر دیتا۔ چٹکیاں بھرتا۔ نہ خود پڑھتا تھا اور نہ کسی کو پڑھنے دیتا تھا۔ چنانچہ روزانہ پٹتا تھا۔ مگر سب اس سے ڈرتے بہت تھے۔ بڑا شورہ پشت تھا۔

بوڑھے ماسٹر نے راجہ کو چھوڑ دیا اور دانت کچکچاتا ہوا پوکر پر جھپٹا۔ پوکر مار کھانے کے معاملے میں تجربے کار تھا۔ اس نے ماسٹر کے پہنچنے سے پہلی ہی گھٹنوں کے اندر سر چھپا لیا اور جھک کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر نے قریب پہنچتے ہی بید لگانا شروع کر دئیے۔ پوکر چپ چاپ پٹتا رہا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔

جب کلاس ختم ہوئی اور ماسٹر باہر چلا گیا تو پوکر لپک کر راجہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ راجہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ پوکر نے گندی سی گالی دی اور آنکھیں نکال کر بولا۔

"اب بتاؤ سالے خاں کیا کہتے ہو؟"

راجہ نے خوف زدہ ہو کر گردن جھکا لی۔ پوکر نے ڈپٹ کر کہا۔ "سیدھا کھڑا ہو تیری تو۔"

گالی دے کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور حلق سے آواز نکالی۔ "ڈھیں۔" ساتھ ہی اچھل کر راجہ کے سر پر ٹکر ماری۔ دوسری، پھر تیسری۔ پوکر حلق سے آوازیں نکالتا رہا۔ "ڈھیں، ڈھیں،

شورا اور شورہ پشت: لڑاکا۔

ڈھیں۔" راجہ چکرا کر گر پڑا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

خون ٹپک کر ہاتھ پر گرا تو راجہ کو تاؤ آ گیا۔ وہ اٹھ کر اس پر کتے کی طرح جھپٹا۔ مگر پوکر نے ہاتھ گھما کر کنپٹی پر ایسا مکا مارا کہ وہ دور جا کر گرا۔ سنبھل کر اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ پوکر نے زور سے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر راجہ کے گھٹنے پر لگی۔ بہت زور کی چوٹ آئی۔ راجہ تکلیف سے بلبلا کر چیخ پڑا۔

جیلر کے روبرو پوکر کی پیشی ہوئی۔ سزا بھی ملی۔ مگر راجہ کے گھٹنے پر ایسا زخم آیا کہ اچھا نہ ہوا۔ کئی بار زخم دھو کر پٹی باندھی گئی۔ لیکن گھاؤ اچھا ہونے کے بجائے اور پھیلتا گیا۔ راجہ لنگڑا کر چلتا اور اکثر بیٹھا اپنا زخم کریدا کرتا۔ کچھ ہی عرصے بعد زخم سے ذرا نیچے پنڈلی پر بھی ایک زخم اور ہو گیا۔ یہ زخم کسی چوٹ سے نہیں آیا تھا۔ خود بخود پیدا ہوا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے راجہ کے جسم پر جگہ جگہ سرخ اور سفید داغ پڑ گئے۔

جیل کا ڈاکٹر معمول کے مطابق قیدیوں کا معائنہ کرنے کے لیے آیا۔ اس نے راجہ کے زخموں اور سرخ اور سفید داغوں کو دیکھا تو دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر علیحدہ کمرے میں لے جا کر بہت سے سوالات کیے۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک اس کا خوب معائنہ کیا۔

دوبارہ ڈاکٹر جیل میں آیا تو راجہ کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹنے لگی تھی۔ زخموں سے رطوبت بہا کرتی۔ راجہ کا چہرہ بھدا ہو گیا تھا۔ کان پھول گئے تھے۔ انگلیوں کے ناخن جھڑ گئے تھے۔ اسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اب اس نے چلنا پھرنا بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت نڈھال پڑا رہتا۔ زخموں کو کریدا کرتا۔

ڈاکٹر نے اس دفعہ دیکھا تو اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس روز اس نے راجہ سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے جیل کے پھاٹک پر ایک ایمبولنس آکر ٹھہری۔ راجہ کو اس میں بٹھا کر اسپتال بھیج دیا گیا۔

راجہ اسپتال سے واپس نہیں آیا۔

❁ ❁ ❁

نوشا کو اب یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ راجہ اسپتال میں ہے یا اسپتال سے کہیں اور چلا گیا۔ لیکن وہ برابر راجہ کو یاد کرتا رہا اور آج جب وہ رہا ہو کر جیل سے نکلا تو اسے بار بار راجہ یاد آ رہا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر

چلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ نہ معلوم اب راجہ کہاں ہوگا، کس طرح ہوگا؟ اسے کہاں تلاش کرے۔ کس طرح ملے؟

نوشا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے آگے پوکر چل رہا تھا۔ پوکر سے اس کی دوستی راجہ کے جیل سے جانے کے بعد ہوئی اور اس کی ابتدا بھی ایک حادثے سے ہوئی۔

پوکر گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا لڑکا تھا۔ اس کی عمر سولہ سال سے کچھ اوپر تھی مگر دیکھنے میں زیادہ کم سن لگتا تھا۔ اس کا قد ٹھنگنا اور رنگ سانولا تھا۔ اس نے ایک رکشا ڈرائیور کو چاقو مار کر زخمی کیا تھا۔ اسے اقدام قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی اور وہ بورسٹل جیل بھیج دیا گیا۔ وہ بڑے فخر سے اپنا یہ کارنامہ سنایا کرتا۔ "سالے کی ایک ہی ہاتھ میں انتڑیاں نکال دی تھیں۔ نہ جانے کیسے بچ گیا۔ ورنہ ہم نے تو کام ہی تمام کر دیا تھا۔"

قیدی لڑکوں پر اس کا بڑا رعب پڑا۔ چند ہی روز میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ بات بات پر گالی بکتا۔ ہر وقت لڑائی جھگڑا کرنے پر تلا رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بلاوجہ لڑکوں کو چھیڑ کر مار پیٹ کرتا۔ بیرک میں آکر آواز لگاتا۔ "ابے ہے کوئی ہے مائی کا لال۔ ذرا ہو جائیں دو دو ہاتھ۔" وہ بار بار انگڑائیاں لے کر ایک ایک کو دیکھتا۔ جب وہ نیا نیا جیل میں آیا تو بعض جرائم پیشہ لڑکوں نے اس کا چیلنج بھی قبول کیا۔ خوب دھینگا مشتی ہوتی۔ پینترے بدل بدل کے مکّے بازی کے ہاتھ دکھائے جاتے۔

پوکر غضب کا پھرتیلا تھا۔ لڑتے وقت اس کا جسم بجلی کی طرح تڑپتا معلوم ہوتا۔ کبھی داہنی طرف جھکائی دے کر نکلا تو گردن پر بھرپور ہاتھ دیا۔ بائیں طرف سے گھسا تو ایک ہی لات میں منہ کے بل گرا دیا۔ جب تک حریف کے سامنے رہتا اس کا جسم بید کی مانند لچکتا رہتا۔ ایک مقام پر نہ ٹکتا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بجّو کی طرح چمکتی تھیں۔ وہ ٹینی مرغ کی طرح اچھل اچھل کر حملہ کرتا۔ عام طور پر اس کی تیکنیک یہ ہوتی کہ پہلے اپنے مقابل کو تھکا دیتا اور جب وہ ہانپنے لگتا تو مینڈھے کی طرح ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ منہ سے "ڈھیں" کی آواز نکالتا اور زمین سے فٹ بھر اوپر اچھل کر زناٹے سے مکا مارتا۔ لڑنے والے کو للکارتا "ابے منہ کیا دیکھ رہا ہے، چل، چل۔" جب وہ حملہ کرتا تو پوکر اس کا ہاتھ صاف بچا جاتا۔ مسکرا کر بار بار اکساتا۔ "ایک اور۔ ابے ایک اور!" وہ بڑھ بڑھ کر حملہ کرتا اور اپنے حریف کا للکارتا بھی جاتا۔

گٹھے ہوئے: مضبوط، صحت مند۔ ٹھنگنا قد: چھوٹا قد۔ دھاک بیٹھنا: رعب قائم ہونا۔ دھینگا مشتی: لڑائی، جھگڑا۔ غضب کا: بہت زیادہ۔ بجو: بڑا گوشت خور جانور جس کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ ٹینی مرغ: چھوٹے قد کا مرغ۔

کوئی دن ایسا نہ جاتا جب اس کی پیشی نہ ہوتی۔ ہر روز اسے سزا ملتی۔ مگر جس طرح وہ مار کے معاملے میں نڈر تھا اسی طرح مار کھانے میں بھی ڈھیٹ تھا۔ سزا پا کر آتا تو بڑی بے حیائی سے ہنس کر کہتا۔ "خواہ مخواہ سالے اپنے ہاتھ تھکاتے ہیں۔" پھر کسی لڑکے کو اشارہ کرتا۔ "لے یار! ذرا کمر پر دو ایک مکیاں تو لگا دے۔ ادھر ایک آدھ ہاتھ گرم پڑ گیا تھا۔" وہ اسی طنطنے سے قیدی لڑکوں پر حکم چلاتا تھا۔ ذرا بھی کوئی حکم عدولی کرتا شامت آجاتی۔

اس کا حکم نہ ماننے پر ایک بار نوشا کی بھی درگت بن چکی تھی۔ اس روز کسی بات پر ناراض ہو کر پوکر نے ایک لڑکے کو مرغا بنا دیا۔ نوشا کو حکم دیا کہ وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ جائے۔ نوشا اس کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ پوکر نے اٹھ کر نوشا کے منہ پر ایک مکا جڑ دیا۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس وقت پوکر نے دوسرا وار کیا۔ سنبھلتے سنبھلتے تیسرا وار ہوا تو نوشا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔

پوکر کے پورے تین مکے جھیل جانا مذاق نہیں تھا۔ اچھے اچھے جی دار لڑکوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ نوشا ان دنوں نیا نیا جیل میں داخل ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ چکرا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ پوکر نے اس لڑکے کی خطا معاف کر دی اور نوشا کو مرغا بنا کر پیٹھ پر اس لڑکے کو بٹھا دیا۔

نوشا نے اسی دن توبہ کر لی تھی کہ اب وہ کبھی پوکر کے منہ نہیں لگے گا۔ وہ بلا چوں چرا اس کی ہر بات مان لیتا۔ البتہ راجہ نے اس کی لیڈری کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ کئی بار اس کا اور پوکر کا مچیٹا ہوا اور ہر بار راجہ کی درگت بنی۔

پہلی بار دونوں کا جھگڑا کسی خاص بات پر نہیں ہوا تھا۔ پوکر نے حسب معمول لڑکوں کو چیلنج کیا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اونچا کیے آواز لگا رہا تھا۔ "ابے ہے کوئی مائی کا لال۔ ہاتھوں میں چل ہو رہی ہے۔ ہو جائے کچھ رگڑم رگڑا۔" اس وقت سارے لڑکے بیرک کے سامنے والے میدان میں اکٹھا تھے۔ پودوں کو پانی دے رہے تھے۔

جب کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ گالیاں دینے لگا۔ "ابے تم سب سالے نامرد ہو۔ ایک بھی مرد کا بچہ نہیں۔" اس نے سب کو خاموش پا کر اور بھی گندی گالیاں دینا شروع کیں۔

پیشی: بڑے افسر کے سامنے حاضری۔ ڈھیٹ: ضدی۔ طنطنہ: شان، رعب۔ درگت بننا: مار پڑنا۔ جی دار: بہادر۔ چھکے چھوٹنا: گھبرانا۔ مچیٹا: مقابلہ، آمنا سامنا۔ چل: خارش۔

اسی طرح اکثر ان کو مشتعل کرتا تھا۔

راجہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوکر کو للکارا۔ "ابے ذرا منہ سنبھال کر بات کر۔ ساری ہیکڑی ابھی نکال کے رکھ دوں گا۔"

پوکر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "تو پھر آجا بے طرم خاں کے سالے۔" اور اس کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ راجہ نے چھوٹتے ہی زناٹے کا ہاتھ پوکر کے منہ پر رسید کیا۔ راجہ اس وقت تھا بھی تگڑا اور پہلا وار بھی اس نے جھنجلا کر کیا تھا۔

پوکر اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ مکا اس کے جبڑے پر بھرپور بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر ایک ہاتھ سے خون صاف کیا۔ ہنس کر بولا۔ "اچھا ہاتھ تھا۔ بڑا کس بل کا معلوم ہوتا ہے۔" پھر وہ دونوں ہاتھ تول کر راجہ کے سامنے لہرانے لگا۔ "کم آن، کم آن۔" وہ اسی طرح شروع میں اپنے حریف کو اکساتا تھا۔ راجہ نے دانت بھینچ کر ایک اور وار کیا۔ پوکر صاف بچا گیا۔ اس نے ایکٹروں کی طرح مصنوعی قہقہہ لگایا۔ "ہے" اور راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "ایک اور میری جان۔ کم آن، کم آن۔" وہ اپنے کندھے بار بار اچکا رہا تھا۔ ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔

"کم آن، کم آن۔"

راجہ نے پھر مکا مارا۔ وہ بھی خالی گیا۔ جھنجلا کر اس نے پے در پے وار کرنا شروع کر دیے۔ مگر اس کے سارے حملے خالی دیتا گیا۔ ذرا دیر میں راجہ ہانپنے لگا۔ اسی وقت پوکر نے اچھل کر وار کیا۔ مکا بھرپور پڑا۔ راجہ نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پوکر نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔

پانچویں مکے پر راجہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔

اس کے بعد بھی کئی بار پوکر سے راجہ کا جھگڑا ہوا۔ شروع شروع میں وہ اس سے ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کے لیے مقابلے پر آجاتا تھا۔ لیکن بعد میں پوکر سے ڈرنے لگا تھا۔ اس سے صرف اسی وقت لڑتا تھا جب بہت جھنجلا جاتا تھا۔

پوکر اب قیدی لڑکوں کا سرغنہ بن چکا تھا۔ سب پر اس کی حکومت چلتی تھی۔ کوئی بھی اس

ہیکڑی: زور آوری، خودسری۔ تگڑا: صحت مند، زور آور۔ کس بل: زور و طاقت۔ پے در پے: مسلسل۔ سرغنہ: سردار۔

کے حکم عدولی کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر مارتا بھی تو لڑکے چپ چاپ ما
کی مار سہ جاتے اور خوشامد الگ کرتے۔ اس لیے کہ اس کی ناراضگی بے حد خطرناک ہوتی تھی۔ غرض
لڑکوں پر پوکر کی حکومت اسی طرح چلتی رہی۔

❁ ❁ ❁

ایک تپتی ہوئی سہ پہر کو پولیس کی لاری جیل کے پھاٹک پر آکر رکی۔ پہرے دار نے تالا کھو
اور تین مسلح کانسٹیبلوں کی حراست میں گٹھے ہوئے بدن کا ایک لڑکا جیل کے اندر داخل ہوا۔ اس کے
ہاتھوں میں ہتکڑیاں پڑی تھیں وہ ٹخنوں سے اونچی نیلی پتلون پہنے تھا۔ جسم پر چھوٹی چھوٹی آستینوں
ریشمی قمیص تھی۔ جس پر اژدھوں اور چیتوں کے علاوہ عورتوں اور مردوں کی ایسی تصویریں چھ
تھیں جو ہیجان انگیز انداز میں بوس و کنار کرتے نظر آتے۔ اس کی کمر کے گرد پیتل کے گوکھرو
سے جڑی ہوئی چمڑے کی پیٹی تھی۔ آنکھوں پر چوڑے چوڑے حلقوں کا سبز چشمہ تھا۔ وہ ہالی ووڈ کی
دھاڑ سے بھرپور فلموں کا کردار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وضع قطع بالکل امریکی کاؤبوائز کی سی تھی۔

اس کا نام تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس نے اپنا تعارف ٹارزن کہہ کر کرایا اور وہ اسی نا
سے قیدیوں میں مشہور ہو گیا۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ نابالغ لگتا تھا مگر اس پر زنا بالجبر کا مقد
چل رہا تھا۔ عدالت سے ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ اور اس کی ضمانت بھی نہ ہو سکی تھی۔ اس
مشغلہ غنڈہ گردی اور سینما کے ٹکٹوں کی چور بازاری تھا۔ شہر میں اس کے ساتھیوں کا باقاعدہ گرو
جو اکثر جیل میں ملاقات کے دن اس سے ملنے آتے اور ہمیشہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے
آتے۔ اس کے علاوہ وہ پہرے داروں کے ذریعے چوری چھپے سگریٹیں منگواتا تھا۔ چھپ چھپ
خود بھی پیتا تھا دوسرے قیدیوں کو بھی پلاتا تھا۔

سگریٹوں کی بدولت ٹارزن جلد ہی جیل میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ اس نے اپنی پسند کے قید
لڑکوں کی ایک ٹولی بنالی تھی جو ہر وقت اس کے دائیں بائیں پھرتے۔ ہر بات میں اس کی ہاں میں ہا
ملاتے۔ اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ ہونٹوں سے سیٹی پر کوئی انگریزی دھن بجاتا ہوا وہ ٹھاٹھ
جیل میں گھومتا پھرتا۔ ہاتھ پیروں میں کس بل تھا اور جھگڑا فساد کرنے کی مشق رہ چکی تھی۔ لہٰذا
کی دھاک اور بھی زیادہ تھی۔

ہیجان انگیز: جذبات بھڑکانے والے۔ گوکھرو: لوہے کے بنے ہوئے کانٹے۔ سن و سال: مراد عمر۔ زنا بالجبر: زبردستی کسی عورت کی
لوٹنا۔ سوغات: تحفہ۔ ٹولی: گروہ۔ دھاک: رعب۔

پوکر کچھ دنوں تک خاموشی سے ٹارزن کی بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی دیکھتا رہا۔ پھر اس نے
ٹارزن سے مراسم بڑھانا چاہے۔ مگر وہ اپنی ہوا میں تھا۔ اس نے پوکر کو زیادہ لفٹ نہیں دی بلکہ ایک
سگریٹ مانگنے پر پوکر کو بری طرح جھڑک دیا۔ اسی بات پر دونوں میں ٹھن گئی۔ پوکر اس وقت تو
چپ ہو گیا۔ اس لیے کہ خطا اس کی تھی۔ مگر دو ایک دن کا غوطہ دے کر اس نے ٹارزن کو چھیڑا۔
کچھ بھی نہ تھی۔ ٹارزن کی عادت تھی کہ وہ بات بات پر انگریزی میں گالیاں بکتا تھا جو امریکی
فلموں میں دیکھ دیکھ کر اس نے ازبر کر لی تھیں۔

ٹارزن اس روز ترنگ میں تھا۔ اس نے ایک لڑکے کو یونہی تفریحاً "بلڈی باسٹرڈ" کہہ دیا۔ وہ
لڑکا کچھ نہیں بولا۔ البتہ پوکر اس کی حمایت میں آکر کھڑا ہو گیا۔ "دیکھو جی ٹارزن! تم اس طرح گالی
گلوج نہ کیا کرو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

ٹارزن نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہایت حقارت سے دھتکار دیا۔

"گٹ آؤٹ یو فکن"

پوکر نے تڑ سے اس کے جبڑے پر فوراً ایک مکا جڑ دیا۔ چیخ کر بولا۔ "سالے میں منع کر رہا ہوں
تو اپنا حرامی پن دکھا رہا ہے۔"

ٹارزن نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور دونوں ہاتھ تول کر فلمی مکے بازوں کی طرح
اس کے سامنے آکر جھومنے لگا۔ پھر اس نے دائیں طرف جھک کر پوکر کے منہ پر ایک مکا لگایا۔ ہاتھ
چھپلتا ہوا پڑا۔ کوئی اور ہوتا تو پوکر صاف جھکائی دے کر نکل جاتا۔ لیکن اس پہلے ہی وار سے پوکر کو
اندازہ ہو گیا کہ اس کا مدمقابل اناڑی نہیں ہے۔ اچھی خاصی مکے بازی جانتا ہے۔ لہٰذا وہ بچ بچ کر حملہ
کرنے لگا۔

دونوں مینڈھوں کی طرح جھوم جھوم کر لڑ رہے تھے۔ بڑے زوروں کا معرکہ پڑا۔ سارے
لڑکے دونوں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ برابر کی جوڑ تھی۔ دونوں پینترے بدل بدل کر ایک
دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ پوکر کمزور پڑ رہا تھا۔ کئی بھرپور ہاتھ اس کی کنپٹی اور رخساروں پر پڑ چکے
تھے اور ایک بار تو ٹارزن نے ایسا زناٹے کا مکا مارا کہ پوکر لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ لڑکوں نے زور
زور سے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ ان میں زیادہ تر ٹارزن کے حمایتی تھے۔

ٹھن جانا: ...ہونا۔ ازبر کرنا: زبانی یاد کرنا۔ خونخوار: غصے سے بھری ہوئی۔ چھپلتا ہوا: سرسری۔ زناٹے کا: زوردار۔

ٹارزن برابر دباتا جا رہا تھا۔ پوکر چوٹ پر چوٹ کھا رہا تھا۔ اب اس کے ہاتھ بھی الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ پوکر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ پیچھے، اور پیچھے وہ جیل کی چار دیواری کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی پشت بالکل دیوار سے لگ گئی۔ اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ راہِ فرار اختیار کرنے کا موقع تلاش کر رہا ہے۔ اس کے رخسار جگہ جگہ سے سوج کر نیلے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ خچر کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ ٹارزن اب اس پر پوری طرح حاوی ہو گیا تھا۔

پوکر نے ایک بار اپنی گردن جھکائی۔ حلق کے اندر سے "ڈھیں" کر کے بھیانک آواز نکالی اور مینڈھے کی طرح پنجوں کے بل اچھل کر ٹارزن کی ٹھوڑی پر زور کی ٹکر ماری۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ چندھیا کر رہ گیا۔ پوکر نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ دوسری ٹکر، پھر تیسری۔ اس نے تابڑ توڑ کئی ٹکریں ایسی ماریں کہ ٹارزن ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر جھومنے لگا۔

پوکر تیزی سے دائیں بغل سے نکلا اور گھوم کر ٹارزن کے رخسار کی پچھلی ہڈی پر زوردار [illegible] دیا۔ وہ چکر کھا کر رہ گیا۔ اب ٹارزن کی پشت پر دیوار تھی اور پوکر اس کے سامنے تھا۔ اس کے بعد پوکر نے اچھل اچھل کر دو تین بھرپور مکے مارے تو ٹارزن لڑکھڑا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں [illegible] پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پیٹھ دیوار سے ٹکی تھی۔ وہ منہ کھولے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

اس معرکے کے بعد ٹارزن کی ہوا بگڑ گئی۔ اسے اپنی بے عزتی کا شدید احساس تھا۔ وہ کئی روز تک اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ کس طرح پوکر کو نیچا دکھایا جائے تاکہ انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو۔

ایک روز موقع پا کر اس نے پوکر کو گھیر لیا۔ اس کے ہمراہ اس وقت کئی منتخب کیے ہوئے قیدی لڑکے تھے۔ پروگرام کے مطابق پہلے ایک لڑکے کو بھیجا گیا۔ وہ پوکر کے برابر سے بغلیں بجاتا ہوا گزرا۔ غنڈوں کی اصطلاح میں اس کا مقصد پوکر کی بے عزتی کرنا تھی۔

پوکر نے اس لڑکے کو غصے سے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "سالے چمگادڑ! تیری تو ایسی کی تیسی"
وہ گالیاں دیتا ہوا جھپٹا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ آناً فاناً ٹارزن اور اس کے ساتھی پوکر پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ سب نے مل کر اسے گرا دیا۔ ٹارزن سینے پر [illegible]

چندھیانا: آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانا۔ ہوا بگڑنا: حالات کا پہلے سے الٹ ہو جانا۔

[illegible] اس نے اوپر سے اندھا دھند پوکر کے منہ پر مکے مارنا شروع کر دیے۔ پوکر نیچے دبا ہوا بے بسی [illegible] گالیاں بکتا رہا۔

نوشا اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ لپک کر وہاں پہنچ گیا۔ ذرا دیر تک وہ پوکر کو پٹتے دیکھتا رہا۔ [illegible] نہ جانے اسے کیا سوجھی منہ بگاڑ کر تیکھے لہجے میں بولا۔

"اتنے بہت سے مل کر اکیلے کو مار رہے ہو۔ ابے یہ بھی کوئی مردانگی ہے۔"

ٹارزن نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ چیخ کر گالی دی۔ "شٹ آپ یو بلیڈی۔"

نوشا نے بے پروائی سے کہا۔۔۔ "اکیلے اکیلے لڑ لو۔"

اس کی مراد یہ تھی کہ ٹارزن اکیلا پوکر سے لڑے۔ مگر ٹارزن یہ سمجھا کہ وہ اس کو للکار رہا ہے۔ [illegible] نے پوکر کو چھوڑ دیا۔ جھپٹ کر نوشا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا، تو تم مجھے چیلنج دے رہے ہو۔ تو پھر آ جاؤ سامنے۔"

نوشا لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ گھبراتا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ "ابے میرے سر کیوں ہوئے جا رہا ہے؟"

ویسے نوشا ایسا کمزور بھی نہیں تھا۔ اب وہ خاصا لمبا چوڑا ہو گیا تھا۔ لمبے لمبے بے ڈول ہاتھ [illegible]، اونچا قد اور موٹا تگڑا جسم۔ دیکھنے میں وہ خاصا مسٹنڈا لگتا تھا۔ ٹارزن نے اس کی بات کا کوئی جواب [illegible] دیا۔ جھپٹ کر اس کے منہ پر ایک زوردار مکا جڑ دیا۔ نوشا بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ ٹارزن نے ایک اور [illegible] لے کا ہاتھ دیا۔ نوشا مکے بازی کا عادی نہیں تھا۔ جھنجلا کر ٹارزن پر جھپٹا۔ ایک مکا اس کی کنپٹی پر اور [illegible] مگر وہ اس سے لپٹ ہی گیا۔

دونوں گتھم گتھا ہو کر کچھ دیر تک زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر نوشا نے ٹنگوی لگا کر ٹارزن کو [illegible] ے مارا اور اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر دو تین کس کس کے رگڑے جو دیئے تو وہ لگا غیں غیں کرنے۔

پوکر ابھی تک ٹارزن کے ساتھیوں کے نرغے میں گھرا ہوا لڑ رہا تھا۔ اس پر چاروں طرف [illegible] ے حملے ہو رہے تھے۔ وہ اکیلا سب کے وار روک رہا تھا۔ ٹارزن کا نوشا نے حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اب وہ [illegible] نے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نوشا نے اس کو تو وہیں چھوڑا اور لپک کر پوکر کے قریب پہنچا۔ اس [illegible] ت وہ واقعی بڑے جوش میں تھا۔ اس نے سب کو للکارا۔

[illegible]: پہلوان ... ٹنگوی لگا کر: مراد ٹانگ مار کر، پہلوانوں کا ایک داؤ۔ غیں غیں کرنا: منت سماجت کرنا، عاجز ہونا۔

"آجاؤ سالو! ایک ایک کی ایسی کی تیسی کر دوں گا۔"

وہ ان پر جھپٹا۔ جس کے ہاتھ مارا اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ذرا ہی دیر میں سب بدحواس ہو کر بھاگے۔ پوکر نے بڑھ کر نوشا کو گلے لگا لیا۔ "ابے واہ میرے شیر کیا بات ہے تیری۔ یار تو تو چھپا رستم نکلا۔" وہ دیر تک اسے بڑھاوا چڑھاوا دیتا رہا۔

اسی وقت سے ان کی دوستی ہو گئی۔ پھر آپس میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ دونوں ہر وقت ایک ساتھ نظر آتے۔ جیل سے راجہ کے جانے کے بعد نوشا جو اکیلا پن محسوس کر رہا تھا، اس کی کمی پوکر نے پورا کر دیا۔ اس کے ساتھ رہنے میں ٹھاٹھ بھی بہت تھے۔ سب پر حکم چلتا تھا۔

ٹارزن زیادہ دنوں تک جیل میں نہیں رہا۔ ایک رات زبردست طوفان آیا۔ موسلا دھار بارش ہوئی۔ ہوا کے جھکڑ اس طرح شور کرتے ہوئے چلتے جیسے بہت سے آدمی ملی جلی آوازوں کے ساتھ سسکیاں بھر رہے ہوں۔ بجلی بار بار کڑکتی۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے بیرک کی چھت پر جلترنگ بجاتے۔ سویرے اٹھ کر سب نے دیکھا۔ ٹارزن غائب تھا۔ تلاش ہوئی تو میدان میں کچھ بڑے بڑے قدموں کے نشان نظر آئے جو احاطے کی دیوار تک گئے تھے۔ ٹارزن راتوں رات دیوار پھاند کر فرار ہو گیا تھا۔

اس کے بعد دو اور قیدی لڑکے جیل سے نکل بھاگے۔ ایک رات پوکر اور نوشا نے بھی فرار ہونے کی کوشش کی مگر پکڑے گئے۔ بڑی سخت سزا ملی۔ پیروں میں ڈنڈا بیڑیاں لگا کر قید تنہائی میں ڈال دیے گئے اور کڑی نگرانی کی جانے لگی۔

جیل میں نوشا نے اور تو کچھ نہیں سیکھا البتہ پوکر کی صحبت میں رہ کر اسے لڑنے بھڑنے اور چاقو چلانے کی تکنیک معلوم ہو گئی۔ اب وہ ایسے موقعوں کے تمام ہتھکنڈے جان گیا تھا اور آئے دن کسی نہ کسی بات پر لڑکوں سے جھگڑتا رہتا۔ اس میں پہلے جو جھجک اور خوف تھا، جاتا رہا۔

اب وہ بالکل نڈر ہو کر لڑتا تھا۔ اس کے علاوہ پوکر بڑا اچھا جیب کترا تھا۔ اس فن کے تمام گُر اس نے نوشا کو بتا دیے تھے۔

بورسٹل جیل میں بڑی تعداد ایسے لڑکوں کی تھی جو جرائم پیشہ تھے۔ ان میں افلاطون بھی تھا جو تالا توڑنے کا ماہر تھا اور اس فن کو بڑی فیاضی سے سکھاتا تھا۔ نوشا بھی کچھ عرصہ اس کا شاگرد رہا اور

سٹی گم ہونا: بوکھلانا۔ گاڑھی چھننا: آپس میں خوب میل جول ہونا۔ فیاضی: سخاوت، کھلے دل سے۔

...حد تک اس فن کو سیکھ بھی گیا۔ تجربہ کرنے کا موقع نہیں ملا ورنہ جس طرح پوکر جیب تراشی ...کئی بار اس کا امتحان لے چکا تھا، تالا توڑنے کے ہنر کا مظاہرہ بھی ہو جاتا۔

پہلے وہ جیل میں بے حد اداس رہتا تھا۔ اکثر راتوں کو اٹھ اٹھ کر رویا کرتا۔ گڑگڑا کر گھٹنوں ...دعائیں مانگا کرتا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا۔ جیل کا ماسٹر جو سبق دیتا اسے جی لگا کے ...پڑھتا۔ جب تک جیل میں راجہ رہا اس کا یہی رویہ رہا۔ مگر جب پوکر سے مراسم بڑھے تو وہ رفتہ رفتہ اس کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ جیل سے دونوں کی رہائی ایک ہی روز ہوئی۔

(۲)

نوشا اور پوکر فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے رہے۔

شام نکھرتی جا رہی تھی۔ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ شہر کی دیواروں پر سائے لہرا رہے تھے۔

...تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"ابے او پوکرا! کدھر منہ اٹھائے جا رہا ہے؟"

پوکر نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹین کی جھکی ہوئی چھت والے ایک چائے خانے کے سامنے استاد ...پیڈرو کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ باجوا بھی تھا۔ پوکر رک گیا۔

استاد پیڈرو اپنی اجلی شلوار کھڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ پیچھے پیچھے باجوا آ رہا تھا۔ استاد نے ...دور ہی سے اپنے بازو پھیلا دیے۔ پوکر کو بڑے جوش سے دونوں بازوؤں میں بھینچ کر اوپر اٹھا لیا۔ ہنستے ...ہوئے بولا۔

"سالوں نے اب چھوڑا ہے۔ میں تو چار بجے کا یاں آیا بیٹھا ہوں۔ حرام کے جنوں نے بیسیوں ...پکڑوا ڈالے۔ ابھی ابھی تو ہو کر آ رہا ہوں۔"

استاد دیر تک بازوؤں میں بھینچے ہوئے اس کی پیٹھ شفقت سے تھپکتا رہا۔ جب دونوں علیحدہ ...ہوئے تو باجوا نے رومال میں لپٹا ہوا پھولوں کا گجرا نکالا اور پوکر کے گلے میں ڈال دیا۔ گجرا پہننے کے بعد ...پوکر کو فوراً نوشا کا خیال آیا جو اس کے برابر خاموش کھڑا تھا۔ اس نے استاد سے نوشا کا تعارف کرایا۔

...زور دکر۔ مراسم: تعلقات۔ بھینچ کر: زور سے دبا کر۔

"استاد! یہ نوشا بھی اپنا یار ہے۔ میرے ساتھ ہی چھٹ کر آیا ہے۔"

نوشا نے گردن کو ذرا سا خم دے کر بڑی سعادت مندی سے استاد کو سلام کیا۔ اس کے ا
انداز پر استاد پیڈرو کا دل خوش ہو گیا۔ بزرگوں کی طرح سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "جیتے رہو!" وہ ب
کی جانب متوجہ ہوا۔

"کیوں بے باجوا، وہ ٹیکسی والا کہاں مر گیا؟ ٹیکسی میں پٹرول ڈلوانے گیا تھا۔ اب تک نہ
لوٹا۔ تو ٹیکسی لے کر آ۔ تب تک میں لمڈوں کو چائے پلا دوں۔"

باجوا ٹیکسی لینے چل دیا۔ استاد پیڈرو دونوں کے ہمراہ چائے خانے میں پہنچا۔ بنچ پر بیٹھتے ہو
چائے خانے کے مالک سے بولا۔

"سیٹھ! دو فشٹ کلاس ڈبل چائے تو مارو۔ ذرا بالائی اچھی ڈلوانا۔ لمڈا دبلا ہو کر آیا ہے۔" ا
نے محبت سے پوکر کے بازو کو دبایا۔ "اب کچھ کھانے کو بھی مل رہا تھا۔ تیری تو ہڈیاں نکل آئیں۔"

پوکر جیل کی تکلیفیں سنانے لگا۔ استاد کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھ رہا تھا۔

نوشا خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ دونوں نے چائے پی اور وہاں سے اٹھ کر سڑک پر آ گئے۔ با
ٹیکسی لے آیا تھا اور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ چاروں ٹیکسی کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی عثمان آباد
طرف چل دی جہاں استاد پیڈرو کا اڈا تھا۔

❀ ❀ ❀

بندر روڈ پر روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ رات ہولے ہولے کراچی کی فلک بوس عمارتوں
نیچے اتر رہی تھی۔ استاد بڑے ٹھاٹھ سے گردن اونچی کیے بیٹھا تھا۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ سر کے با
کھچڑی ہو گئے تھے۔ مونچھیں بہت گھنی تھیں۔ آنکھوں میں بڑی پراسرار چمک تھی۔ قد میانہ تھا۔ ا
جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔

جب وہ اڈے پر پہنچے تو پہر رات گزر چکی تھی۔

"اڈا ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر تھا۔ چاروں طرف کچی دیواروں والے چھوٹے چھو
مکانات تھے۔ البتہ اڈا جس مکان میں تھا اس کی دیواریں پختہ تھیں۔ اس میں کئی کمرے اور ایک طو

فلک بوس: اونچی، بلند۔ کھچڑی: سفید اور سیاہ۔ میانہ: مناسب۔

ان تھا۔ صحن بڑا کشادہ تھا مگر اس کا فرش کچا تھا۔ صحن کے ایک گوشے میں نیم کا گھنا درخت تھا جس
ے بسیرا کرتے تھے اور چاندنی راتوں میں اڑ اڑ کر شور مچاتے تھے۔
ٹیکسی گلی کے نکڑ پر رکی۔ استاد پیڈرو کرایہ ادا کر چکا تو اس نے مشکوک نظروں سے نوشا کو
یا اور پوکر کو علیحدہ لے جا کر پوچھا۔

"کیوں جی! یہ نوشے کا کیا معاملہ ہے؟"

پوکر نے فوراً جواب دیا۔ "استاد! وہ تو اب اپنے ہی ساتھ رہے گا۔"

"ساتھ تو رکھ لوں گا پر کچھ اپنے کینڈے کا بھی ہے؟"

"کیا پوچھتے ہو استاد! بڑا جی دار لونڈا ہے۔ ویسے میں نے اس کو کاریگری کے دو چار ہاتھ سمجھا
ہیں۔"

استاد پیڈرو نے اسے ڈانٹا۔ "ابے تو کیا سمجھائے گا۔ ابھی تو تیرا ہاتھ خود نہیں صاف ہوا۔
لے چلے ہیں استادی کرنے۔"

پوکر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

استاد نے باجوا اور نوشا کو اشارے سے قریب بلایا اور ان کے ہمراہ گلی میں داخل ہوا۔ اڈے
اندر جا کر اس نے دیکھا۔ بڑے کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ چکرم دیوار سے پیٹھ لگائے
ئی بیٹھا تھا۔ استاد پیڈرو کو دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ استاد نے پوچھا۔

"یہ لمڈے ابھی تک نہیں لوٹے؟"

"قادر اور پنچھی آئے تھے۔ چائے پینے گئے ہیں۔"

استاد نے ایک لمبی، ہوں کی اور کمرے میں بچھی ہوئی دری پر تھکا ہوا سا بیٹھ گیا۔ پوکر کو
ب کر کے بولا۔ "ابے تیرے چکر نے تو آج اپنا پلیتھن نکال دیا۔"

چکرم نے مسکرا کر پوکر کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ چکرم نے کہا۔ "یار
بغیر تاش کھیلنے کا لطف جاتا رہا۔ خدا قسم تجھے روز یاد کرتے تھے۔"

پوکر ہنس کر بولا۔ "تو پھر آج ہی جمے گی۔ یار بہت دن ہو گئے تاش کھیلے ہوئے۔ بڑی مشکل
اتوں کی ایک گڈی ہاتھ لگی تھی۔ ایک دن سالوں نے دیکھ لیا۔ اسی وقت چھین کر لے گئے۔"

الفاظ معانی: کھسیانی: شرمندگی والی۔ پلیتھن نکل گیا: مراد بہت تھک گیا۔

وہ چکرم کو بورسٹل جیل کی باتیں سنانے لگا۔ نوشا چپ بیٹھا رہا۔ پو کر نے اسے چکرم سے ملایا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا۔

استاد پیڈرو اب بازو پر سر ٹکا کر چت لیٹا تھا۔ باجوا پھرتی سے اس کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بڑے سدھے ہوئے تھے اور تیزی سے چل رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کے دروازے پر بیس، بائیس سال کے دو نوجوان لڑکے نمودار ہوئے ایک کا رنگ سیاہ تھا۔ بالوں میں خوب تیل چپڑا ہوا تھا۔ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے تھا۔ دوسرا اس سے مختلف تھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ گلے میں ریشمی رومال بندھا تھا۔ خوب گھیر دار لٹھے کی شلوار پہنے تھا۔ دونوں بے تکلفی سے قہقہے لگا رہے تھے۔

استاد نے دونوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ گرجدار آواز سے بولا۔ "ابے بڑی پینگیں ہو رہی ہیں۔ بہت دن سے تمہاری کندی نہیں ہوئی۔"

دونوں سہم کر رہ گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی استاد کو سلام کیا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ استاد نے پوچھا۔

"ابے ادھر منہ چھپا کر کیوں بیٹھ گئے۔ تم اب تک رہے کہاں؟"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔

اس دفعہ استاد نے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے منہ پھوٹ گئے تمہارے۔ بولتے کیوں نہیں؟" پھر اس نوجوان کو جس کا رنگ سیاہ تھا، مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو بتا بے کالٹین؟"

وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔ "استاد ذرا دیر ہو گئی۔"

استاد کو جلال آگیا۔ "ابے یہ ذرا دیر ہو گئی۔ دس بج رہا ہے اور تو ذرا ہی دیر کہہ ریا ہے۔ دونوں کی ڈیوٹی تو پاسپورٹ کے دفتر پر تھی۔ وہ تو چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ اب تو وہاں کتے لوٹ رہے ہوں گے۔"

"کلفٹن چلے گئے تھے۔" اس دفعہ دوسرے نے جواب دیا۔

"تو یوں کہو سیریں ہو رہی تھیں۔ ابے تم کو کیوں ہوا لگی ہے۔ سالو! کھال میں رہو کھال میں۔" وہ چکرم کی طرف پلٹا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "چل بے چکرم! بہت ہو چکی یاری۔ کام بھی کرے گا! باتیں ہی ہوتی رہیں گی۔"

چت لیٹنا: پشت کے بل بالکل سیدھا لیٹنا۔ کندی: پٹائی۔ جلال: غصہ۔

چکرم گھبرا کر اٹھا۔ اس نے کمرے کے کونے میں رکھا ہوا لکڑی کا صندوق کھولا۔ رجسٹر اور قلمدان نکالا اور لالٹین کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ استاد نے دونوں نوجوان لڑکوں سے کہا۔

"کلیلیں تو تم دونوں بہت بھر رہے تھے۔ اب دیکھوں تم کیا تیر مار کر آئے ہو؟"

کالٹین نے پتلون کی جیب سے کئی نوٹ اور کچھ ریزگاری نکال کر چکرم کے سامنے ڈال دی۔ استاد پیڈرو نے پوچھا۔ "کیوں بے چکرم۔ کتنی رقم ہے؟ یہ تو سالے اپنی زبان سے بتائیں گے نہیں۔"

چکرم نے پوری رقم گن کر کہا۔ "۵۵ روپے نو آنے ہیں۔" اور رجسٹر میں رقم درج کرنے لگا۔

استاد پیڈرو نے کہا۔ "بس! کل تو تم بڑے فروٹ گئے تھے۔ آج کیا ہوا؟"

"آج تو صرف ایک ہی موقع لگا۔ کل چار دفعہ کاریگری کی تھی۔"

"نہیں بے، اتنی تیزی ٹھیک نہیں۔ تم نے کل یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ بس ایک دفعہ کاریگری دکھایا کرو۔ ورنہ دھر لیے جاؤ گے۔ جتنا ملے گا نہیں اتنا رشوت میں الفتے کھا جائیں گے۔"

استاد پیڈرو کی ناراضگی رفع ہو چکی تھی۔ وہ انہیں بزرگوں کی طرح جیب تراشی کے فن پر نئے نئے نکتے سمجھانے لگا۔ دونوں سر جھکائے اس کی باتیں سنتے رہے۔ اسی اثنا میں تین نوعمر لڑکے کمرے میں داخل ہوئے۔

"استاد سلام!"

"استاد سلام!"

"استاد سلام!"

تینوں اسے سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ چند ہی منٹ بعد ایک لمبے قد کا نوجوان آیا۔ اس نے بھی سلام کیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ استاد فرش پر لیٹ گیا۔ باجوا اس کے پیر دباتا رہا۔ اب جیب کتروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ گیارہ بجے تک کمرے میں خاصی بھیڑ ہو گئی۔ وہ تعداد میں [illegible] تھے۔

ان میں کم سن لڑکے تھے۔ کڑیل نوجوان تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو سن و سال کے لحاظ سے ادھیڑ ہو گئے تھے۔ جو بھی جیب کترا آتا پو کر سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوتا اور جیل کا حال پوچھتا۔

کلیلیں بھرنا: اچھل کود کرنا، ہنسی مذاق کرنا۔ الفتے: لفنگے، مفت خورے۔ خرانٹ: تجربہ کار۔

کمرے میں ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہا تھا۔ استاد پیڈرو کروٹ کے بل خاموش لیٹا تھا۔ آخر وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔

سارے جیب کترے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چکرم نے لالٹین اور رجسٹر اٹھایا اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

استاد نے جیب کتروں سے کہا۔ "چلو بے حساب دو۔"

ایک ایک جیب کترا باری باری آتا اور جیب سے نوٹ اور ریز گاری نکال کر اس کے سامنے ڈالتا جاتا۔ استاد پیڈرو اونچی آواز سے جیب کترے کا نام لیتا اور خود رقم گنتا۔ چکرم فوراً رجسٹر میں اندراج کر لیتا۔

استاد پیڈرو کسی کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دیتا۔ کسی کو گالیاں دیتا۔ کسی کو جیب تراشنے کے فن پر لیکچر دیتا۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

جب سب جیب کترے اپنی اپنی آمدنی جمع کرا چکے تو استاد نے ساری رقم میں سے ایک تہائی حصہ نکال کر چکرم کو دے دیا۔ یہ اڈّے کا حصہ تھا۔ بقیہ رقم میں سے استاد نے ہر ایک کی دہاڑی بانٹ دی۔

جیب کتروں کے مختلف مدارج تھے۔ جو سینیئر تھے ان میں ۵۰ فی صدی حصہ تقسیم کر دیا گیا۔ جو ان سے کم درجے کے تھے ان کو روپے میں ۵ آنے کا حصہ ملا اور جو بالکل جونیئر تھے ان کے حصے میں ۳ آنے کا حصہ آیا۔

استاد پیڈرو جیب کتروں میں اس روز کی دہاڑی تقسیم کر چکا تو اس نے باجوا کی طرف اشارہ کر کے چکرم سے کہا۔ "اسے بیس روپے دے دیجیو۔" پھر باجوا کی طرف متوجہ ہوا۔ "جا بے نیاز کے لیے سامان لے آ۔ مٹھائی تازہ لائیو۔ اس سالے افضل کے ہاں نہ جائیو۔ پتہ نہیں سالا گھی میں کیا ملاوٹ کرتا ہے۔ اس دن جو امرتیاں تو لایا تھا ایسا گلا پکڑا کہ اب تک طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔"

باجوا نے چکرم سے بیس روپے لیے اور باہر چلا گیا۔

استاد بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جیب کتروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے دے کر باتیں کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ بے تکلفی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ سب کھسک کھسک کر پوکر کے گرد حلقہ بنا کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ الٹے سیدھے سوالات پوچھ رہے تھے۔

نوشا گم صم بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہر جیب کترا مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے اس انداز نے اسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔

❁ ❁ ❁

استاد پیڈرو کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت صرف سفید لنگی باندھے ہوئے تھا اور اپنے بھیگے ہوئے بدن کو تولیہ سے پونچھ رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غسل کر کے آیا ہے۔

جب بدن پونچھ چکا تو اس نے چکرم کے آگے کنجی پھینک کر کہا۔ "الماری سے ایک دھلا ہوا پاجامہ نکال کر لا۔" کنجی لے کر چکرم جانے لگا تو اس نے ٹوکا۔

"اور ہاں میری ٹوپی اور مصلا بھی لائیو۔"

چکرم باہر چلا گیا۔ استاد پیڈرو نے اشارے سے نوشا کو قریب بلایا۔ "میرے کنے آئیو۔" وہ سہما سہما اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ استاد نے کہا۔

"ذرا اپنا داہنا ہاتھ تو دکھائیو۔"

نوشا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ استاد اس کا ہاتھ تھام کر انگلیوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ نوشا کی انگلیاں نرم اور لانبی لانبی تھیں۔

استاد مسکرا کر بولا۔ "انگلیاں تو تیری ٹھیک دکھے ہیں۔ کچھ دن زور پنجہ کرانا پڑے گا۔ کھنچاؤ ہے۔"

وہ اس کی انگلیاں دیکھتا رہا اور اپنی مخصوص اصطلاحات میں ان پر تبصرہ بھی کرتا رہا۔ جب وہ انگلیاں دیکھ چکا تو نوشا اٹھ کر جانے لگا۔ استاد نے ڈپٹ کر کہا۔

"ابے ڈرا کیوں جا رہا ہے۔ یہ ڈھو کا ڈھو[1] بدن دیکھو اور ابھی سے اس کی سٹی گم ہے۔"

نوشا چپ چاپ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

استاد کچھ کہنے ہی جا رہا تھا اتنے میں پنچھی بول پڑا۔

"کل سولجر بازار والے استاد احمد جان ٹکر گئے تھے۔ آج کل ان کے بڑے نقشے ہیں۔ بڑے ڈول پر جا رہے ہیں۔"

۱۔ خاموش۔ ڈھو کا ڈھو: مراد موٹا تازہ۔

پیڈرو نے اس کی بات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کہ رہا تھا؟"

پنچھی نے بتایا۔ "بڑی ہوا باندھ رہے تھے۔ کہنے لگے کراچی میں تو سب اٹھائی گیرے ہیں کاریگر ایک بھی نہیں۔ جسے دیکھو وہی استاد بنا پھرتا ہے۔"

استاد پیڈرو کو تاؤ آگیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"استاد تو وہی سالا شہر بھر میں رہ گیا ہے۔ خواہ مخواہ فنٹی مارتا پھرتا ہے۔ بس کپڑا ماری دو چار الٹے سیدھے ہاتھ جانتا ہے۔ وہ تو ذرا ذرا سے لمڈے بھی جانتے ہیں۔ جسے گرہ کٹی کہتے ہیں فن تو اس کے استاد کو بھی نہ آتا ہوگا۔ سالا اب تک تیسری انگلی اناڑیوں کی طرح چلاتا ہے۔ انگو چلانا تو اسے آج تک نہیں آیا۔ وہ کیا بمبئی کے سیکھے ہوئے جتنے کاریگر ہیں سب سالے اناڑی ہیں۔"

استاد پیڈرو بڑے جوش کے ساتھ بول رہا تھا۔

سارے جیب کترے دم بخود بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ استاد گردن کو بار بار خم دے کہتا رہا۔

"کام کرنے والے تو کلکتے سے بڑھ کر روئے زمین پر نہ ہوں گے۔ یہاں کا سا حساب تھوڑ ہے کہ پھوکٹ میں ہنر سیکھ لو۔ اپنے استاد تھے شیخ نبی بخش۔ ستر سے اوپر سن تھا۔ دکھائی بھی کم تھا۔ ان کا باقاعدہ اسکول تھا۔ پورے سو روپے نذرانہ لیتے تھے۔ پھر کام سیکھنے میں ان کے نوسو نخ الگ جھیلنا پڑتے تھے۔ ذرا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی چھٹتے ہی منہ پر ہاتھ پڑتا تھا۔ کیا مجال کو چوں کر جائے۔ کھڑے کھڑے نکال باہر کرتے۔ مگر اپنے کام کے ماہر تھے۔ دھاک اتنی تھی پیشاب سے چراغ جلتا تھا۔ بڑے بڑے مانے ہوئے استاد آکر کان پکڑ گئے۔"

استاد پیڈرو کا غصہ ختم ہوگیا۔ اب وہ موج میں آکر بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اسی اثنا میں چکرم کپڑے لے کر آگیا۔

استاد پیڈرو نے اٹھ کر وہیں کھڑے کھڑے کپڑے تبدیل کیے۔ دری پر مصلا بچھایا اور اس کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد باجوا سامان سے لدا پھندا کمرے میں داخل ہوا اور سارا سامان استاد پیڈرو کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیا۔

اٹھائی گیرا: جیب کترا، اچکا۔ فنٹی: مراد شیخی، اکڑ۔ پھوکٹ میں: مفت میں۔ چھٹتے ہی: فوراً ہی۔

چکرم نے اگربتیاں سلگائیں۔ کمرے میں دھوئیں کے ہلکے ہلکے مرغولے لہرانے لگے۔ فضا میں خوشبو پھیل گئی۔

استاد نے اپنی ترکی ٹوپی پہنی۔ شیرینی کو مصلے پر رکھا۔ آنکھیں بند کیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

نیاز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نوشا کو قریب بلایا۔ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی۔

شاگردی کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ نوشا اب استاد پیڈرو کے حلقے میں باقاعدہ شامل ہو چکا تھا۔

استاد نے اپنے ہاتھ سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں رکھا اور مٹھائی تمام جیب کتروں میں تقسیم کر دی گئی۔

نوشا اٹھ کر ہر جیب کترے سے گلے مل رہا تھا۔

وہ اڈے کا سترہواں رکن تھا۔

پنچھی نے استاد پیڈرو کی فرمائش پر ایک فلمی گیت سنایا۔ اس کی آواز اچھی تھی۔ خوب لہک لہک کر گا رہا تھا۔ قادر گیت کے ساتھ منہ سے طبلہ بجاتا رہا۔ اچھا خاصا سماں بندھ گیا۔

آدھی رات تک یہ جشن جاری رہا۔

جیب کترے سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اڈے پر رہتے تھے۔ ایک کمرے میں کئی کئی کی رہائش تھی۔ پوکر اور نوشا نے اپنے ٹھہرنے کا بندوبست الگ کمرے میں کیا۔

لگ بھگ ہفتہ بھر تک استاد پیڈرو، نوشا کو جیب تراشی کی تکنیک سکھاتا رہا۔ زور پنجے کی مشق سے اس کی انگلیاں مضبوط اور پھرتیلی بنائی گئیں۔ آخر ایک روز چکرم کی نگرانی میں اس کی ڈیوٹی مقرر کر دی گئی۔

❁ ❁ ❁

چکرم چھریرے بدن کا طرح دار نوجوان تھا۔ وہ اپنے کام میں بڑا چوکس اور پھرتیلا تھا۔ استاد

لفظ معنا: محفل جمنا۔ چھریرا بدن: پتلا بدن۔ طرح دار: خوش انداز۔ چوکس: ہوشیار۔

خداکی!

پیڈرو اس پر اس قدر مہربان تھا کہ بہت سے سینئر جیب کتروں کی موجودگی میں چکرم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

استاد اس پر اعتماد بھی اتنا کرتا تھا کہ جیب کتروں کا سارا حساب کتاب وہی لیتا اور ساری بھی اس کی تحویل میں رہتی۔ چکرم دل کا بھی اچھا تھا۔ نوشا کی ہر طرح دلجوئی کرتا۔ خوب خا مدارات کرتا۔

دن میں کئی بار چائے اور لسی کا دور چلتا۔ ٹھاٹھ سے سگریٹیں پی جاتیں۔

نوشا چند ہی روز میں چکرم سے مانوس ہو گیا۔

دونوں کی آپس میں خوب پٹنے لگی۔ ان دنوں چکرم کی ڈیوٹی شہر کے گنجان علاقے، ایمپر مارکیٹ کے بس اسٹینڈ پر تھی۔

مہینے کی شروع تاریخیں تھیں۔

پہلے ہی دن چکرم نے ایک تگڑا مرغا ذبح کیا۔ (جیب کتروں کی اصطلاح میں اس سے م جیب کاٹنا ہے)۔ دو سو سے اوپر کی رقم ہاتھ لگی۔

جس وقت چکرم نے جیب کاٹی نوشا قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ آغا پلپلی بھی ان ساتھ تھا۔

چکرم نے جس دیدہ دلیری سے کاریگری کا ہاتھ دکھایا نوشا دنگ رہ گیا۔ پتہ بھی نہ چلا کہ اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔

نوشا کو تو اس وقت علم ہوا جب چکرم نے چمڑے کا بٹوہ اس کے ہاتھ میں دے کر نکل جا- اشارہ کیا۔ ایسی تمام ہدایتیں استاد پیڈرو اسے پہلے ہی دے چکا تھا اور باقاعدہ امتحان بھی لے چکا تھا۔

نوشا بٹوا سنبھال کر سیدھا اسی چائے خانے میں پہنچا جہاں چکرم روزانہ بیٹھتا تھا۔ کوئی پندرہ بعد چکرم اور آغا پلپلی بھی مسکراتے ہوئے چائے خانے میں پہنچ گئے۔ سب کچھ اتنی پھرتی اور آسانی ہوا کہ نوشا کے دل میں جیب تراشی کا جو خوف تھا، پہلے ہی تجربے میں بہت حد تک زائل ہو گیا۔

جانشین: قائم مقام۔ دل جوئی کرنا: تسلی دینا۔ دنگ: حیران۔ زائل ہونا: جاتے رہنا، ختم ہونا۔

فصل دہم

(۱)

نیاز کو بیوی کے انشورنس کا روپیہ ملا تو اس کے دن پھر گئے۔ پچاس ہزار وصول کرنے کے کچھ بعد اس نے مضافات میں ایک کوٹھی خرید لی اور پرانا مکان چھوڑ کر اس میں منتقل ہو گیا۔

یہ خاصا اجاڑ علاقہ تھا۔ مشرق میں اونچے نیچے بنجر ٹیلے تھے، قرب و جوار میں چند پرانی وضع کے جن میں کبھی فوجی افسروں کی رہائش تھی۔ مگر جب سے یہ بنگلے عام شہریوں کے تصرّف میں تھے اس وقت سے روز بروز نت نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن شام ہوتے ہی ہر طرف ہو کا تا۔ راستوں پر آمد و رفت کم ہو جاتی۔ پہر رات گزرنے کے بعد سارا علاقہ قبرستان کی طرح معلوم ہوتا۔ اندھیرا ہوتے ہی گیدڑ بولنا شروع کر دیتے۔ رات کے سناٹے میں ان کی آوازیں ائی لگتیں۔

ٹھی میں چار کمرے تھے۔ نیاز نے نیلام میں خریدے ہوئے فرنیچر سے تمام کمروں کو خاصا کر دیا تھا۔ کوٹھی میں بڑا سا احاطہ تھا جس میں گھنے درخت تھے۔ عرصے سے باغیچے کی دیکھ ئی تھی۔ لہٰذا ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ نظر آتے۔ رات کے وقت شاخوں سے خشک پتے ٹ کر گرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کوئی دبے قدموں درختوں تلے چل رہا ہے۔

ٹھی میں آکر نیاز کو ہر طرح کی آسائش مل گئی تھی۔ مگر آمد و رفت کی بڑی تکلیف تھی۔ کا شہر میں تھا۔ سویرے ہی سویرے وہ گھر سے نکل جاتا۔ مگر بس کے انتظار میں کبھی کبھی

دن پھرنا: اچھے دن آنا۔ مضافات: قرب و جوار۔ وضع: انداز۔ تصرف: استعمال۔ ہو کا عالم: خاموشی، ویرانی۔

تو گھنٹوں انتظار کرنا پڑا۔ صرف چند بسیں اس راستے پر چلتی تھیں۔ وہ بھی پرانی کھٹارا تھیں۔ آئے
دن کوئی نہ کوئی بس خراب ہو جاتی۔ اس پریشانی کا حل اس نے یہ نکالا کہ ساڑھے چھ ہزار میں ایک کار
خرید لی۔ یہ سرخ رنگ کی ٹوسیٹر سنگر تھی۔ پرانا ماڈل تھا مگر کنڈیشن اچھی تھی۔

کار خریدنے کے ساتھ ہی نیاز کے پر لگ گئے۔ اس نے شلوار اور قمیص چھوڑ کر پتلون اور بش
شرٹ پہننا شروع کر دی۔ مونچھیں صفاچٹ کرا دیں اور ٹوسیٹر میں ٹھاٹھ سے بیٹھ کر اڑا اڑا پھرتا۔
دکان بھی اس نے ختم کر دی اور ایک روز اس کی کوٹھی پر پلاسٹک کی بنی ہوئی تختی بھی لگ گئی جس پر
انگریزی حروف میں لکھا تھا:

شیخ محمد نیاز، گورنمنٹ کنٹریکٹر

ویسے وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ جانتا تھا۔ مگر گورنمنٹ کنٹریکٹر ضرور ہو گیا تھا۔ اس کو
ڈبلیوڈی کی نئی بیرکوں کی تعمیر کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ کام بڑا نہیں تھا لیکن بی کلاس گورنمنٹ کنٹریکٹر کی
حیثیت سے اس کا نام ٹھیکے داروں کی فہرست میں رجسٹرڈ ہو گیا۔ اسی ٹھیکے کے بل بوتے پر اسے
میونسپلٹی کے نئے مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ اس کا ٹینڈر سات لاکھ کا تھا۔ دوسرے
کنٹریکٹروں کے ٹینڈر کم تھے۔ مگر خان بہادر فرزند علی انہی دنوں نیا نیا میونسپلٹی کا چیئرمین بنا تھا۔
الیکشن پر اس کا بہت روپیہ صرف ہوا تھا لہٰذا وہ ان دنوں زیادہ سے زیادہ کمائی کی فکر میں تھا۔ نیاز
اس کے مراسم بھی تھے۔ اس نے ۳۳ فیصد حصہ رکھ کر نیاز کا ٹینڈر منظور کرا دیا۔

نیاز کو تعمیرات کے کام کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس اتنے بڑے کنٹریکٹ
کے لیے سرمایہ تھا۔ لہٰذا اس نے ساڑھے چار لاکھ روپے میں سارا کام چھوٹے ٹھیکیدار کو دے دیا۔
اب اس کام میں اس کی دلچسپی صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ ٹھیکے کے نام پر اس نے سیمنٹ اور لوہا
جو فاضل کوٹا منظور کرا لیا تھا اسے بلیک مارکیٹ میں کس طرح فروخت کیا جائے۔

خان بہادر فرزند علی سے اس کے تعلقات پہلے ہی اچھے تھے۔ اس ٹھیکے کی وجہ سے دونوں کے
تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ نیاز کا بیشتر وقت خان بہادر ہی کے ساتھ گزرتا۔ خان بہادر کے
توسط سے شہر کے اعلیٰ حکام تک اس کی رسائی ہو گئی۔ رفتہ رفتہ وہ ایک معزز شہری بنتا جا رہا تھا۔
تقریباً ہر شب خان بہادر کے یہاں اس کی نشست ہوتی۔ اس محفل میں شراب کا دور

پر لگنا: شیخی مارنا۔ صفاچٹ: بالکل صاف۔ بل بوتا: زور، طاقت۔ فاضل: فالتو۔ کوٹا: حصہ۔ رسائی ہونا: تعلق / پہنچ ہونا۔

اور رمی ہوتی۔ خان بہادر کو رمی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ میونسپلٹی کا چیئرمین منتخب ہونے
اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ مگر رمی کے پروگرام میں فرق نہ آیا۔
رات ہوتے ہی کچھ سرکاری افسر اور شہر کے بعض بڑے تاجر اس کی کوٹھی پر اکٹھا ہوتے اور
مشغلہ شروع ہو جاتا۔ اس طرح خان بہادر کی کوٹھی پرائیویٹ قسم کا کلب بن گئی تھی جس
کن نیاز بھی تھا۔ شروع شروع میں وہ پینے پلانے کے شغل سے کتراتا رہا۔ مگر کب تک بچتا۔
بہادر نے اصرار کر کے زبردستی تھوڑی سی اسکاچ وہسکی پلا دی۔ یہ گویا ابتدا تھی۔
اس کے بعد تو وہ لہک لہک کر پینے لگا۔

نیاز کی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے بسر ہو رہی تھی۔ سلطانہ اور انو اس کے ساتھ ہی کوٹھی میں
دونوں جاتے بھی کہاں۔ ان کا بیٹا ہی کون تھا جو سرپرستی کرتا۔ مگر نیاز کا رویہ سلطانہ کے
بالکل نارمل تھا۔ سلطانہ کی ماں کو مرے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مگر اس تمام عرصے میں نہ
نے اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ کسی ایسی بات کا موقع دیا، جس سے اس کی دل
آزاری ہوتی۔

عام طور پر سویرے ہی سویرے کار لے کر کوٹھی سے نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ ایسا
ہوا کہ رات کو واپسی کے بعد اس نے سلطانہ سے کوئی بات چیت کی ہو۔ وہ چپ چاپ جا کر
ے میں سو جاتا۔ رات کا کھانا وہ خان بہادر ہی کے ساتھ کھاتا تھا۔ شروع شروع میں نیاز کا کھانا
کے کمرے میں رکھوا دیتی۔ مگر جب نیاز نے خود ہی منع کر دیا تو اس نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔
نیاز کی صحت بھی اب اچھی ہو گئی تھی۔ دکان پر دن بھر بیٹھے رہنے سے اس کے جسم میں جو
آ گیا تھا، دوڑ بھاگ سے کم ہو گیا۔ اس کی رنگت نکھر گئی تھی۔ شراب پینے سے رخساروں پر
رخی جھلکتی رہتی۔ وہ جب نائیلون کی بش شرٹ اور پتلون پہن کر گھر سے بن سنور کر نکلتا
مارٹ لگتا۔
ایک بار تو سلطانہ نے بھی اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ نیاز روز بروز خوش شکل اور وجیہہ ہوتا

❁ ❁ ❁

کھیل۔ دل آزاری: دل دکھنا، تکلیف۔ خوش شکل، وجیہہ: خوبصورت۔

گرمیوں کی خوشگوار شام تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں گہری نارنجی روشنی پھیلی تھی۔ درختوں کے طویل سائے خوابوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سڑک پر اونٹوں کا ایک کارواں گزر رہا تھا۔ ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں شام کے سناٹے میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔ سلطانہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر کھڑی تھی۔ یہ کھڑکی باہر باغیچے میں کھلتی تھی۔ گھنٹیوں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ آفتاب کی نارنجی شعاعیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

سامنے ایک درخت کے پاس نیاز کھڑا تھا۔ اس وقت وہ کہیں جانے کی غرض سے نکلا تھا۔ ڈرائیور اسٹپنی کا پنکچر جڑوانے کے لیے کار لے گیا تھا۔ وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی لالہ گوں روشنی میں وہ خاصا دیدہ زیب نظر آ رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ عین اسی وقت نیاز نے اس کی جانب نظریں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔

سلطانہ فوراً ہٹ گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن اس واقعے کے بعد بھی نیاز کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اتوار کو نیاز عموماً گھر پر رہتا۔ مگر اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزرتا یا پھر ملنے جلنے والے آ جاتے۔ وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ سلطانہ سے اس کی بات چیت بہت سرسری ہوتی۔ کئی بار وہ اسے اور انو کو کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لیے شہر بھی لے گیا اور ہمیشہ سامان سے لدا پھندا لوٹا۔ اس کے سامان میں زیادہ تر سلطانہ کے بنڈل ہوتے۔

وہ اس کے ساتھ بڑی نرمی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا۔ بات کرتا تو عام طور پر نظریں جھکی ہوتیں۔ یہ گفتگو عام طور پر رسمی سی ہوتی تھی۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا جب وہ اس سے کوئی ذاتی سوال کرتا تو وہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا۔

"تمہارا دل تو یہاں نہیں گھبراتا؟"

"رات تمہاری کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ جا کر ڈاکٹر کو دکھا دو!"

"کسی بات کی تکلیف تو نہیں؟"

گھریلو اخراجات کے لیے وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو سویرے ہی سویرے انو کو بلاتا اور اس کے ذریعے سلطانہ کو تین سو روپے بھجوا دیتا۔ بجلی کا بل، نوکروں کی تنخواہ اور کپڑوں کی دھلائی وہ خود ادا

...تھا۔ بڑے مزے میں گزر بسر ہو رہی تھی۔ اس آسائش نے ماں کا غم دھندلا کر دیا تھا۔ سلطانہ کا ...تابناک ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں برسات کی شاموں کا حسن ہوتا اور جسم پھولوں سے لدی ...ی طرح لچکتا۔ اس کے حسن میں نرالی سج دھج آ گئی تھی۔

❀ ❀ ❀

سلطانہ کے ساتھ نیاز کا رویہ جتنا نرم اور معقول تھا اسی قدر وہ انو کے ساتھ بے رخی سے پیش ...بات بات پر اسے ڈانٹتا ڈپٹتا۔ زیادہ ناراض ہوتا تو گالیاں دینے سے بھی نہ چوکتا۔ دو بار انو کے منہ ...نے تھپڑ بھی مارے تھے اور ایک دفعہ تو ایسا غضب ناک ہو گیا کہ پانی کا گلاس کھینچ مارا۔ مگر انو ...بال بچ گیا۔ شیشے کا گلاس دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

انو ڈرا سہا رہتا تھا۔ نیاز کے جارحانہ رویے نے اسے اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت چپ ...رہتا اور اس کمسنی میں بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ نظر آتا۔ نیاز گھر میں آتا تو انو کی یہی ...ش ہوتی کہ اس کے سامنے نہ جائے۔ اگر نیاز کسی کام سے بلاتا تو اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ وہ سہا ہوا ...کھڑایا اس کے پاس جا کر خاموش کھڑا ہو جاتا۔ وہ کسی کام کو کہتا تو بدحواسی میں کوئی نہ کوئی الٹی ...ی حرکت سرزد ہو جاتی۔ نیاز پاگل کتے کی طرح دانت کچکچا کے اس کی جانب لپکتا اور گالیوں کی ...اڑ کر دیتا۔

انو کے ساتھ نیاز کے اس ناروا رویے کو سلطانہ نہ بارہا شدت سے محسوس کر چکی تھی۔ مگر کبھی ...اج کرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ ایک بار جب نیاز نے انو کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ روتا ہوا اس ...پاس آیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ انو کے رخسار پر انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ سسکیاں ...لے بے چارگی سے رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو اپنی بے کسی پر خود اس کی ...چھلک پڑیں۔ وہ انو کو سینے سے لگا کر بے اختیار رونے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے بھائی صبر کر۔ اللہ کے لیے اس طرح بلک بلک کر نہ رو۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

اسے سینے سے لگائے وہ دیر تک ہچکیاں لے کر روتی رہی۔

انو سے اسے بچپن ہی سے بڑی محبت تھی۔ اور اب تو بھری دنیا میں وہ اس کا واحد سہارا رہ گیا ...ں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک بھائی ایسا گیا کہ یہ بھی خبر نہ ملی کہ زندہ ہے یا مر گیا۔

انو کے ساتھ نیاز کا رویہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسے خواہ مخواہ ایذا پہنچانے کی

کوشش کرتا۔

اس کا کام کاج کرنے کے لیے گھر میں ملازم موجود تھا۔ مگر وہ اپنا سارا کام ادبدا کر انّو ہی سے کراتا۔ ذرا سی غلطی پر گندی گندی گالیاں دیتا۔ اس کے چہرے پر تھوک دیتا۔ بازو پکڑ کر پن چبھو... تکلیف سے بلبلا کر چیختا تو بے رحمی سے مارتا۔

انّو نے بارہا سلطانہ سے فریاد کی۔ وہ اسے دلاسا دے کر رہ جاتی۔ نیاز سے کچھ کہنے کی کبھی ہمت ہوئی پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انّو نے نیاز کے خلاف کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ چپ چاپ اس کی مار س... اور گھر کے کسی گوشے میں جا کر چپکے چپکے روتا۔ نیاز سے تو اسے چڑ تھی ہی اب وہ سلطانہ سے بھی بیزار رہنے لگا۔ اسے تنہائی سے رغبت ہوتی جا رہی تھی۔ جب دیکھو اکیلا بیٹھا ہے۔ اس وقت وہ بڑی... پٹانگ باتیں سوچا کرتا۔ اس کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ جسم کے ہر ہر جوڑ کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔

اس مریل سے لڑکے سے نیاز کو نہ معلوم کیوں اس قدر بیر تھا کہ دیکھتے ہی جھنجلا جا... آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ ہونٹ کانپنے لگتے۔ اسے اذیت پہنچا کر اسے عجیب سی تسکین ملتی۔

انّو اس کے سامنے جاتا تو اس طرح گھگیا کر بولتا کہ خارش زدہ کتے کی طرح حقیر نظر آتا۔

نفرت کی بنیادی وجہ کسی حد تک خود سلطانہ تھی۔ اسے انّو سے بے تحاشا پیار تھا۔ ان کا زیادہ تر... اس کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ وہ اسے اپنے سامنے بٹھا کر ناشتا کراتی۔ اصرار کر کے کھانا کھلاتی۔ اپنے کمرے ہی میں اسے سلاتی تھی۔ کبھی بیٹھی اس کے کپڑوں میں بٹن ٹانک رہی ہے۔ اس کی کتا... قرینے سے لگا رہی ہے۔ اس کے جوتوں پر پالش کر رہی ہے۔ اس کا بستر درست کر رہی ہے۔

وہ سویرے بہت تڑکے اٹھ جاتی اور دیر تک انّو کو بیدار کرتی رہتی۔ وہ اس وقت گہری نیند... ہوتا۔ بار بار کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر ناراض ہونے کے بجائے وہ اسے چمکارتی ر... آخر جب اٹھ کر بیٹھ جاتا تو اسے غسل خانے میں لے جاتی۔ جب تک وہ نہاتا رہتا عام طور پر دروازے پر کھڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہتی۔ کنگھا لے کر اس کے بال بناتی۔ ذرا دیر... اس کے لیے گرم گرم دودھ کا گلاس لے کر آتی اور زبردستی پورا گلاس پلاتی۔ اسکول جاتا تو کوٹھی... دروازے پر کھڑی دور تک اسے دیکھتی رہتی۔

سلطانہ نے اپنی ساری توجہ کا مرکز انّو کو بنا لیا تھا۔ نیاز کبھی کبھار اس کے کمرے کے سا...

ادبدا کر: جان بوجھ کر۔ بیر: دشمنی۔ تسکین: راحت، تسلی۔ چمکارتی: پیار کرتی۔

گزرتا تو یہی دیکھتا کہ وہ انّو کا کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہے۔ وہ اس قدر منہمک ہوتی کہ نیاز کی جانب اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔

انّو کی عزلت پسندی نے سلطانہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اسے کبھی باغیچے کے گھنے ...وں کے نیچے سے کبھی باورچی خانے کی کوٹھری سے، کبھی چھت پر جانے والے زینے سے ...ڈھونڈھ کر لاتی۔ مگر انّو اس کی نظر بچتے ہی کہیں نہ کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ وہ گھبرائی ...ئی اسے تلاش کرتی پھرتی۔ اس کے پیار میں ماں کی ممتا کا جذبہ تھا۔ اس کی دیکھ بھال میں سلطانہ ...ب طرح کا سکون ملتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ سلطانہ کی طبیعت خراب تھی۔ معمولی موسمی بخار تھا۔ نیاز نے اصرار کر ...اسے بوڑھی خادمہ کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس بھیجا اور خود کار کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

⊛ ⊛ ⊛

شام کا وقت تھا۔

انّو باہر باغیچے میں درختوں تلے حسب عادت تنہا بیٹھا تھا۔ جب اندھیرا خوب پھیل گیا تو وہ اٹھ کر ...کے اندر گیا۔ اسی وقت نیاز نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ انّو کا خون خشک ہو گیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔

وہ سہما ہوا اس کے پاس پہنچا۔ نیاز اسے دیکھتے ہی غرایا۔

"ابے کہاں مر گیا تھا۔ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔"

انّو نے حسب معمول اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ نیاز نے جل کر کہا۔ "سور کے بچے! منہ ...کیوں نہیں بولتا۔ اب تک کہاں آوارہ گردی کر رہا تھا؟"

انّو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "باہر درختوں کے نیچے بیٹھا تھا۔"

نیاز نے ایک سڑی ہوئی گالی دے کر کہا۔ "اب تو جھوٹ بولنا بھی سیکھ گیا ہے۔ سمجھ لینا کھال ...کے رکھ دوں گا۔ اس گھر میں رہنا ہے تو ٹھیک سے رہو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں نے کوئی ...انہ نہیں کھول رکھا۔"

...دیر تک اس پر برستا رہا۔ پھر ڈپٹ کر بولا۔ "ذرا الماری سے گلاس تو نکال اور وہ جو کونے میں ...تل رکھی ہے وہ بھی لیتا آ۔ میری طبیعت خراب ہے۔ ذرا سی دوا پیوں گا۔"

منہمک: مصروف۔ عزلت پسندی: تنہا رہنے کی عادت۔

انّو چپ چاپ الماری کی طرف چلا گیا۔

جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہوا سنکی ہوئی تھی۔ موسم سہانا تھا۔ نیاز کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ طبیعت کچھ بھاری بھاری تھی۔ اس نے سوچا اس وقت ایک آدھ پیگ وہسکی کا لگا لیا جائے تو طبیعت بشاش ہو جائے گی۔ اب وہ کبھی کبھار گھر پر بھی پی لیتا تھا۔ وہ شراب پینے کا موڈ بنا کر کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

انّو نے الماری سے گلاس نکالا۔ بوتل اٹھائی۔ اسی وقت نیاز نے چیخ کر کہا۔

"ابے کہاں مر گیا؟"

انّو گھبرا گیا۔ بدحواسی میں بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ فرش پر گرتے ہی اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ وہسکی برسات کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ کمرے میں اس کی تیز بو پھیل گئی۔ نیاز لمحہ بھر تک تو خوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اُس نے وحشیوں کی طرح جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے انّو کے بال پکڑ لیے۔ کئی بار زور زور سے اسے جھنجوڑا اور بھرپوری طاقت سے دھکا دیا۔ وہ گیند کی طرح دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ نیاز نے قریب پہنچ کر اندھا دھند اس کی کمر پر، پیٹ پر، سینے پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔

انّو کے سینے پر ایک بھرپور لات پڑی تو وہ درد سے بلبلا کر فرش پر دہرا ہو گیا۔ نیاز نے ایک اور کس کے لات ماری۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ نیاز بھینسے کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ انّو ذرا دیر تک تو لاش کی مانند بے سدھ پڑا رہا پھر اس نے اٹھ کر کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نیاز نے جانے نہ دیا۔ لپک کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا دیا۔ انّو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور گریبان پکڑ کر ایک بار پھر اسے زور زور سے جھنجوڑنے لگا۔ پہلی بار انّو نے جرأت پیدا کی اور جل کر اپنا پورا منہ نیاز کی کلائی پر رکھ کر گوشت چبا ڈالا۔ نیاز نے تکلیف سے گھبرا کر بڑا گھناؤنا سا منہ بنایا۔ زور سے چلایا۔ "مار دیا سالے نے۔" اور پھر انّو کو فرش پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے مچھلی کی طرح تڑپا۔ نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ کر زور لگایا۔ انّو کے حلق سے بلیوں کے غرانے کی سی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔

جھٹ پٹا: سورج غروب ہونے کا وقت۔ بشاش: تروتازہ۔ خوں خوار: نہایت غصے سے بھری ہوئی۔ گھناؤنا: خوفناک۔

نیاز نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ انّو آنکھیں پھاڑے دیر تک نیاز کو تکتا رہا۔ اس کے منہ سے بہہ رہی تھی۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ اسی طرح سکتے کے عالم پڑا رہا۔ پھر وہ درد سے کراہنے لگا۔ نیاز نے چیخ کر کہا۔

"تو ابھی میرے گھر سے نکل جا۔ ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔"

انّو نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ڈگمگا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے تربتر تھا۔ سانس ہوئی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

نیاز نے گالی دے کر کہا۔ "ابے اب جاتا ہے کہ سالے کچھ اور لے گا۔" وہ اس کی جانب ار نظروں سے گھورتا ہوا لپکا۔ انّو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی بے بسی سے ہاتھ جوڑ گھگیا کر فریاد کرنے لگا۔

"اب نہیں، اب نہیں۔"

نیاز بولا۔ "تو پھر نکل جا یہاں سے۔"

اس نے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ زور سے دہاڑا۔ "دیکھ اب لوٹ کے نہیں آنا۔ ورنہ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

انّو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے کے باہر چلا گیا۔ لیکن وہ کوٹھی میں ٹھہرا۔ لان عبور کر کے پھاٹک سے نکلا اور سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

(۲)

رات نے اپنے پر پھیلا دیے تھے۔

کوچہ و بازار پر تاریکی پھیل گئی۔ انّو سنسان سڑک پر کئی گھنٹے تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ مسلسل رہا کہ اسے کہاں جانا چاہیے۔

مگر وہ کہیں نہیں گیا اور ایک ویران فٹ پاتھ پر تھک کر سو گیا۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے انّو کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ مینہ برس

عالم: بے حس و حرکت۔ تربتر: گیلا۔

رہا ہے۔ اسے اپنا بدن بھیگتا ہوا معلوم ہوا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اسی وقت اندھیرے میں کسی کی گھبرا
ہوئی آواز ابھری۔

''اوئے تیرا خانہ خراب۔ ابے تجھے یہیں مرنے کو جگہ رہ گئی تھی۔''

انّو نے دیکھا۔ ایک شخص اس کے سر پر کھڑا پیشاب کر رہا ہے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا
سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ شخص اسی طرح اطمینان سے کھڑا پیشاب کرتا رہا۔ ذرا
بعد وہ فارغ ہوا تو ازار بند باندھتا ہوا قریب آکر بولا۔

''ابے یہاں کیوں سو رہا ہے۔ گھر میں جگہ نہیں؟''

انّو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھا ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔

اس نے دوبارہ پوچھا۔ ''یہیں رہتا ہے؟''

اس دفعہ انّو نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

ذرا دیر تک وہ شخص خاموش کھڑا رہا۔ اندھیرے میں وہ سائے کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا
انّو اس کے حلئے کا اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کی آواز بھاری تھی۔ لب و لہجے سے گھٹیا قسم کا آدمی لگتا تھا۔ چ
لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔

''ابے تو یہاں کیوں پڑا ہے؟''

انّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ نہ کوئی آہ
تھی نہ آواز۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اچانک رات کی خاموشی میں گھوڑے کی ہنہناہٹ ابھری۔ انّو
دیکھا، چند قدم کے فاصلے پر ایک تانگا کھڑا ہے۔ گھوڑا ہنہنا ہنہنا کر سڑک پر ٹاپیں مار رہا تھا۔ وہ آد
گھوڑے کو چمکارنے لگا۔ ''اوذرا دم لے بادشاہ! میں ابھی آیا۔'' پھر اس نے پلٹ کر انّو سے کہا۔

''ابے یہاں کوڑے کے ڈھیر پر کیوں پڑا ہے؟ چل میرے ساتھ۔''

انّو خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس دفعہ وہ آدمی جو تا
والا تھا، بے تکلفی سے بولا۔ ''ابے اب کھڑا بھی ہو۔'' اس نے انّو کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

انّو اس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ اس نے چابک ہوا میں لہرائی۔ باگیں کھینچیں۔ گھو
آگے بڑھ گیا۔ دور تک سرمئی سڑک پھیلی تھی جس پر گھوڑے کے پیروں میں لگے ہوئے نعل
ٹپاٹپ بج رہے تھے۔ انّو کچھ دیر بیٹھا ہچکولے کھاتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں وہ کتنی د

...جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا۔ تانگا ایک تنگ بازار سے آہستہ آہستہ گزر رہا ہے۔ بازار
...تھا۔ پنواڑیوں اور دودھ والوں کی اکا دکا دکانیں ابھی تک کھلی تھیں جن پر تیز روشنی ہو رہی
...تانگے والے نے ایک دودھ والے کی دکان کے سامنے تانگا ٹھہرایا۔ اتر کر دکان پر گیا۔ دودھ
...بھاری بھر کم جسم کا آدمی تھا بڑی بے تکلفی سے بولا۔

''کہاں نوروز خان کہاں سے آ رہے ہو؟ آج تو تم نے بڑی دیر لگا دی۔''

نوروز بولا۔ ''یار چھاؤنی کی ایک سواری لے کر گیا تھا، پلیتھین نکل گیا اپنا۔'' اس نے لمبے بھر
...ن کر کے کہا۔ ''لا یار سیر بھر دودھ تو دے۔ بڑے آب خورے میں دینا۔''

''یہاں نہیں پیو گے؟''

''نہیں یار ساتھ لے جاؤں گا۔''

نوروز کا جواب سن کر دودھ والا چونکا۔ اس نے جھک کر تانگے کی جانب دیکھا جس میں انّو
...وش بیٹھا تھا۔ اس نے آنکھ مار کر پوچھا۔ ''تو یوں کہو نا! ابے کہاں سے پٹا لایا۔''

نوروز مسکرایا۔ ''بس پوچھ نہ، چڑھ گیا ہتے۔ اللہ سب کو رزق دیتا ہے پہلوان۔''

دودھ والے نے ایک بار پھر انّو کو دیکھا۔ ران کھجاتے ہوئے بولا۔ ''لونڈا تو صورت شکل کا
...رکھے ہے۔ پر یار یہ تو بہت چھوٹا ہے۔ ابے یہ مر جائے گا۔ سالے کھنچے کھنچے پھرو گے۔ میرا کہنا
...یہ چکر اب چھوڑ دے۔ گھر ور بسا لے۔''

نوروز بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ''ابے کیا رکھا ہے گھر بسانے میں۔ خواہ مخواہ کا ٹنٹا ہے۔''

''تم کو تو سالے چاٹ ہی اور لگ گئی ہے۔''

''یار پہلوان! تو زیادہ باتیں نہ بنایا کر۔ لا دودھ دے۔'' یہ کہہ کر نوروز نے پانچ روپے کا نوٹ نکال
...دودھ والے کو دیا۔ ''ربڑی ہو تو پاؤ بھر وہ بھی دے دے۔ ربڑی نہ ہو تو کچھ اور میٹھا دے دے۔''

دودھ والا بولا۔ ''آج تو بڑے زوروں پر جا رہا ہے۔''

نوروز صرف مسکرا کر رہ گیا۔ پہلوان نے دودھ سے بھرا ہوا آب خورہ اسے دیا۔ کہنے لگا۔
...تو ہے نہیں۔ جلیبیاں دے دوں؟''

...کھلیان بیچنے والا۔ آب خورہ: مٹی کا پیالہ جس میں پانی وغیرہ پیتے ہیں۔ پٹانا: پھانسنا۔ گھر بسانا: شادی کرنا۔ ٹنٹا: ذمہ داری، بوجھ۔ چاٹ:

"لایار وہی دے۔ دیر نہ کر۔"

پہلوان نے جلیبیاں اور پانچ روپے کے نوٹ سے بچی ہوئی رقم اس کے حوالے کر دی۔ نو نے تانگے کے قریب آکر دودھ کا آب خورہ اور جلیبیوں کا پُڑا انّو کو تھما دیا۔ خود اچک کر تانگے پر ہو گیا۔ گھوڑے نے حرکت کی اور تانگا بازار سے گزرنے لگا۔

مختلف راستوں کے چکر کاٹنے کے بعد تانگا ایک احاطے کے اندر داخل ہوا۔ احاطے کی دیواری بوسیدہ تھی۔ اندر کھپریل کی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ ان ہی میں نورو کوٹھری بھی تھی۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ نوروز نے تالا کھولا۔ ماچس جلا کر چندھی سی لالٹین رو کی جس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کوٹھری میں ایک طرف پلنگ پڑا تھا جس پر میلے کچیلے بستر کے نوروز کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک ٹرنک تھا جس پر کنگھا، تیل کی شیشی اور ایک چھوٹی موٹی چیزیں رکھی تھیں۔

نوروز نے لالٹین روشن کی۔ بستر پر سے کپڑے ہٹائے۔ انو سے بولا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ گھوڑا کھول کر تھان پر باندھ دوں۔ بس ابھی آیا۔ گھبرانا نہیں۔"

وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔ کوٹھری کی فضا مرطوب تھی اور عجیب سی بساند پھیلی ہوئی تھ انّو خاموشی سے پلنگ پر دونوں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور کوٹھری کی ایک ایک چیز کھوئی کھوئی نظروں دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک گم صم تھا۔ ہر چیز اس کے لیے اجنبی تھی۔ ہر بات انوکھی تھی۔ گذشتہ ساتھ گھنٹوں میں اس کی زندگی میں کچھ اس طرح پے بہ پے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں کہ سو سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف خوابوں کا دھندلکا چھایا تھا جس میں کی اپنی ذات گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر احساس دم بخود تھا۔

نوروز واپس آیا۔ اس نے کوٹھری کے دروازے کی کنڈی لگائی۔ المونیم کے بڑے کٹورے میں دودھ اور جلیبیاں لے کر انّو کے پاس گیا۔ انّو نے صرف سہ پہر کی چائے پی تھی۔ ا سخت بھوک لگ رہی تھی۔ نوروز نے اصرار کیا تو اس نے دودھ میں بھیگی ہوئی جلیبیاں کھالیں نوروز نے ہاتھ بڑھا کر طاق سے لالٹین اٹھائی اور پھونک مار کر بجھا دی۔

❁ ❁ ❁

اچک کر: چھلانگ لگا کر۔ کھپریل: گھاس پھونس۔ تھان: گھوڑا کھڑا کرنے کی جگہ۔ مرطوب: گیلی۔ بساند: بدبو۔

نوروز سویرے بہت تڑکے اٹھ کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

انّو کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے جاگ رہا تھا اور بستر پر لاش کی بے سدھ پڑا تھا۔ اس نے نوروز کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ روشن دان سے ابھرتی ہوئی ہلکی کافوری روشنی بھی دیکھی۔ سویرا ہو رہا تھا۔ کہیں قریب ہی مسجد سے اذان بلند ہو رہی تھی۔

احاطے میں ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں، بوڑھوں کی کھانسی، ں کی چیخ پکار۔ یہ سب آوازیں گھل مل کر ہلکے ہلکے شور میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ انّو چپ شور کو سنتا رہا۔ روشن دان سے ابھرنے والی روشنی کو دیکھتا رہا۔

نوروز جب واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں گرم گرم پوریوں کا پڑا دبا ہوا تھا۔ اس نے انّو پر ایک ی۔ مسکرا کر بولا۔

"ابے تو ابھی تک لیٹا ہے؟ منہ ہاتھ تو دھو لیا ہوتا۔"

انّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پلنگ سے نیچے اترا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس نے کونے کے ہوئے لوٹے میں گھڑے سے پانی بھرا اور کوٹھری کے دروازے پر جا کر منہ دھونے لگا۔

اس کا جی متلا رہا تھا۔ مگر نوروز نے اصرار کر کے اسے دو پوریاں زبردستی کھلا ہی دیں۔ چار اس نے انّو کے دوپہر کے کھانے کے لیے رکھ دیں۔ نرم لہجے میں بولا۔

"موقع لگا تو میں دوپہر کو آجاؤں گا۔ نہیں تو رات کو واپسی ہوگی۔ گھبرانا نہیں۔ کسی چیز کی ت ہو تو بتا دے۔"

انّو نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ نوروز نے اس کی پیٹھ تھپتھپا "اب تو اطمینان سے پڑ کر سو۔ طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بھوک لگے تو پوریاں کھا لینا۔ کھانا میں لے کر آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

اس نے انّو کے رخسار میں ہولے سے چٹکی بھری۔ مسکرا کر بولا۔ "وکیل صاحب کو دیر ہو گی۔ مجھے ان کے لیے تانگا لے کر جانا ہے۔ گھبرانا مت۔" وہ کوٹھری سے باہر نکلا۔ دروازہ ور اس میں تالا لگا دیا۔

انّو دن بھر کوٹھری میں نڈھال پڑا رہا۔ سہ پہر کو ذرا بھوک لگی مگر ایک پوری بھی نہیں کھائی جانے کیسی طبیعت ہو رہی تھی۔ اس نے گلاس بھر کر پانی پیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

رات کو دس بجے کے قریب نوروز آیا۔ وہ اپنے ساتھ روٹیاں اور سالن لایا تھا۔ اس کے علاوہ انو کے لیے ایک پھولدار ریشمی بش شرٹ بھی لایا تھا۔ اس نے بڑے شوق سے بش شرٹ اسی وقت انو کو پہنائی اور ہنس کر بولا۔

"بچ گئے استاد۔ ابے میرے ساتھ رہا تو عیش کرادوں گا۔"

انو کو بش شرٹ پہن کر کوئی خاص مسرت نہ ہوئی۔ مگر نوروز بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ بار بار بش شرٹ کی تعریف کرتا۔ اس کی اپنی قمیص خاصی میلی تھی۔ شلوار اس سے بھی زیادہ میلی تھی۔ وہ دہرے بدن کا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ تیس بتیس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ رنگ سانولا تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ہنستا تو آنکھیں بند ہو جاتیں۔ چہرہ کچھ ایسا بے ڈھنگا ہو جاتا کہ اچھا خاصا الو کا پٹھا معلوم ہوتا۔

لیکن وہ الو کا پٹھا ہرگز نہ تھا۔ روزانہ دس بارہ روپے اور کبھی کبھی تو اٹھارہ بیس روپے کما لاتا۔ طبیعت میں چٹورپن تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا تھا۔ شہر کے تانگے والوں میں وہ بڑا سرکش مشہور تھا۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں اچھے تھے اس لیے لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب اڈے پر کسی تانگے والے سے اس کی تو تکار نہ ہوتی۔ اکثر اس گالی گلوچ میں ہاتھاپائی کی نوبت آجاتی۔

لیکن انو کے ساتھ نوروز کا رویہ بڑا اچھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتا۔ انو نے بھی کبھی اسے ناراض ہونے کا موقع نہ دیا۔ وہ فطرتاً کم گو تھا۔ اب اس نے بولنا اور بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت چپ چپ رہتا۔

نوروز روزانہ صبح کوٹھری میں تالا لگا کر چلا جاتا اور رات گئے آکر کھولتا۔ واپسی پر انو کے لیے کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ اکثر اور بھی کچھ نہ کچھ لے آتا۔ کھانا کھانے کے بعد نوروز زور زور سے ڈکاریں لیتا اور دھم سے بستر پر گر جاتا۔ انو کو آواز دے کر قریب بلاتا۔

"لے بے ذرا ٹانگیں تو دبادے۔"

انو پائنتی بیٹھ کر چپ چاپ اس کی موٹی موٹی پنڈلیاں دبانے لگتا۔ نوروز اس وقت باتیں کرنے کے موڈ میں ہوتا۔ وہ انو سے پوچھتا۔ "کیوں بے کوئی تکلیف تو نہیں؟"

الو کا پٹھا: سر و بد شکل، ڈرلونا۔ چٹورپن: کھانے کا شوق۔ سرکش: لڑاکا۔ پائنتی: چارپائی کا پاؤں کی طرف کا حصہ۔

انو اپنا سر انکار میں ہلا دیتا۔

وہ اصرار کرکے پوچھتا۔ "دیکھ بے کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً کہہ دیا کر۔"

"اچھا۔" انو کا جواب بہت مختصر ہوتا۔

نوروز کو اس کی یہ خاموشی کبھی کبھی بڑی گراں گزرتی۔ وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہتا۔ "ابے تو نے کوئی چپ کا روزہ رکھا ہے۔ ذرا بات چیت کیا کر۔ یہ کیا ہونٹ سیئے بیٹھا ہے۔ اور دیکھ جو تیرا جی چاہے بے خوف مجھ سے کہہ دیا کر۔ دیکھ تو میں تیری بات پوری کرتا ہوں کہ نہیں۔"

اس کے اسی اصرار پر آخر ایک روز انو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے اسکول میں داخل کرادو۔"

نوروز حیرت سے چونک پڑا۔ "اسکول میں داخل کرادوں؟" وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ "ابے کیا کرے گا اسکول جاکر۔ وہاں تو لڑکے جاکر ایک نمبر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ جا بے تو بھی یوں ہی رہا۔"

اس کے اس جواب سے انو کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ سوچا کرتا کہ اسکول میں داخل ہو جائے گا، خوب پڑھے گا۔ پھر اچھی سی کوئی نوکری کرلے گا اور سلطانہ کو اپنے پاس بلا لائے گا۔ اسے سلطانہ بہت یاد آتی تھی۔ اسے یاد کرکے وہ اکثر رو پڑتا۔ اب وہ اس کے پاس جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ نیاز دیکھ لیتا تو اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔

نوروز کے پاس رہتے ہوئے انو کو دو ہفتے سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ نوروز اسے روزانہ کوٹھری میں بند کرکے چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ انو دن بھر کوٹھری میں قید رہتا۔ کبھی کبھی دل گھبراتا تو وہ بے چینی سے چکر کاٹنے لگتا۔ پھر اپنی بے کسی پر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ وہ سسکیاں بھر کر دیر تک روتا رہتا۔ نوروز سے اس کو کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے ہونٹ غلیظ تھے۔ منہ سے بڑی خراب بو آتی تھی۔ ابابیل کے پروں کی طرح گھنی مونچھیں تھیں۔ وہ پیار کرتا تو انو کا جی متلانے لگتا۔ بس چلتا تو وہ نوروز کے منہ پر تھوک دیتا۔

ایک رات نوروز واپس آیا تو نشے میں دھت تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ قدم بہکے بہکے پڑ رہے تھے۔ اس نے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی انو کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ جھوم کر بولا۔

"کنڈی لگادے۔"

بے کسی: مجبوری۔ کراہیت: نفرت۔ غلیظ: گندے۔ خمار آلود: نشیلی۔

اس کی آواز اس وقت پھٹے بانس کی طرح بے ڈھنگی تھی۔ انو نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ نوروز کوٹھری کے بیچوں بیچ کھڑا جھومتا رہا۔ اس نے گہری نظروں سے انو کو دیکھا۔ "ادھر آبے۔" انو چپ چاپ اس کے پاس چلا گیا۔

نوروز نے لالٹین پر ایک لات ماری جو دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ لالٹین کی لو چند بار بھڑکی اور بجھ گئی۔ کوٹھری میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔

صبح اٹھ کر نوروز نے دیکھا انو غائب تھا۔ اس کی نظر فوراً دروازے پر گئی۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر جا کر دیکھا۔ انو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ رات کو نہ جانے کب اٹھ کر فرار ہو گیا۔

نوروز دن بھر پاگلوں کی طرح تانگے پر بیٹھا انو کو تلاش کرتا رہا مگر کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ کئی روز تک وہ جگہ جگہ اسے ڈھونڈتا رہا لیکن انو ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہ آیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔

❀ ❀ ❀

نوروز قریب قریب انو کو بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ اچانک نظر آ گیا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ بازاروں کی رونق اجڑ چکی تھی۔ نوروز تھکا ہارا لوٹ رہا تھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر اس نے دیکھا۔ بجلی کے کھمبے کے پاس انو کھڑا ہے۔ وہ اس وقت بوسکی کی قمیص اور شلوار پہنے تھا۔ گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ کلّے میں پان تھا۔ آڑی مانگ نکلی تھی۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کے ہمراہ تین آدمی تھے۔ وہ اجلے لباس پہنے ہوئے تھے اور وضع قطع سے اوباش نظر آتے تھے۔ انو مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کر رہا تھا۔

نوروز نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے تانگا آگے بڑھایا اور عین ان لوگوں کے سامنے جا کر روک لیا۔ نیچے اترا۔ انو نے دیکھا تو چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ نوروز نے نتھنے پھلا کر خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"کیوں بے حرام کے تخم۔" نوروز کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا۔ اس کی مونچھیں خطرناک طریقے پر پھڑپھڑانے لگیں۔ اس نے لپک کر انو کا بازو دبوچ لیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ سیدھی طرح چلتا ہے کہ دوں ایک ہاتھ۔"

وضع قطع: ظاہری حالت۔ اوباش: بدمعاش۔ نتھنے پھلا کر: غصے سے۔

تینوں شخص لمحہ بھر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے نوروز کو تکتے رہے۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ "بات کیا ہے جی؟"

نوروز بولا۔ "اسی سے پوچھ لو۔"

"اس سے تو بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے تم بتاؤ۔"

نوروز بگڑ کر بولا۔ "دیکھو جی بہت دن تم نے میرا لونڈا رکھ لیا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ الگ کھڑے رہو۔ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

وہ شخص طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اچھا" اور اپنے ساتھ والے سے مخاطب ہوا۔ "لو جی یہ لونڈا ان کا ہو گیا۔"

نوروز نے کہا۔ "اس سے پوچھ کر تو دیکھو۔"

وہ شخص بولا۔ "اس سے کیا پوچھنا ہے۔ آٹھ سو روپیہ نقد خرچ کیا ہے۔ تانگا گھوڑا بک جائے ... ہیجڑے سے پوچھ لو کیا رقم دی ہے اس لونڈے کی۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ انو نوروز کی کوٹھری سے نکل کر بھاگا تو راستے میں ننو ہیجڑے سے ملاقات ہو گئی۔ ننو اب سن سے اتر چکا تھا۔ اس نے نائکہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ گھیر گھار کر نوخیز لڑکوں کو لاتا۔ کچھ دن ان کی کمائی کھاتا اور جب کوئی مالدار اسامی مل جاتی تو اس کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ انو کی خوف زدہ نگاہیں دیکھ کر ننو کی تجربہ کار نظریں تاڑ گئیں کہ گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ اس نے دلاسا دیا اور بہلا پھسلا کر اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ کچھ عرصہ اپنے پاس رکھا۔ پھر علی جان کے ہاتھ بیچ دیا۔

اس وقت نوروز سے علی جان ہی بات کر رہا تھا۔ وہ چمڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ آمدنی اچھی تھی۔ خوب عیاشی کرتا تھا۔ خود بھی مزاج میں غنڈا پن تھا اور دو چار بدمعاشوں کو بھی ساتھ رکھتا تھا۔

نوروز نے گالی دے کر کہا۔ "میں کسی سالے ننو وتو کو نہیں جانتا۔ میں تو ابھی اسے لے کر جاؤں گا۔"

علی جان نے کہا۔ "لے جایا جائے تو لے جاؤ۔"

نوروز نے گردن اونچی کر کے کہا۔ "دیکھوں تو کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔" اس نے انو کا

مڈبھیڑ: ملاقات۔ سن سے اتر چکا تھا: مراد نوجوان نہ رہا تھا۔ نائکہ: جس کے ماتحت کئی طوائفیں ہوں۔ مائی کا لال: بہادر، دلیر۔

ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "چل بے۔"

اسی وقت علی جان کا ایک ساتھی بڑھ کر آگے آیا۔ نوروز کو آہستہ سے دھکا دے کر بولا
"الگ ہٹ کر بات کر۔"

نوروز نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "یہ مت سمجھنا کہ اکیلا ہوں۔ تینوں پر بھاری ہوں"۔

مگر وہ شخص مشتعل نہ ہوا۔ نرمی بولا۔ "جا بھئی اپنا کام کر۔ کیوں خواہ مخواہ سر ہوئے جا رہا ہے۔"

نوروز نے پھر انّو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ علی جان کے ساتھی نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑا سا کمانی دار چاقو باہر نکال لیا۔ کڑ کڑ کر کے چاقو کے کھلنے کی آواز ابھری۔ چاقو کی جھلکتی ہوئی نوک نوروز کے پیٹ پر تھی۔

وہ آدمی ڈپٹ کر بولا۔ "اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ورنہ لاش بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔"

نوروز چپ چاپ کھڑا جھلکتے ہوئے چاقو کو دیکھتا رہا۔

علی جان نے نوروز کو گالی دے کر کہا۔ "ابے اب یہاں سے ٹلے گا بھی یا ہتیا کرانے کا ارادہ ہے؟"

نوروز پسپا ہونے کے سے انداز میں پیچھے ہٹا اور گردن جھکا کر تانگے کی طرف چل دیا۔ جب وہ تانگے پر سوار ہونے لگا تو علی جان نے کہا۔

"آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا، ورنہ ٹھنڈے ٹھنڈے پڑے ہو گے۔"

نوروز کو ان پر تاؤ تو بہت آیا مگر وہ ایک نہیں تین تھے اور مسلح بھی تھے وہ بالکل نہتا تھا۔ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ گھوڑے کی لگام کھینچی اور تانگے کو آگے بڑھا دیا۔ کولتار کی پختہ سڑک پر اس کے تانگے کی آہٹ دور تک ابھرتی رہی انّو بجلی کے کھمبے کے ساتھ علی جان اور اس کے ساتھیوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔

ہتیا: قتل۔ نہتا: خالی ہاتھ، اسلحہ کے بغیر۔

(۳)

انّو گھر سے نکلنے کے بعد واپس نہ آیا۔

سلطانہ روزانہ اس کا انتظار کرتی۔ اسے امید تھی کہ انّو ایک نہ ایک روز ضرور واپس آئے گا۔ ...نے انّو کی ایک ایک چیز سنبھال کر الماری میں رکھ دی تھی۔ اس کے لیے کپڑوں کے نئے نئے ...ے سلوائے تھے۔ وہ بھی الماری میں رکھے تھے۔ جب انّو بہت یاد آتا تو وہ الماری کھول کر کھڑی ...جاتی اور ساری چیزوں کو حسرت سے دیکھتی۔ پھر اس کا دل بھر آتا۔ بے اختیار رو پڑتی۔ انّو سے ...بڑی ڈھارس تھی۔ اس کے جانے کے بعد تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح گھر ...چکر کاٹا کرتی۔

گھنٹوں دریچے پر کھڑی سڑک کی جانب خواب ناک نظروں سے تکا کرتی کہ شاید انّو آتا ہوا ...آ جائے۔

اسے اس قدر پریشان دیکھ کر گھر کی خادمہ نے ایک روز بتایا کہ گمٹی میں ایک شاہ صاحب ہیں۔ ...پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ فال نکال کر ایسی پتے کی باتیں بتاتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جائے۔ ان کا ...بڑا ایک پر ایک ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کئی حیرت انگیز واقعات بھی سنائے جن کو سن کر ...انہ کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ ایک روز جب نیاز باہر گیا ہوا تھا اس نے خادمہ کو اپنے ہمراہ لیا اور شاہ ...صاحب کے ہاں جا پہنچی۔ اس نے دیکھا۔ حاجت مندوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ دور دور سے لوگ ان کے ...آئے تھے۔ ان کا قیام ایک ٹیلے کے دامن میں تھا۔ یہ مختصر سا نیم پختہ مکان تھا۔ اس میں کل دو ...رے تھے۔ کمروں کے آگے سائبان تھا جس میں مردوں کے لیے انتظام تھا۔ ایک کمرے میں پردہ ...خواتین بیٹھی تھیں۔ سلطانہ بھی وہیں جا کر بیٹھ گئی۔ وہ نو بجے دن کو وہاں پہنچی تھی۔ دوپہر کو اس ...کی ہوئی۔

کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ شاہ صاحب مسند پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ قریب ہی ایک ...بڑا اگر سوز رکھا تھا جس میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف تیز خوشبو پھیلی

...حوصلہ، ہمت۔ دریچہ: کھڑکی۔ ایک پر ایک ہے: بہت اچھا ہے۔ اشتیاق: شوق۔ جمگھٹا: ہجوم۔ اگر سوز: وہ برتن جس میں اگر بتی ...جلتی ہے۔

تھی۔ وہ ادھیڑ آدمی تھے۔ خوب گھنی ڈاڑھی تھی۔ سر پر کاکلیں تھیں۔ اس وقت وہ زعفرانی رنگ کا کرتا اور ویسا ہی تہبند باندھے ہوئے تھے۔ چہرے سے جلال ٹپکتا تھا۔ سلطانہ اندر پہنچی تو وہ آنکھیں بند کئے مراقبے کے عالم میں تھے۔ سلطانہ کے ساتھ خادمہ بھی تھی۔

دونوں غالیچے کے ایک سرے پر مؤدب ہو کر بیٹھ گئیں۔ شاہ صاحب آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ اچانک شاہ صاحب کی آواز ابھری۔

"لڑکی تیرا بھائی شمال مشرق کی جانب گیا ہے۔ وہ ایک شخص کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہے۔"

سلطانہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کو سخت حیرت ہوئی کہ انہیں کس طرح یہ علم ہوا کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کرنے آئی ہے۔ ان سے اس بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ فرطِ عقیدت سے اس کی گردن جھک گئی۔ کمرے میں اگر سوز سے اٹھتا ہوا ہلکا نیلگوں دھواں لہرا رہا تھا۔ گہری خاموشی اور اگر بتیوں کی تیز خوشبو نے ماحول کو آسیب زدہ بنادیا تھا۔

ذرا دیر بعد شاہ صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ سلطانہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر بولے۔ "تم دونوں کب آئیں؟" سلطانہ تو خاموش رہی البتہ خادمہ نے کہا۔

"ہم کو تو آئے ہوئے دیر ہو گئی۔ بلکہ آپ نے بی بی جی سے کچھ کہا بھی تھا۔"

"کاہے کے بارے میں؟"

"ان کا چھوٹا بھائی بہت دنوں سے لاپتہ ہے۔ اسی کے بارے میں آپ نے کہا تھا۔"

شاہ صاحب زیر لب مسکرائے۔ "اچھا اچھا۔ میں تو نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔" لمحہ بھر رک کر انہوں نے کہا۔ "حاجیوں کا ایک جہاز عدن کے قریب سمندری طوفان میں گھر گیا تھا مجھے حکم ملا فوراً جا کر حاجیوں کو بچاؤ۔ اللہ غنی کیا عالم تھا۔ جہاز میں کہرام برپا تھا۔ ہر شخص موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ موجیں دھاڑتی ہوئی اٹھ رہی تھیں۔ جہاز درخت کے پتے کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔" اس طرح آہستہ آہستہ بول رہے تھے جیسے خواب میں بڑبڑا رہے ہوں۔

زعفرانی رنگ کا: زرد رنگ کا۔ جلال: نور، چمک۔ چنگل میں آجانا: قابو میں آنا۔ فرطِ عقیدت: بہت زیادہ عقیدت۔ کہرام برپا ہونا: شور ابہ ہونا، ہنگامہ برپا ہونا۔

خادمہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سلطانہ کا سر عقیدت سے اور جھک گیا۔

شاہ صاحب نے زعفران کی روشنائی سے دو تعویز لکھے اور سلطانہ کو دیتے ہوئے بولے۔ "یہ لو ایک گھر کے شمالی کونے میں کھود کر دفن کر دینا۔ دوسرا کسی اونچے درخت پر لٹکا دینا۔ جیسے جیسے ہوا سے تعویز ہلے گا ویسے ہی لڑکے کے دل میں ہول اٹھے گا۔ گھر کی یاد ستائے گی۔ انشاءاللہ شام تک وہ لوٹ ہی آجائے گا۔"

سلطانہ نے تعویذ لے کر پرس سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ اسے نذرانے کے طور پر پیش کرنا چاہا تو شاہ صاحب ہنس پڑے۔

"تمہارا بھائی آجائے تو ایک سیاہ بکرا صدقہ کر دینا۔ اس کا گوشت غریبوں محتاجوں میں تقسیم کر دینا۔"

سلطانہ نے نوٹ پرس میں واپس رکھ لیا۔ شاہ صاحب سے اجازت لی اور خوشی خوشی گھر آگئی۔ شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق اس نے ایک تعویذ زمین میں دفن کرا دیا۔ دوسرا باغیچے میں کھڑے ہوئے پیپل کے پیڑ کی اونچی شاخ پر لٹکوا دیا۔ اسے یقین تھا کہ انو ضرور آجائے گا۔ شاہ صاحب کی شخصیت کا طلسم اس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔

اس روز اس نے خانساماں کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے سامنے کھیر تیار کرائی۔ انو کھیر بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ سہ پہر تک وہ بڑی خوش خوش رہی۔ جب دن ڈھلنے لگا اور دھوپ کا رنگ گہرا زرد ہو گیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ بار بار دریچے پر جا کر باہر دیکھتی۔ سورج غروب ہو گیا۔ دن کا الاؤ بجھ گیا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ شام ہو گئی مگر انو نہ آیا۔

رات ہو گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ راستے سنسان پڑ گئے۔ مگر انو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ساری رات جاگتی اور انو کا انتظار کرتی رہی۔

پھر بہت سی شامیں آئیں اور گزر گئیں اور شاہ صاحب کا تعویذ پیپل کی اونچی شاخ پر لہراتا رہا۔ خادمہ نے دوبارہ شاہ صاحب کے پاس جانے کے لیے اصرار بھی کیا۔ لیکن سلطانہ پھر ان کے پاس نہ گئی۔ اس کی عقیدت کا طلسم درہم برہم ہو چکا تھا۔

ہول اٹھنا: خوف پیدا ہونا، گھبراہٹ ہونا۔ طلسم: جادو۔

(۴)

نیاز کو سلطانہ کے دکھ کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ ہر طرح اس کی ناز برداری کی کوشش کرتا۔ ان دنوں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ اس کے لیے خرید کر لاتا۔ اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا۔ انّو کے چلے جانے پر اظہار افسوس کرتا۔ لیکن سلطانہ اس سے کھنچی کھنچی اور بے زار بے زار سی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ انّو نے صرف اس کی وجہ سے گھر چھوڑا ہے۔ حالانکہ بوڑھے خانساماں نے صرف اس قدر بتایا تھا کہ اس نے نیاز کو انّو پر ناراض ہوتے سنا تھا۔ اس کے بعد انّو کوٹھی کا پھاٹک کھول کر چپ چاپ باہر چلا گیا۔

جب وہ اس بات پر غور کرتی تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ نیاز کے خلاف شدید نفرت کا طوفان امڈ تا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس کوٹھی سے کہیں چلی جائے۔ ہر طرف نظریں دوڑاتی مگر کوئی بھی سہارا کوئی بھی اپنا غم گسار نظر نہ آتا۔ ایسے عالم میں کبھی کبھار سلمان کا بھی خیال آتا۔ مگر اس کی یاد کے ساتھ ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ اگر سلمان مل جائے تو وہ اس کا منہ نوچ لے۔ اس کے چہرے پر تھوک دے اور ہزاروں کوسنے دے۔ پھر وہ سوچتی، کاش ایک بار سلمان اسے مل جائے اور وہ اسے یہاں لا کر دکھائے کہ اب سلطانہ وہ لڑکی نہیں رہی جسے غریب اور لاوارث جان کر اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ شاندار کوٹھی میں رہتی ہے۔ اس کے پاس کا ہے، قیمتی فرنیچر ہے، نوکر ہیں، خدمت گار ہیں جن پر اس کا حکم چلتا ہے۔ اس کے پاس ڈھیر سارے ریشمی کپڑے ہیں۔ زیورات ہیں۔ جوتوں کی درجنوں جوڑیاں ہیں۔ وہ جس قدر ٹھاٹ باٹ سے رہتی ہے، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

انہی دنوں ایک بار اصرار کر کے نیاز اسے اپنے ہمراہ خان بہادر فرزند علی کے گھر لے گیا۔ خان بہادر بڑی شاندار کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کا رہن سہن شاہانہ تھا۔ ہر کمرے میں عمدہ اور نفیس فرنیچر تھا۔ کام کاج کے لیے نوکروں کی پلٹن تھی۔ مگر اس کی بیوی بڑی چھچھوری اور خردماغ تھی اترا اترا کر بات کرتی تھی۔ اس کے ہر انداز سے نودولتا پن ٹپکتا تھا۔ البتہ دونوں لڑکیاں بہت شائستہ اور ملنسار تھیں۔ بڑا لڑکا بھی خوش اخلاق اور بہت ہنس مکھ تھا۔

شام کی چائے اس نے تینوں کے ساتھ پی۔ لڑکے کا نام شاہد علی تھا۔ لمبا نکلتا ہوا قد، منہ

ناز برداری: ناز اٹھانا۔ کوسنے دینا: برا بھلا کہنا۔ چھچھوری: کم ظرف۔ خردماغ: مغرور، بددماغ۔

نمہ پاؤں، تیکھے نقوش، بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ خاصا خوبصورت نوجوان تھا۔ بی ایس سی کر چکا اور اسکالرشپ پر ایم بی اے کرنے کے لیے امریکہ جانے والا تھا۔ چائے پر بھی امریکہ کے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔

دوران گفتگو شاہد نے اچانک سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مسز نیاز آپ کو دیکھ کر تو بڑی حیرت ہوئی۔"

سلطانہ کو مسز نیاز کہنے پر سخت تعجب ہوا۔

اس کا جی چاہا کہ اس غلط فہمی کو دور کر دے۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ نیاز نے نہ جانے اس کے متعلق ان لوگوں سے کیا کہا ہے۔ سلطانہ کو بڑا غصہ آیا۔ کم بخت نے کم سے کم اشارہ ہی کر دیا ہوتا۔ ذرا دیر خاموشی رہ کر اس نے شاہد سے کہا۔ "آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھتا تھا نہ جانے آپ کیسی ہوں گی۔" اس کے انداز میں بچوں کی سی سادگی تھی۔

سلطانہ کو اس کی یہ ادا بڑی پیاری معلوم ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔ "کیا مطلب؟"

وہ گھبرا گیا۔ "میں سمجھتا تھا کہ آپ کچھ عجیب سی ہوں گی۔"

اسی وقت شاہد کی بہن نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر تعجب تو مجھے بھی ہوا۔"

سلطانہ کی سمجھ میں ان کی باتوں کا مطلب نہیں آیا۔ پوچھنے لگی۔ "کیوں؟"

وہ بولی۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ نیاز صاحب کی مسز تو بڑی بور سی ہوں گی۔ موٹی موٹی، کالی سی۔ مگر آپ اتنی زیادہ خوبصورت اور اتنی سوئٹ ہوں گی، یہ تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" پھر وہ بڑے بھائی کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں بھائی جان! یہی بات ہے نا؟"

"سچ مچ آپ بڑی گرینڈ معلوم ہوتی ہیں۔"

سلطانہ کا ایک بار پھر جی چاہا کہ وہ ان کی غلط فہمی رفع کر دے۔ مگر اس میں نیاز کی ناراضی کا ڈر تھا اور وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اپنے گھر میں واپس پہنچی اور دیر تک خان بہادر کے اہل خانہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ ناک چڑھی بیوی، ملنسار بیٹیاں اور ہنس مکھ شاہد جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

نہ جانے کیوں اس کی باتیں سلطانہ کو بار بار یاد آتی رہیں۔

❁ ❁ ❁

رات کے کوئی آٹھ بجے اچانک شاہد آگیا۔

نیاز اس وقت موجود نہیں تھا۔ عام طور پر وہ اس وقت غیر حاضر رہتا تھا۔ سلطانہ چاہتی تو نیاز کے دوسرے ملنے جلنے والوں کی طرح اسے بھی ٹرخا دیتی۔ مگر شاہد سے ملنے وہ خود ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہ کسی کام سے نیاز کے پاس آیا تھا۔

باتوں باتوں میں اس نے سلطانہ کو پھر مسز نیاز کہہ کر مخاطب کیا۔ سلطانہ نے سوچا کہ وہ اس غلط فہمی کو مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے مسکرا کر ٹوکا۔

"آپ مجھے مسز نیاز نہ کہا کریں۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "کیوں؟"

"میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔" سلطانہ نے شرما کر دبی زبان سے کہا۔ "شاید آپ کو پتہ نہیں۔ نیاز صاحب رشتے میں میرے سوتیلے والد لگتے ہیں۔"

شاہد تعجب سے منہ پھاڑ کر بولا۔ "ارے!" لمحہ بھر تک وہ ہکا بکا اسے تکتا رہا۔ "تو پھر اس روز آپ نے یہ بات کیوں نہ بتائی؟"

"آپ لوگوں نے بتانے کا موقع ہی کہاں دیا۔"

شاہد معذرت کرنے لگا۔ "ہم تو یہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ تو بہت بری بات ہو گئی۔ آپ نے برا تو نہیں مانا۔ پھر اس نے گھبرا کر خود ہی کہا۔ "آپ نے ضرور برا مانا ہوگا۔"

اسے پریشان دیکھ کر سلطانہ بولی۔ "وہ تو غلط فہمی تھی۔ اس کا کیا برا ماننا۔"

شاہد نے اس کے بعد کچھ نہ کہا۔ چپ چاپ بیٹھا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا رہا۔ پنکھے کی ہوا سے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ چہرہ سوچتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس عالم میں وہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔

سلطانہ نے کئی بار اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ ہر بار وہ اسے زیادہ کشش انگیز نظر آیا۔ معصوم چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بھرے بھرے گلابی ہونٹ۔

ٹرخانا: ٹال دینا۔ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا: کنکھیوں سے دیکھنا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ باہر باغیچے میں درختوں کے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑا رہے تھے۔ دبی دبی آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔

رات کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔

سلطانہ نے اسے خاموش پا کر پوچھا۔ "آپ کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی ذرا سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟" سلطانہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ شاہد علی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور بے چین ہو کر انگلی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ پھر اس نے دبی زبان سے کہا۔ "میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں؟"

شاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ دروازہ پر پہنچا اور سلطانہ کی جانب دیکھے بغیر باہر چلا گیا۔ سلطانہ کچھ نہ بولی۔ گم صم بیٹھی رہی۔

دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ نیاز اس وقت بھی موجود نہ تھا۔ سلطانہ جیسے اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بلا جھجک پہنچ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر کوئی بات نہیں ہوئی۔ کمرے میں خاموشی تھی اور باہر شام در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ تاریک ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد شاہد کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "میں آپ ہی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔"

"مجھ سے؟" سلطانہ کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"یہاں تو بہت ویرانی ہے۔" شاہد نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ "آپ کا دل نہیں گھبراتا؟"

"گھبراتا تو ہے۔" اس دفعہ سلطانہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر شاہد کو دیکھا۔ "آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے تھے؟"

شاہد چپ رہا۔ اس نے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی طرف مڑا۔ آگے بڑھا۔ مگر دہلیز تک پہنچتے پہنچتے ٹھٹکا۔ پلٹ کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ شاہد مبہوت کھڑا رہا۔ پھر کسی سحر زدہ انسان کی

ہکا بکا: حیران۔ سحر زدہ: جس پر جادو کیا گیا ہو۔

طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلطانہ کے قریب آیا۔ اس کی سانس اتنی تیز چل رہی تھی گویا ہانپ رہا ہو۔ سلطانہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ سلطانہ نے شاہد کی گرم گرم سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی۔

شاہد کی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بے اختیار سلطانہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

سلطانہ نے کسمسا کر کئی بار اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکلنے کی کوشش کی مگر صرف کلبلا کر رہ گئی۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اس نے نڈھال ہو کر اپنا سر شاہد کے کندھے سے ٹکا دیا وہ موم کی طرح پگھل چکی تھی۔

کمرے کی خاموشی میں شاہد کی تیز سانسوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سلطانہ اس کے پہلو میں بت بنی کھڑی تھی۔

چند لمحے بعد شاہد کی آواز ابھری۔ "میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ میں اب ایم بی اے نہیں کروں گا۔" وہ اپنی بے ترتیب سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں؟" سلطانہ نے مجسم سوال بن کر پوچھا۔

"میں تم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں آج یہی کہنے آیا تھا۔" وہ ہولے ہولے سلطانہ کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ "میں پہلے تم سے شادی کروں گا۔ خدا کی قسم! میں آج ہی امّی سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ "تم میری ہو تم میری ہو۔" اس نے پاگلوں کی طرح سلطانہ کی گردن چومنا شروع کر دی۔

❁ ❁ ❁

شاہد چلا گیا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں گئی۔ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی کیا وہ واقعی خوب صورت ہے؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ شاہد اس سے بیاہ کر لے؟

یہ سوالات اس کے ذہن میں کلبلاتے رہے اور اس کی دلکش آنکھیں بار بار آئینے میں جھپکتی رہیں۔ ہونٹ لرز کر رہ جاتے۔ ان پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔

وہ شام اور ایسی کئی شامیں اس نے انگڑائیاں لے لے کر اور مسکرا مسکرا کر گزار دیں۔

مگر شاہد دوبارہ نہ آیا۔

ایک روز نیاز نے باتوں باتوں میں سلطانہ کو بتایا کہ شاہد امریکہ چلا گیا۔ سلطانہ کے دل پر زور کا نا لگا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

زندگی ایک بار پھر اسے جل دے گئی تھی۔

اس صدمے نے اسے توڑ پھوڑ کر ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ وہ سہانے خواب، جو اس نے پچھلے کئی روز دیکھے تھے، تار عنکبوت کی مانند بکھر کر رہ گئے۔ اس کے چاروں طرف اندھیرے کا جال پھیل پھر زندگی کا وہی لق و دق صحرا تھا۔ وہی تنہائی وہی بے چارگی۔

(۵)

ساون کا مہینہ لگ چکا تھا۔ آسمان پر اودی اودی بدلیاں گھر گھر کر آتیں۔ مینہ برستا اور ہر ن جل تھل ہو جاتا۔ برسات کی ایک ایسی ہی رات تھی۔ پچھّم سے گھٹائیں اٹھیں۔ ہوا کے تیز چلنے لگے۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بارش کے موٹے موٹے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر ٹپ ٹپ بج رہے تھے۔ ہوا کی رائیں سیٹیوں کی طرح رات کے سناٹے میں چیخ رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ نہ ابھی جاگ رہی تھی۔ اچانک بجلی غائب ہو گئی۔ جھلکتی ہوئی تمام روشنیاں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ نہ خوفزدہ ہو گئی۔

وہ دیر تک سہمی ہوئی پڑی رہی۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ پھر اس نے برساتی میں کار کی آواز سنی۔ نیاز واپس آ گیا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز پختہ فرش پر سنائی دی ذرا دیر بعد زہ کھلنے کی آواز ابھری۔ نیاز اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ کئی بار اس کی کھنکار خاموشی میں ابھری۔ ار پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔

لبا کرٹ، گرے ہوئے مکان کی اینٹیں وغیرہ۔ تار عنکبوت: مکڑی کا جالا۔ لق و دق: سنسان، ویران۔ پچھّم: مغرب۔ برساتی: مراد

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش برابر ہو رہی تھی۔ ہوا درختوں میں چیخ رہی تھی۔
سلطانہ ابھی تک سونہ سکی تھی۔ بجلی واپس نہیں آئی تھی۔ اندھیرے سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔
تیز ہوا کی سر سراہٹوں میں اس نے سنا، باہر برآمدے میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ چاپ رک
رک کر ابھر رہی تھی۔

سلطانہ لرز کر رہ گئی۔

❁ ❁ ❁

قدموں کی آہٹ رک رک کر ابھرتی رہی۔ بارش کا زور ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ ہوا کے شور
سے دل دہلتا تھا۔ اسی اثنا میں کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ۔
ڈر کے مارے سلطانہ مسہری کی پٹی سے چمٹ گئی۔ پھر ایک بھاری آواز ابھری۔ "سلطانہ۔
سلطانہ!" نیاز آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔

سلطانہ نے پوچھا۔ "کون؟"

نیاز نے کہا۔ "دروازہ کھولو۔"

سلطانہ دم بخود پڑی سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ دروازے پر آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ
ہوتی رہی۔ نیاز رک رک کر اسے آواز دیتا رہا۔ آخر سلطانہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

نیاز اندر آگیا۔ ذرا دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے سلطانہ سے کہا۔ "دیکھو ذرا ہوشیار
سونا۔"

اس نے جلدی سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"مجھے ابھی ابھی ایسا محسوس ہوا کہ کوئی برآمدے میں چل رہا ہے۔"

آواز سلطانہ نے بھی سنی تھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گئی۔ نیاز کہتا رہا۔

"پہلے تو میں پڑا پڑا اس آہٹ کو سنتا رہا، پھر باہر نکل کے دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ اندھیرا اس
قدر ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ تم نے موم بتیاں بھی منگوا کر نہیں رکھیں۔"

اس کی آواز اندھیرے میں آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔

خوف کے مارے سلطانہ کی آواز تک نہ نکلی۔ وہ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینا: کچھ نظر نہ آنا۔

نیاز نے پوچھا۔ "تم کو ڈر تو نہیں لگے گا؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر سلطانہ کا بازو تھام لیا۔
"چلو آج میرے کمرے میں سو جاؤ۔"
سلطانہ نے کسمسا کر آہستہ سے کہا۔ "نہیں۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔
نیاز نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "پاگل مت بنو، آؤ!" اور جھپاک سے اسے دونوں بازوؤں پر
اٹھا لیا۔
نیاز اسے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے کمرے کے باہر آگیا۔
بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر، درختوں پر، چھتوں پر بج رہے تھے۔ ہوا فراٹے بھرتی
درختوں سے گزرتی تو ایسا محسوس ہوتا کوئی زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔
اندھیرا بہت گہرا تھا اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نیاز کے بوجھل قدموں کی آواز برآمدے
کے پختہ فرش پر آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔
کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ۔ آواز دور ہوتی چلی گئی۔
باہر درختوں میں کوئی پرندہ اچانک زور سے چیخا۔ پھر اس کی چیخ بارش کے شور میں ڈوب گئی۔
ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ بھیگی ہوئی سیاہ بخت رات اور سیاہ ہو گئی۔

فصل یازدہم

(۱)

سلمان لگ بھگ ڈیڑھ مہینے تک اسپتال میں رہا۔ اس کے جسم پر تیرہ زخم آئے تھے۔ تین روز تک وہ ایمر جنسی وارڈ میں بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو اس کی بینائی بہت دھندلی تھی۔ نقاہت اس قدر زیادہ تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ پہلو میں تیسری پسلی کے نیچے ایسا گہرا زخم تھا جس نے کئی روز تک ڈاکٹروں کو پریشان رکھا۔

شروع شروع میں اسکائی لارک اسپتال میں اس کی عیادت کے لیے آتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ انہوں نے آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ان کا یہ رویہ سلمان کو بہت شاق گزرا۔ اسے اسکائی لارکوں کی اس بے اعتنائی پر غصہ آیا اور اپنی بیکسی پر دکھ بھی ہوا۔

اسپتال سے صحت یاب ہو کر جب وہ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں وہ اسکائی لارکوں کی اس بے رخی کے خلاف شدید احتجاج کرے گا اور یہ دریافت کرے گا کہ اس کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیوں اختیار کیا گیا؟

لیکن گنگی پہنچ کر اس نے ہیڈ کوارٹر دیکھا تو سب کچھ بھول گیا۔ ہیڈ کوارٹر کی دیواریں ابھی تک جھلسی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ہر چند کہ جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ نئی کھڑکیاں اور دروازے لگا دئے گئے تھے مگر آتشزدگی کے نشانات جگہ جگہ دھویں کے سیاہ دھبے بن کر بکھرے ہوئے تھے۔ لائبریری کی ایک دیوار چیخ گئی تھی۔ اس میں انچ بھر چوڑا نشان تھا۔

نقاہت: کمزوری۔ عیادت: تیمارداری۔ شاق: ناگوار۔ بے اعتنائی: لاپروائی۔

ن مدیقی

لمان جس وقت وہاں پہنچا دن ڈھل چکا تھا۔ شام کے امنڈتے اور پھیلتے ہوئے دھندلکے میں
وارٹر کی عمارت کسی کھنڈر کی طرح ویران نظر آ رہی تھی۔

لمان نے اندر داخل ہو کر دیکھا، کمروں میں گہرا سناٹا تھا۔ نہ پہلی سی چہل پہل تھی نہ اسکائی
ں کی مصروف اور سرگرم زندگی کی گہما گہمی تھی۔ ہر طرف بوجھل خاموشی چھائی تھی۔ وہ
ارں سے گزرتا ہوا دفتر کی جانب بڑھا۔

دفتر کا دروازہ کھلا تھا کمرے میں دن کی ڈوبتی ہوئی روشنی مدھم پڑ چکی تھی۔ اس نیم تاریکی میں
نحیف و لاغر شخص میز پر جھکا سامنے رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے قریب
دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ یہ ڈاکٹر زیدی تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں بال کنپٹیوں پر
سفید ہو گئے تھے۔ وہ خاصا بوڑھا نظر آ رہا تھا۔

سلمان کے دل کو سخت دھچکا لگا وہ دروازے پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ غور سے دیکھنے لگا کہ آیا وہ ڈاکٹر
ہی ہے یا کوئی اور۔ واقعی وہ اب بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ اچانک ڈاکٹر نے گردن اٹھا کر سلمان کی
ن دیکھا اور حیرت سے چیختا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو سلمان!"

سلمان گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر تم نے اپنا یہ کیا حلیہ بنا لیا؟"

ڈاکٹر زیدی صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پژمردہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے
لمان کے اس سوال سے اسے ذہنی اذیت پہنچی ہے۔ سلمان نے خاموشی اختیار کر لی۔ مزید بات
نہیں کی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر
ب روشن کیا۔

سلمان نے پوچھا۔ "دوسرے اسکائی لارک کہاں ہیں؟"

"اپنے اپنے حلقوں میں کام کرنے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"

ڈاکٹر زیدی کے جواب سے سلمان کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ اس کے بعد باتوں کا طویل سلسلہ
رُ گیا۔

ڈاکٹر زیدی نے بتایا کہ صفدر بشیر حملے کی رات ہی کو جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کے جسم پر زخموں

لاغر: بہت زیادہ کمزور۔ ششدر: حیران۔ پژمردہ: افسردہ، مرجھائی ہوئی۔

کے ۴۲ نشانات تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے اسکائی لارک بھی زخمی ہوئے تھے۔ صرف فہیم اللہ اسکائی لارکوں کے ساتھ پچھلی دیوار پھاند کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

پولیس موقع واردات پر اس وقت پہنچی جب حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ حالانکہ فہیم اللہ ہیڈ کوارٹر سے نکلتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ پولیس کو حملے کی اطلاع کر دی تھی۔ پولیس کی تفتیش شروع ہونے کے چند ہی روز بعد قریب قریب سارے اسکائی لارک گرفتار کر لیے گئے۔ ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اسکائی لارکوں پر صفدر بشیر کے قتل کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق الزام کی نوعیت یہ تھی کہ صفدر بشیر فلک پیما سے مستعفی ہو چکا تھا۔ وہ لندن جانے والا تھا۔ واردات کی شب وہ ہیڈ کوارٹر آیا تھا اور فلک پیما کے فنڈ میں اس کی جو رقم موجود تھی، اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مگر رقم دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ اسکائی لارکوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ صفدر بشیر اپنے حامیوں کے ساتھ حملہ کرنے کی نیت سے آیا تھا، ہیڈ کوارٹر کی عمارت کو آگ لگا دی۔

پولیس کے موقف کی تائید علیم احمد نے کی۔ بعد میں فہیم اللہ بھی سرکاری گواہ بن گیا۔ ان دونوں کے علاوہ پولیس بستی سے بھی چند گواہ مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مقدمے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ پولنگ سے قبل کسی اسکائی لارک کی ضمانت نہ ہو سکی۔ ووٹنگ کے وقت پولنگ اسٹیشن پر اسکائی لارکوں کا نہ کوئی ایجنٹ موجود تھا اور نہ ہی ووٹوں کی گنتی کے وقت کوئی نمائندہ تھا۔

ڈاکٹر زیدی امیدوار تھا۔ مگر دوسرے اسکائی لارکوں کے ساتھ وہ بھی جیل میں بند تھا۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس کے ووٹ تعداد میں اس قدر کم نکلے کہ ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ خان بہادر فرزند علی بھاری اکثریت سے میونسپل بورڈ کا ممبر منتخب ہو گیا۔ اس شاندار کامیابی پر اس کا دھوم دھام سے جلوس نکلا۔ بستی میں جگہ جگہ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ اس کے کارکنوں نے اپنے گھروں پر چراغاں کیا۔

خان بہادر فرزند علی کی کامیابی کے چند ہی روز بعد اسکائی لارکوں کی ضمانتیں منظور ہونا شروع ہو گئیں۔ علی احمد بھی ضمانت پر رہا ہو چکا تھا۔ البتہ ریاض سیفٹی ایکٹ کے تحت ہنوز نظر بند تھا۔ بعض

لارک رہائی کے بعد اس قدر دہشت زدہ اور ہراساں ہو گئے کہ انہوں نے فلک پیما سے کنارہ کرلی۔ اب صرف سات اسکائی لارک رہ گئے تھے۔ اس افراتفری میں تمام محاذوں پر کام بند انڈسٹریل ہوم پر کسی نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ تعلیم بالغاں کے تمام مراکز بند ہو گئے۔ لے میں ایک تانگے والے نے اپنا گھوڑا باندھنا شروع کر دیا اور اسے باقاعدہ اصطبل بنا دیا۔ کا فنڈ ضبط کر لیا گیا تھا اور ہیڈ کوارٹر کی عمارت سر بہ مہر کر دی گئی تھی۔

رہائی کے بعد اسکائی لارکوں کے سامنے طرح طرح کی مشکلات تھیں جن پر قابو پانے کے نہایت سرگرمی سے جدوجہد کی جا رہی تھی۔ تحریک کو زندہ رکھنے کے واسطے از سر نو سازگار فضا رہا پڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر زیدی دیر تک سلمان کو بیتی باتیں سناتا رہا۔

سلمان نے یہ حالات سنے تو غم و غصے سے تڑپ کر بولا۔ "یہ ساری مصیبتیں خان بہادر کی لائی ہیں۔ بڑا کمینہ اور بے رحم شخص ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا اور خود غرض بنا دیتی ہے۔"

"فہیم اللہ اور علیم احمد سے بھی کبھی ملاقات ہوئی؟"

"نہیں!" ڈاکٹر نے لحہ بھر رک کر کہا۔ "خان بہادر نے دونوں کو میونسپلٹی میں ملازمت دلوا دی ہے تنخواہ تو زیادہ نہیں مگر بالائی آمدنی بہت اچھی ہے۔ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد علی احمد آ گیا۔

اس کے ہمراہ دو نوجوان اسکائی لارک بھی تھے۔ علی احمد نے سلمان کو دیکھا تو گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔ ہنس کر بولا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ جس طرح اور اسکائی لارک ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تم نے بھی منہ موڑ لیا۔"

سلمان نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ "میں آج ہی تو اسپتال سے نکلا ہوں۔ آپ لوگوں نے تو نہیں پوچھا کہ کس حال میں رہا۔ زندہ بچا کہ مر گیا۔"

علی احمد معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "بھئی معاف کرنا۔ کچھ عرصہ تو جیل میں گزرا۔ رہائی ملی افراتفری کا زمانہ گزرا کہ کسی کو ایک دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ تمہاری شکایت بالکل درست

ع رہے سے۔ بالائی آمدنی: مراد رشوت، ناجائز کمائی۔

ہے۔ مجھے اس کا بیحد افسوس ہے۔"

سلمان نے مزید کچھ نہ کہا۔ علی احمد اسے اسکائی لارکوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ آٹھ بجے تک سارے سکائی لارک دفتر میں اکٹھا ہوگئے۔ ہر ایک نے بڑے جوش و خروش سے سلمان کا خیر مقدم کیا۔ سب اس کی آمد سے بہت خوش تھے۔ ان میں نئی توانائی اور مستعدی نظر آرہی تھی۔

اس روز سب نے مل کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ دس بجے کے قریب فلک پیما کا اجلاس ہوا جس میں صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا اور اس کی روشنی میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کیا گیا۔ نئے عزائم اور تازہ ولولے کے ساتھ جدوجہد کرنے کا عہد کیا گیا۔ اجلاس آدھی رات تک جاری رہا۔ ہر مسئلے پر بحث ہوئی اور ہر اسکائی لارک نے بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

نئی تجاویز پیش کی گئیں۔ سب سے زیادہ اس تجویز پر زور دیا گیا کہ فلک پیما کے نئے کارڈ بنائے جائیں۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس لیے کہ فلک پیما کے پاس اب بہت تھوڑا فنڈ تھا۔ وہ بھی علی احمد نے بارہ ہزار روپے میں اپنا مکان فروخت کر کے مہیا کیا تھا۔ اور جس کا بڑا حصہ مقدمے بازی میں اور ضروری اشیاء کی خریداری پر خرچ ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں بعض اسکائی لارکوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ فلک پیما کے ہمدردوں سے چندہ لیا جائے۔ سلمان کی رائے تھی کہ تعلیم بالغاں کے مرکزوں میں پڑھنے والے طلبا سے فیس لی جائے جو بہت معمولی ہو۔ ڈاکٹر زیدی نے اس کی تائید کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ڈسپنسری سے جو دوائیں دی جاتی ہیں مریضوں سے ان کی کچھ نہ کچھ قیمت لی جائے۔ کم سے کم ان لوگوں سے جو قیمت دے سکتے ہیں۔ لیکن اس روز کوئی تجویز منظور نہیں کی گئی اور فنڈ کا مسئلہ آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زیدی نے سلمان کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ دن آرام کرے۔ اس کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ کوئی کام کر سکے۔ مگر اس نے ڈاکٹر کی ایک نہ سنی۔ دوسرے ہی روز اپنے پرانے شاگردوں سے ملا۔ جس جگہ تعلیم بالغاں کا مرکز تھا، وہ جگہ دیکھی۔ وہاں ایک قصائی نے گوشت کی دکان کھول لی تھی۔ اس کا گھر بھی قریب ہی تھا۔ سلمان اس سے ملا اور یہ تجویز پیش کی کہ دکان کہیں اور جائے۔ مگر وہ سرکش آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف سلمان کی تجویز مسترد کر دی بلکہ اس قدر خفا ہوا کہ گالی گلوچ پر اتر آیا۔ سلمان کے ساتھ جو لوگ تھے ان کو بھی غصہ آگیا۔ اچھی خاصی لڑائی جھگڑے کی فضا پیدا ہوگئی۔

سلمان نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ یہ طے کیا کہ مرکز کسی اور جگہ قائم کر لیا جائے۔ کہیں جگہ ملے تو فوری طور پر کسی کھلی جگہ چٹائیاں بچھا کر اور گیس بتی روشن کر کے کلاسیں شروع کر دی جائیں۔

شام کو سلمان وہاں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک مکان کی دیوار کے سہارے پرانے ٹین کے ڈبوں کا سائبان ڈال دیا گیا تھا۔ گیس بتی روشن تھی اور فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں۔ اسے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دن یاد آگیا جب فلک پیما نے تعلیم بالغاں کا پہلا مرکز قائم کیا تھا۔

چند ہی روز میں طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مجبوراً داخلہ بند کرنا پڑا۔ جب مرکز اچھی طرح چلنے لگا تو سلمان نے اس کی ذمہ داری ایک تربیت یافتہ اسکائی لارک کے سپرد کی اور خود دوسرا مرکز قائم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

لگ بھگ مہینہ بھر میں سلمان نے دوڑ دھوپ کر کے تعلیم بالغاں کے تین مرکز قائم کر دیے۔ ان میں باقاعدہ تعلیم بھی شروع ہوگئی۔

علی احمد کو سلمان کے واپس آنے سے بڑی مدد ملی۔ اب ہر کام معمول پر آتا جا رہا تھا۔ ٹریل ہوم کو اسکائی لارکوں نے اپنی نگرانی میں لے کر از سر نو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ دارالمطالعہ پھر سے قائم کر دیے گئے۔ ڈسپنسری کو بھی درست کیا گیا۔ مگر سب سے بڑی دقت فنڈ کی تھی جس کے بغیر کام چلانا بہت مشکل تھا۔

اسکائی لارک ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ فنڈ کس طرح مہیا کیا جائے۔ فنڈ کی قلت کے باعث اسکائی لارکوں نے ایک وقت کا کھانا بند کر دیا تھا۔ اپنی تمام ضروریات کم سے کم کر دی تھیں۔ سگرٹوں کے بجائے انہوں نے بیڑیاں پینا شروع کر دی تھیں۔ جن کے کپڑے پھٹ گئے تھے دوسرے اسکائی لارکوں کے کپڑوں سے کسی نہ کسی طور پر اپنا کام چلا رہے تھے۔

سلمان کی صحت اسپتال سے نکلنے کے بعد پہلے ہی خراب تھی۔ سخت مشقت اور مناسب غذا نہ ملنے کے باعث اس کا جسم اور لاغر ہو گیا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ خشک بال تنکوں کی طرح کھڑے رہتے۔ اس کے چہرے پر ویرانی برسنے لگی تھی۔ مگر وہ اپنی صحت سے بے نیاز کام کرنے کی دھن میں مگن تھا۔

(۲)

ایک شام کو سلمان شہر کے بڑے بازار سے گزر رہا تھا۔ اچانک نیاز سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ نیاز کے ساتھ سلطانہ بھی تھی۔ وہ اس وقت خاصی ماڈرن اور طرح دار لگ رہی تھی۔ جدید طرز کا ریشمی لباس اور ہلکا ہلکا میک اپ۔ وہ کسی شہزادی کی طرح نظر آرہی تھی۔ دونوں ایک دکان سے نکل کر باہر آرہے تھے۔ سلمان نے چاہا کہ ان کی نظریں بچا کر نکل جائے مگر نیاز نے اسے دیکھ لیا۔ بے تکلفی سے بولا۔

"ہیلو سلمان!"

مجبوراً اسے رکنا پڑا۔ نیاز اس کے قریب آکر بولا۔ "ارے بھئی! کہاں ہو۔ کہیں نظر نہیں آتے؟"

سلمان نے جواب دیا۔ "میں تو یہیں تھا۔"

"مگر تم نے یہ اپنا کیا حلیہ بنالیا ہے؟"

سلمان اس کی بات سن کر قدرے گھبرا گیا۔ واقعی اس کا عجیب حلیہ تھا۔ خشک بال، بڑھا ہوا شیو، چہرے پر گرد۔ لباس گندہ جس کی ایک آستین اس طرح پھٹ گئی تھی کہ اندر کی جلد صاف نظر آتی تھی۔ اور نیاز ایسا لگتا تھا جیسے کسی لانڈری سے ابھی دھل دھلا کر نکلا ہے۔ شارک اسکن کی جھلکتی ہوئی سفید بش شرٹ اور کارڈرائی کی پتلون میں وہ خاصہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت نکھر گئی تھی۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ آنکھیں شفاف تھیں۔ سلطانہ کے ہمراہ کسی طرح بھی ناموزوں نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ سلمان نے اس کے روبرو خود کو کوڑے کے ڈھیر سے نکلے ہوئے مریل چوہے کی طرح حقیر محسوس کیا۔

نیاز بولا۔ "کہیں نوکری ووکری بھی ملی یا ابھی تک بے روزگاری کا چکر چل رہا ہے۔"

"نوکری کا ارادہ تو مدت ہوئی میں نے ترک کردیا۔"

"تو پھر کیسے کام چل رہا ہے؟" نیاز نے سلمان سے پوچھا۔

"کچھ سوشل کام کر رہا ہوں آج کل۔"

نیاز ہنسنے لگا۔ "ارے بھئی، اس سوشل کام وام کے چکر میں کہاں پڑے ہو۔ ذرا اپنی حالت تو

دیکھو۔ میں پہلے تو تمہیں پہچان ہی نہ سکا۔"

سلمان اس کی باتوں سے پریشان ہوگیا، کہنے لگا۔ "بیمار تھا۔"

نیاز بڑے سرپرستانہ انداز میں بولا۔ "بھئی لیڈری ویڈری تم کو زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔ میرا کہا مانو تو اس جھنجھٹ پر لعنت بھیجو۔ کل کسی وقت آکر مجھ سے ملو۔ تمہارے لیے نوکری کا بندوبست کرادونگا۔ میرا دفتر پاور ہاؤس کے برابر والی سڑک پر ہے۔ وہاں پر جس کسی سے پوچھو گے دفتر کا پتہ بتادے گا۔ میں عام طور پر نو بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں اور دو بجے تک ضرور رہتا ہوں۔ لو یہ میرا کارڈ رکھ لو۔" اس نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر سلمان کو دیا۔

سلمان اس کی باتوں پر سخت جھنجلایا۔ دل ہی دل میں کہا یہ سالا کباڑیا خود کو کیا سمجھنے لگا ہے۔ نہ جانے کیا چار سو بیس کر کے کچھ رقم پیدا کرلی۔ اب اس طرح بات کر رہا ہے جیسے دولت کے ساتھ اس کی عقل بھی بڑی ہوگئی۔ اس نے کسی قدر بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔ فی الحال مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں۔ اگر کبھی ایسا کام ہوا تو آپ سے ضرور ملوں گا۔"

سلمان نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی ہونٹوں سے لگا کر سلگانے ہی والا تھا کہ نیاز نے اپنا سنہری سگریٹ کیس کھولا اور سلمان کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"لو یہ ۵۵۵ پیو۔"

"شکریہ۔ میں بیڑی پیوں گا۔"

نیاز بے تکلفی سے بولا۔ "اماں اس خواہ مخواہ کے تکلف میں کیا رکھا ہے۔ اچھی چیزیں استعمال کرو تو باتیں بھی اچھی ہی اچھی سوجھتی ہیں۔"

اسی وقت سلطانہ نے بیزاری سے کہا۔ "چلئے دیر ہو رہی ہے۔"

نیاز نے پلٹ کر سلطانہ کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "یہ مسٹر سلمان ہیں۔ میرے پرانے ملنے والے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لیڈری کے چکر میں پڑ کر اپنی یہ حالت بنالی۔" وہ سلمان کی طرف سے صفائی پیش کرنے لگا۔ مگر سلطانہ نے سلمان کا ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔ بے نیازی سے اپنے لمبے سرخ ناخون دیکھتی رہی۔

نوٹس لینا: توجہ کرنا۔

سلمان کے لیے ایک ایک لمحہ دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ گھبرا کر
سے بولا۔ "اب میں چلوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"اچھا، اچھا! جی چاہے تو کبھی دفتر کی طرف چلے آنا۔" یہ کہتا ہوا نیاز آگے بڑھ گیا۔

سلطانہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کی خوبصورت صراحی دار گردن
اٹھی ہوئی تھی۔ چال میں تمکنت تھی۔ دونوں قریب کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گئے۔ کار نیاز ڈرائیو کر
رہا تھا۔ سلطانہ اس کے برابر ہی بیٹھی تھی۔ سلمان چپ چاپ کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ اسے گمان
سلطانہ ایک بار اس کی جانب ضرور دیکھے گی۔ مگر سلطانہ نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بڑے لاڈ
کے شانے پر جھک کر اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ دونوں مسکرا دیے۔

کار اسٹارٹ ہوئی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔ سلمان دور تک اسے خوابناک نظروں سے
رہا اس نے آگے بڑھتے ہوئے سوچا۔ سلمان! سلطانہ اب بہت دور جا چکی ہے اور تم دلدل میں
پڑے ہو اور اس دلدل میں گرنا تم نے خوشی سے منظور کیا ہے۔ اس لیے کہ تم معاشرے سے غلا
صاف کر دینا چاہتے ہو۔ تمہیں حسین چیزوں کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ خواہ وہ سلطانہ
چودھویں کا چاند۔ تم تو خوبصورتی کے حصول کے بجائے بد صورتی کو حسن میں ڈھالنے کے
جدوجہد کر رہے ہو۔

سلمان نے کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا تو لیا مگر وہ یہ نہ بھول سکا کہ اس کی زندگی
ایک لڑکی سلطانہ بھی آئی تھی جس نے ایک رات اس سے محبت کی بھیک مانگی تھی اور جس نے
اسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ایک نگاہ غلط انداز ہی ڈال لیتی۔ کیا وہ اس سے انتقام لے رہی
واقعی سلطانہ نے اسے حقیر سمجھا تھا؟ یہ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے سوالات اس کے ذہن میں ابھ
رہے ڈوبتے رہے۔ ڈوبتے رہے ابھرتے رہے۔ اسی الجھن میں وہ اس روز پوری یکسوئی کے
پڑھا بھی نہ سکا۔

رات اس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ پھر اس کی کتنی ہی راتیں بے چینی میں کٹیں۔
ایک روز وہ اسی بے چینی کے عالم میں علی احمد کے پاس پہنچا۔ یہ عذر پیش کیا کہ اس کی ماں کی طب
بہت خراب ہے۔ وہ چند روز کے لیے گھر جانا چاہتا ہے۔

دوبھر: مشکل۔ کرب: دکھ۔ صراحی دار: مراد لمبی۔ تمکنت: رعب، شان۔

علی احمد نے اس سے صرف اتنا کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے واپس آنے کی کوشش کرے۔ اس
سلمان کو ۲۰ روپے زادِ راہ کے طور پر دیے اور ایک بار پھر جلد آنے کی تاکید کی۔

دوسرے روز سلمان رات کی ٹرین سے سفر پر روانہ ہو گیا۔

(۳)

ستمبر کی ایک دھندلی صبح کو سلمان چپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی
لٹک رہا تھا۔ لباس ملگجا تھا اور سر کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع سے کسی
دواخانے کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔

اس کی آمد پر نہ کوئی ہلچل پیدا ہوئی نہ ہی کسی نے توجہ دی۔

گھر کا ہر فرد سرد مہری سے پیش آیا۔ باپ نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔ البتہ ماں کی مامتا بلک
وہ اسے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ چند لمحے اس کے چاروں طرف ہجوم رہا۔ پھر ہر
خاموشی سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ نہ کسی نے زیادہ بات چیت کی اور نہ اس پر
ت کی بوچھاڑ کی گئی۔

اس کے جھلسے ہوئے چہرے پر چھائی ہوئی ویرانی، دھنسی ہوئی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھالے ملگجے
نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

سلمان نے غور کیا کہ اس کی غیر حاضری میں گھر میں بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ باپ
ت سے ریٹائر ہو کر پنشن پر آ گیا تھا۔ اس نے لمبی ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ وہ بڑی پابندی سے پانچوں
نماز پڑھتا۔ سویرے تاروں کی چھاؤں میں اٹھ بیٹھتا اور دیر تک کلام پاک کی تلاوت کرتا۔
تہجد بھی پڑھتا۔ اس کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا جہاں وہ خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑایا
مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

نماز مغرب کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا اور صحن سے چپ چاپ گزرتا ہوا بیٹھک میں
بیٹھ جاتا۔ پاس پڑوس سے اس کے کچھ ہم سن بوڑھے آجاتے۔ وہ حقہ پیتے، پان چباتے اور

سرد مہری: بے مروتی، سنگدلی۔ ہم سن: ہم عمر۔

باتیں کرتے۔ ان کی گفتگو کا دائرہ بہت محدود ہوتا۔ کچھ بیتے دنوں کی یادیں کچھ ذاتی الجھنیں۔ کبھی دنیا کی بے ثباتی کا رونا۔ کبھی نئی پود کی بے راہ روی پر کڑھنا اور کبھی کبھار گردوپیش کی زندگی پر سرسری سا تبصرہ۔

باپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اطمینان قلب حاصل ہے۔ اسے فخر تھا کہ اس نے ۳۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے سرکاری ملازمت کی اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ہمیشہ افسران بالا کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ صاف ستھرا رہا۔ اسے سوا تین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ اسے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کا بیٹا سلمان نالائق رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلمان نائب تحصیل دار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا تھا۔ وہ بات بات پر رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی۔ مگر اب اسے کاٹھ کباڑ کی طرح ناکارہ قرار دے کر گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھری نما مختصر کمرے میں پڑی کھانسا کرتی، پان چبایا کرتی اور چھالیہ کترا کرتی۔ بلغم اور پان کی پیکوں سے اس نے دیواروں پر خوب گلکاریاں کی تھیں۔ وہ اپنی اولاد کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی اور اولاد اسے جاہل اور کوڑھ مغز قرار دیتی تھی۔

گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو اس کے کمرے میں باہر سے تالا لگا دیا جاتا اس لیے کہ وہ بڑی بے سروپا باتیں کرتی تھی۔ اس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے پھوہڑ پن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی جو بہت معیوب ہوتی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

لیکن یہی ایک ایسا وقت ہوتا جب وہ اپنی اولاد سے انتقام لے سکتی تھی۔ وہ اپنا ملگجا لباس پہنے جوتیاں گھسیٹتی سڑ سڑ کرتی ادبدا کے مہمانوں کے سامنے آ جاتی۔ دونوں لڑکیوں اور بہو کے چہرے سفید پڑ جاتے۔ وہ دانت کٹکٹا کر اسے گھورتیں تاکہ وہ جلد سے جلد نظروں سے دور ہو جائے۔ لیکن وہ سب کچھ نظرانداز کر کے عین مہمان کے سامنے آ کر بیٹھ جاتی اور دنیا جہان کے قضیے چھیڑ دیتی۔ بعد

بے ثباتی: ناپائیداری۔ پود: نسل۔ اطمینان قلب: دلی سکون۔ گل کاریاں: پھول بوٹے، نقش و نگار۔ کوڑھ مغز: بے عقل۔ بے سروپا: فضول۔ پھوہڑ پن: اجڈ پن، جہالت۔ معیوب: ناپسندیدہ۔ افشا: ظاہر۔ قضیے: جھگڑے۔

ِمرے کے اندر کہرام مچتا۔ ہر طرف سے اس پر لتاڑ پڑتی۔ وہ چیخ چیخ کر روتی۔ کوسنے دیتی اور اپنی بہن ُمر ہمیشہ کے لیے چلے جانے کی دھمکی دیتی۔ پھر ٹرنکوں اور صندوقوں سے کپڑے نکلتے۔ بندھتا اور اسٹیشن جانے کے لیے تانگا بلایا جاتا۔ یہ گویا سارے ڈرامے کا نقطہ عروج ہوتا۔ جانے قبل ماں ہر ایک کے گلے لگ کر سسکیاں بھرتی اور یہیں سے حالات معمول پر آنا شروع جاتے۔ سارا معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

جب بھی گھر میں مہمان آتے تو ان کے جانے کے بعد اکثر یہی ڈراما ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا مہانوں کی آمد سے پہلے ماں کے ڈھیروں مکھن لگایا جاتا۔ سو سو طرح سے اس کی خوشامد ہوتی۔ بار ہدایتیں دی جاتیں اور منت سماجت کر کے اسے کمرے میں بند کر دیا جاتا۔ مگر یہ اس کی مرضی پر رتھا۔ اس لیے کہ وہ کمرے کے اندر سے بھی شور مچا سکتی تھی اور اس کا یہ اقدام بہت ہی خطرناک تھا۔ چنانچہ کبھی تو ہنگامہ ٹل جاتا اور کبھی پاس پڑوس والوں کو بھی مہمانوں کی آمد کا پتہ چل جاتا۔

ماں کو سب سے زیادہ شکایت اپنی چھوٹی بیٹی سے تھی جس کے سپرد ان دنوں خانہ داری کا سارا ام و انصرام تھا۔ یہ ذمہ داری سنبھال کر اس نے ماں کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا جسے وہ کسی قیمت پر ثت نہیں کر سکتی تھی۔ اس حق سے محروم ہونے کے بعد اس کی حیثیت گھر میں ملازموں سے ہو گئی تھی۔ اب چھوٹی بیٹی کی حکمرانی تھی۔ وہ انٹرمیجیٹ کے فائنل ائر میں تھی۔ اسے جدید کے بھڑکدار لباس، میک اپ اور اپنی استانیوں کو نت نئے تحفے دینے کا شوق تھا۔ اس فضول ا کا اثر گھر کے بجٹ پر پڑتا اور ہمیشہ نزلہ ماں کے پاندان پر گرتا جو اس کا مونس تنہائی رہ گیا تھا۔ ہر بات سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اسے صرف پان سے دلچسپی تھی اور جب پان ملنے میں بھی اری پیش آتی تو وہ شعلے کی مانند بھڑک اٹھتی۔

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی اور ان دنوں چھٹیوں پر گھر آئی ہوئی اس نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا۔ لیکن وہ خود ایک ہی فلسفے میں یقین رکھتی تھی۔ اور وہ فلسفہ یہ کی گزیٹیڈ افسر سے شادی ہو جائے۔ اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ یک اپ کے باوجود آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں صاف نظر آتی تھیں۔ وہ گھر میں کسی سے کم بات چیت کرتی اور سب پر اس طرح حکم چلاتی گویا وہ اس کے تابعدار ہوں۔

ڈ: دھتکارنا، ملامت کرنا۔ بھڑک دار: چمکیلے۔ نزلہ گرنا: شامت آنا۔ مونس تنہائی: تنہائی کا ساتھی۔

گزیٹیڈ افسر شوہر سے مایوس ہو کر اب وہ غیر ملکی اسکالر شپ کے لیے کوشاں تھی۔ ان دنوں اس پر یہی دھن سوار تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے وزارت تعلیم کے ایک بڑے افسر کے بنگلے کے اتنے طواف کئے تھے کہ اس کے متعلق طرح طرح کے اسکینڈل مشہور ہو گئے۔

منجھلا بھائی نہر کے محکمے میں ملازم تھا۔ وہ سر تا پا تصنع تھا۔ اس پر مغربیت دیوانگی کی حد تک سوار تھی۔ اس کی بیوی گریجویٹ تھی۔ لہٰذا وہ اور بھی زیادہ انگریز بنتا جا رہا تھا۔ وہ سویرے اٹھ کر بیڈ ٹی پیتا۔ ناشتے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتا اور اخبار میں ہمیشہ ایسی خبریں تلاش کرنے کی کوشش کرتا جن میں ان افسروں کا ذکر ہوتا جن سے اس کی شناسائی تھی۔ دفتر جاتے وقت بیوی اسے دروازے تک چھوڑنے جاتی تھی جہاں وہ اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا اور بائی بائی کہتا ہوا چلا جاتا۔ بیوی کو ہمیشہ ڈارلنگ کہتا۔ ہالی وڈ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر نئے نئے انداز کے لباس پہنتا اور بڑا عجیب و غریب نظر آتا۔

وہ گھر میں روزانہ نت نئی تبدیلیاں کرتا رہتا۔ ایک روز پیتل کی ایک گھنٹی لے آیا جو کھانے کی میز پر رکھ دی گئی۔ ناشتے اور کھانے کے وقت اسے بجا کر باقاعدہ اعلان کیا جاتا کبھی بیوی کے لیے جمنازیم کا سامان لے آتا۔ سویرے بہت تڑکے اٹھتا اور اپنی نگرانی میں بیوی سے ورزش کرواتا۔ اسے طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ عام طور پر وہ اپنا ہر تجربہ بیوی پر آزماتا تھا۔ جب وہ موٹی ہو جاتی تو ڈائیٹنگ کرواتا۔ دبلی ہو جاتی تو مکھن اور دودھ کی مقدار میں ناپ ناپ کر اضافہ کرتا۔ وہ اپنے بچوں سے ہمیشہ انگریزی میں بات چیت کرتا۔ اگر کبھی ان کی زبان سے اردو کا لفظ سن لیتا تو آگ بگولا ہو جاتا۔ اس کے دو بچے تھے جو بہت کم سن تھے مگر انہیں کانونٹ میں داخل کرانے کے لیے اس نے ابھی سے کوشش شروع کر دی تھی۔

وہ کوئی بڑا عہدے دار نہیں تھا۔ آمدنی کم تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے وہ رشوت خوری کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی اور وہ یہ تھی کہ اسے بڑا آدمی سمجھا جائے۔ لیکن ماں اسے بڑا آدمی سمجھنے کے بجائے نرا کاٹھ کا الو سمجھتی تھی جس کا انتقام وہ اس طرح لیتا کہ اکثر رات کو بیئر کا ایک گلاس چڑھاتا اور نشے کی ترنگ میں ماں کو ڈانٹتا پھٹکارتا۔

دھن: جنون۔ طواف کرنا: چکر لگانا۔ تصنع: بناوٹ، دکھاوا۔ آگ بگولا ہونا: نہایت غصہ میں آنا۔ کاٹھ کا الو: بیوقوف، احمق۔

چھوٹا بھائی بی اے کر چکا تھا۔ وہ تمام وقت پڑھنے میں جٹا رہتا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا کی طرح سی ایس پی بن جائے۔ شاندار بنگلہ، جھلکتی کار، اردلی اور سر کہنے والے ماتحتوں کی پلٹن۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی بینائی خراب کر چکا تھا۔ وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھا۔

اسے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے میں کتابوں پر جھکا نظر آتا۔

❁ ❁ ❁

سلمان کئی برس بعد آیا تھا اور ان کئی برسوں میں اتنی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں کہ وہ اپنے ...ر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔

بظاہر اس کے بھائی بہنوں کے پروگرام مختلف تھے مگر سب کی منزل ایک ہی تھی۔ وہ اس ...ی تک پہنچ جانا چاہتے تھے جس پر چڑھ کر وہ اوپر کے طبقے میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر وہ خلا میں ...ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر تھیں تاکہ نیچے نہ دیکھ سکیں، صرف بلندی کو ...یں۔ وہ نیچے اترنا نہیں چاہتے تھے اور اوپر پہنچنا ان کے بس میں نہ تھا۔ انہیں ایک ایسے سہارے ...رت تھی جو ان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لے۔

سلمان اس لیے گھر آیا تھا کہ اس کی صحت کچھ سنبھل جائے گی اور جس ذہنی انتشار میں مبتلا تھا ...ل کمی آجائے گی۔ مگر ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹائی فائیڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا بیمار پڑا کہ ہفتوں بستر ...رہا۔ یہ اس کی زندگی کا بڑا اذیت ناک دور تھا اس کے بھائی بہنوں کا رویہ بڑا افسوس ناک تھا۔ ...ل کے قریب آکر نہ پھٹکتا۔ وہ اس سے اس طرح کتراتے جیسے وہ مجسم ٹائی فائیڈ کی بلا بن گیا تھا ...ب آتے ہی ان سے چمٹ جاتی۔

...ب مل کر قہقہے لگاتے۔ فلموں پر تبصرے کرتے۔ لباسوں کے نئے ڈیزائنوں پر بحث ...ر مگر کوئی اس کی علالت کے متعلق بات بھی نہ کرتا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑا تپتا رہتا۔ بے ...ے کروٹیں بدلا کرتا۔ ایک ایک چیز کو ترسا کرتا۔ منجھلے بھائی کو تو اپنی نت نئی مصروفیات کے

...معلق رہنا۔ اردلی: سرکار کی طرف سے ملنے والا نوکر۔ معلق: لٹکے ہوئے۔ انتشار: پریشانی، فکر۔ اذیت ناک: تکلیف دہ۔ دور:

باعث اس کے متعلق سوچنے تک کی فرصت نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی سی ایس پی بننے کی تیاری میں غرق تھا۔ وہ سلمان کے لیے صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور واپس آکر اس قدر احسان جتلایا تو کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی بہن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اس کی طرف آجاتی۔ مگر وہ بھی اس طرح کہ ناک پر رومال رکھ کر دروازے کی دہلیز ہی پر ٹھٹک جاتی۔ کھڑے کھڑے اشاروں سے اس کی طبیعت کا حال پوچھتی اور الٹے قدموں واپس چلی جاتی۔

ایک ماں کی ممتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی رہتی اور اکثر ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوا دیتی۔ اس کا سر دباتی۔ بخار کی شدت ہوتی تو اس کے تلوے سہلاتی۔ پیشانی پر کپڑا بھگو کر رکھتی۔ ہر طرح اسے تسلی دیتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بے کسی پر بے قرار ہو کر آب دیدہ ہو جاتا تو وہ اسے سمجھاتی اور سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رونے لگتی۔

❁ ❁ ❁

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ گھر کے سارے اخراجات قرض پر چل رہے تھے۔ سلمان کے لیے دوا بھی قرض پر آرہی تھی۔

وہ موسمی کا رس پینا چاہتا تھا۔ طویل علالت نے اسے بچوں کی طرح ضدی بنا دیا تھا۔ وہ ماں سے بار بار موسمبیاں منگوانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ ماں پہلے تو ٹالتی رہی پھر اپنی مجبوری پر رو پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

سلمان کو اپنی غلطی کا اچانک شدت کے ساتھ احساس ہوا۔

اس کے کمرے کے سامنے صحن تھا اور صحن کے مشرقی کونے پر اس کے منجھلے بھائی کا کمرہ تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے صاف نظر آتا تھا۔

لیٹے لیٹے سلمان کی نظر منجھلے بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دیکھا، کمرے میں میز پر بہت سے تازہ پھل رکھے تھے اور اس کا بھائی اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ اپنے ایک بیمار افسر کی عیادت کے لیے اسپتال جا رہا تھا اور یہ پھل، جن میں سرخ سرخ موسمبیاں بھی شامل تھیں، اسے پیش کرنے کے لیے بطور خاص منگوائے گئے تھے۔ سلمان نے سب کچھ خاموش

ٹھٹکنا: ذرا دیر کیلئے رکنا۔ آبدیدہ ہونا: آنکھوں میں آنسو آنا۔

نظروں سے دیکھا اور کسی اندرونی چوٹ سے بلبلا کر رہ گیا۔

ایک رات بخار کی شدت سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کا بدن انگیٹھی کی طرح سلگ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک پڑ گیا تھا۔ اس نے کئی بار ماں کو اپنی نحیف آواز سے پکارا مگر ماں کو بھی بخار تھا کوئی تشویش ناک مرض نہ تھا۔ مسلسل شب بیداری سے بیمار پڑ گئی تھی اور اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سلمان کچھ دیر تک آوازیں دیتا رہا پھر ہمت کر کے پلنگ سے نیچے اترا گھر پر سناٹا چھایا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ڈوبتے چاند کی زرد چاندنی چھت کی منڈیر پر جھلک رہی تھی۔ ہوا سرد تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سلمان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے صحن عبور کیا۔ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے ہانپنے لگا جہاں کھانے کی میز رکھی تھی۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی اور اس روشنی میں اس نے میز پر رکھا ہوا تھرماس دیکھ لیا۔

چند لمحوں تک وہ دروازے کا سہارا لیے ہانپتا رہا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے اور حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے سہارے چلتا ہوا میز کے قریب پہنچا۔ تھرماس کھولا۔ اس میں سے برف کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اچانک اس کے پیر زور زور سے کانپے اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے پردے لہرانے لگے۔ وہ چکرا کر وہیں گر پڑا۔

اسے نہیں معلوم وہ کب تک کمرے کے سرد فرش پر پڑا رہا۔ کب وہ اپنے بستر پر آیا؟ کون اٹھا کر لایا؟ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

ہوش آیا تو سب سے پہلی آواز جو اس نے سنی وہ اس کی بھاوج کی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

"تھرماس گر کر بالکل تباہ ہو گیا۔ پچھلے ہی مہینے تو خریدا تھا۔"

اس کے شوہر نے صرف اس قدر کہا۔ "ڈارلنگ! تم اس طرح پریشان ہو کر اپنی صحت خراب کرو گی۔ میں دوسرا تھرماس لے آؤں گا۔"

مگر وہ دیر تک غصے سے بڑبڑاتی رہی اور سلمان بستر پر پڑا اس کی آواز سنتا رہا۔ یہ اور ایسے ہی زخم اس نے بیماری کے دنوں میں اپنے دل پر کھائے اور ہر بار دکھ سے تڑپ کر رہ گیا۔

گرم ہونا، جلنا۔ نحیف: کمزور۔

❁ ❁ ❁

باپ فجر کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ واپسی پر سلمان کے کمرے میں بھی آتا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ جھک کر سلمان کی پیشانی چھوتا۔ کلائی تھام کر نبض دیکھتا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ اس کے سرہانے کھڑا زیرلب کوئی دعا پڑھتا رہتا۔

جب بھی وہ آتا، سلمان کی آنکھ کھل جاتی۔ اس وقت اسے اپنے باپ کے چہرے پر ایک مقدس نور نظر آتا۔ اس کی سفید ڈاڑھی آہستہ آہستہ حرکت کرتی اور آنکھوں میں بے بسی اور مظلومیت جھلکتی۔

سلمان خاموش لیٹا سوچتا رہتا کہ یہ بوڑھا کس قدر بدقسمت ہے۔ اس نے اپنی ساری جوانی موٹی موٹی فائلوں میں سر کھپاتے گزار دی۔ افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دس دس بارہ بارہ گھنٹے دفتر میں کاٹے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا پہنا اور روکھا سوکھا کھایا۔ نہ کبھی بالاخانے پر جانے کی اسے توفیق ہوئی نہ اسے مے خانے سے نکلتے دیکھا گیا۔ نہ کسی کی بانکی چتون نے اسے گھائل کیا اور نہ سہانی راتوں میں اس کی جوانی نے انگڑائیاں لیں۔ اس نے زائد سے زائد مشقت کی۔ کم سے کم خرچ کیا اور زائد سے زائد پس انداز کیا۔ اور یہ سب کچھ اس نے صرف اس لیے کیا کہ اس کی اولاد کا مستقبل روشن ہو جائے۔

وہ ہزاروں روپے جو اس نے اپنی خوشیاں نیلام کر کے کمائے تھے، اولاد کی تعلیم پر لگا دیے۔ اور اس کی تعلیم یافتہ اولاد اور ان پڑھ نیاز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سلمان سوچا کرتا کہ یہ بدقسمت بوڑھا کس قدر احمق ہے۔ اس سے زیادہ سمجھ دار تو نیاز کا باپ تھا جس نے اسے کوئی تعلیم نہیں دلائی۔ اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اس پر صرف نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اس سم سم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اس کے بہن بھائی سرگرداں تھے۔ لیکن نیاز نے اس سم سم کا سراغ لگا لیا تھا۔ ان پڑھ کباڑیا تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا۔ کوٹھی، کار اور بینک بیلنس۔ جیت کے تینوں کارڈ اس کے پاس تھے۔ وہ بڑا آدمی بن چکا تھا۔ اور وہ تینوں ابھی تک جیت کے ان تینوں کارڈوں کے خواب ہی دیکھ رہے تھے۔

زیرلب: منہ ہی منہ میں۔ بالاخانہ: رنڈی کا کوٹھا۔ مے خانہ: شراب خانہ۔ بانکی چتون: ترچھی نظر۔ پس انداز: بچت۔ گاڑھی کمائی: محنت سے حاصل کی گئی دولت۔ سرگرداں: مصروف۔

سلمان کو نیاز سے نفرت تھی اور اپنے بہن بھائیوں سے بھی۔ نیاز نے اسے اس لیے نظر ...ت سے دیکھا تھا کہ وہ قیمتی سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔ شان دار سوٹ نہیں پہنے تھا۔ اس کے پاس ...یں تھی۔ وہ مفلوک الحال انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی سنوارنا چاہتا تھا۔ اور ...ے بہن بھائی اس لیے اسے حقیر اور کم تر سمجھتے تھے کہ اس نے کوئی عہدہ کوئی منصب ہتھیانے ...شش نہیں کی۔ بینک بیلنس کیوں نہ بڑھایا؟ ان کے نزدیک عوام کی خدمت محض مسخراپن تھا، ...ر احماقت تھی۔ اس لیے کہ وہ بلندی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں مطلق احساس نہ تھا کہ ...کروڑوں ننگے بھوکے، کیڑے مکوڑوں کی مانند رینگ رہے ہیں جو ان ہی کی طرح انسان ہیں۔ ...کی خوشیاں اور غم ان سے مختلف نہیں ہیں۔

بیماری کے دنوں میں سلمان مسلسل ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور ان کا نفسیاتی ردعمل یہ ہوا کہ وہ ...ماندہ اور پریشان حال انسانوں کا دکھ درد بھول کر اپنے بہن بھائیوں سے انتقام لینے کی سوچنے لگا۔ ...انچا دکھانے کا پروگرام بنانے لگا۔

وہ اپنی تحقیر اور ذلت کا ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

❁ ❁ ❁

صحت یاب ہونے کے بعد سلمان نے فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور یہ ...چنے لگا کہ وہ کیا کرے؟

انہیں دنوں ماں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ شادی کر لے۔ ماں کی خواہش تھی کہ اس کی ...لائی میں وہ اپنا گھر بسا لے۔

یہ پروگرام دراصل اس کے باپ کا تھا اور بیوی کے ذریعے اس نے سلمان تک پہنچایا تھا۔ ...طبقے کے ایک عام باپ کی طرح اسے بھی سلمان کو راہ راست پر لانے کا ایک ہی مجرب نسخہ ...مجھ آیا اور وہ شادی کا پروگرام تھا۔

سلمان نے صاف انکار کر دیا۔

مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ چچا نے ...کی طرح اسے پالا پوسا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپیہ نقد دے گا اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دلوا دے

...لحال: تباہ حال، خستہ حال۔ مسخراپن: دل لگی۔ پس ماندہ: غریب۔ تحقیر: بے عزتی۔

گا۔ یہ سن کر سلمان کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

اس نے سوچا زندگی میں آگے بڑھنے اور شادمانی و کامرانی حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ صرف چور دروازے سے اندر داخل ہوا جا سکتا ہے اور صوبائی اسمبلی کے ممبر کے پاس اس چور دروازے کی کنجی ضرور ہوگی۔ چنانچہ چند روز تک سوچ بچار کرنے کے بعد وہ شادی پر رضامند ہو گیا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

اس کے باپ نے روپیہ قرض لے کر خرچ کیا۔ اس لیے کہ وہ صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر کا سمدھی بننے جا رہا تھا۔

شادی میں شہر کے اعلیٰ حکام اور معززین کے علاوہ تین وزیر بھی شریک ہوئے۔ لہٰذا اتما مقامی اخبارات میں شادی کی تقریب کی تصاویر بھی شائع ہوئیں جن میں سلمان کے بجائے وزیر دولھا معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ ایک اخبار نے، جسے سرکاری اشتہارات کی اشد ضرورت تھی، دولھا کو بھی نکال دیا اور تصویر میں صرف وزیروں ہی کو رہنے دیا جس میں وزیر اطلاعات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا تھا۔

سلمان کو شب عروسی ہی پر اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیوی سیدھی سادھی گھریلو لڑکی ہے۔ اس نے میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔ اس کا ذہن گویا گیلی مٹی تھا جسے وہ کمہار کی طرح جس سانچے میں چاہتا ڈھال سکتا تھا۔

وہ اس کی توقع سے زیادہ دل کش اور معصوم نکلی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار روپے نقد ملے تھے اور ملازمت کے لیے چچا سسر نے حسب وعدہ کوشش شروع کر دی تھی۔

شادی کے تیسرے ہی ہفتے سسر کا خط آیا کہ فوراً کراچی پہنچو۔ ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سلمان نے بیوی کو گھر پر چھوڑا اور اسی روز پہلی ٹرین سے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

شادمانی و کامرانی: خوشی و کامیابی۔ سمدھی: دلہن اور دولہا کے باپ آپس میں سمدھی ہوتے ہیں۔ شبِ عروسی: شادی کی پہلی رات۔

فصل دوازدہم

(۱)

گلابی جاڑوں کی غبار آلود دوپہر تھی۔ نوشا ٹرام کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اس وقت یلا ہی تھا۔ چکرم کی ڈیوٹی استاد پیڈرو نے نمائش پر لگا دی تھی اور نوشا کو پوکر کی ٹیم میں شامل کر ا۔ چار بجے اسے پوکر سے صدر کے ایک ایرانی چائے خانے میں ملنا تھا۔ ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ گزارنے کے لیے اس نے سوچا ٹرام پر کیماڑی تک ایک چکر ہی لگا لیا جائے۔ ممکن ہے کوئی شکار ل جائے۔

اب وہ کبھی کبھار اکیلے بھی کام کر جاتا تھا۔ حالانکہ استاد پیڈرو کی سخت ہدایت تھی کہ بغیر ٹیم کوئی کاریگری نہ دکھائی جائے۔ اس میں خطرہ بہت تھا۔ مگر اب نوشا جیب تراشنے کے فن میں انجھ گیا تھا اور اس قدر نڈر ہو گیا تھا کہ سیکڑوں کے ہجوم میں جیب صاف کر دیتا۔

نوشا خاصی دیر سے ٹرام کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر کوئی ٹرام آتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اکتا کر وہ ہی چل دیا۔ راہ گیر تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ دکانوں پر سناٹا تھا۔ دو رکشا والے فٹ پاتھ کے اپنی اپنی رکشاؤں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ فضا بڑی بوجھل تھی۔ نوشا نے پتلون کی جیبوں میں ڈال لیے اور ہولے ہولے سیٹی بجاتا ہوا بلا مقصد بندر روڈ پر چلنے لگا۔ کچھ دور تک وہ اپنی دھن اسی طرح فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ ایک موڑ پر کسی گداگر نے صدا لگائی۔

"سخی بابا، اللہ کے نام پر اس محتاج کو کچھ دیتا جا۔"

ے: ہلکی ہلکی سردی کا موسم۔ کاریگری: مہارت، یہاں مراد جیب تراشنے کی مہارت ہے۔ منجھنا: تجربہ کار ہونا۔

نوشا اس صدا پر توجہ دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ آواز کچھ مانوس اور جانی پہچانی سی ہے۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ایک دیوار کے سائے میں فٹ پاتھ پر ایک گداگر سکڑا سکڑایا پڑا ہے۔ اس کے جسم پر بہت بوسیدہ لباس تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ داہنا ہاتھ خیرات کے لیے آگے بڑھا تھا۔

نوشا نے غور سے گداگر کے چہرے کو دیکھا۔ ذہن کو ایسا شدید جھٹکا لگا کہ وہ تکلیف سے کانپ اٹھا۔ یہ راجہ تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ سکڑا سکڑایا جسم کسی سڑتی ہوئی لاش کی طرح گھناؤنا نظر آرہا تھا۔ نوشا نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ قدموں کی آہٹ پاکر راجہ نے ایک دردناک صدا بلند کی۔ اس کے بدن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ جگہ جگہ پھنسیاں تھیں جن سے رطوبت بہہ رہی تھی۔

نوشا نے آہستہ سے آواز دی۔ "راجہ!"

راجہ نے آنکھیں کھول دیں اور نوشا کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ خوشی سے چیخ پڑا۔ "نوشا!" وہ ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا۔

نوشا نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "یار! یہ تیری کیا حالت ہوگئی؟" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس کی بات سے راجہ کو دکھ پہنچا۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے مسرت کی جو رمق ابھری تھی اس نے فوراً دم توڑ دیا۔ وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔

"میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔" اس کا لہجہ بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ تھا۔ آواز میں ایک رقت تھی جیسے شدید کرب میں مبتلا ہو۔

نوشا نے کہا۔ "یار! تو تو اسپتال بھیج دیا گیا تھا وہاں علاج نہیں ہوا؟"

راجہ کے ہونٹوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ ابھری۔ "اسپتال والوں نے میری ایک ٹانگ کاٹ ڈالی اور کوڑھیوں کے اسپتال بھیج دیا۔ کئی روز تک وہاں پڑا رہا۔ مگر اسپتال میں جگہ نہیں تھی۔ ایک روز چوکیداروں نے زبردستی اٹھا کر مجھے ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ جب سے یونہی دربدر کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔"

نوشا خاموش بیٹھا رہا۔ راجہ آہستہ آہستہ کہتا رہا۔ "ایک حکیم جی کو دکھایا تھا۔ وہ کہنے لگے تم

گھناؤنا: خوفناک۔ رمق: امید۔ کوڑھی: کوڑھ کا مریض۔ دربدر کی خاک چھاننا: جگہ جگہ پھرنا۔

آتشک ہے۔"

"یہ آتشک کیا بیماری ہوتی ہے؟"

"سنا ہے رنڈی بازوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے۔"

نوشا نے پریشان ہو کر کہا۔ "یار تو نے تو کبھی ایسی حرکت کی نہیں۔"

"میں نے حکیم جی سے یہی بات کہی تو وہ بولے تمہارے باپ کو یہ مرض ہوگا۔ یہ خاندانی ہوتی ہے۔ اکثر مریضوں کو ورثے میں ملتی ہے۔"

"تو پھر تم نے کچھ علاج ولاج کروایا؟"

سڑی ہوئی لاش میں سے پرانا راجہ جاگ اٹھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "یار تو بھی کرتا ہے۔ ابے علاج کوئی پھوکٹ میں ہوتا ہے۔ اس میں رقم لگتی ہے۔"

نوشا اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔ "یہ تو بتاؤ آج کل رہتے ہو؟"

"اپنا بھی کوئی گھربار ہے۔ جہاں جی چاہا پڑ رہا۔ کوئی ہفتہ بھر سے تو یہیں پڑا ہوں۔" لمحہ بھر کے راجہ خاموش رہا۔ "مگر یہ تو بتا تو آج کل کیا کر رہا ہے؟ ویسے تو تیرے بڑے ٹھاٹھ دکھائی دیتے بڑی لائٹ مار رہا ہے۔ کہیں نوکری ووکری کرلی؟"

نوشا صاف بات نہ بتا سکا۔ "ہاں یار ایک جگہ نوکری ہی کرلی ہے۔"

"مزے میں گزر بسر ہوتی ہے؟"

"بالکل۔" نوشا نے مختصر جواب دیا۔

راجہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "یار نوشے! تو مجھے ایک بیساکھی دلوادے۔" اس نے پاس پڑے ڈنڈے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سالے سے دو قدم چلنا مصیبت ہو جاتا ہے۔ میں نے ا کے لیے دس روپے جمع کئے تھے۔ کوئی سالا چوٹٹا سوتے میں نکال لے گیا۔" راجہ نے اسے گالی دی۔ دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "نوشا! تو مجھے بیساکھی ضرور دلوادے۔ تیرا بہت بڑا احسان مجھے بہت تکلیف ہے۔"

"یار اس میں احسان کی کونسی بات ہے۔" نوشا نے اس کی دل جوئی کی۔ "میں جلد ہی تجھے

ایک جنسی بیماری۔ پھوکٹ: مفت۔ دل گرفتہ: رنجیدہ۔

بیساکھی دلوادوں گا۔"

وہ گھنٹہ بھر تک راجہ کے پاس رہا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا۔ چلتے وقت اس نے راجہ کو ایک روپیہ دیا اور کھانے کے لیے جو کچھ مانگا خرید کر دے دیا۔ راجہ صبح سے بھوکا تھا۔

راجہ سے مل کر نوشا کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بار بار اسے راجہ کی بے کسی کا خیال آتا۔ اس نے سوچا راجہ کے لیے اسے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ دوسرے روز وہ پھر اس کے پاس گیا۔ اس دفعہ وہ اس کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے گیا۔

اب وہ اکثر راجہ کے پاس جاتا اور کچھ نہ کچھ اسے دے کر آتا۔ راجہ کے لیے اس نے ایک بیساکھی بھی خریدی جس کے سہارے وہ چلنے پھرنے لگا تھا۔ چوہے کی کھال کا سا گھناؤنا لباس اتروا کر نیا جوڑا پہنا دیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کہیں رہنے کی جگہ مل جائے تو اس کے ایک حصے میں راجہ کی رہائش کا بندوبست کر دے۔

سردی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ راجہ رات بھر شبنم میں پڑا بھیگا کرتا اور سردی سے کانپتا رہتا۔ رہنے کو مکان تو نہ مل سکا البتہ ایک اونچی عمارت کی دیوار کے ساتھ ترپال ڈال کر نوشا نے سائبان بنا دیا جس کے نیچے راجہ رہنے لگا۔

راجہ کے لیے وہ جو کچھ کر رہا تھا، اس سے نوشا کو بڑی خوشی ہوتی۔ یہ عجیب سی خوشی تھی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔ وہ محض جیب کترا نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ راجہ کی بیماری دور ہو جائے۔

ایک روز وہ راجہ کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ مگر وہ علاج کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور یہ مشورہ دیا کہ اسے کوڑھ ہے۔ کوڑھیوں کے اسپتال لے جاؤ۔ مگر نوشا اسے کسی اسپتال نہ لے گیا۔ اسے خوف تھا کہ جس طرح اسپتال والوں نے ٹانگ کاٹ کر لنگڑا بنا دیا اسی طرح اس کے جسم کا کوئی اور حصہ نہ کاٹ دیں۔

ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر وہ راجہ کو ایک حکیم کے پاس لے گیا۔ اس نے دونوں کی بہت ڈھارس بندھائی۔ اس کا خیال تھا کہ راجہ کا مرض لاعلاج نہیں ہے۔ اگر پابندی سے علاج کرایا جائے تو وہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اس علاج کے لیے اس نے ڈھائی سو روپے طلب کیے۔

مکدر: غمگین۔ ترپال: ایک موٹے کپڑے کی چادر۔ ڈھارس بندھانا: حوصلہ دینا، ہمت بڑھانا۔

نوشا اس وقت تو راجہ کو خاموشی سے واپس لے آیا۔ مگر اب اس پہ یہ دھن سوار تھی کہ کسی طرح ڈھائی سو روپے مہیا کیے جائیں تاکہ راجہ کا باقاعدہ علاج ہو سکے۔ چنانچہ پو کر کے ساتھ جیب تراشی کرنے کے علاوہ وہ اکیلا بھی کاریگری کے ہاتھ دکھانے لگا اور اس رقم کو استاد پیڈرو سے پوشیدہ رکھتا۔

اسے ڈھائی سو روپے کی ضرورت تھی تاکہ راجہ کا علاج کرا سکے۔

❁ ❁ ❁

نوشا نے میریئٹ روڈ سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر کو بھانپا۔ وضع قطع سے وہ دکان دار لگتا تھا۔ نوشا کا اندازہ تھا کہ اس کے پاس لمبی رقم ہے۔ اس نے سوچا اگر داؤں لگ جائے تو آج ہی راجہ کے علاج کی پوری رقم نکل آئے گی۔ رات کے نو بجے تھے۔ سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ راستوں پر سناٹا بڑھ گیا تھا۔ دو بار نوشا نے اسے گھیرا مگر وہ ہتھے نہیں چڑھا۔ نوشا نے ہمت نہ ہاری۔ برابر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ شخص سڑک سے مڑ کر ایک گلی میں گھس گیا۔

گلی سنسان تھی اور روشنی کم تھی۔ گلی کشادہ بھی نہ تھی۔ دونوں جانب کئی کئی منزلہ اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ نوشا سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس نے پتلون کی جیب میں پڑا ہوا چاقو نکال کر آہستہ سے کھول لیا اور جب وہ ایسی جگہ پہنچا جہاں اندھیرا زیادہ تھا نوشا جھپاک سے اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کھلا ہوا چاقو سینے پر رکھ کر بولا۔

"جو کچھ جیب میں ہے نکال کر چپ چاپ دے دو۔"

اس نے گھبرا کر نوشا کو دیکھا جو اندھیرے میں بھوتوں کی مانند خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا جس کی جھلکتی ہوئی نوک عین سینے پر تھی۔ اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے خوف سے منہ پھاڑ دیا مگر آواز نہ نکلی۔ نوشا نے حواس باختہ اور خاموش پا کر خود ہی اس کی جیب سے پرس نکال لیا۔

نوشا نے پرس نکال کر اپنی جیب میں رکھا ہی تھا کہ گلی میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ دو سائے فلیٹ کی کھڑکی سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں نظر آئے۔ دونوں راہ گیر اسی طرف آ رہے تھے۔ نوشا نے اس شخص کا بازو پکڑ کر اندھیرے میں گھسیٹا۔ ڈپٹ کر بولا۔

ہتھے چڑھنا: قابو نہ آیا۔ گھگی بندھ جانا: ڈر کے مارے بول نہ سکنا۔

"آواز نکلی تو پورا چاقو اتار دوں گا سینے میں۔"

وہ خوف سے کانپ رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوشا کو گھور رہا تھا۔ دونوں اندھیرے میں ایک دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ چاپ گلی کے پتھریلے فرش پر ابھر رہی تھی۔ ان کے جوتے بھاری بھاری لگتے تھے۔ نوشا کو شبہ ہوا کہیں وہ پولیس والے نہ ہوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ کسی قدر گھبرا گیا۔

قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ، قریب اور قریب اور قریب۔

اچانک نوشا کے کھلے ہوئے چاقو کی زد میں کھڑے ہوئے خوف زدہ آدمی نے حلق سے آواز نکالی یہ آواز اتنی ہیبت ناک تھی کہ تنگ و تاریک گلی کے در و دیوار لرز کر رہ گئے۔ ساتھ ہی وہ چلانے لگا۔

"بچاؤ! بچاؤ۔"

نوشا نے اس کے کھلے ہوئے منہ پر پوری قوت سے مکا مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ مگر سنبھلنے کے ساتھ ہی اس نے پھر دہاڑنا شروع کر دیا۔ اب نوشا کے لیے وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ اس نے اندھیری گلی میں بھاگنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک فلیٹوں کی کھڑکیاں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ گھبرائے ہوئے لوگ بالکونیوں سے نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ بعض نے اونچی آوازوں سے بولنا بھی شروع کر دیا۔

گلی میں داخل ہونے والے دونوں راہ گیر واقعی پولیس والے تھے۔ شور سن کر پہلے تو وہ ٹھٹکے اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اسی وقت ان کے سامنے ایک سایہ تیزی سے لہرایا۔ کوئی تیز رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ یہ نوشا تھا۔ دونوں نے فوراً اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

نوشا کچھ دور تک بھاگتا رہا پھر وہ داہنے ہاتھ مڑنے والی گلی میں گھس گیا۔ یہ گلی بھی تاریک تھی۔ اس کے قدموں کی آوازیں گلی کے پتھریلے فرش پر ابھر رہی تھیں۔ وہ گلی میں پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ سے ٹھوکریں کھاتا، لڑکھڑاتا، سرپٹ بھاگتا رہا۔ اس کی پشت پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کے قدموں کی آہٹ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ دونوں کانسٹیبل زور زور سے سیٹیاں بجا کر خطرے کا اعلان کر رہے تھے۔

دوڑتے دوڑتے نوشا کی سانس پھول گئی۔ قدم ڈگمگانے لگے۔ اچانک ایک نئی مصیبت سامنے آ گئی۔ اب گلی کے دوسرے نکڑ پر بھی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دھندلی روشنی میں انسانی شکلیں نظر

...تھیں۔ آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے اپنی رفتار سست کر دی اور ایک مکان کی دیوار ...لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دیوار میں کھڑکی تھی۔ نوشا نے کھڑکی پر ہاتھ رکھا اور امید موہوم کے ساتھ ...چاہا کہ شاید کھڑکی کھل جائے۔

کھڑکی کا ایک پٹ ہاتھ رکھتے ہی کھل گیا۔ وہ اچک کر اس پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ اس نے فوراً ...کی بند کر دی اور چوکھٹ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نوشا جس جگہ کھڑا تھا، وہ ایک تنگ غلام گردش تھی۔ غلام گردش جہاں ختم ہوتی تھی وہاں ...جنوبی سمت لکڑی کا زینہ تھا جس کی سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی تھیں اوپر سے ہلکی ہلکی روشنی ...رہی تھی جو زرد دھبے کی طرح دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ نوشا دھندلی دھندلی روشنی میں دم بخود ...ا تھا۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ وہ منہ کھولے بری طرح ہانپ رہا تھا۔

(۲)

گلی میں ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ پتھریلے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ...رہی تھی اور تیز تیز بجتی ہوئی سیٹیاں چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسی اثناء میں زینے کی ...ی پر ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی۔ کوئی آہستہ آہستہ چوبی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ ابھرتی رہی۔ روشنی زینے سے نکل کر غلام گردش کی دیواروں پر پھیلنے لگی۔ ...تے دیکھتے زینے پر سایہ ابھرا۔ ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ اس کی مختصر سی ڈاڑھی تھی۔ سر گنجا تھا۔ ...ھوں پر چشمہ تھا۔ وہ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں شمع دان تھا جس میں موم بتی ...ن تھی۔ وہ کمر کو ذرا سا خم دے کر چل رہا تھا۔ نوشا بدحواس ہو کر دیوار سے چمٹ گیا۔ اس نے کھلا ...چاقو مضبوطی سے تھام لیا اور بوڑھے کو سہمی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا۔

بوڑھا زینے سے اتر کر غلام گردش میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جب فاصلہ ...قدم رہ گیا تو اس کی نگاہ نوشا پر پڑی۔ وہ رک گیا۔ اس کا ہاتھ آہستہ سے کپکپایا۔ موم بتی کی لو زور

موہوم: ہلکی سی امید۔ غلام گردش: مراد برآمدہ، گیلری۔ اسی اثناء میں: اسی دوران۔ چوبی: لکڑی کی بنی ہوئی۔ لو: شعلہ۔

سے تھر تھرائی۔ غلام گردش میں بہت سی دھندلی دھندلی پرچھائیاں جھومنے لگیں۔ نوشا نے ایک لمحے کا بھی انتظار نہ کیا۔ جھپٹ کر اس کے سامنے کھلا ہوا چاقو بڑھا کر بولا۔

"آواز نکلی تو پورا چاقو سینے کے اندر ہوگا۔"

بوڑھے نے حیرت زدہ نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ کھلے ہوئے چاقو کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ نہ اس نے جسم کو کوئی حرکت دی اور نہ زبان سے ایک لفظ نکالا۔ نوشا ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ اس کے جس ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اس میں ہلکی سی تھر تھراہٹ تھی۔

بوڑھے نے اس کی گھبراہٹ اور ہاتھ کی تھر تھراہٹ کو محسوس کیا۔ سنبھل کر نرمی سے بولا۔

"گھبراؤ نہیں۔ تم یہاں قطعی محفوظ ہو۔"

نوشا کھلا ہوا چاقو تانے اسی طرح کھڑا رہا۔ بوڑھا اسے بڑا عجیب و غریب معلوم ہوا۔

"ڈرو مت۔" اس دفعہ بوڑھے کا لہجہ صاف اور پر اعتماد تھا۔ "میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھ سے تم اس قدر کیوں ڈر رہے ہو؟ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ مڑا۔ لیکن نوشا اس کے ہم راہ جاتے ہوئے جھجکنے لگا۔ البتہ اس نے چاقو نیچے کر لیا تھا۔ بوڑھے نے بڑے مشفقانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "بھئی تم مجھ سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ آؤ، گھبراؤ مت۔"

اس کے لہجے میں اس قدر نرمی اور اپنائیت تھی کہ نوشا کے قدم خود بخود اٹھ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ زینے کے عین مقابل دروازہ تھا بوڑھا اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نوشا بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ یہ مختصر کمرہ تھا۔ اس کے آگے تنگ راستہ تھا۔ دونوں کمرے سے گزر کر باہر آگئے۔ سامنے دروازہ تھا جس کی جھری سے روشنی پھوٹ کر باہر آرہی تھی۔ مگر وہ اس طرف نہیں گیا۔ دوسری طرف مڑ گیا۔ کچھ دور آگے چل کر اس نے ایک دروازہ کھولا۔ نوشا نے دیکھا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ اس میں کتابوں سے بھری ہوئی تین الماریاں تھیں۔ لمبی میز تھی جس پر بہت سی کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔

جھری: درز، شگاف۔

بوڑھے نے شمع دان میز پر رکھ دیا تھا جس میں جلتی ہوئی موم بتی کی لو ہولے ہولے تھر تھرا رہی تھی۔ بوڑھا ایک کرسی پر تھکا ہوا سا بیٹھ گیا۔ اس نے نوشا کو برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نوشا چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ بوڑھے نے میز پر رکھا ہوا پائپ اٹھایا۔ تمباکو بھری اور اسے سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ اچانک رات کے سناٹے میں ایسی آواز ابھری جیسے کوئی رک رک کر کراہ رہا ہو۔ نوشا نے چوکنا ہو کر کان کھڑے کیے۔ وہ کسی نا معلوم خوف سے لرز اٹھا۔ بوڑھا خاموشی سے پائپ پر کش لگاتا رہا اور تمباکو کا تیز بودار دھواں کمرے میں بکھیرتا رہا۔

❂ ❂ ❂

کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ سولہ سترہ برس کی ایک سرو قد لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا جسم اونی شال میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بوڑھے کے پاس جا کر گویا ہوئی۔

"ابا جان! ابھی تک بجلی نہیں آئی۔ سارے گھر میں اندھیرا ہو رہا ہے۔"

وہ جیسے چونک پڑا۔ "اوہ بجلی۔ میرا خیال ہے مجھے ڈاکٹر رفیق کے گھر سے ٹیلی فون کر دینا چاہیے۔" لمحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔ "مگر اب تو ڈاکٹر سو گیا ہوگا۔"

وہ بولی۔ "آپ تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون ہی کرنے تو گئے تھے۔"

"ہاں گیا تو میں ضرور تھا۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے نوشا کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تم، یعنی تم؟ میرا مطلب ہے۔" وہ ہکلانے لگا۔ "اوہو ہو بھئی معاف کرنا۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو۔ دیکھو نادرہ! یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ان کو گرم گرم دودھ لا کر پلا دو۔ اور بھئی مجھے بھی ایک گرم پیالہ کافی کا مل جائے تو کیا بات ہے؟" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

نادرہ نے مزید بات چیت نہیں کی۔ کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑی۔ بوڑھے نے جاتے جاتے اسے ٹوکا۔ "کیا تمہاری ماں پر پھر دورہ پڑا ہے؟"

"جی ہاں، مگر اب ان کو نیند آگئی ہے۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا اور وہ باہر چلی گئی۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ بوڑھا کسی

سرو قد: لمبے قد کی۔

گہری سوچ میں ڈوب گیا اور آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگانے لگا۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا گنجا سر چمک رہا تھا۔ چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں خوابیدہ خوابیدہ سی معلوم ہو رہی تھیں۔

نادرہ دونوں ہاتھوں میں طشت سنبھالے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ طشت پر دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور کافی کی پیالی تھی۔ اس نے میز پر جھک کر طشت رکھا۔ اس کا چہرہ موم بتی کی زرد روشنی کے سامنے آ گیا۔ نوشا نے غور سے دیکھا اور سوچنے لگا، لونڈیا زوردار ہے۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ البتہ خدوخال سبک تھے۔ آنکھیں کنول کی طرح شفاف تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ اس پر ہلکی ہلکی سنجیدگی چھائی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور بڑی بے باکی سے نوشا کو دے دیا۔ نہ وہ جھجکی نہ شرمائی۔

وہ کمرے میں زیادہ دیر نہ رکی۔ نوشا نے دودھ کا گلاس ختم کیا تو اسے اپنے جسم میں کسی قدر تازگی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ رات بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ اسے چلنا چاہیے۔ اسی وقت بوڑھے نے اس سے پوچھا۔ "تم نے کسی کو قتل کیا ہے؟"

"نہیں۔" نوشا نے انکار میں گردن ہلائی۔

"چوری؟" بوڑھے نے دوسرا سوال کیا۔

نوشا نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں" اور ندامت سے گردن جھکالی۔

بوڑھے نے گہری سانس بھری۔ ذرا دیر کچھ سوچتا رہا پھر گویا ہوا۔ "تمہاری عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ مگر تم جرائم پیشہ کیسے بن گئے؟" پھر خود ہی چونک کر اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہیے۔ یہ بات تمہیں خود بھی نہیں معلوم ہوگی۔ تمہیں ابھی بہت سی باتیں نہیں معلوم۔ مثلاً یہ کہ اگر میں تم سے کہوں کہ تم انجینئر، ڈاکٹر، قانون داں، سائنس داں، ماہرِ تعلیم، مصنف اور مصوّر بن سکتے ہو تو یہ تمہارے لیے بڑی حیرت انگیز بات ہوگی۔"

نوشا کو واقعی اس کی بات پر تعجب ہوا۔ وہ ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ کہتا رہا۔ "کیا تم اپنی زندگی کی نہج نہیں بدل سکتے؟" اس نے رک کر ایک بار پھر اپنا جملہ دہرایا۔ "نہج

خوابیدہ: سوئی ہوئی۔ طشت: بڑی پلیٹ، ٹرے۔ خدوخال: چہرے کے نقوش۔ سبک: باریک۔ بے باکی: جرأت، بہادری۔ ہونق: بیوقوف۔ نہج: انداز، طریقہ۔

ہمارے لیے مشکل لفظ ہے۔ مجھے یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ یوں سمجھو!" وہ پھر الجھا۔ "بھئی ...ی کرنا ہم نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ میرا نام کلیم اللہ ہے۔ میں گورنمنٹ کالج میں ریاضی کا پروفیسر ہوں۔ کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"نوشا۔"

پروفیسر نے مسکرا کر نوشا کو دیکھا۔ "نوشا یعنی دولہا۔ بھئی تمہارا نام تو خوب ہے۔ گو میں اس بات کا قائل نہیں کہ نام کا اثر کردار پر پڑتا ہے۔ مگر تمہارے نام میں بڑی رجائیت ہے۔ غالب کی عرفیت بھی مرزا نوشہ تھی۔ تمہیں تو شاعر ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جس نے یہ نام رکھا ہوگا اس کا مزاج ضرور شاعرانہ ہوگا۔" کہتے کہتے وہ رک گیا۔ حسبِ معمول چونک کر بولا۔

"بھئی معاف کرنا۔ میں ذرا بہک گیا تھا۔ ہمارے ملک میں لوگوں کو ناموں کی معنویت کا اتنا شعور ہی کہاں ہے۔ سچ پوچھو تو اتنا شعور کہیں نہیں ہوتا۔ ورنہ ایک اچھے بھلے انگریز ادیب کا نام مسٹر ڈرنک واٹر نہ ہوتا۔ ڈرنک واٹر تم جانتے ہو۔ اس کا مطلب ہے پانی پیو۔ لاحول ولا قوۃ، کیا مسخرا پن ہے، یہ بھی بھلا کوئی نام ہوا۔"

وہ بے تکان بولتا جا رہا تھا۔ نوشا خاموش بیٹھا اس کا منہ تک رہا تھا۔ پروفیسر کی باتیں اس کی سمجھ میں مشکل سے دس فی صد آ رہی تھیں۔ وہ بہت جلد اکتا گیا۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں جمائی لے کر انگڑائی لی۔ پروفیسر نے نوشا کی عدم دلچسپی اور اکتاہٹ کو محسوس کیا۔

"اوہو تم کو نیند آ رہی ہے۔ تم کو اب سو جانا چاہیے۔"

نوشا نے فوراً کہا۔ "میں اب جاؤں گا۔"

"رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ کیا اس وقت تمہارا جانا مناسب ہوگا؟"

"میں چلا جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"تم مجھ سے آئندہ ضرور ملنا۔ تم ابھی عادی مجرم نہیں بنے ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب تم ...چاقو تانے کھڑے تھے تو تمہارا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ابھی اناڑی ہو۔" لمحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔

"کیا تم کبھی جیل بھی گئے ہو؟"

رجائیت: امید۔ شعور: عقل، سمجھ۔ بے تکان: مسلسل، لگاتار۔ اناڑی: ناتجربہ کار۔

نوشا نے بڑے سادگی سے جواب دیا۔ "ہاں۔"

پروفیسر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ "تم جیل بھی جا چکے ہو۔ پھر بھی اناڑی ہو۔ سلسلے کی کوئی درمیانی کڑی ضرور غائب ہے۔ میرا سارا تجزیہ غلط ہو گیا۔" اس نے حیرت زدہ نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ "بہر حال تم مجھ سے ضرور ملنا۔ آؤ میں تم کو دروازے تک پہنچا دوں۔"

اس نے شمع دان اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ دونوں زینے سے اتر کر نیچے آئے اور غلام گردش عبور کر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ نوشا نے دروازے سے نکلتے ہوئے مڑ کر پروفیسر کو دیکھا۔ موم بتی کی روشنی میں وہ سرکس کے مسخرے کی طرح اول جلول نظر آ رہا تھا۔

نوشا باہر گلی میں پہنچ کر سوچنے لگا۔ یار کس اوندھی کھوپڑی سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ سالا نہ جانے کونسی ایران توران کی ہانک رہا تھا۔ کہنے لگا یہ کام چھوڑ دو۔ پھر کیا کرو؟ جھک مارو۔ کیا کیا اڑا رہا تھا۔ انجینئر، ڈاکٹر، قانوں داں اور نہ جانے کیا اناپ شناپ بنا رہا تھا۔ بھئی حد ہو گئی۔ بھلا میں کیسے انجینئر یا ڈاکٹر بن سکتا ہوں۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے اور اپنی قسمت میں تو ہاتھ کی صفائی دکھانا لکھی ہے۔

یہ سوچتے سوچے اس نے جیب سے پرس نکال کر دیکھا۔ اس میں پونے دو سوسے اوپر روپے تھے۔ خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ دل ہی دل میں کہا۔ یار اپنے کام کی بھی کیا بات ہے۔ منٹوں میں چاندی کٹتی ہے۔ استاد پیڈرو سچ کہتا ہے یہ کچی کیمیا ہے۔ بس ذرا سی ہاتھ کی صفائی اور تھوڑی سی کاری گری چاہیے۔

وہ اسی طرح سوچتا ہوا آہستہ آہستہ اڈّے کی طرف چل دیا۔

(۳)

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ استاد پیڈرو کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ کسی مہنت کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ چاروں طرف جیب کترے حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ کمرے میں تمباکو کا دھواں بھرا تھا۔ ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔

اول جلول: بے ڈھنگا، بے وقوف۔ ایران توران کرنا: نامانوس باتیں کرنا، فلسفہ بگھارنا۔ اناپ شناپ: اوٹ پٹانگ۔ باچھیں کھلنا: بہت خوش ہونا۔ چاندی کٹنا: مراد فائدے حاصل ہونا، عیش ہونا۔ عمل: وقت۔ مہنت: جوگی، سادھوؤں کا سردار۔

نوشا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی استاد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"کیوں بے تو اب تک کہاں تھا؟"

نوشا نے آہستہ سے کہا۔ "سینما چلا گیا تھا۔"

"اور تو استاد اللہ رکھا کے علاقے میں کیوں گیا تھا؟ میں نے ہزار دفعہ کہا کہ بولٹن مارکیٹ کے ...ر کا علاقہ اپنا نہیں ہے۔ پر تم تو سالوں اپنی ماں کے یار ہو۔ ابے تو اپنی باندگی دکھانے کھار ادر ...گیا تھا؟ استاد اللہ رکھا کے کاریگر تم سے پتلا موتتے ہیں۔ سالو! تم خواہ مخواہ دلوں میں پھیر ڈالوا ...ے۔" استاد پیڈرو نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "لا نکال جھمکوں کی رانی۔" گرہ کٹی کی رقم ...لیے یہ استاد پیڈرو کی اپنی مخصوص اصطلاح تھی۔

نوشا پہلے تو سٹ پٹایا کہ ضرور کچھ گول مال ہے۔ استاد کو کہیں سے کچھ سراغ مل گیا ہے۔ مگر ...وہ استاد کو دینا نہ چاہتا تھا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ "میں تو اس طرف گیا بھی نہیں۔ آغا پلپلی ہو گا۔ ...ں طرف جاتا ہے۔"

آغا پلپلی کونے میں سکڑا سکڑایا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے کچھوے کی طرح اپنی سوکھی بے ڈول ...نکال کر نوشا کو دیکھا اور ناک میں منمنا کر بولا۔

"اماں دیکھ رہے ہو استاد! سالا خواہ مخواہ کے لیے مجھ سے فلاشٹین کر رہا ہے۔ وہ رانپٹا دوں گا کہ ...نکل پڑے گی۔ میں تو باہر نکلا ہی نہیں۔ دوپہر سے بخار میں پڑا بھن رہا ہوں اور یہ سالا اپنی اڑا ...ہے۔"

استاد پیڈرو نے اسے فوراً ڈانٹا۔ "بند کر اپنا لیکچر۔ بہت کہہ چکا۔"

پھر وہ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے اجنبی کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیوں جی! تم نے خود ...دیکھا تھا۔" اس نے نوشا کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بولا۔ "ہاں جی، یہی لونڈا تھا۔ شام سے شکار کے پیچھے منڈلا رہا تھا۔"

نوشا نے اس عرصے میں پہلی بار اسے دیکھا۔ وہ دہرے بدن کا مضبوط نوجوان تھا اور گردن ...کئے بڑی بے باکی سے بول رہا تھا۔ "استاد! میں نے کئی بار اسے اشارہ بھی کیا کہ یہ اپنا گاہک ہے۔ ...بار ٹوپ ٹاپ مارا تو یہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔"

...مہارت۔ پتلا موتتے ہیں: مراد کم ہنر مند نہیں ہیں۔ پھیر: جھگڑا، فرق۔ فلاشٹین کر رہا ہے: مراد چکر دے رہا ہے۔

استاد پیڈرو مسکرانے لگا۔ "یار تو بھی کیا بات کر رہا ہے۔ اسے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ یہ سالا سمجھے گا استادی کے یہ گر۔ ابھی تو۔۔۔" استاد نے ایک گندی گالی دی۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ ابھی اناڑی ہے۔"

نوشا ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔ "اماں بے فضول میں میرے اوپر الزام لگا رہے ہو۔ میں نے تو تم کو دیکھا بھی نہیں۔" وہ خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ اسی وقت استاد نے زناٹے کی گالی دے کر کہا۔

"اب چپکا بھی رہے گا یا چخ چخ ہی کیے جائے گا۔ تیری ساری کھٹّاشاہی کا ابھی پتہ چلے جاتا ہے۔"

نوشا نے چوری کا بٹوا پھینک دیا تھا اور نوٹ پتلون کی موری میں سراخ کر کے چھپا لیے تھے۔ اسے اطمینان تھا کہ وہاں تک کسی کی نظر نہ جائے گی۔ لہٰذا اس نے چمک کر کہا۔ "جھوٹ بول رہا ہوں تو میری تلاشی لے لو۔"

استاد نے گردن ہلا کر کہا۔ "کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں تجھے بالکل نلوہ چھوڑ دوں گا۔" اس نے چکرم کو اشارہ کیا۔ "دیکھ بے ناواں اسی کے پاس ہے یہ کہیں رکھ آیا۔ ذرا انٹی پر چڑھا کے۔ یہ بڑا حرامی دکھے ہے۔"

چکرم نے دونوں ہاتھ پکڑ کے نوشا کو کھڑا کر دیا۔ استاد نے ڈپٹ کر کہا۔ "ہاتھ اوپر کر۔" نوشا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ چکرم تلاشی لینے لگا۔

استاد بلّی کی طرح تیز نظروں سے نوشا کر گھورتا رہا۔ چکرم نے ہر جگہ ٹٹولا۔ جسم کا ایک ایک گوشہ کریدا۔ مگر رقم برآمد نہ ہوئی۔ ایک بار وہ اپنے ہاتھوں کو تھپکی دیتا ہوا اوپر سے نیچے تک آیا تو استاد کی تجربہ کار نظر نے تاڑ لیا کہ جب چکرم کا ہاتھ پیروں پر آیا تو نوشا ذرا سا بدکا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

"ذرا میرے کنے تو آئیو۔"

نوشا اس کے پاس چلا گیا۔ استاد کا ہاتھ سیدھا پتلون کی موری پر پہنچا۔ اس نے انگلی ڈال کر نوٹوں کا فلیتہ نکالا اور بے نیازی سے اٹھا کر سامنے ڈال دیا۔ سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ نوشا کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ استاد پیڈرو نے قہر آلود نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔

ہٹ دھرمی: ضد۔ نلوہ: مراد آزاد۔ بدکنا: ڈر کر ہلنا۔

ے میرے سے ٹرکیں کرنے چلا تھا۔ تیرے جیسے نہ جانے کتنے لمڈے ٹانگ کے نیچے سے چکے ہیں۔ ۳۰ سال سے اوپر ہو گئے یہ کام کرتے ہوئے۔ جھک نہیں ماری۔" استاد پیڈرو نے کان پکڑ کر گردن ہلائی۔ "ایسے استاد کا شاگرد ہوں کہ ولایت تک اس کی تصویریں کھینچ کر استاد پیڈرو کچھ دیر یوں ہی لیکچر دیتا رہا۔ پھر اس نے چکرم سے کہا۔

"ذرا گن تو کتنی رقم ہے؟"

چکرم نے مڑے تڑے نوٹوں کو اٹھا کر گنا۔ استاد کو بتایا۔ "ایک سو تراسی ہیں۔"

استاد پیڈرو نے اللہ رکھا کے آدمی سے پوچھا۔ "کیوں جی! تمہارا حساب کیا کہتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں جی بس اتنا ہی ہمارا اندازہ تھا۔"

"تو یہ سنبھالو اپنی امانت۔"

استاد نے نوٹ چکرم سے لے کر اسے دے دیئے۔ اس نے نوٹ لے کر گنے اور اس میں سے ۔ٹ نکال کر استاد کے آگے ڈال کر بولا۔ "یہ ۴۶ روپے ہیں۔ ۲۵ فی صدی کے حساب سے اتنا ہی مختنانا بنتا ہے۔ اگر تمہارا ریٹ کچھ اور ہے تو بتا دو۔"

"نہیں جی، یہی ٹھیک ہے۔"

وہ اٹھ کر جانے لگا تو پیڈرو نے کہا۔ "استاد اللہ رکھا سے میرا اسلام کہنا۔ ان سے کہہ دیجیو لمڈا اناڑی ہے۔ قاعدہ قانون نہیں جانتا۔ ویسے میں اس کی اچھی طرح کندی کر دوں گا۔"

اللہ رکھا کا آدمی چلا گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ نوشا کی سٹی گم تھی۔ اب اس کی شامت آنے کی۔ وہی ہوا۔ استاد پیڈرو نے اس کو ذبح کرنے والی تیز نظروں سے دیکھا۔ گالیاں دے کر بولا۔

"سالے تو مجھے چک پھریاں دیتا ہے۔ حرام کے تخم نے ناک کٹوا دی۔ اللہ رکھا کہے گا۔ پیڈرو نہ جانے کیا الم غلم شاگرد رکھ چھوڑے ہیں۔ اس جھپ سٹ سے اپنی یوں ہی لگتی ہے۔ شہر کے ہر اڈّے پر یہ بات پہنچ جائے گی۔ تف ہے سالی ایسی استادی پر۔ ساری عزت کرکری ہو گئی۔"

نوشا ملزموں کی طرح سر جھکائے سہما ہوا بیٹھا رہا۔ استاد غصے سے چیختا رہا۔ پھر اس نے قادر سے

مختنانا: معاوضہ۔ کندی کرنا: مارنا پیٹنا۔ سٹی گم ہونا: پریشان ہونا۔ چک پھیریاں: دھوکا، فریب۔ الم غلم: فضول، بے کار۔ عزت کرکری ہونا: بے عزتی ہونا۔

کہا۔ "ابے او قادرا۔ لگا اس حرام کے جنے کو دو ٹھونکے۔"

قادر نے اٹھ کر نوشا کے ایک ہی ٹھونکا لگایا تھا کہ وہ تکلیف سے بلبلا کر چیخنے لگا۔ استاد نے قادر کو للکارا۔ "ابے ذرا دبا کے۔ کیا زنخوں کے سے ہاتھ چلا رہا ہے؟ یہ سالا تو یوں ہی فیل مچا رہا ہے۔"

قادر نے کودنے کے سے انداز میں دونوں بازوؤں کو تولا۔ پہلے داہنے ہاتھ کو ذرا سا ترچھا کیا اور کہنی کی ہڈی کی بھرپور ضرب لگائی۔ نوشا کراہتا ہوا دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ قادر آگے بڑھا اور جھپٹ کر زور کا ٹھونکا لگایا۔ ایک، دو، تین۔ وہ تابڑ توڑ ٹھونکے لگاتا چلا گیا۔ قادر بڑا کڑیل جوان تھا۔ بھاری بھرکم کسرتی جسم تھا۔ ایک ایک بازو کا وزن پنج سیریوں میں تھا۔ پنڈلیاں اور پیر لوہا لاٹ تھے۔

نوشا لڑکھڑا کر دھڑام سے فرش پر گرا اور زور زور سے چیخنے چلانے لگا۔ پھر اس کی آواز حلق سے غیں غیں کر کے نکلنے لگی۔ اس کا منہ پھٹا ہوا تھا۔ چہرہ وحشت ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح فرش پر لوٹنے لگا۔

نہ جانے وہ دیو کا دیو قادر کب تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا کہ اسی اثناء میں استاد کی آواز ابھری۔ "بس بے۔ سالے کو ذرا سانس تو لینے دے۔"

قادر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ گینڈے کی طرح ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے سارے جیب کترے دم بخود تھے۔ نوشا ابھی تک فرش پر تڑپ رہا تھا۔ استاد پیڈرو نے ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری پر رکھ لی اور جسم کو ہولے ہولے حرکت دینے لگا۔ سامنے دیوار پر اس کا مہیب سایہ جھوم رہا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ ہر شخص خاموش تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ نوشا تڑپتے تڑپتے تھک کر شل ہو گیا اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ کمرے کے سکوت میں اس کی بوجھل سانسوں کی آواز صاف سنائی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد استاد کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ وہ نوشا سے کہہ رہا تھا۔ "اٹھ کے بیٹھ۔ بہت ہو چکا نخرہ۔ نہیں تو سالے دو چار اور لگواؤں گا۔ جو کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔"

نوشا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ وہ منہ بسور بسور کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ مگر استاد پیڈرو اس کی حالت زار سے ذرا

زنخا: ہیجڑا۔ فیل: شور۔ کڑیل جوان: بھرپور جوان۔ کسرتی جسم: مضبوط گٹھا ہوا جسم۔ پنج سیری: مراد بہت وزنی۔ لوہا لاٹ: مراد بہت مضبوط۔ دم بخود: خاموش۔ مہیب: بھیانک، خوفناک۔ شل ہو جانا: بے حس ہو جانا۔ کسر: کمی۔ حالت زار: بری حالت

متاثر نہ ہوا۔ مڑ کر چکرم کو اشارہ کیا۔

"سالے کو تھوڑا سا زندہ طلسمات پلا۔ پھر اس کو چلتا کر۔"

چکرم کمرے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ قارورے کی شیشی لیے ہوئے کمرے میں ہوا۔ اس میں زرد زرد پیشاب بھرا تھا۔ شیشی دیکھتے ہی نوشا دہائی دینے لگا۔

"استاد! اللہ کے لیے چھوڑ دو۔ مر جاؤں گا۔"

"اب غلطی کروں تو جان سے مار دینا۔"

وہ گڑگڑاتا رہا۔ فریاد کرتا رہا۔ مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ استاد پیڈرو کی ہدایت پر ایک جیب شا کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو دبوچ لیا۔ دوسرے نے اس کا منہ چیر دیا۔ نے قارورے کے کئی قطرے اس کے حلق میں ڈال دیئے۔

نوشا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ وہ زور زور سے ابکائیاں لے رہا تھا۔ پٹ کر بولا۔ "باہر جا کر الٹی کیجو۔ سالے یہاں گندگی پھیلائی تو ابھی اور زندہ طلسمات پلواؤں ب جا رہا ہے کہ نہیں۔"

نوشا لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رے کے دروازے پر نمودار ہوا۔

"اب یہاں ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔" استاد تیکھے لہجے میں بولا۔ "تم ابھی اپنا ٹین پاٹ ے گول کرو۔"

نوشا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "استاد! خدا کی قسم۔ تم سے سب کچھ سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔ بہ ہے۔"

استاد زور سے دھاڑا۔ "اب تو اپنی بات اپنے ہی پاس رکھ۔"

"میری بات تو سن لو استاد!"

"میں تجھے اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تو ایک نمبر کا حرام کا تخم ہے۔" استاد پیڈرو نے دس کا ایک نوٹ اس کی طرف پھینکا۔ حقارت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "لو سالے خاں یہ اپنے کفن کے لیے جاؤ۔ یہ کام تیرے بس کا نہیں۔ تو تو مجھے بھڑوا دکھے ہے۔ ان ہی کی طرح پٹیاں نکالتا ہے۔"

ٹ/ لو سامان۔ پٹیاں نکالتا ہے: مراد بہانے تراشتا ہے۔

اب جا کے اپنی ماں کے لیے کوئی یار ڈھونڈ۔"

نوشا اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ استاد نے ڈانٹا۔ "سالے! آنکھیں کیا دکھا رہا ہے جا کر تھانے میں رپٹ لکھا دیجیو کہ استاد پیڈرو جیب کتروں کا اڈہ چلاتا ہے۔ تجھے بھی قسم ہے جو جا کے نہ کہیو۔ پر یہ بھی سن لے کہ دو ہزار روپے نقد بھتا دیتا ہوں۔ سالے کسی اور ہوا میں نہ رہنا تو یہ سمجھ رہا ہو کہ میں استاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔"

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ کھڑا رہا۔

استاد نے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے جا رہا ہے یا کچھ اور تیری کندی کراؤں۔ تجھے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔ بس اب تو یہاں سے دفان ہو جا۔"

نوشا نے دس روپے کا نوٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اڈے سے باہر آ گیا۔

(۴)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ نوشا کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رات کہاں گزارے۔ اچانک اسے راجہ کا خیال آ گیا۔ مگر اس کی یاد آتے ہی جھنجلا گیا۔ اس سالے کی تو تقدیر ہی کھوٹی ہے۔ سوچا تھا کہ اس رقم سے اس کا علاج کرا دوں گا۔ الٹا ڈبا گول ہو گیا۔ نہ رہنے کو ٹھکانہ ہے نہ کوئی کام دھندا۔

وہ اسی طرح سوچتا ہوا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ عثمان آباد کی گلیوں سے گزر کر وہ لارنس روڈ آ گیا۔ سڑک سنسان تھی۔ سناٹے میں کہیں کہیں کتے بھونک رہے تھے۔ گشت کرنے والا ایک کانسٹیبل اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔ نوشا گھبرا گیا۔ اس طرح رات گئے آوارہ گردی کرنا مناسب نہیں تھا۔ سردی تھی اور وہ بہت تھکا ہوا بھی تھا۔ آخر وہ ایک درخت کے نیچے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

رات دیو کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ شبنم کے قطرے درخت کے پتوں سے ٹپ ٹپ فٹ پاتھ پر گر رہے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک شخص گٹھری کی طرح

کھوٹی: بری۔ ڈبا گول ہو گیا: بات بگڑ گئی، معاملہ خراب ہو گیا۔

پڑا ہوا تھا۔ اسے اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں تھا۔ مزے سے پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ نوشا کو سردی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس طرح بیٹھے بیٹھے ایک دفعہ اس نے قریب پڑے ہوئے آدمی کو دیکھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس شخص پر ذرا ہاتھ کی صفائی کا تجربہ کرنا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی اس کی انگلیوں میں کھُل ہونے لگی۔ وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ وہ بوسیدہ اونی کوٹ پہنے تھا۔ اس کی ایک جیب سے کاغذوں کے چند پرزے اور ایک ٹوٹا ہوا کنگھا نکلا۔ دوسری جیب بالکل خالی تھی۔ البتہ اندر کی جیب سے ایک روپیہ اور چند آنے کی ریزگاری نکلی۔ پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر بھی نکلی۔ تصویر کو اس نے دھندلی دھندلی روشنی میں دیکھا۔ اس میں گول مٹول سا ایک بچہ بیٹھا ہمک رہا تھا۔ اس تصویر کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلے تو نوشا نے سوچا کہ رقم پار کر لے۔ پھر یہ خیال کر کے واپس جیب میں رکھ دی کہ سالا بھوکا مر جائے گا۔ خواہ مخواہ بددعا دے گا۔ اسے اس بات سے خوشی ہوئی کہ اب وہ بہت صفائی سے کام کر سکتا تھا۔ اس نے اس آدمی کی تمام جیبوں کی تلاشی لے ڈالی مگر اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

شبنم سے نوشا کے بال بھیگ گئے تھے اور سردی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ بار بار اس کا جسم کانپ اٹھتا تھا۔ نیند کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے سوچا کوئی نہ کوئی چائے خانہ تو کھلا ہی ہو گا۔ جا کر چائے پی جائے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دفعتاً نوشا کو اس آدمی کا خیال آ گیا جو بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ خبردار کر دے ورنہ کوئی نہ کوئی اس کا بھائی بند جیب صاف کر جائے گا اور سویرے اٹھ کر اس کے پاس چائے پینے کو بھی نہ ہو گا۔

اس نے جھک کر اسے جھنجھوڑا اور بے تکلفی سے بولا۔ "اے بھائی نیند کے متوالے۔" مگر وہ

نوشا کو محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کب کا مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کے آتے ہی وہ خوف سے کانپ اٹھا۔ ایسا لگا کہ لاش اس سے چمٹ

ہمک ہمکنا: بچے کا ہاتھ پاؤں مارنا۔ بھائی بند: ہم پیشہ، ساتھی۔ متوالہ: مست، شوقین۔

گئی ہے۔ وہ فوراً آگے بڑھ گیا اور پیچھے مڑ مڑ کر لاش کو دیکھتا رہا۔ اسے بار بار معلوم ہوتا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

اسی گھبراہٹ کے عالم میں وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بندر روڈ پر پہنچا۔ بندر روڈ پر پنواڑیوں کی اکا دکا دکانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ ایرانی چائے خانے بھی کھلے تھے۔ وہ خاموشی سے ایک ایرانی چائے خانے میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس وقت بھی خوب چہل پہل تھی۔ شب زندہ داروں کا ہجوم تھا۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں سٹے باز تھے، دلال تھے، رکشا والے تھے، وکٹوریہ والے تھے، پولیس کے کانسٹیبل تھے اور ایسے کوچہ گرد تھے جن کا نوشا کی طرح کوئی ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔

نوشا نے گرم گرم چائے کے دو گھونٹ پیے تو ذرا سکون ملا۔ ایک پیالی چائے ختم کرنے کے بعد اس نے بی پی کے دو مسکہ بن کھائے۔ ایک اور گرم گرم ڈبل چائے چڑھائی۔ مگر ابھی تک سنبھل نہیں سکا تھا۔ اسے رہ رہ کر مرے ہوئے آدمی کا خیال آ رہا تھا جس کی جیبوں سے اس نے ایک روپیہ اور پانچ آنے نکالے تھے۔ یہ احساس بڑا اذیت ناک تھا۔ وہ بار بار سوچتا۔ یہ گرہ کٹی کا پیشہ سالا، واہیات ہے۔ یار اس پیشے کو تو چھوڑ ہی دینا چاہیے۔

مگر سوال یہ تھا کہ وہ پھر کرے گا کیا؟ اسی عالم میں کوئی اس کے وجود کے اندر سے بولا۔ دنیا میں سب جیب کترے ہی تو نہیں ہیں۔ اس خیال سے اسے کسی قدر تقویت پہنچی۔

وہ دیر تک چائے خانے میں بیٹھا رہا۔ جب صبح کے آثار ہویدا ہوئے اور ہلکی سفیدی آسمان کے کناروں پر ابھرنے لگی تو وہ چائے خانے سے نکل کر باہر آ گیا اور سڑکوں کی آوارہ گردی شروع کر دی۔ دن بھر وہ کام دھندے کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر اس کا وہ دن بیکار گیا۔ رات اس نے ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں گزاری۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ دن سڑکوں پر اور چائے خانوں کے اندر گزرتا اور رات مسافر خانے میں۔ اس کے دس روپے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اس احساس سے وہ پریشان ہو جاتا۔

آخر ایک آٹو گیراج میں اسے میکینک کا کام مل گیا۔ ۵۰ روپے مہینہ تنخواہ اور صبح ۸ بجے سے

اکا دکا: کوئی کوئی۔ چہل پہل: رونق۔ سٹے باز: جواری۔ دلال: سودا کرانے والا۔ کوچہ گرد: گلیوں میں آوارہ پھرنے والے۔ مسکہ بن: مکھن لگے بن۔ گرہ کٹی: جیب تراشی۔ تقویت: حوصلہ، ہمت۔

...شام تک کی ڈیوٹی۔ سب شرائط اس نے قبول کر لیں اور کام شروع کر دیا۔

کام تو مل گیا مگر رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ معاً اسے پروفیسر کلیم اللہ کا خیال آیا۔ اس نے سوچا ...ل کر اس سے ملا جائے۔ باتیں تو بہت کرتا ہے۔ شاید کچھ کام بن جائے۔ چنانچہ ایک شام کو آٹو ...راج سے نکل کر وہ سیدھا پروفیسر کے پاس گیا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

"آخر تم آ ہی گئے۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

"میں نے پرانا دھندا چھوڑ دیا ہے اور ایک گیراج میں نوکری کر لی ہے۔" نوشا نے اسے مطلع کیا۔

پروفیسر ہو، ہو کر کے بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ اس خبر سے اسے بڑی خوشی ہوئی۔ "بہت ...ا، بہت اچھا۔ تم تو انجینئر بن سکتے ہو۔" اس نے نوشا کا موبل آئل سے داغ دار لباس غور سے ...ھا۔ "تم تو ابھی سے انجینئر لگنے لگے۔" وہ اس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دینے لگا۔

نوشا نے موقع غنیمت جان کر مطلب کی بات کہہ دی۔ "کام تو مل گیا مگر رہنے کا کوئی ٹھکانا ...ں۔ اسٹیشن جا کر مسافر خانے میں پڑ رہتا ہوں۔"

پروفیسر ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "نہیں، میں تم کو رہنے کے ...جگہ دوں گا۔" اس نے فوراً اپنی بیٹی کو بلایا۔ نادرہ آ گئی تو وہ گویا ہوا۔ "نادرہ ان سے ملو۔ یہ نوشا ...ہمارے دوست۔ اگر تم کو دوست کے لفظ پر اعتراض ہے تو میں اس لفظ کو واپس لیتا ہوں۔ بہر ...حال یہ ہمارے مہمان ضرور ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ ہی ٹھیریں گے۔"

"مگر ابا جان گھر میں جگہ کہاں ہے؟"

"وہ ایک احمقانہ سی مثال ہے۔ جگہ دل میں ہونی چاہیے۔ تو اس وقت جگہ دل ہی میں نکالنا ...ے گی۔ دل نہیں دماغ سے سوچو کہ کہاں جگہ نکل سکتی ہے؟"

نادرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پروفیسر ذرا دیر تک بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے چٹکی بجا کر کہا۔ "یہ ٹھیک ...ہے گا۔ کھانے کے کمرے سے میز اٹھا کر تم راہداری میں لگا دو۔ کیا مضائقہ ہے۔ کھانا ہی تو کھانا ...ہے۔ راہداری بھی بری جگہ نہیں۔ خاصی کشادہ بھی ہے۔ کھانے کی میز اس میں آسانی سے لگائی جا ...سکتی ہے۔ جس شہر میں انسان کو سر چھپانے کے لیے چھت تک میسر نہ ہو وہاں کسی کو ڈائننگ روم ...کا کوئی حق نہیں۔ یہ خود غرضی ہے۔ میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

نادرہ پروفیسر کی عادت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ ایک بار طے کر لیتا ہے اسے پورا کیے بغیر نہیں رہتا۔ لہٰذا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے باہر چلی گئی اور گھر کے ملازم کی مدد سے کھانے کی میز نکال کر غلام گردش میں ڈال دی۔ کمرہ نوشا کے لیے خالی کر دیا گیا۔

پروفیسر نے اس کے لیے چارپائی اور بستر کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس رات نوشا کئی راتوں کے بعد گہری نیند سویا۔ سویرے ہی سویرے پروفیسر کی آواز سن کر نوشا جاگ اٹھا۔ وہ اسے ناشتے کے لیے بلا رہا تھا۔ اس نے غسل خانے میں جا کر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور اس کے پاس چلا گیا۔

پروفیسر اور نادرہ کھانے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ میز پر چائے اور ناشتے کا سامان رکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے جھجکنے لگا۔ پروفیسر نے کہا۔

"تم شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ آؤ، ادھر آ کر بیٹھو۔"

نوشا سکڑا سکڑایا کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر نے پھر کوئی بات نہیں کی اور اخبار کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ نادرہ نے نوشا کو چائے بنا کے دی۔ ٹوسٹ اور ایک انڈا دیا۔ نوشا آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا۔ وہ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے ہر چیز اجنبی اور نامانوس معلوم ہو رہی تھی۔

اس روز وہ آٹو گیراج پہنچا تو اس کی طبیعت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ کام بھی محنت سے کیا۔ پہلی بار اسے گیراج سے چھٹی ہوتے وقت خوشی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھا گھر آیا اور غسل خانے میں دیر تک نہاتا رہا۔ رات کا کھانا بھی اس نے پروفیسر ہی کے ساتھ کھایا۔

چند ہی روز کی رہائش کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی زندگی میں بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اب وہ سڑکوں پر آوارہ گردی اور گھٹیا چائے خانوں میں وقت گزارنے کے بجائے زیادہ تر گھر ہی پر رہتا۔ اس کی زندگی میں کسی قدر اعتدال اور سلیقہ پیدا ہو رہا تھا۔

غلام گردش: برآمدہ۔ محو: مصروف۔ ہشاش بشاش: خوش و خرم، تازہ دم۔ اعتدال: ٹھہراؤ، اچھائی۔ سلیقہ: تمیز، عمدگی۔

فصل سیزدہم

(۱)

کراچی آئے ہوئے سلمان کو کئی مہینے ہو گئے تھے۔ چچا سسر کے سیاسی اثر و رسوخ سے اسے
ب غیر ملکی فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی، کام بھی زیادہ نہ تھا۔ پانچ
ار روپے جو سسرال سے شادی پر سلامی میں ملے تھے اس کے پاس موجود تھے۔ اس میں سے چار
ار روپے پگڑی دے کر اس نے شہر کے ایک بارونق علاقے میں رہائش کے لیے فلیٹ لے لیا تھا۔

اس میں تین کمرے تھے۔ فلیٹ روشن اور ہوادار تھا۔ پاس پڑوس بھی برا نہیں تھا۔ اس چار
زلہ عمارت میں زیادہ تر پارسی اور عیسائی خاندان آباد تھے۔ ان کے رہن سہن میں نفاست اور
ذیب تھی۔ اکثر رات گئے تک خوب چہل پہل اور ہنگامہ رہتا۔

آمدنی معقول تھی۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ سلمان عام طور پر گھر ہی میں رہتا تھا اور
یادہ‌تر وقت مطالعے میں گزارتا۔ ان دنوں اس کا صرف یہی مشغلہ تھا۔ مہینے کی شروع تاریخوں میں
بازار سے نئی کتابیں خرید کر لاتا۔

یٹ کا ایک کمرہ اس نے مطالعے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس میں مختصر سی لائبریری بن گئی تھی۔
ابوں کی دو الماریاں، مطالعے کی میز اور صوفہ سیٹ لگا کر اس نے کمرے کو قرینے سے آراستہ کیا
ا۔ کچھ فرنیچر اس نے خریدا تھا، کچھ کرائے پر لے آیا تھا۔

کراچی میں اس کا کوئی شناسا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے ساتھ اس نے مراسم بڑھانے کی

ورسوخ: اختیار، تعلقات۔ پارسی: آتش پرست۔

کوشش کی۔ دفتر میں کام کرنے والے ساتھیوں سے اسے کبھی انسیت پیدا نہ ہوئی۔ مگر وہ حتی الوسع کوشش کرتا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اس نے آشفتہ مزاجی اور بے راہ روی ترک کر کے زندگی میں اب میانہ روی اور سلیقہ پیدا کر لیا تھا۔ چند موٹے موٹے اصول وضع کر رکھے تھے۔ ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ دفتر کے کسی شخص سے بدمزگی پیدا نہیں کرے گا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اسے روزانہ وہاں سات گھنٹے گزارنا پڑتے تھے۔ البتہ دفتر سے باہر آنے کے بعد وہ اس ماحول کو اس فضا کو یکساں فراموش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی رفیق کار کے ساتھ اس کے تعلقات دفتر کی چار دیواری سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اتوار کو عام طور پر وہ میٹنی شو دیکھتا یا سمندر کے کنارے کسی پر فضا مقام پر چلا جاتا اور گھنٹوں ریت پر بیٹھا شور مچاتی لہروں کو دیکھتا رہتا۔ اس کی زندگی میں ایک طرح کا ٹھیراؤ اور توازن آ گیا تھا۔ اور وہ اس سے مطمئن بھی تھا۔ کبھی کبھی اسے کھانے کی دقت کا احساس ہوتا۔ ہوٹل کے کھانے سے وہ اکتا گیا تھا۔ اس نے ایک ملازم رکھ لیا اور گھر پر کھانا پکوانے کا بندوبست کیا۔ مگر وہ ہفتہ بھر بھی نہ ٹکا۔ ایک روز دفتر سے لوٹا تو ملازم غائب تھا۔ سوٹ کیس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ خیریت ہوئی کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور سوٹ کیس میں صرف ۴۲ روپے پڑے تھے۔ ان ۴۲ روپوں کے علاوہ وہ کچھ کپڑے چرا کر بھی لے گیا۔ نقصان زیادہ نہ ہوا۔ لیکن اسی روز اس نے طے کر لیا کہ آئندہ ملازم نہیں رکھے گا۔ دوسرے روز اس نے بیوی کو بلانے کے لیے خط لکھا اور پھر ہر خط میں اصرار کرنے لگا۔

❁ ❁ ❁

جاڑوں کی ایک کہر آلود صبح کو سلمان کی بیوی رخشندہ کراچی پہنچ گئی۔ اس کے ہمراہ ایک ادھیڑ خادمہ بھی تھی۔ بیوی کو لینے صبح تڑکے وہ کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین کچھ لیٹ تھی۔ اس انتظار میں اس نے ایک خاص کیف محسوس کیا۔ یہ ایسی مسرت تھی جو وہ بہت عرصے بعد محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ انٹر کلاس کے ایک زنانہ ڈبے سے اس کی بیوی خادمہ کے ساتھ اتری۔

وہ برقع پہنے ہوئے تھی اور بہت شرمائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ گھر آ کر بھی اس کا یہی انداز رہا۔ بات کرتا تو نگاہ نیچے جھکی رہتی۔ چہرے پر کچھ عجیب سی گھبراہٹ نظر آتی۔

انسیت: محبت۔ حتی الوسع: جہاں تک ہو سکے۔ آشفتہ مزاجی: پریشان حالی۔ جاڑے: سردی کا موسم۔ کیف: سرور، مزہ

اس روز اس نے دفتر سے چھٹی نہیں لی تھی۔ لہٰذا وہ فلیٹ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ دفتر روانہ ہو گیا۔ سہ پہر ہونے تک اس کا دل کام سے اچاٹ ہو گیا۔ اس روز وہ جلد ہی گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ دفتر سے نکلا تو بہت خوش تھا۔

وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا بازار گیا۔ اس نے حلوہ سوہن خریدا، تازہ پھل لیے اور گل فروش کی دکان سے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی خرید لیا۔ گھر پہنچا تو رخشندہ چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے شاید کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اس کا چمپئی چہرہ پھولوں کی طرح شگفتہ تھا۔ ہلکے آسمانی لباس میں وہ دل کش اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔ سلمان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی بیوی حسین اور خوب رو ہے۔

چائے پیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے چھیڑتا رہا تاکہ اس کا حجاب کسی قدر کم ہو جائے۔ اس وقت وہ ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح غیر سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔ اس کی یہ شام بڑی خوشگوار گزری۔

سلمان کو جلد ہی اندازہ ہو گیا۔ کہ رخشندہ بڑی محنتی اور سگھڑ ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ بیدار ہو جاتی۔ اس کے کپڑوں پر استری کرتی۔ شیو کرنے کا سامان آئینے کے سامنے رکھ دیتی۔ جتنی دیر وہ غسل کرتا اس عرصے میں وہ ناشتا تیار کر کے میز پر لگا دیتی۔ ہر چند کہ گھر میں خادمہ موجود تھی مگر اس کا سارا کام وہ خود کرتی اور اس میں اسے مسرت بھی محسوس ہوتی۔ سلمان نے اکثر غور کیا کہ اگر اس نے کسی کام کے لیے خادمہ سے کہا تو رخشندہ خود ہی وہ کام کر دیتی۔

شام کو واپس آتا تو چائے تیار ملتی۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ جاتا۔ بیوی اس کے قدموں پر جھک کر جوتے کا فیتہ کھولنے لگتی۔ سلمان نے منع بھی کیا مگر وہ باز نہ آتی۔ اس کے کپڑے وہ خود ہی کھونٹی پر ٹانگتی۔ اس کی ایک ایک چیز قرینے سے لگی ہوتی حالانکہ وہ رخشندہ کے آنے کے بعد خاصا لاپرواہ ہو گیا تھا۔ دفتر جاتا تو سارا کمرہ کباڑ خانہ بنا کر ڈال دیتا۔ مگر شام کو ہر چیز اپنی جگہ آراستہ ملتی۔

یہ بڑے پر کیف دن تھے۔ اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ چہرے پر تازگی آ گئی تھی۔ وہ اچھا خاصا سجیلا جوان نظر آتا۔ لیکن ان دنوں وہ جس قدر باتونی ہو گیا تھا رخشندہ اسی قدر خاموش

دل اچاٹ ہونا: دل نہ لگنا۔ چمپئی: چمکتا ہوا زرد رنگ۔ شگفتہ: کھلا ہوا، خوش۔ دل آرا: مراد خوبصورت۔ حجاب: شرم۔ سگھڑ: ہنرمند، تمیز والی۔ پر کیف: خوشی سے بھرپور۔

رہتی۔ بہت کم بات چیت کرتی۔ کوئی بات اچھی لگتی تو صرف مسکرا دیتی۔ اس کے سفید دانت جھلکتے اور سرخ لب کپکپا کے رہ جاتے۔

سلمان کو اس کی مسکراہٹ بہت پسند تھی۔

❁ ❁ ❁

کراچی آنے کے بعد سلمان کی بیوی ابتدائی دنوں میں شدید تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اجنبی شہر، اجنبی ماحول، اجنبی پاس پڑوس۔ نہ کسی سے میل ملاپ، نہ کہیں آنا جانا۔ سلمان دفتر چلا جاتا تو اس کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ لیکن سلمان نے زور دیا تو اس نے پڑوسیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی اور رفتہ رفتہ خاصا میل جول پیدا کر لیا۔

بلڈنگ کے عیسائی اور پارسی خاندانوں کی بیشتر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں بینکوں اور تجارتی اداروں میں سیکرٹری، ٹائپسٹ یا اسٹینو گرافر تھیں۔ وہ تنگ اسکرٹ پہنتیں، مردوں کی طرح سر پر چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال رکھتیں اور اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ قیمتی لباس اور میک اپ پر خرچ کرتیں۔ وہ اکثر سلمان کے فلیٹ میں بھی آتیں۔ ان کی مسکراہٹ مصنوعی تھی، ان کی نظروں کا انداز مصنوعی تھا، جسم کی حرکت مصنوعی تھی، وہ بنی سنوری کٹھ پتلیوں کی طرح نظر آتیں۔ ان کی باتیں عام طور پر لباسوں کے جدید ترین ڈیزائنوں، نئی فلموں، ڈانس پارٹیوں، پکنک اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے متعلق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شہزادی مارگریٹ کے کسی نئے اسکینڈل یا شاہ فاروق اور پرنس علی خان کے تازہ ترین معاشقے کے بارے میں بھی بات کر لیتیں اور ان کے تذکرے میں خاص لذت محسوس کرتیں۔

سلمان نے غور کیا کہ ان لڑکیوں کے ساتھ بڑھتے ہوئے میل جول نے اس کی بیوی میں بھی بعض تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ باتوں کے دوران خواہ مخواہ انگریزی کے بھونڈے الفاظ استعمال کرتی۔

اس نے اپنے بالوں کا سیدھا سادا انداز بدل دیا تھا۔ میک اپ کرنے لگی تھی۔ اب اس کی یہ بھی خواہش ہوتی کہ سلمان اس کے حسن کی تعریف کرے۔ پہلے وہ فلم دیکھنے سے پرہیز کرتی تھی مگر اب دبے دبے الفاظ میں فلم دیکھنے کا اشتیاق بھی ظاہر کرتی۔

دوبھر: مشکل۔ بھونڈے: بے تکے۔ اشتیاق: شوق، خواہش۔

ایک اتوار کو پکنک کا پروگرام بنا جسے پڑوسیوں نے بنایا تھا۔ آمد و رفت کے لیے انہوں نے ایک اسٹیشن ویگن کا بندوبست کیا۔ سب اس میں لد لدا کر ہاکس بے پہنچے۔ اس روز رخشندہ کا برقع بھی اتر گیا۔ پارٹی میں خاصی تفریح رہی۔ سمندر میں غسل کیا گیا۔ ریت پر لیٹ کر سورج کی شعاعوں سے جسم سینکا گیا۔ بہت سی الم غلم چیزیں کھائیں۔ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اور جب سورج بحیرہ عرب میں غروب ہونے لگا اور لہروں کا رنگ ارغوانی ہو گیا تو وہ تھکے ہارے واپس ہوئے۔

اس کے بعد اکثر اتوار کو پکنک پارٹیاں ہوتی رہیں۔

سلمان ہفتے کی شام کو بیوی کے ساتھ پکچر ضرور دیکھتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کے ہمراہ شام کو ٹہلنے نکل جاتا۔ دونوں کچھ شاپنگ کرتے اور کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ مہینے کی شروع تاریخیں ہوتیں تو وہ شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں رات کا کھانا بھی کھا لیتے۔

زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ البتہ اس میں سکون کم اور ہنگامے زیادہ ہو گئے تھے۔ مگر یہ ہنگامے اس طرح دبے قدموں زندگی میں داخل ہوئے کہ سلمان کو مطلق احساس نہ ہوا۔ وہ ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن جس قدر یہ ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے مطالعے کا شوق کم ہوتا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں وہ معمول کے مطابق روزانہ چالیس پچاس اور کبھی کبھی تو سو سوا سو صفحات پڑھ ڈالتا تھا۔ ان دنوں وہ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے شیڈ کا ہلکا عکس لہراتا۔ بیوی بار بار کروٹ بدلتی۔ خواہ مخواہ بات کر کے اسے چھیڑتی۔ وہ مطالعے میں محو رہتا۔ اب یہ محویت کم ہونے لگی تھی۔

بیوی میں شاپنگ کی عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ جوتوں اور سینڈلوں کی اس نے درجنوں جوڑیاں خرید ڈالی تھیں۔ ہر فلم دیکھنے کے بعد وہ نیا لباس تیار کرانے کا پروگرام بناتی۔ میک اپ کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ نت نئے لوشن خرید کر لاتی۔ کوئی غسل کرنے کے لیے ہوتا، کوئی صرف ہتھیلیوں کی جلد نرم کرنے کے لیے اور کسی سے چہرے کا رنگ نکھارا جاتا۔ دونوں بازار جاتے اور کوئی شاپنگ نہ بھی ہوتی تب بھی فیشن میگزین ضرور خریدے جاتے، جن کو پڑھ کر وہ روزانہ نئے نئے انداز سے بال سنوارتی۔ درزی سے ایسے لباس سلواتی جن سے سینے کی جلد زیادہ سے زیادہ عریاں نظر آتی۔ ان کی فٹنگ اس طرح ہوتی کہ جسم کا ایک ایک خم نظر آتا۔

مطلق: ذرا بھی، بالکل۔ خم: مراد ابھار۔

اب وہ کام کرنے سے بھی جی چرانے لگی تھی۔ ہر وقت خادمہ کو احکامات دیتی رہتی۔ کام کرنے سے ہاتھوں کی جلد کھردری پڑ جانے کا اندیشہ تھا اور زیادہ محنت کرنے سے رنگت سانولا جانے کا خطرہ تھا۔ البتہ اب وہ یہ فن ضرور جان گئی تھی کہ اپنی دلکشی کی زیادہ سے زیادہ کس طرح نمائش کی جائے۔ وہ خوبصورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ سج سجا کر شام کو چائے کی میز پر بیٹھتی تو کمرے میں تازہ پھولوں کی شگفتگی اور مہک رچی ہوتی۔ سلمان دفتر سے تھکا ہارا آتا۔ اس کے دل آویز چہرے اور پھڑکتے ہوئے جسم کو دیکھتا تو ساری تھکن بھول جاتا۔ اس کی قربت میں مسرت اور کشش محسوس کرتا۔

آمدنی بنی تلی تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ کتابوں کی خریداری کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی۔ مطالعہ بھی بند ہو گیا۔ تنخواہ ملنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ بلکہ اکثر بلوں کی ادائیگی بھی رہ جاتی جن کو آئندہ ماہ پر ٹالنا پڑتا۔

سلمان اب سگرٹ گن گن کر پینے لگا تھا اور اپنی ضروریات کا سامان خریدنے سے حتی الوسع پرہیز کرتا۔ اب وہ اکثر بغیر استری کیا ہوا سوٹ پہن کر آفس چلا جاتا۔ دفتر میں ہر شخص سے اس کا لین دین شروع ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ادائیگی میں تاخیر ہوتی تو بدمزگی بھی پیدا ہوتی۔ پہلے وہ دفتر کے ساتھیوں سے مراسم بڑھانے سے کتراتا تھا مگر اب کم از کم قرض خواہوں سے اسے زیادہ گھل مل کر رہنا پڑتا۔

سلمان کے مزاج میں رفتہ رفتہ چڑچڑا پن آتا جا رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر رخشندہ سے الجھ پڑتا اور پھر کئی کئی روز تک اس کا سلسلہ چلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دفتر سے گھر آنے کے بجائے کسی چائے خانے میں بیٹھ جاتا۔ پکچر دیکھنے چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ اس میں عجیب سا لاابالی پن آ گیا تھا۔

❀ ❀ ❀

جاڑے جا چکے تھے اور گرمیوں کی آمد آمد تھی۔

ایک روز دفتر کے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر "شب ماہ تاب" منانے کا پروگرام بنا۔ وہ ایک ہوٹل کے کھلے لان میں رات بھر بیئر پیتا رہا اور پورے چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پارٹی میں دفتر کی کچھ عیسائی اور پارسی لڑکیاں بھی تھیں جن کو نشے میں وحشت ہو کر اس نے بہت ستایا۔ ایک لڑکی کا اسکرٹ پھاڑ ڈالا۔ وہ نیم برہنہ ہو گئی۔ کئی کے گال نوچ لیے اور وہ بلیوں کی طرح غرا کر

طرح دار: ناز و ادا والی۔ دل آویز: دل کو لبھانے والا۔ لاابالی پن: لاپروائی، غیر سنجیدگی۔

ے لگیں۔ ایک موٹے تگڑے نوجوان کے چہرے پر اس نے بیئر کا پورا گلاس انڈیل دیا اور اس
لپاڑی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

یہ بڑی سہانی رات تھی۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا ہر طرف اجلی اجلی چاندنی بکھری تھی۔ آرکسٹرا
زگت بج رہی تھی۔ پینے کے لیے اچھی بیئر تھی اور آس پاس نوجوان اور طرح دار لڑکیاں تھیں
لکے ہلکے سرور سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ گھنٹیوں کی طرح بجتے ہوئے تیز تیز قہقہے لگا رہی تھیں اور
ے تکلفی کو کبھی پیار سے ڈانٹ کر اور کبھی صرف مسکرا کر ٹال دیتیں۔ اس خوب صورت رات کو
نے جی بھر کر ہنگامہ کیا اور خوب لطف اندوز ہوا۔

واپس گھر پہنچا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ دروازہ اس کی بیوی نے کھولا۔ وہ ابھی تک
ل رہی تھی۔

سلمان پہلی بار اس کے سامنے شراب پی کر گیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ کہتا کچھ تھا بات منہ سے نکلتی
تی۔ جسم بے قابو ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھندلی دھندلی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ اس
کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے۔ جھومتا جھامتا بستر پر جا کر اوندھے منہ گر پڑا اور اسی حالت میں پڑا
۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے رخسار پر نمی محسوس ہوئی۔ وہ نشے سے چونکا ذرا دیر بعد چہرے پر ایک
قطرہ گرا۔

سلمان نے گردن کو خم دے کر دیکھا۔ بیوی اس پر جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ کمرے کی روشنی میں
کا دلکش چہرہ کملایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ سلمان نے گردن
ائی اور سوچنے لگا کہ اسے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے اس طرح اپنی بیوی کو دکھ نہیں پہنچانا
یے۔ ساتھ ہی مسرت بھی ہوئی کہ بیوی اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ اس مسرت میں رات
کے سارے ہنگاموں سے زیادہ لذت تھی۔

(۲)

ہفتے کی شام تھی۔ سلمان دوپہر ہی کو دفتر سے گھر واپس آ گیا تھا۔ مہینے کی شروع تاریخیں تھیں۔

ل: [illegible]

سہ پہر کو چائے پیتے ہوئے دونوں میاں بیوی نے طے کیا کہ شام گھر سے باہر گزاری جائے۔ پروگرام
کہ کسی پر سکون ریستوران میں بیٹھ کر آئس کریم کھائی جائے۔ اس کے بعد فلم دیکھی جائے۔ فلم کے
انتخاب پر دونوں کی پسند مختلف تھی۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ فلم کا انتخاب آئس کریم کھاتے وقت کیا جائے
فلم دیکھنے کے بعد رات کا کھانا بھی باہر ہی کھانا تھا اور یہ طے ہوا کہ کھانا چاہے کسی بھی ہوٹل میں کھا
جائے مگر اس میں سیخ کے کباب ضرور شامل ہوں۔ گرم ہوں اور چٹ پٹے ہوں۔

دونوں گھر سے باہر آئے۔

گرمی کا موسم تھا۔ دن ڈھلتے ہی شہر کی ساری آبادی سڑکوں اور بازاروں میں آگئی تھی۔ ہر
طرف چہل پہل تھی۔ شور و غل تھا۔ دکانوں پر بھیڑ تھی۔ دونوں تفریح کے موڈ میں تھے اور بے
فکری سے بازار سے گزر رہے تھے۔

ایک موڑ پر سلمان نے محسوس کیا کہ ایک نوجوان پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ معمولی
لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر الجھے ہوئے گھونگھریالے بال، کھلتا ہوا رنگ اور چہرے پر ہلکی بھوری
بھوری مونچھیں۔

سلمان کو پہلے تو اس کے انداز پر غصہ آیا۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔
سلمان کو شبہ ہوا کہ وہ نوشا ہے۔

وہ واقعی نوشا تھا اور اس نے سلمان کو پہچان لیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ مگر یہ سوچ کر
شرمندگی کا احساس ہوا کہ وہ گھر سے بھاگ کر کراچی آیا ہے۔ سلمان کو بھی اس کا علم ہوگا۔ ملے گا
اس کا ذکر ضرور کرے گا اور اس کے متعلق وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور راہ گیروں
کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

سلمان کو دیکھنے کے بعد نوشا کو اپنا گھر یاد آگیا۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے اماں کس طرح ہوں
گی؟ سلطانہ کیسی ہوگی؟ انو تو اب بڑا ہو گیا ہوگا۔ ٹھاٹھ سے اسکول جاتا ہوگا۔ شاید اماں نے انو کو
اسکول سے اٹھا کر کہیں کام دھندے پر لگا دیا ہوگا۔ اس کے اس طرح چلے آنے پر اماں ضرور دکھی
ہوں گی۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار وہ گھر کی چھت پر چڑھتے ہوئے گر پڑا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔
سارا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔ اماں پہلے تو اسے دیکھ کر تھر تھر کانپتی رہیں اور پھر چیخ مار کر زور زور سے
رونے لگی تھیں۔ اماں اس کے لیے ضرور روئی ہوں گی۔ سلطانہ بھی روئی ہوگی۔ سب اسے

ہوں گے۔

اس روز وہ گھر سے ہشاش بشاش نکلا تھا۔ ایک روز پہلے اسے تنخواہ ملی تھی۔ اور ابھی تک اس
یب میں کچھ کم ۲۰ روپے پڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے اس نے اپنے لیے دو سوتی بش شرٹوں کے علاوہ
بنیان خریدی تھی۔ ٹافیوں کا ایک چھوٹا ڈبا اس نے یونہی موج میں آکر خرید لیا تھا۔ نادرہ کے لیے
ک کے خوبصورت آویزے بھی خریدے تھے۔ آویزے خریدتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ یار
لڑکی کی بدولت کھانے کے علاوہ گرما گرم چائے بھی مل جاتی ہے۔ اسے راضی خوشی رکھنا بہت
روری ہے۔ تمام خریداری پر اس کے ۲۵ سے زیادہ روپے خرچ ہوئے تھے۔ مگر وہ خوش تھا اور
وم جھوم کر چل رہا تھا۔ لیکن سلمان کو دیکھ کر اس کا دل افسردہ ہو گیا۔ اسے گھر کی یاد ستانے لگی۔
ار خیال آتا کہ وہ کراچی میں عیش کر رہا ہے اور ادھر گھر پر نہ جانے سب کس حال میں ہوں گے؟
ہوں گے؟

اسی افسردگی کے عالم میں وہ واپس پہنچا۔ ملازم اپنے گھر جانے کے لیے اس کا بے چینی سے
ظار کر رہا تھا۔ نوشا نے اسے رخصت کیا۔ دروازے کا بولٹ چڑھایا اور زینے کی سیڑھیاں طے کرتا
اوپر چلا گیا۔ گھر میں سناٹا تھا پروفیسر کے کمرے میں روشنی تھی لیکن نوشا اس طرف نہیں گیا۔ غلام
دش سے گزر کر اس نے نادرہ کے کمرے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ سامنے میز پر نادرہ سر
ائے پڑھنے میں محو تھی۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے چہرے کے خدوخال پتھر کے
وں کی طرح ترشے ترشائے نظر آرہے تھے۔ ایک ایک زاویہ ایک ایک خم ابھر کر نمایاں ہو گیا تھا۔
ڑکی کھلی تھی اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

نوشا نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور چپکے سے کمرے میں جا کر اس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ کو
ی آمد کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میز کے
نے پر پلاسٹک کے آویزے رکھ دیئے۔ تیز روشنی میں وہ خوبصورت نظر آنے لگے۔ نادرہ نے
شت سے آویزے دیکھے۔ پھر گردن موڑ کر نوشا پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا؟"

"تم اتنی دیر تک کہاں غائب رہے؟"

"ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد سیدھے گھر کیوں نہیں آئے؟"

اس نے نوشا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی چلی گئی۔ اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ چہرے پر قدرے جھنجلاہٹ تھی۔ نوشا گھبرا گیا۔ کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ خاموش کھڑا ٹکر ٹکر اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"ابا جان کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ تمہیں اس قدر غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہیے۔"

نوشا نے سوچا۔ یار یہ تو بلا کی طرح چپٹ گئی۔ سالی بڑی تیز لونڈیا ہے۔ ایسے طمطراق سے بات کرتی ہے جیسے ماں بچے کو ڈانٹ رہی ہو۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ نادرہ نے آویزے الٹ پلٹ کر دیکھے اور تیزی سے بولی۔

"یہ کیوں لے آئے؟"

نوشا پھر بھی نہ بولا۔

"میں پوچھتی ہوں کہ تم نے یہ ٹاپس کیوں خریدے؟"

نوشا نے گھبرا کر کہا۔ "تمہارے لیے لایا تھا۔"

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "میرے لیے؟" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "جناب عالی میرے پاس ایک درجن سے زیادہ کانوں کے ٹاپس ہیں اور ذرا آپ اپنی یہ قمیص ملاحظہ فرمائیے موبل آئل کے داغوں نے جیسے ہر جگہ جنگل اگا دیئے ہیں۔ اور آپ کی یہ اکلوتی قمیص ہے۔"

نوشا نے فوراً وضاحت کی۔ "دو بش شرٹیں بھی تو لایا ہوں۔" اس نے ہاتھ میں دبا ہوا پیکٹ کھولا اور اس کے سامنے ڈال دیا۔

نادرہ نے بش شرٹوں کو ایک نظر دیکھا اور آویزوں کی ڈبیا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی

"آئندہ کوئی ایسی چیز خرید کر نہ لانا۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نوشا کو اس کا یہ انداز بہت ناگوار گزرا۔ اس نے بجھی بجھی نظروں سے اسے دیکھا اور آویزوں کی ڈبیا اٹھالی۔ جب وہ جانے لگا تو نادرہ نے پوچھا۔

"تم نے کھانا کہاں کھایا؟"

نوشا بے رخی سے بولا۔ "کہیں نہیں۔"

"تو پھر چلو کھانا کھالو۔"

بلا: چڑیل۔ طمطراق: رعب، غرور۔ زہر خند: طنزیہ ہنسی۔

وہ منہ پھلا کر بولا۔ "میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ اس وقت کسی ضدی بچے کی طرح روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نادرہ نے خاموشی سے اسے دیکھا ئی بات نہیں کی۔ نوشا جھنجلایا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ تھکے تھکے قدموں سے زینہ طے کیا اور کمرے میں چلا گیا۔

بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نادرہ کے رویّے سے اس کے دل کو ں پہنچی تھی۔ وہ اس کے لیے خوشی خوشی آویزے خرید کر لایا تھا۔ اور اس نے اس حقارت سے واپس کر دیا کہ وہ تلملا کر رہ گیا نوشا کو محسوس ہوا کہ وہ اسے گھٹیا اور حقیر سمجھتی ہے۔ وہ بڑا ں اور زود رنج تھا۔ یہ بات کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں کھٹکنے لگی۔ بہت دیر تک وہ اس واقعے ر کرتا رہا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نوشا کی آنکھوں پر ہلکی ہلکی ی طاری تھی۔ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ پھر اندھیرے میں ایک سایہ سا لہرایا ے اپنے سرہانے کسی کی آہستہ آہستہ سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ نوشا نے آنکھیں کھول ور اندھیرے میں گھورنے لگا۔ ایک نرم نرم ہاتھ اس کے کندھے پر آ کر ٹک گیا۔ ساتھ ہی آئی۔

"نوشا!"

یہ نادرہ تھی وہ آہستہ آہستہ اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی تھی۔ نوشا دم بخود پڑا رہا۔ اس نے نادرہ اس وقت اس کے پاس کیوں آئی ہے؟ جب نادرہ نے کئی بار جھنجھوڑا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ں ملتا ہوا بولا۔ "نادرہ۔"

"ہاں!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیا بات ہے؟" نوشا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

وہ نرم لہجے میں بولی۔ "کھانا کھالو۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

نوشا نے اٹھ کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ اس نے دیکھا۔ نادرہ کھانا لے ئی۔ اس نے کھانے کی پلیٹیں پلنگ پر رکھ دیں اور خود بھی بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔

ود رنج: جلد ناراض ہو جانے والا۔

"جاؤ ہاتھ دھو کر آؤ اور کھانا کھالو۔"

نوشا سدھے ہوئے جانور کی طرح چپ چاپ غسل خانے میں گیا۔ ہاتھ دھوئے اور کمرے میں آکر کھانا کھانے لگا۔ اسے خاموش دیکھ کر نادرہ بولی۔ "لاؤ وہ ٹاپس کی ڈبیا کہاں ہے؟" نوشا نے تکیے کے نیچے سے ڈبیا نکال کر اسے دے دی۔

ڈبیا لے کر وہ بولی۔ "دیکھو اب کوئی ایسی چیز نہ خریدنا تمہیں خود ابھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔"

نوشا سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔

وہ کہتی رہی۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے میری بات کا بہت برا مانا۔" وہ زیرِ لب مسکرائی۔ "میں تم کو سزا دینا چاہتی تھی۔ دیکھو نا یہ کتنی بے تکی سی بات ہے۔"

نوشا کو اس میں کوئی بے تکا پن نہ معلوم ہوا اس نے کسی قدر تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح گردن اٹھائے بیٹھی تھی جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کے روبرو بیٹھا ہو۔ جب نوشا کھانا کھا چکا تو وہ پلیٹیں اٹھا کر اوپر جانے لگی نوشا نے چاہا کہ پلیٹیں وہ خود اٹھا کر لے جائے تو وہ ڈانٹنے کے سے انداز میں بولی۔

"خواہ مخواہ تکلف مت کرو۔ تم کو صبح تڑکے جانا ہے۔ جلدی سو جاؤ۔"

وہ کھٹ پٹ کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نوشا خاموش بیٹھا لکڑی کے زینے پر اس کے قدموں کی آہٹ سنتا رہا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ نادرہ ہمیشہ نوشا سے اسی طرح پیش آتی تھی۔ عمر میں لگ بھگ وہ اس کے برابر ہی تھی مگر اس کا رویّہ بزرگوں کا سا تھا۔ وہ بات بات پر اس سے باز پرس کرتی۔

"نوشا! تم صبح دیر سے کیوں اٹھتے ہو؟"

"نوشا! تمہارے دانت اتنے گندے کیوں ہیں؟ دونوں وقت دانت صاف کیا کرو۔"

"نوشا! تم ایکٹروں کے سے بال مت بنایا کرو۔ بالکل لوفر لگتے ہو۔"

"نوشا! تم نے پھر غلط زبان بولی۔ فلاشٹین قطعی مہمل لفظ ہے۔"

وہ ہر وقت اسے ٹوکتی رہتی۔ نوشا تم نے یہ نہیں کیا۔ نوشا تم نے وہ نہیں کیا۔

سدھے ہوئے: تربیت یافتہ۔ لوفر: آوارہ۔ مہمل: بے معنی۔

شروع شروع میں تو نوشا نے اس رویے کے خلاف احتجاج کرنے کی بھی کوشش کی لیکن رفتہ رفتہ وہ مانوس ہوتا گیا۔

اس ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں خاصی شائستگی پیدا ہو گئی۔ اب وہ بے ڈھنگے پن سے قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ بات کرتا تو سنبھل سنبھل کر بولتا۔ پہلے اس کی وضع قطع فلم ایکٹروں کی سی تھی۔ اب اس نے بال چھوٹے کرا دیے تھے۔ پتلون کی موریاں الٹ کر چڑھانا چھوڑ دیں۔ رات کو مزے میں آکر کبھی کبھی وہ کوئی فلمی دھن گنگنانے لگتا تھا۔ اب ایسی کوئی آواز اس کمرے سے نہیں ابھرتی تھی۔

❀ ❀ ❀

پروفیسر سے نوشا کی ملاقات صرف ناشتے کی میز پر ہوتی۔ مگر اس وقت بھی وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہوتا۔ بات چیت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھار اتفاق سے اس کا نوشا سے آمنا سامنا ہو جاتا تو اس طرح کھویا کھویا گزر جاتا جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔

ایک روز پروفیسر کو نہ جانے کیا سوجھی۔ اچانک نوشا کے کمرے میں آگیا اور آتے ہی بولا۔ "میں نے ابھی ابھی سوچا کہ تم کو کسی اسکول میں داخلہ لے لینا چاہیے۔"

نوشا نے دبی زبان سے کہا۔ "میں کام کرنے گیراج جو جاتا ہوں۔"

"بہت ٹھیک بات کہی تم نے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ نائٹ اسکول کیسا رہے گا؟ مگر نائٹ اسکول تو یہاں سب واہیات ہیں۔ ایک صاحب کو میں جانتا ہوں جو رات کو اسکول چلاتے ہیں اور دن کو قرق امینی کرتے ہیں۔ نائٹ اسکول اور قرق امینی میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ یہ مسئلہ آج تک میں حل نہیں کر سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تعلیم دینے کے بجائے طلبا کے ذہن قرق کرتے ہوں گے۔"

اس بات پر وہ خود ہی ہنس پڑا۔

نوشا خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"کوئی وجہ نہیں کہ تم انجینئر نہ بنو۔ مگر تعلیم کا مسئلہ، مگر تعلیم کا مسئلہ۔" وہ بے خیالی میں آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ پھر چونک کر گویا ہوا۔

"تم گیراج کی ملازمت کیوں نہ چھوڑ دو؟"

بے ڈھنگا پن: بے تکا انداز، بد تمیزی۔ قدرِ مشترک: مشترک بات۔

نوشا نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ”نہیں۔ تمہیں ضرور کچھ نہ کچھ کما رہنا چاہیے۔ ورنہ زندگی بھر احساس کمتری میں مبتلا رہو گے۔ کچھ اور سوچنا پڑے گا۔“ یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک عرصے تک نوشا سے پروفیسر کی ملاقات نہیں ہوئی۔

نادرہ بھی اپنے باپ کی طرح عجیب و غریب لڑکی تھی۔ ذرا سی بات پر اس کی بھویں تن جاتیں۔ آنکھوں میں تیز چمک آجاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نوشا جھنجلا کر کوئی الٹی سیدھی بات کہ دیتا تو مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ ایک دن تو اس نے کمال کر دیا۔ نوشا نے شوخ رنگ کی بش شرٹ خریدی تھی۔ اس پر فلمی اداکاراؤں کی رنگ برنگی اور ہیجان انگیز تصاویر چھپی تھیں۔ وہ اسے پہن کر نادرہ کے سامنے سے گزرا تو اس نے ٹوکا۔

”نوشا تمہارا مذاق بڑا گھٹیا ہے۔“

نوشا اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کہنے لگا۔ ”کیوں، کیا ہوا؟“

وہ بولی۔ ”یہ بش شرٹ پہن کر تم پلے بوائے سے زیادہ لائف بوائے صابن کا ٹریڈ مارک معلوم ہوتے ہو۔“

نوشا کو تاؤ تو بہت آیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ اس کا مذاق اڑاتی رہی۔ ”اس لباس میں تم بالکل لو معلوم ہوتے ہو اور وہ بھی تیسرے درجے کے۔“

نوشا کو اس روز وہ کئی بار ڈانٹ پھٹکار چکی تھی۔ وہ پہلے ہی جھنجلایا ہوا تھا۔ جل کر بولا۔ ”تم یہ روزانہ الٹے سیدھے بال بناتی ہو اور نہ جانے کیسی آڑی ترچھی قمیصیں اور فراکیں پہنتی ہو تو نے کبھی یہ نہیں کہا تم بالکل چڑی کی بیگم لگتی ہو۔ ایک دم چڑی کی بیگم۔“

کہنے کو تو غصے میں نوشا نے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ مگر فوراً سہم گیا۔ اس نے سوچا اب شامت آگئی۔ مگر نادرہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی اور جب نوشا جانے لگا تو اسے روک کر نرم لہجے میں بولی۔

”معاف کرنا نوشا! مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ میں اپنی غلطی کی معافی چا ہوں۔“

نوشا ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا اور وہ بار بار معذرت کرتی رہی۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں جن سے وہ بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے

اس کی ماں سیدھی سادی گھریلو سی عورت تھی۔ اس کا نام عارفہ بیگم تھا۔ اسے گٹھیا کا عارضہ تھا۔ کبھی دردِ گردہ کا بھی دورہ پڑتا۔ وہ بیشتر وقت بستر پر پڑی رہتی۔ جب نوشا پہلے پہل اس گھر میں آیا اس نے بڑی ناک بھوں چڑھائی۔ اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ ممکن ہے اس کے شوہر سے شکایت بھی کی ہو۔ مگر وہ جلد ہی نوشا سے مانوس ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نوشا مستعدی سے اس کی خدمت کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا اس کے پیروں پر مالش کیا کرتا۔ اس کا سر دباتا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے لیے دوائیں اور انجکشن لاتا۔

نوشا اکثر رات کو کھانا کھانے کے بعد عارفہ بیگم کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ سرہانے بیٹھا اس کا سر دبایا کرتا اور گھنٹوں باتیں کیا کرتا۔ اس کی باتیں سیدھی سادی عام گھریلو قسم کی ہوتی تھیں۔ ان میں کچھ ماضی کی یادیں ہوتیں۔ عزیزوں اور رشتے داروں کا تذکرہ ہوتا۔ کسی کی غیبت اور کسی کی تعریف ہوتی اور شوہر کے خلاف گلے شکوے ہوتے۔ پروفیسر سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔ یہ معمولی اور عام سی باتیں تھیں جن کو نہ کبھی پروفیسر کلیم اللہ سننے کی زحمت گوارہ کرتا تھا اور نہ نادرہ توجہ دیتی تھی۔ نوشا ہی گھر بھر میں ایک ایسا فرد تھا جو عارفہ بیگم کی ہر بات چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ اسے بڑا اچھا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ بہت سعادت مند اور فرمانبردار۔ چنانچہ جب وہ کمرے سے اٹھ کر جاتا تو وہ دیر تک بڑی بوڑھیوں کی طرح اسے دعائیں دیتی رہتی۔

❁ ❁ ❁

نوشا اب پروفیسر کلیم اللہ کے کنبے کا ایک 'فرد بن چکا تھا۔ شروع شروع میں جو جھجک اور عار محسوس کرتا تھا، اب ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کھانے میں دیر ہو جاتی تو وہ بڑی بے تکلفی سے آواز لگاتا۔ ”بھئی کھانا لاؤ، شہر بھر کے سارے چوہے میرے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور خوب ادھم دھاڑ مچا رہے ہیں“

اسی طرح جب اس کی قمیصوں کے بٹن ٹوٹ جاتے یا کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو وہ نادرہ کے سر پر سوار ہو کر اسے درست کرواتا۔ کبھی خوشامد کرتا کبھی ناگواری سے منہ بگاڑتا اور اپنا کام کروائے بغیر نہ ٹلتا۔ البتہ پروفیسر کلیم اللہ کو وہ اب تک نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ پہلے بھی اس کے لیے معمہ تھا اور اب بھی معمہ تھا۔

وہ بھلکڑ اور غائب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ خبطی اور سنکی بھی تھا۔ ہر وقت کھویا کھویا رہتا

گھٹنوں کا درد۔ عارضہ: مرض۔ مستعدی: تیزی، ہوشیاری۔ غیبت: کسی کے پیٹھ پیچھے برا کہنا۔ عار: شرم۔ ادھم دھاڑ: شور شرابہ۔ بھلکڑ: بھول جانے والا۔ خبطی: دیوانہ، سودائی۔ سنکی: جنونی۔

اور اکثر اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔ بیوی کا کہنا تھا کہ وہ پہلے ایسا نہ تھا۔ اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اسے ذرا بھی تکلیف ہوتی تو بے چین ہو جاتا۔ طرح طرح سے اس کی دل جوئی کرتا۔ بچوں سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتا تھا اور پہلوٹی کے بیٹے سلیم اللہ کی چاہت کا تو یہ عالم تھا کہ اسے دیکھ کر نہال ہو جاتا۔ ہر طرح اس کی ناز برداری کرتا۔ اس کا مستقبل سنوارنے کے لیے نت نئے منصوبے بناتا رہتا۔ اس کی تعلیم اور تربیت پر پوری توجہ صرف کرتا۔ سلیم اللہ ذہین اور ہونہار طالب علم تھا۔ صحت مند اور خوش شکل تھا۔ ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ ایم بی بی ایس کا تیسرا ہی سال تھا کہ پروفیسر کلیم اللہ نے اسے لاڈ میں ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں وہ اپنے چند ہم جماعت طلباء کے ساتھ ایک روز سینڈس پٹ پر پکنک منانے گیا۔ سمندر میں نہاتے ہوئے بپھری ہوئی سرکش لہروں میں ایسا گم ہوا کہ دوسرے روز غوطہ خوروں کی سخت جدوجہد کے بعد اس کی لاش ملی۔ اس دل خراش سانحے سے ایسا شدید صدمہ پہنچا کہ پروفیسر کلیم اللہ ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ گھنٹوں بت بنا خاموش بیٹھا رہتا۔ بہکی بہکی باتیں کرتا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھر سے نکل جاتا۔ بیٹے کے انتقال کو کئی سال ہو گئے تھے مگر اس کے دماغ کی چولیں ایسی ڈھیلی ہوئیں کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ ہولو اور خبطی ہو گیا۔

مگر نوشا کے لیے وہ فرشتہ رحمت سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ محلے کے ایک شخص نے، جو محکمہ زراعت میں چپراسی تھا، کسی بات پر پروفیسر کو الو کا پٹھا کہہ دیا۔ نوشا کو ایسا تاؤ آیا کہ ایک لمحے بھی انتظار نہ کیا۔ تابڑ توڑ اس کے جبڑے پر کئی مکے جڑ دیے۔ اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ پاس پڑوس میں کھلبلی مچ گئی۔ خاصا ہنگامہ ہوا۔ بات پروفیسر تک پہنچی۔ اس نے فوراً اس شخص کے پاس جا کر باقاعدہ معافی مانگی اور دس روپے اصرار کر کے تاوان بھی دیا۔ نوشا ڈرا کہ اب وہ اس پر ناراض ہوگا۔ مگر اس نے نوشا سے صرف اس قدر کہا۔

"تمہارے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ تمہیں انجینئر کی بجائے فوجی بننا چاہیے مجھے تمہاری اسپرٹ پسند آئی۔"

وہ دیر تک اس کی پیٹھ تھپک کر شاباشی دیتا رہا۔

پہلوٹی کا بچہ: پہلا بچہ۔ دل خراش: تکلیف دہ۔ تاوان: جرمانہ۔ اسپرٹ: طاقت، تیزی۔

(۳)

موسم گرما کی سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف بگولے منڈلا رہے تھے۔ غبار میں ڈھکی ہوئی عمارتیں اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ سلطانہ کمرے میں تھکی ہوئی لیٹی تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ بہت ہلکا لباس پہنے تھی۔ اس کے برہنہ بازو تکیے پر جھول رہے تھے چہرے پر گہری زردی تھی اور آنکھیں دھلی دھلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

مہینہ بھر تک اسپتال میں رہنے کے بعد وہ پچھلے ہفتے واپس آئی تھی۔ اس کے برابر ہی پالنے میں ایک ننھا سا بچہ آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ یہ اس کا بچہ تھا اس کا چہرہ نیاز کی طرح چوڑا تھا۔ ناک کے نتھنے ابھرے ہوئے تھے اور دہانہ بڑا تھا۔ اس بچے کی پیدائش میں وہ اٹھارہ گھنٹے تک لیبر روم میں مچھلی کی طرح تڑپتی رہی اور موت اور زندگی کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی۔

وہ رات کے ۴ بجے پیدا ہوا تھا اس روز شام ہی سے سلطانہ کی حالت غیر تھی۔ اس پر بار بار غشی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ ۱۲ بجے تک اس کی نبضیں ڈوبنے لگی تھیں۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور چہرے پر سیاہی منڈلانے لگی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے گھبرا کر نیاز کو ٹیلی فون کیا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس رات اس نے شراب زیادہ پی لی تھی۔ مدہوش پڑا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا کہ وہ صبح سے پہلے اسپتال نہیں آسکتا۔ نرس نے کئی بار نمبر ملایا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہی مگر نیاز ایسا کروٹ بدل کر سویا کہ پھر آنکھ ہی نہ کھلی۔

چار بجے تک سلطانہ پر نزع کی حالت طاری رہی۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اس کے جسم میں دو بوتل خون داخل کیا گیا۔ نیاز آٹھ بجے صبح اسپتال پہنچا۔ بچے کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ مریضہ کے پاس جا کر بچے کو ایک نظر دیکھ لے۔ مگر اسے گھنٹہ بھر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ تمام وقت وارڈ کے باہر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ جب نرس نے بچہ لا کر دکھایا تو اس نے جھک کر بچے کو بے ساختہ چوم لیا۔

جب تک سلطانہ اسپتال میں رہی وہ پابندی سے اسے دیکھنے جاتا۔ دن میں کئی کئی بار ٹیلیفون

نزاعی حالت: دم نکلنے کی حالت۔ پالنا: بچوں کا جھولا۔

کرتا اور ہر بار بچے کے متعلق کچھ نہ کچھ پوچھتا۔ اسے اپنے بچے سے بے حد پیار تھا۔ گھر میں واپس آ کر
سلطانہ نے دیکھا کہ نیاز نے بچے کے لیے ڈھیر سارے کھلونے لا کر اکٹھا کر دیئے تھے۔ صبح اٹھتے ہی
سلطانہ کے کمرے میں آتا۔ بچے کی پیشانی کو بوسہ دیتا اور دیر تک اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ رات
واپس آتا تو ایک بار بچے کو ضرور پیار کرتا۔ اگر وہ جاگتا ہوتا تو پالنے کے قریب بیٹھ کر عجیب وغریب
آوازیں نکال کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتا۔

سلطانہ خوش تھی کہ نیاز بچے سے اس قدر پیار کرتا ہے۔ وہ خود بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ ا
نے اپنی جان کی بازی لگا کر اسے جنم دیا تھا۔ حالانکہ بچے کی پیدائش سے پہلے اکثر سوچا کرتی تھی کہ
اسے ماں کی مامتا نہ دے سکے گی۔ سلطانہ کو اس کے خیال ہی سے نفرت ہوتی تھی۔ ایک روز جب
راز افشا ہوا کہ وہ حاملہ ہے تو تمام دن روتی رہی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی نفرت بڑھتی گئ
وہ جل کر کبھی کبھی اسے کوسنے لگتی۔ "یا اللہ! یہ حرامی پیدا ہوتے ہی مر جائے۔" اسی کوفت میں وہ
ہو گئی۔ جسم لاغر پڑ گیا۔ ان دنوں وہ ذرا ذرا سی بات پر نیاز کو جھڑک دیتی۔ بلیوں کی طرح غرا کر ا
آنکھیں نکالتی اور گھنٹوں بند کمرے میں بیٹھی رویا کرتی۔ یوں بھی اس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر
گزرتا تھا۔ وہ بہت ہی کم باہر نکلتی۔ گھر کے نوکروں تک کے سامنے آتے ہوئے خوف معلوم ہوتا۔
اس نے سوچا تھا کہ پیدائش کے فوراً ہی بعد گلا گھونٹ کر چپکے سے اسے ختم کر دے گی۔ ا
اب یہ حالت تھی کہ اسے دیکھ کر جی رہی تھی۔ وہ ہر وقت بچے ہی کے کسی نہ کسی کام میں منہمک
رہتی۔ اسی کی بدولت وہ اب نیاز میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔ ورنہ اس نے ہمیشہ نیاز کی قربت۔
بیزاری محسوس کی تھی۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ کبھی بولتی بھی تو اس میں تلخی ہو
حقارت ہوتی اور دبی دبی سی نفرت۔ مگر اب یہ ہوتا کہ نیاز جب صبح ہی صبح بچے کو دیکھنے کمرے میں
تو وہ دیر تک نیاز کے پہلو میں بیٹھی باتیں کیا کرتی۔ وہ نیاز سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ بچہ ان۔
تعلقات کے درمیان مضبوط کڑی بن گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ در و دیوار انگاروں کی طرح تپتے۔ باہر احاطے میں خشک پتے دن
کھڑکھڑاتے۔

راز افشا ہونا: بھید کھل جانا، راز ظاہر ہونا۔

ایک روز بڑی زور کی آندھی آئی۔ آسمان کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ درختوں کی شاخیں چیخ چیخ کر
ہلنے لگیں۔ کھڑکیوں کے شیشے چھن چھن ٹوٹنے لگے۔ آندھی کا زور ٹوٹا تو موسلا دھار بارش
روع ہو گئی۔

اس طوفان سے بڑا نقصان ہوا۔
بجلی کے تار جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا کسی کھنڈر کی
رح ہیبت ناک نظر آتا تھا۔

تیز بارش سے جہاں اور بہت سا نقصان ہوا، اس میں میونسپلٹی کا نیا مارکیٹ بھی شامل تھا۔ یہ دو
زلہ عمارت تھی۔ نیچے بازار تھا۔ اوپر کی منزل میں رہائشی فلیٹ تھے۔ بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور
ارت کے ایک حصے کی چھت ٹوٹ کر نیچے آ گئی۔ کئی دیواریں شق ہو کر منہدم ہو گئیں۔
ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اوپر فلیٹوں میں رہنے والوں میں سے کئی خاندان پورے کے پورے
ندہ درگور ہو گئے۔ بڑا برا وقت تھا۔ گہرا اندھیرا پھیلا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ فائر بریگیڈ
لے رات بھر ملبے سے زخمیوں کو نکالتے رہے۔ بارہ افراد اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے جن میں ۴
وں اور ۳ عورتوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ ۵۵ زخمیوں کو نکال کر اسپتال پہنچایا گیا۔ بعض کی
الت بہت نازک تھی۔

دوسرے روز اخبارات نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا۔ اداریوں میں اس
ناک سانحہ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا اور میونسپلٹی کے ذمہ دار حکام کے خلاف سخت اعتراضات
ئے گئے۔

میونسپلٹی میں ایک گروپ خان بہادر کے مخالفین کا بھی تھا۔ انہوں نے اس حادثے کی آڑ لے
ایسے بیانات جاری کیے جن میں خان بہادر پر بحیثیت چیئرمین بہت سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔
شہریوں کی جانب سے احتجاجی جلسہ بھی ہوا جس میں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔
ض مقررین نے کھلم کھلا نیاز کا نام لیا۔ اس لیے کہ مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکیدار وہی تھا۔ صوبائی حکومت
نے احتجاج سے مرعوب ہو کر اسپیشل پولیس کے ایک سینئر افسر کی نگرانی میں فوراً تحقیقاتی کمیٹی مقرر
ردی۔ خان بہادر پہلے ہی کیا کم پریشان تھا، اس اطلاع نے اسے اور سراسیمہ کر دیا۔ معاملہ بہت سنگین

ق ہونا: پھٹنا، شگاف پڑنا۔ منہدم ہونا: مسمار ہونا، گرنا۔ زندہ درگور: زندہ دفن۔ اشتعال انگیز: جوشیلی، غصیلی۔ سراسیمہ: پریشان۔

ہو گیا تھا اور مخالفین تلے ہوئے تھے کہ اسے چیئرمین کے عہدے سے ہٹائے بغیر نہ رہیں گے۔

خان بہادر نے اس صورتحال سے گھبرا کر میونسپلٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور ساری ذمہ داری نیاز پر ڈال دی۔ اس طرح عدم اعتماد کی تحریک اس کے خلاف کارگر نہ ہو سکی۔ مخالفین کو منہ کی کھانا پڑی۔

میونسپلٹی کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد وہ تحقیقاتی کمیٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ جو پولیس افسر اس کا نگراں مقرر ہوا تھا اس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ معلوم ہوا کہ وہ عنقریب ریٹائر ہونے والا ہے۔ خان بہادر کو یہ اطلاع ملی تو ہاتھ اونچا کر کے بولا۔

"بس اب کام بن گیا۔"

خان بہادر اس افسر سے ملا۔ آدمی تجربہ کار تھا۔ اس کی باتوں سے تھوڑی ہی دیر میں خان بہادر کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ بن سکتا ہے۔ اس نے ۲۰ ہزار روپے مخمل کے ڈبے میں رکھ کر اسے "نذرانہ" دیا اور بقول شخصے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

تحقیقات ہوتی رہی۔ خان بہادر حسب معمول روزانہ شام کو اسکاچ کے تین چار پیگ چڑھاتا اور رات گئے تک رمی کھیلتا۔ البتہ نیاز کی آمدورفت اس نے اپنے یہاں بالکل بند کرادی اور یہ مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے وہ شہر سے باہر چلا جائے۔ نیاز پہلے تو تیار ہو گیا۔ پھر اس کی سمجھ میں خود ہی یہ بات آگئی کہ غیر حاضری سے خواہ مخواہ شبہ پیدا ہو گا۔ لہٰذا اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

نیاز کے لیے یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ وہ گھر میں بہت کم رہتا۔ دوڑ دوڑ کے ان ٹھیکے داروں کے پاس جاتا جن کے ذریعہ اس نے مارکیٹ بنوائی تھی۔ گھر میں جتنی دیر رہتا کھویا کھویا سا بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہتا۔ اکثر رات گئے بستر سے اٹھ کر سلطانہ کے پاس آتا اور اس سے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیتا۔

❁ ❁ ❁

نیاز ایک رات سلطانہ کے پاس کمرے میں بیٹھا تھا۔

باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ بچہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ ہمک ہمک کر نیاز کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لیکن نیاز بڑا افسردہ تھا۔ سلطانہ نے دل جوئی کی کوشش کی۔ بچے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اپنی پریشانی میں آپ نے ننھے کو بھی بھلا دیا۔ دیکھئے تو آپ کو کس طرح دیکھ رہا ہے۔"

نیاز نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کا رخسار چوم کر بولا۔ "بیٹا تمہارے باپ کو سزا ہو گئی تو ر تم کس کے ساتھ کھیلو گے؟"

سلطانہ نے فوراً کہا۔ "آپ پر تو آج کل یہی بھوت سوار ہے۔"

نیاز مسکرا کر چپ ہو گیا۔ سلطانہ کچھ کہنے ہی جا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی زور زور سے ج گی۔ نیاز نے بچے کو سلطانہ کی گود میں دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ برساتی میں پولیس کی گاڑی کھڑی ی۔ ایک انسپکٹر اور کئی مسلح کانسٹیبل دروازے پر موجود تھے۔ وہ گرفتاری کے وارنٹ لے کر آئے ھے۔ انہوں نے اسی وقت اسے حراست میں لے لیا اور گاڑی میں بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے۔

نیاز کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو خان بہادر گھبرا گیا۔ اس نے جو اسکیم تیار کی تھی اس میں نیاز کی زاری کے پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ خطرہ یہ درپیش تھا کہ مارکیٹ کے ٹھیکے سے جو منافع ہوا ا اس میں سے ۸۰ ہزار روپے خان بہادر کے حصے میں بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو ں فیکٹری لگائی تھی اس کی تعمیر میں سیمنٹ اور لوہا بھی مارکیٹ ہی کے کوٹے سے گیا تھا۔ یہ سارا م نیاز ہی کے ذریعے ہوا تھا۔ اس نے سوچا نیاز کہیں گھبرا کر سب کچھ صاف صاف نہ اگل دے۔ کی صورت میں اس کے پھنس جانے کا قطعی امکان تھا۔

پہلی بار خان بہادر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل کترانے کے بجائے اسے نیاز کو اپنے ے میں رکھنا چاہیے تھا۔ بہرحال اب جو کچھ ہو چکا تھا اس کا تدارک ضروری تھا۔ چنانچہ چند ہی روز د اس نے دوڑ دھوپ کر کے نیاز کو ضمانت پر رہا کرا لیا۔

دوسرے مہینے تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کو دے دی۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ کیٹ کی تعمیر میں جو میٹریل استعمال کیا گیا تھا وہ بہت ناقص اور غیر معیاری تھا مزید براں سیمنٹ کا ب بہت کم تھا۔ اس کی کو ریت اور بجری سے پورا کیا گیا تھا۔ چھتوں پر کنکریٹ برائے نام ڈالی گئی ور لوہا ضرورت سے بہت کم استعمال کیا گیا تھا۔ یہ سارے الزامات نیاز کے خلاف تھے۔

تحقیقاتی کمیٹی نے حکومت سے پرزور سفارش کی تھی کہ ٹھیکیدار کے خلاف سخت کارروائی کی ئے۔ اس کی بدعنوانیوں کے باعث ۱۲ شہریوں کی قیمتی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ سات افراد اپنے

بچانا۔ تدارک: روک تھام۔

جسموں کے اکثر اعضاء ضائع کر کے اپاہج ہوگئے اور لاکھوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔

رپورٹ میں جگہ جگہ نیاز کے خلاف ٹھیکیدار کی حیثیت سے سنگین الزامات لگائے گئے تھے اسے ہر طرح جانی اور مالی نقصانات کا ذمہ دار قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ گو کہ یہ رپورٹ ہنوز کانفیڈنشیل تھی مگر خان بہادر کو اس کی ایک نقل مل گئی۔ نقل کے ملتے ہی وہ بدحواس ہوگیا۔ اب نیاز اسے اپنی سلامتی کے لیے بے حد خطرناک نظر آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ معاملہ عدالت کے روبرو بھی جائے گا اور وہاں نیاز کا بیان بھی لیا جائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد خان بہادر کو اپنی گلو خلاصی کے لیے ایک ہی راستہ نظر آیا۔ اور وہ تھا نیاز کا صفایا۔ نیاز کو قتل کیے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس کی موجودگی سے خان بہادر کو ہر وقت خطرہ درپیش تھا نیاز اس کے خلاف سارے ثبوت مہیا کر سکتا تھا۔

نیاز کے قتل کا پورا منصوبہ خان بہادر تیار کر چکا تھا۔ اسے صرف ایک شخص کا انتظار تھا جو ان دنوں راولپنڈی میں تھا۔ اور جلد ہی آنے والا تھا۔

(۴)

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔

آسمان پر گھٹا چھائی تھی۔ کمرے میں نرم نرم بھیگے ہوئے جھونکے آرہے تھے جن میں برسات کے پہلے چھینٹے کی مہک تھی۔ نادرہ گردن جھکائے کاغذ پر آہستہ آہستہ لکھ رہی تھی۔ اس کے برابر نوشا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ابتدائی کلاسوں کی کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی۔ گزشتہ کئی مہینوں سے وہ پابندی کے ساتھ نادرہ کی نگرانی میں پڑھ رہا تھا۔

نادرہ نے لکھتے لکھتے فاؤنٹین پن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور تھکی ہوئی سی انگڑائی لی۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کے جسم پر لہروں کا مدوجزر پھیلتا چلا گیا۔ نادرہ ذرا دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی پر چلی گئی۔

نوشا مکتب کے کسی طالب علم کی طرح جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ

کانفیڈنشیل: خفیہ۔ گلو خلاصی: چھٹکارا، نجات۔ مدوجزر: اتار چڑھاؤ۔ مکتب: اسکول۔

ہل رہے تھے اور نگاہیں کتاب پر جمی تھیں۔ ذرا دیر بعد نادرہ کی آواز ابھری۔ "نوشا یہاں آؤ۔"

وہ چپ چاپ جا کر اس کے برابر کھڑا ہوگیا۔ نادرہ نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش کھڑی رہی۔ سامنے حد نظر تک روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں کے جھلکتے ہوئے دریچوں نے چراغاں کر دیا تھا۔ رم جھم رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ دور افق پر بار بار بجلی کڑک رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے نادرہ کے بالوں کی ایک لٹ بکھر کر رخسار پر لہرا رہی تھی۔ چند منٹ بعد نادرہ نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آج رات بھر بارش ہوگی۔"

نوشا نے مختصر جواب دیا۔ "ہاں"

اچانک نادرہ نے بڑا بے تکا سا سوال کیا۔ "نوشا تم نے کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔

"تم سخت بور معلوم ہوتے ہو۔"

نوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ننھی ننھی بوندوں کی جھالر روشنی کے پس منظر میں لہراتی رہی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ نادرہ کا جسم بار بار تھرتھرا کے رہ جاتا۔ وہ بے چین نظر آرہی تھی۔ اس نے نوشا کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔

"تم نے کسی لڑکی کو پیار بھی نہیں کیا؟"

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ نوشا کو اس کی بات بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ شرما کر بولا۔ "نہیں"

اس دفعہ نادرہ نے گھوم کر اس کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "سچ؟"

نادرہ کی نظریں نوشا کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اس نے الجھی ہوئی آواز سے کہا۔ "نوشا!"

اور نوشا نے بے اختیار اپنا منہ اس کے ہونٹوں کی جانب بڑھا دیا۔

عین اسی وقت کمرے میں کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ نوشا نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پروفیسر کھڑا تھا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی گول گول آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ کمر

کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ گردن اونچی کئے باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ نوشا اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے نظریں نیچی کرلیں۔ پروفیسر نے انگلی کے اشارے سے نوشا کو اپنے قریب بلایا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

نوشا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور نیچے آ گئے۔ پروفیسر کمرے کا دروازہ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔ "قطعی ناقابل برداشت۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ یہ انسانی ہمدردی کا بے جا استعمال ہے۔" اچانک وہ غضب ناک ہو کر دھاڑا۔

"کیا سمجھے تم؟"

نوشا سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑا رہا۔

پروفیسر کہنے لگا۔ "مسٹر! تم اس کمرے کو فوراً خالی کر دو۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ تم کو وقت نہیں دے سکتا۔" یہ کہہ کر وہ دہلیز کے بیچوں بیچ ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

نوشا ہکا بکا کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے، ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو، جیب کترے ہو، اٹھائی گیرے ہو۔ میں تم کو اس بات کا ہرگز حق نہیں دے سکتا کہ تم میری بیٹی کے ساتھ فلرٹ کرو۔ تم اور نادرہ مل کر مکمل اکائی نہیں بن سکتے۔ وہ خط مستقیم ہے اور تم خط منحنی۔ دو غیر مساوی مقداریں۔ تم مسئلہ فی التناسب سمجھتے ہو؟"

نوشا ہونق کی طرح خاموش کھڑا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر زور سے چیخا۔ "میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ تین منٹ ہو چکے ہیں۔ پانچویں منٹ پر تمہارا ایک قدم گھر کے باہر ہونا چاہیے۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

نوشا نے گھبرا کر جلدی جلدی اپنا سامان ایک چادر میں باندھا اور گٹھری اٹھا کر بغل میں دبالی۔

پروفیسر نے معائنہ کرنے والے انسپکٹر کی طرح نوشا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔

اٹھائی گیرا: اچکا، جیب کترا۔ فلرٹ: جھوٹی محبت۔ خط مستقیم: سیدھی لکیر۔ خط منحنی: ٹیڑھی لکیر۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

نوشا کمرے سے باہر نکلا۔ پروفیسر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے گھر کا ...در دروازہ کھولا۔ نوشا سہما ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے دروازے کا بولٹ چڑھانے کی آواز سنی۔ اندر ...م گردش میں قدموں کی آواز آہستہ آہستہ ابھری۔ چوبی زینے پر ٹھپ ٹھپ کا دبا دبا شور ہوا۔ ...وفیسر اوپر جا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

نوشا دروازے کے باہر کھڑا ایک ایک آواز ایک ایک آہٹ سنتا رہا۔ ابھی تک بوندا باندی ...رہی تھی۔

آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ اسے رہ رہ کر پروفیسر پر غصہ آ رہا تھا۔ سالا الو کا پٹھا ہے۔ ...ل دم چڑیا۔ نہ جانے کیسی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔

لیکن اس گھر سے نکلنے کا اسے بہت افسوس تھا۔ کئی سال بعد اسے گھریلو ماحول ملا تھا۔ جہاں وہ ...ش تھا، مطمئن تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسکول میں پڑھنا شروع کر دے گا۔ بغل میں موٹی موٹی ...ابیں دبا کر ٹھاٹھ سے پڑھنے جائے گا۔ پھر وہ میٹرک کا امتحان پاس کر لے گا۔ نادرہ نے یہی کہا تھا مگر ...سالی نے تو انگریزی کا سبق پڑھاتے پڑھاتے پیار و محبت کا سبق پڑھانا شروع کر دیا اور اس طرح ...روع کیا کہ اپنا ڈبا ہی گول ہو گیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

نادرہ پر اسے طیش آ رہا تھا اور وہ اسے یاد بھی آئی۔ وہ چھریرے جسم کی نازک اور دلکش لڑکی جو ...ت بات پر اسے ڈانٹتی پھٹکارتی تھی اور جس کے ناراض ہونے میں اسے مزا آتا تھا۔ اب وہ اسے دیکھ ...سکے گا یہ سوچتے سوچتے دل بوجھل ہو گیا۔ اس نے بڑی بے چارگی کے عالم میں سوچا کہ وہ کراچی ...وڑ دے گا۔ سیدھا اماں کے پاس جائے گا۔ سب سالا کھٹ راگ ہے۔ بس اب گھر چلنا چاہیے۔

اسی وقت اس نے طے کیا کہ سویرے کی ٹرین سے چلا جائے گا۔ کراچی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ...وڑ دے گا۔

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور رات سر پر کھڑی تھی۔ نوشا نے اسٹیشن کے مسافر ...نے میں رات بسر کرنے کا پروگرام بنایا۔ معاً راجہ یاد آ گیا۔ سوچا چلتے چلتے اس سے بھی مل لینا

...با: لکڑی کا بنا ہوا۔ آشیانہ: نشیمن، گھونسلہ۔ چھریرا: دبلا پتلا۔ کھٹ راگ: بکواس، مصیبت۔

چاہیے۔ جانے اب اس سے کبھی ملاقات ہو بھی کہ نہیں۔

پروفیسر کے دروازے پر کھڑے ہونے سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ نوشا نے گٹھری سر پر رکھی۔ آگے بڑھا اور سڑک پر چلنے لگا۔

وہ راجہ کے پاس پہنچا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ راجہ ایک کونے میں سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ قریب ہی ایک کتا لیٹا تھا۔ ترپال سے بارش کا پانی ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ اندر کیچڑ تھی، سڑاند تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ نوشا ٹھٹھک کر باہر ہی رہ گیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتا غرا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ ساتھ ہی راجہ کی آواز ابھری۔

"کون ہے؟"

نوشا نے بے تکلفی سے کہا۔ "ارے یار میں ہوں نوشا۔ پر یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔"

"ابے اپنی قسمت میں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔" راجہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "باہر کیوں کھڑا ہے۔ اندر آجا۔"

نوشا گردن جھکا کر اندر داخل ہوا تو نتھنوں پر تیز بو نے اچانک حملہ کر دیا۔ وہ چپ چاپ جا کر راجہ کے قریب بیٹھ گیا۔

راجہ نے پوچھا۔ "اس وقت بارش میں کیسے آگیا؟"

نوشا نے جواب دیا۔ "میں صبح کی گاڑی سے گھر جا رہا ہوں۔"

"سچ؟" راجہ کو یقین نہ آیا۔ "یار ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"ابے میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"مگر تو تو کہتا تھا کہ میں نے پڑھائی شروع کر دی ہے۔ اسکول میں نام لکھوانے والا ہوں۔ میٹرک کا امتحان دوں گا یہ کروں گا، وہ کروں گا۔ وہ سارا پروگرام کیا ہو گیا؟"

"بات تو کچھ ایسی ہی تھی پر یار اپنی سالی تقدیر ہی کھوٹی ہے۔"

راجہ گردن ہلا ہلا کر اپنی بھونڈی اور بے سری آواز سے گنگنانے لگا۔

تقدیر بنی بن کر بگڑی دنیا نے ہمیں برباد کیا

نوشا نے بیزاری سے کہا۔ "ابے بند کر اپنی یہ بھیرویں۔ میں بات کر رہا ہوں اور تجھے گلے

سڑاند: کسی شے کے سڑنے کی بدبو۔ سجھائی دینا: نظر آنا۔ دل گرفتہ: رنجیدہ، غمگین۔ بھیرویں: ایک راگنی جو صبح کے وقت گائی جاتی ہے۔

زی کی سوجھی ہے۔ سالے تجھے کبھی عقل نہ آئی۔"

راجہ کھسیانا ہو کر بولا۔ "یار یوں ہی دل پشوری کر لیتے ہیں۔ تو آگیا تو ذرا بات چیت بھی لی۔ ورنہ شام سے اکیلا پڑا ہوں۔ بخار بھی ہے۔"

راجہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا نے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھا۔ وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ جہ کے سارے کپڑے بارش کی بوچھاڑ سے بھیگ گئے تھے۔ وہ اس وقت دھوبی کی ناند میں پڑے ئے گیلے کپڑوں کی پوٹ معلوم ہو رہا تھا۔

"ابے تو نے کچھ کھایا پیا بھی؟" نوشا نے پوچھا۔

راجہ نے جواب دیا۔ "نہیں، بھوک ہی نہیں لگی۔"

"اچھا لے ایک سگرٹ تو پی۔"

"یار نوشے! کیا بات کہی تو نے۔ قسم اللہ کی دل خوش کر دیا۔"

دونوں نے سگریٹیں سلگائیں اور لمبے لمبے کش لگانے لگے۔ بارش کے قطرے ترپال پر ٹپ پ گر رہے تھے۔ ہوا سرد تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ر نوشا نے دیوار سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ راجہ پر بھی نیند کی غنودگی طاری ہو گئی۔ دونوں ک کر سو گئے۔

⊛ ⊛ ⊛

رات کے پچھلے پہر نوشا کی آنکھ کھل گئی۔

کتا بارش سے بھیگ کر کوں کوں کرتا ہوا اس کی ٹانگوں کے اندر گھس گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کتے کو گالیاں دینے لگا۔

"دھت تیرے کی۔ مار دیا سالے نے۔"

راجہ بھی اس کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ "ابے نوشے! کیا ہو گیا؟"

نوشا جل کر بولا۔ "ہو کیا گیا۔ یہ سالا تیرا کتا ہے۔ حرامی پن کر رہا ہے۔ تو نے بھی کیا جھمیلا ال رکھا ہے۔"

راجہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یار انسانوں کا ساتھ تو چھوٹ گیا۔ اب جانوروں سے بھی

دل پشوری: ہنسی مذاق، دل لگی۔ ناند: بڑا کونڈا۔ پوٹ: گٹھری۔ جھمیلا: مصیبت۔

دوستی نہ کروں۔"

اس کے لہجے میں بلا کا کرب تھا۔ نوشا کانپ اٹھا۔ مینہ برسنا بند ہو گیا تھا۔ آسمان شفاف نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھیلنے لگی تھی۔ نوشا نے جھک کر باہر دیکھا۔

"سویرا ہونے والا ہے۔ اب میں اسٹیشن چلوں گا۔"

"ابے چلا جانا۔ تھوڑی دیر تو اور بیٹھ۔"

نوشا کے پاس اس وقت ۴۰ روپے تھے اور کچھ ریزگاری۔ اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور راجہ کو دیتے ہوئے بولا۔

"لے یہ روپے رکھ لے۔"

"نہیں یار، میں تیرے روپے نہیں لوں گا۔ میرا تو کسی نہ کسی طرح کام چل ہی جاتا ہے۔ تو اتنے دنوں بعد گھر جا رہا ہے۔ خالی ہاتھ جائے گا تو سب کیا کہیں گے؟"

نوشا اصرار کرنے لگا۔ مگر راجہ نے نوٹ نہیں لیا۔ "تو مجھے ایک سگرٹ اور پلا دے۔ گلا سوکھ رہا ہے۔"

دونوں نے ایک ایک سگرٹ سلگائی۔ تمباکو کا دھواں ہر طرف بکھر گیا۔ راجہ نے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر بڑا سا چاقو نکالا۔ نوشا کی طرف بڑھا کر بولا۔

"لے اسے رکھ لے۔ کچھ کام ہی دے جائے گا۔ میرے لیے تو اب یہ بیکار ہو گیا ہے۔"

"میں نے چاقو واقو رکھنا چھوڑ دیا ہے۔" نوشا نے چاقو لینے سے صاف انکار کر دیا۔ "اسے تو اپنے ہی پاس رکھ۔"

"تو اسے میری نشانی ہی سمجھ کر رکھ لے۔" اس کی آواز دردناک ہو گئی۔ "میرے پاس رہے گا تو کسی دن اپنے ہی ہاتھوں اپنا سینہ نہ چیر ڈالوں۔ یار سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ تف ہے ایسے جینے پر۔"

نوشا نے چاقو لے کر چپ چاپ اپنے پاس رکھ لیا۔ راجہ کے چہرے کو دیکھا جو صبح کاذب کی دھندلی دھندلی روشنی میں بڑا خوفناک نظر آ رہا تھا۔ راجہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ وہ بار بار بے چینی سے کروٹ بدلنے لگتا۔ آخر جب نوشا اٹھ کر جانے لگا تو راجہ نے عاجزی

بلا کا کرب: بہت زیادہ دکھ۔ دردناک: دکھ بھری۔ صبح کاذب: صبح کی روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

سے کہا۔

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جا۔ ایک تیرا ہی تو سہارا رہ گیا تھا۔ اس دنیا میں اب اپنا کوئی نہیں رہا۔"

اس کی آواز بھرّا گئی۔ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اس نے تڑپ کر نوشا کا ہاتھ مضبوطی سے دبوچ لیا۔ اس پر اپنا منہ رکھ کر بولا۔ "نوشے! خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ میرا کوئی نہیں۔ ہائے میرا کوئی نہیں رہا۔" وہ چیخیں مار مار کر رونے لگا نوشا کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر راجہ کے چہرے پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

دونوں کچھ دیر اسی طرح روتے رہے۔ ان کی سسکیاں گہری خاموشی میں ابھرتی رہیں۔ پھر راجہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے نوشا سے کہا۔

"جا یار! تجھے دیر ہو رہی ہے۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

نوشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور راجہ کو دے دیا۔ اس نے اپنی گٹھری اٹھائی اور آگے بڑھا۔

باہر آ کر اس نے مڑ کر راجہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ نوشا کو دیکھ کر وہ تلخی سے بولا۔ "یار اب تو جا۔ کیوں خواہ مخواہ دیر کر رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا بڑھ کر سڑک پر آ گیا۔ دور تک راجہ کی کھانسی اسے سنائی دیتی رہی۔

وہ اسٹیشن پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اس نے ٹکٹ خریدا اور تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی گاڑی چھوٹنے میں دیر تھی مگر مسافروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔

گھنٹہ بھر بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ ڈبا مسافروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔

نوشا ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اسے اپنا شہر یاد آ رہا تھا۔ اپنا محلّہ اور محلّے کی وہ گلی جس کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین تھی۔ جہاں راتوں کو سب لڑکے مل کر کھیلتے تھے۔ اودھم مچاتے تھے۔ گلی کی نیچی نیچی دیواروں والے وہ مکان جن میں اس کا بھی گھر تھا اماں، سلطانہ اور انّو۔ نہ جانے سب لوگ اب کیسے ہوں گے؟ اسے دیکھ کر کیا کہیں گے؟ ایک کے بعد دوسرا خیال۔ ایک یاد کے بعد دوسری یاد۔

خیالات کا سلسلہ تھا کہ پھیلتا ہی جارہا تھا۔ ٹرین آہنی پٹریوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اور وہ یادوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

نوشا ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے خاموشی سے پلیٹ فارم طے کیا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر آگیا۔ ایک رکشا والے کی جانب بڑھتے ہوئے شبہ ہوا کہ کہیں اسے دیکھا ہے۔ وہ دبلا پتلا نوجوان تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں اور اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔

رکشا والے نے بھی غور سے دیکھا اور چیخ کر بے اختیار اس کے گلے سے چمٹ گیا۔

"ابے نوشے تو آگیا؟"

وہ شامی تھا۔ اس سے مل کر نوشا کو بڑی خوشی ہوئی۔ "ابے یہ دھندا تو نے کب سے شروع کر دیا؟"

شامی مری ہوئی آواز سے بولا۔ "یار ابا کے مرنے کے بعد تو سالی مصیبتوں نے اپنا گھر دیکھ لیا۔"

"ابے تیرے ابا کا انتقال ہو گیا۔ کب؟"

"یار ان کو مرے ہوئے یہ تیسرا سال ہے۔"

نوشا نے پوچھا۔ "دکان بھی تو تھی تیری؟"

"وہ تو ابا کی بیماری کے زمانے ہی میں بیچ دی تھی۔" شامی اپنی پریشانیاں سنانے لگا۔ وہ صبح کے وقت ابھی تک اخبار بیچتا تھا اور رات کو سائیکل رکشا چلاتا تھا۔ گھر میں سات کھانے والے تھے اور ان سب کا بوجھ تنہا اس کے کندھوں پر تھا۔ اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ وہ رک رک کر کھانس رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے نوشا سے پوچھا۔

"مگر اس وقت تم جاؤ گے کہاں؟"

نوشا کو اس کے سوال پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ "گھر جاؤں گا اور کہاں؟"

"کونسا گھر؟" شامی نے دریافت کیا۔

نوشا گھبرا گیا۔ "ابے کیا اڑا رہا ہے؟ اپنے گھر جاؤں گا۔ وہی گلی والا گھر اور میرا کونسا گھر ہے؟"

شامی نے گردن نیچی کر لی اور رسان سے بولا۔ "تو یار تجھے کچھ بھی پتہ نہیں؟"

نوشا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے صرف ایک لفظ کہا۔ "کیا؟"

"اس گھر میں تو حاجی رحیم بخش رہتے ہیں۔"

نوشا نے گھبرا کر کہا۔ "اور میری اماں؟"

شامی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "ان کا تو دو سال ہوئے انتقال ہو گیا۔"

نوشا کے سینے پر زبردست گھونسا لگا۔ وہ شامی کے گلے سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا۔ دیر اس کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ پھر اس نے بھرّائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "میری بڑی بہن اور انو ال ہیں؟"

شامی نے ٹالنا چاہا۔ "تمہارے جانے کے بعد گھر میں بڑی عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔ تم ے ساتھ گھر چل کر بیٹھو تو اطمینان سے سب کچھ بتاؤں گا۔ بڑی لمبی داستان ہے۔"

نوشا نے اصرار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "یار کچھ تو بتا دے۔ تو نے مجھے یہ خبر بتا کر بے ت مار دیا۔ ہائے اماں تم کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔" نوشا پھر منہ بسور کر رونے لگا۔

"اچھا اب تم رکشے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو راستے میں بتا دوں گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ نے لگا تو گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔"

نوشا رکشا پر سوار ہو گیا۔ شامی نے پیڈل پر پیر مارا۔ رکشا آگے روانہ ہوا۔ تھوڑی دور جانے بعد نوشا نے اپنا سوال دہرایا۔ "یار یہ تو بتا دے کہ سلطانہ اور انو کہاں ہیں؟"

"انو کی نہ پوچھ۔ اس سالے نے تو ناک کٹوا دی۔"

"کیوں؟" نوشا نے چونک کر پوچھا۔

"سالا ہیجڑوں کے ساتھ رہتا ہے۔ روزانہ شام کو خوب پوڈر ووڈر لگا کر ان کے ساتھ بازار گھومتا ہے۔ پھٹا پھٹ تالیاں پٹخارتا ہے۔ عورتوں کی طرح اٹھلا اٹھلا کر لپکتا ہے۔ اسے ذرا شرم نہیں آتی۔ یار برا نہ ماننا۔ میرا بھائی ہوتا تو سالے کے چار ٹکڑے کر کے ڈال دیتا۔ اس نے بے غیرتی کی حد کر دی۔"

نوشا کا خون کھول اٹھا۔ تڑپ کر پوچھا۔ "وہ سالا رہتا کہاں ہے؟"

"نہ جانے کہاں رہتا ہے۔ پر شام کو بازار میں ضرور نظر آتا ہے۔"

نوشا نے ایک لمبی "ہوں" کی۔ پوچھا۔ "سلطانہ کا بھی کچھ اتا پتا ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے؟"

شامی اس وقت سڑک کی چڑھائی پر رکشا لے جا رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوشا نے ذرا دیر بعد اپنی بات دہرائی تو اس نے بتایا۔

"وہ تو نیاز کے ساتھ رہتی ہے۔"

نوشا بھونچکا ہو کر بولا۔ "نیاز کے ساتھ؟"

"ہاں بے وہی نیاز کباڑیا جس کی بازار میں دکان تھی۔ اب تو وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایک دم صاحب بہادر لگتا ہے۔ کوٹ پتلون پہنتا ہے اور موٹر کار سے نیچے بات نہیں کرتا۔ یار اس کے تو بڑے ٹھسے ہیں۔ دیکھے گا تو پہچان بھی نہ سکے گا۔"

"مگر سلطانہ اس کے یہاں کیوں چلی گئی؟"

"یار! بات یہ ہے نا کہ تیری اماں نے نیاز سے نکاح پڑھوا لیا تھا۔ تو ناراض نہ ہو تو ایک بات بتاؤں۔" شامی نے بات کہتے کہتے قدرے تامل کیا، پھر دبی زبان سے بتایا۔ "میں نے سنا ہے کہ سلطانہ کی اور نیاز کی کچھ لگ سٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے نیاز نے تیری اماں کو مروا دیا۔ سارے محلے والے یہی کہتے ہیں۔" وہ رکشا چلاتا جا رہا تھا اور رک رک کر بول رہا تھا۔ "سالے نے بہت حرامی پن کیا۔ ایک نمبر بدمعاش ہے۔"

نوشا خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے شامی سے دریافت کیا۔ "تجھے نیاز کا گھر معلوم ہے؟"

"ہاں معلوم ہے۔"

"تو مجھے وہیں لے چل۔"

"یار اس وقت وہاں جا کر کیا کرے گا وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

وہ نیاز کی کوٹھی پر جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ شامی نے مجبوراً رکشا اس طرف موڑ دی۔ اب نوشا بہت کم بول رہا تھا۔ کبھی کبھار ہوں ہاں کر دیتا۔ شامی رک رک کر محلے کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں سناتا رہا۔

نیاز کی کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ کر شامی نے رکشا ٹھہرایا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ نوشا نے رکشا سے اتر کر شامی کو کرائے کا ایک روپیہ دینا چاہا تو اس نے خفا ہو کر گالی دی۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "یار!

بھونچکا: حیران۔ ٹھسا: شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹ۔ تامل: وقفہ۔ لگ سٹ: مراد دوستی، محبت۔

کراچی سے چند ٹکے کما لایا تو مجھ پر رعب جھاڑ رہا ہے۔ یہ روپیہ اپنے پاس رکھ۔ صبح گھر آنا۔ دونوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔ اور دیکھ نیاز کے ہاں تیرا زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔" وہ اچک کر رکشا پر سوار ہوا، پیڈل پر پیر مارا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

نوشا کوٹھی کے پھاٹک پر خاموش کھڑا رہا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ البتہ ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مگر یہ روشنی اس قدر دھیمی تھی کہ تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ نوشا نے آہستہ سے پھاٹک کھولا اور احاطے کے اندر چلا گیا۔ مگر برساتی کی طرف جانے کے بجائے وہ درختوں کی جانب مڑ گیا۔ وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ خشک پتے اس کے پیروں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بار بار چونک پڑتا۔

اس نے آہستہ سے جوتے اتارے اور درختوں کے نیچے ایک طرف رکھ دیئے۔ قریب ہی گٹھری بھی رکھ دی۔ اس نے دبے دبے قدموں چل کر کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ ہر طرف سے جائزہ لیا۔ پھر اپنی گٹھری کے پاس آیا۔ چاقو نکال کر کھولا اور اسے دانتوں میں دبا کر دیوار پر چڑھ گیا۔ کوٹھی کے اندر گہری خاموشی تھی۔ وہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر چلا گیا۔ اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا اس کے کمرے کے قریب پہنچا جہاں روشنی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

اس نے برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لے کر کمرے کے اندر نظر ڈالی۔ نیاز سامنے صوفے پر ایک طرف جھکا ہوا نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک رک کر گہری سانس بھر رہا تھا۔ نوشا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ نیاز کو ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

اچانک اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ آہٹ ہوئی۔ نیاز نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا نوشا آن کی آن میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو ہاتھ میں تھا۔ اس نے پہلا ہی وار بھرپور کیا۔ تین پسلیاں چیر ڈالیں۔ نیاز زور سے چیخا۔

"ہائے مار ڈالا۔"

وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر پڑا۔ نوشا ایک ٹانگ کے بل جھک کر بیٹھ گیا اور پے بہ پے وار کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے نیاز کے سینے کو، پیٹ کو، گردن کو، بازوؤں کو، ہر ہر حصے کو چیر ڈالا۔

ہو کا عالم: ویرانی، مکمل خاموشی۔ پے بہ پے: مسلسل۔

نیاز کا جیتا جیتا خون کمرے میں ہر طرف پھیل گیا۔ وہ ذرا دیر تک تڑپتا رہا، کراہتا رہا۔ پھر اس نے دم توڑ دیا۔

❂ ❂ ❂

نوشا لاش کے سرہانے بیٹھا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ خون سے بھرا ہوا چاقو ابھی تک ہاتھ میں تھا۔ اسی اثنا میں کمرے کے باہر آہٹ ابھری۔ نوشا نے پلٹ کر دیکھا۔ سلطانہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نوشا کو دیکھا۔ پھر نیاز کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش دیکھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔

"ہائے نوشا تو نے یہ کیا کر دیا۔"

نوشا خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ سلطانہ اس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

نوشا نے خونخوار نظروں سے اسے مڑ کر دیکھا۔ گردن ہلا کر بولا۔ "تھانے!" اس کی آواز ڈھول کی طرح گرجدار تھی۔

سلطانہ جھپاک سے آگے بڑھی۔ دروازے پر پہنچی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔"

نوشا غرا کر چیخا۔ "ہٹ جا حرامزادی چھنال میرے سامنے سے۔ ٹکڑے کر کے یہیں تیرے یار کے پاس ڈال دوں گا۔"

وہ پاگلوں کی طرح بولتی چلی گئی۔ "تو مجھے بھی مار دے۔ تو مجھے بھی مار دے۔"

نوشا نے قریب پہنچ کر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی۔ نوشا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سلطانہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "نوشا میرے بھائی۔ اللہ کے لیے رک جا۔ میری بات تو سن لے۔" وہ گڑگڑا کر رونے لگی۔

سراسیمہ: حیران پریشان۔ چھنال: بدکار عورت۔

نوشا کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے پیر کو زور سے جھٹکا دیا۔ سلطانہ لڑھک کر دور جا گری۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سلطانہ فرش پر پڑی ہوئی رک رک کر کہہ رہی تھی۔

"نوشا، خدا کے لیے رک جا!"

"نوشا! نوشا!"

اس کی آواز دیر تک ابھرتی رہی۔

نوشا کوٹھی سے نکل کر باغیچے میں آ گیا۔ درختوں کے خشک پتوں پر اس کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوٹھی میں خادمہ بدحواس ہو کر زور زور سے چیخ رہی تھی۔ نوشا نے احاطہ طے کیا۔ پھاٹک کھولا اور باہر سڑک پر آ کر بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں خون سے بھرا ہوا چاقو تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن جا رہا تھا۔

ٹھپ، ٹھپ، ٹھپ۔

سنسان سڑک پر نوشا کے قدموں کی آواز رک رک کر ابھرتی رہی۔

فصل چہاردہم

(۱)

قدموں کی آہٹ پر سلمان نے مڑ کر دیکھا۔ اسکی پشت پر لمبے قد کا ایک گورا چٹا نوجوان کھڑا بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ سلمان لمحہ بھر تک خاموش بیٹھا اسے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اجنبی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام انیس اے، جیفرے ہے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس گرم جوشی سے مصافحہ کیا کہ سلمان کی انگلیوں کا کچومر نکل گیا۔ اس نے فوراً پہچان لیا کہ وہ کون ہے۔ وہ اس کے سیکشن کا انچارج انیس احمد جعفری تھا۔ وہ کمپنی کا سینئر آفیسر تھا اور سال بھر تک امریکہ میں ٹریننگ لینے کے بعد اسی ہفتے لوٹا تھا۔ لیکن دفتر میں اس روز پہلی بار آیا تھا اور اپنے سیکشن کے ہر رکن سے ذاتی طور پر ملاقات کر رہا تھا۔

اس کی پیشانی تنگ تھی۔ ناک ستواں تھی۔ سر پر بھورے بھورے خشخشی بال تھے۔ وہ ٹخنوں سے اونچی ڈھیلی ڈھالی پتلون اور نائیلون کی جھلکتی ہوئی سفید قمیص پہنے تھا۔ کالر میں شوخ رنگ کی ٹائی بھی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار اپنے کندھے اچکاتا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ وہ خالص امریکی لہجے کے ساتھ روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔ دوران گفتگو جتنی بار اس نے سلمان کو مخاطب کیا ہر بار مسٹر سالو من کہتا رہا۔ سلمان کو اس کا انداز تخاطب بڑا عجیب سا لگا۔ مگر پہلی ہی ملاقات میں اندازہ ہو گیا کہ انیس احمد جعفری دلچسپ نوجوان ہے۔

گرم جوشی: تپاک، جوش۔ مصافحہ کرنا: ہاتھ ملانا۔ ستواں: پتلی، لمبی۔ خشخشی: مراد چھوٹے چھوٹے۔ انداز تخاطب: بات کرنے کا طریقہ۔

بعد میں دفتری امور کے سلسلے میں سلمان کو بارہا اس سے ملنا پڑا۔ اور ہر بار اس نے محسوس کیا کہ جعفری میں افسروں والی روایتی رعونت نام کو نہ تھی۔ مسکرا مسکرا کر نرمی سے بات کرتا۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا انداز مشفقانہ ہوتا۔ اپنے اسی روّیے کی بدولت وہ انہیں ناراض کیئے بغیر زیادہ سے زیادہ کام کراتا تھا۔ یہ تکنیک اس نے سال بھر کی ٹریننگ میں بڑی مہارت کے ساتھ سیکھی تھی۔ دفتر کے مقررہ اوقات کے علاوہ اگر وہ سلمان کو روکنا چاہتا تو پوچھتا۔

"مسٹر سالو من! کیا میں دریافت کر سکتا ہوں آج شام کے لیے آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

سلمان فوراً سمجھ جاتا کہ اس استفسار کا کیا مطلب ہے۔ اگر اس کا کوئی پروگرام بھی ہوتا تب بھی اس کا اظہار نہ کرتا۔ اس لیے کہ وہ اسے ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بلا جھجک کہہ دیتا۔ "جی نہیں، آج شام میرا کوئی خاص پروگرام نہیں۔"

جعفری بڑے رسمی انداز سے کہتا۔ "کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کی اس شام کا کچھ وقت لے لوں؟" اس کے بعد وہ کوئی کام سلمان کے سپرد کر دیتا۔

اکثر وہ سیکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح سلمان کو بھی اتوار اور دوسری چھٹیوں پر بلا لیتا۔ جب کبھی ایسی ضرورت پیش آتی تو وہ گھنٹی بجا کر پہلے چپراسی کو بلاتا۔ کینٹین سے چائے یا کافی منگواتا اور اپنا امریکی برانڈ کا سگرٹ پیش کر کے کہتا۔

"مسٹر سالو من! کیا آپ اپنی ڈائری دیکھنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ میں دریافت کرنا چاہوں گا کہ اتوار کے لیے آپ کے کیا کیا اَنگیج منٹس ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ آپ آؤٹنگ کے موڈ میں تو ہرگز نہیں ہیں اور پکنک کے لیے موسم بڑا ارف ہے۔"

سلمان بغیر ڈائری دیکھے کہہ دیتا۔ "میری ڈائری میں اس اتوار کا صفحہ بالکل خالی ہے۔"

جعفری سرپرستانہ انداز میں مسکرا کر کہتا۔ "اس عمر میں لڑکوں کو اتنا صوفی نہیں بننا چاہیے۔"

پھر لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ حرف مطلب پر آجاتا۔ حسب معمول بڑے تکلف کے ساتھ کہتا۔

"اگر آپ ہالی ڈے کے موڈ میں نہیں ہیں تو میں آپ سے یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ آپ اپنا یہ قیمتی وقت بستر پر صرف کرنے کے بجائے دفتر کو دے دیں۔ اگر یہ ممکن ہو سکتا ہے تو آپ مجھے ذاتی طور پر ممنون ہونے کا موقع دیں گے۔"

رعونت: غرور۔ مشفقانہ: ہمدردانہ، محبت بھرا۔ استفسار: پوچھ گچھ۔ صوفی: نیک، پرہیزگار۔ ممنون: شکر گزار۔

جب کوئی سینئر افسر اپنے ماتحت سے اس قدر انکسار کے ساتھ مطالبہ کرے تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلمان بھی سیکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح اس کی بات مان لیتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ سلمان نے پہلے ہی ارادہ کر لیا کہ وہ ایسے بے جا مطالبات ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ مگر جب وہ جعفری کے روبرو گیا تو اس کے نرم اور شگفتہ رویے سے ایسا پسیجا کہ انکار نہ کر سکا۔

ان ہی خدمات کے صلے میں کمپنی نے جعفری کو ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ اور بھی بہت سی مراعات دے رکھی تھیں۔ جعفری جس کوٹھی میں رہتا تھا وہ اسے کمپنی کی جانب سے ملی تھی۔ ہر ماہ ایک ہزار روپیہ مختلف الاؤنسوں کی صورت میں مل جاتا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے رہتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا رہن سہن تھا اور اعلیٰ طبقوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔

سلمان پر یا تو وہ زیادہ مہربان تھا یا سلمان کو یہ گمان تھا کہ وہ اسے زیادہ مانتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آتا تھا۔ اگر دفتری امور میں سلمان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو وہ خفگی کا اظہار نہ کرتا۔ بلکہ نرمی سے سمجھا دیتا۔ کبھی تنبیہہ بھی کرتا تو ہمیشہ براہ راست نہ کہتا۔

"میں سوچتا ہوں کہ آج کل آپ ذہنی طور پر پریشان ہیں۔ کیا آپ مجھے یہ حق دیں گے کہ میں اس سلسلے میں کچھ پوچھ سکوں؟ مجھے خوشی ہوگی کہ میں آپ کی کچھ مدد کروں۔" سلمان انکار کرتا کہ وہ کسی ذہنی الجھن میں مبتلا نہیں ہے تو وہ پوچھتا۔ "کیا آپ نے فائل پر میرا نوٹ دیکھا ہے؟ میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ اس سے کس حد تک اتفاق رائے رکھتے ہیں؟" اور پھر اپنے سوالوں کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہتا۔ "کیا میں آئندہ یہ امید رکھوں کہ آپ مجھے فائلوں پر سرخ پنسل چلانے کا موقعہ نہیں دیں گے؟"

جعفری عام طور پر انگریزی میں بات کرتا تھا۔ کبھی کبھار اردو میں بات کرتا تو پہلے وہ انگریزی میں سوچتا۔ پھر اس کا ترجمہ کرتا۔ یہ انداز گفتگو اس نے اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ویسے وہ علی گڑھ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور اس کے بی اے کے نصاب میں اردو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل تھی۔ بلکہ طالب علمی کے زمانے میں وہ شاعری بھی کرتا تھا اور کچھ اس قسم کی رومانی نظمیں کہتا تھا:

تم میرے واسطے یوں اشک بہایا نہ کرو
محفل حسن میں یوں دیپ جلایا نہ کرو

میری تصویر کو سینے سے لگایا نہ کرو
میری محبوب مجھے بھول بھی جا، بھول بھی جا

حالانکہ نوجوان لڑکیاں اسے نرا الو کا پٹھا سمجھتی تھیں۔ چہرے مہرے سے وہ یتیم اور وضع قطع سے کانجی ہاؤس کا محرر لگتا تھا۔ مگر اب اسے لڑکیاں ڈان ژوان کہتی تھیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب وہ بن سنور کر شام کو اپنی نئی شیورلیٹ پر نکلتا تو بڑا بانکا سجیلا جوان نظر آتا۔

جعفری کی شخصیت میں سلمان کے لیے روز بروز کشش پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس کشش میں ایک عقیدت مندانہ جذبہ کارفرما تھا۔ وہ اس کے روبرو جاتا تو اس انداز سے بات کرتا جیسے منوں بوجھ تلے دبا ہو۔

❂ ❂ ❂

ایک روز سلمان دفتر سے نکلا تو بس اسٹاپ پر بہت بھیڑ تھی۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی کسی بس میں جگہ نہ ملی تو پیدل ہی چل دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک ایک جھلکتی ہوئی کار اس کے قریب آکر رکی۔

سلمان نے دیکھا جعفری اسٹیرنگ وہیل سنبھالے بیٹھا ہے۔ اس نے اشارے سے سلمان کو قریب بلایا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔

"اگر آپ چہل قدمی کے موڈ میں نہ ہوں تو میں آپ کو گھر تک لفٹ دینے میں خوشی محسوس کروں گا۔"

اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سلمان چپ چاپ اگلی نشست پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ راستے بھر دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ جعفری نے اس سے صرف مکان کا پتہ دریافت کیا اور آہستہ آہستہ کسی نئی انگریزی فلم کی دھن گنگنانے لگا۔

کار جب سلمان کے فلیٹ کے سامنے رکی تو اترتے ہوئے سلمان نے سوچا کیوں نہ جعفری کو چائے پر مدعو کر لیا جائے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔ جعفری ذرا دیر سوچتا رہا پھر کار سے نکل کر باہر آ گیا۔

دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے۔ دروازہ گھر کی خادمہ جنت نے کھولا۔ وہ اس

الو کا پٹھا: بیوقوف۔ کانجی ہاؤس: وہ سرکاری مکان / جگہ جہاں لاوارث مویشی بھیجے جاتے ہیں۔ بانکا، سجیلا: شوخ، خوش مزاج۔

وقت گندا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سلمان کو اس پر سخت غصہ آیا اور کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ کمرے میں اس کی بیوی موجود نہیں تھی۔ اس نے جعفری سے اجازت لی اور پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ بیوی بستر پر لیٹی تھی۔ سلمان نے جاتے ہی کہا۔

"رخشی! میرے آفس کے جعفری صاحب آئے ہیں۔ چائے ہم ڈرائنگ روم میں پئیں گے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "اچھا وہیں بھجوائے دیتی ہوں۔"

"خدا کے لیے جنت کے ہاتھ چائے نہ بھجوانا۔ اس سے کہو کبھی کبھار تو نہا لیا کرے۔ کپڑوں سے ایسی بو آرہی ہے کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔ جعفری بڑا نفاست پسند ہے۔ وہ چائے لے کر گئی تو پینے سے انکار کردے گا۔"

"اچھا تو پھر خود ہی لے آؤں گی۔"

سلمان نے بیوی کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت عام گھریلو لباس میں تھی۔ سلمان کو اس کا لباس نامناسب معلوم ہوا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "تم ذرا اپنا حلیہ تو ٹھیک کرلو۔ سخت واہیات لباس پہن رکھا ہے۔ دیکھو جلدی چائے لے کر آنا۔" وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں جاکر سلمان نے دیکھا، جعفری ایک میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سلمان چپ چاپ اس کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خاموش بیٹھے بیٹھے سلمان کی نظر اس کشن پر پہنچ گئی جو جعفری کے پہلو میں رکھا تھا۔ اس کا غلاف خاصا میلا تھا۔ اس گندے کشن کو دیکھ کر جعفری نے نہ جانے کیا سوچا ہوگا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی طرح کشن اٹھا کر صوفے کے پیچھے ڈال دے تاکہ جعفری کی اس پر نظر نہ پڑے۔ ابھی وہ کشن ہی کے متعلق غور کر رہا تھا کہ ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کا پردہ لہرانے لگا۔ سلمان نے غور کیا کہ پردے کے کنارے پر جگہ جگہ چکنائی کے دھبے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں خادمہ کو برا بھلا کہا جس کے پھوہڑپن کے باعث پردے اس قدر گندے اور بدنما ہوگئے تھے۔ آخر اس نے اٹھ کر پردے کو اس طرح سمیٹ دیا کہ داغ دھبے کسی حد تک چھپ گئے۔

چائے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ جعفری نے میگزین کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ مگر سلمان سے کچھ نہ کہا۔ وہ کچھ بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ

نفاست پسند: صفائی کو پسند کرنے والا۔ کشن: گدا۔ پھوہڑپن: بد سلیقگی، بے ہنری۔

بے چین سلمان تھا۔ اسے رہ رہ کر بیوی پر غصہ آرہا تھا۔

کوئی ۲۰ منٹ بعد جنت چائے کا سامان لے کر آئی۔ اب اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور کسی حد تک صاف ستھری نظر آرہی تھی۔ سلمان کو قدرے اطمینان ہوا چائے کا سامان رکھا ہی جا رہا تھا کہ رخشندہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے میک اپ میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ سلمان نے بیوی کو دیکھا وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی حسین اور دلکش نظر آرہی تھی۔ جعفری احتراماً کھڑا ہوگیا۔ سلمان نے جعفری سے بیوی کا تعارف کراتے ہوئے خوشی محسوس کی۔ یہ خوشی ایسی ہی تھی جیسے جدید ترین ماڈل کی کار، شاندار کوٹھی یا اعلیٰ نسل کا کتا رکھ کر محسوس کی جاتی ہے۔

جعفری نے رخشندہ سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس قدر حجاب محسوس کر رہی تھی کہ جعفری زیادہ بات نہ کر سکا۔ وہ تمام عرصہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ البتہ سلمان بہت چہک رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بیوی سے چھیڑ چھیڑ کر باتیں کر رہا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا۔ اس کی مسرت میں بچوں کی سی سادگی تھی۔

چائے پینے کے بعد جعفری زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اسے کسی سے ملنے کے لیے جانا تھا۔ وہ سلمان اور رخشندہ کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ سلمان اسے کار تک رخصت کرنے گیا۔

چند ہی روز بعد دفتر میں چھٹی ہونے سے کچھ دیر قبل جعفری اس کے پاس آیا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ "سالو من! اس روز چائے پر تمہارے ہاں کیا چیز تھی؟" لمحہ بھر کے لیے وہ رکا۔ "میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو شاید وہ پکوڑے تھے۔ کیا تم میرے خیال کی تائید کرو گے؟"

"جی ہاں وہ پکوڑے ہی تھے۔ کیا آپ کو پسند آئے تھے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کا ذائقہ پسند آیا تھا۔ کیا تم آج شام مجھے چائے کی دعوت دے رہے ہو؟ لیکن پکوڑے کا آئیٹم ضرور ہو۔ ان کے لیے میں شام کا بہترین پروگرام بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

سلمان اسے چائے پلانے پر خوشی سے تیار ہوگیا۔

شام کو وہ جعفری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ چائے کے ساتھ خاص طور پر پکوڑے تیار کیے گئے۔ جعفری نے بڑے شوق سے کھائے۔ اس روز وہ قطعی بے تکلفی کے موڈ میں تھا۔

حجاب: شرم۔ تائید: حمایت۔

چائے کے دوران اس نے دلچسپ لطیفے سنائے۔ سلمان اور رخشندہ کو خوب ہنسایا۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پکچر کا پروگرام بنایا اور اصرار کر کے دونوں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

سینما گھر میں بھی وہ بڑا ہنس مکھ اور خوش طبع نظر آ رہا تھا۔ پکچر دیکھ کر باہر نکلے تو جعفری ان کو چھوڑنے گھر تک گیا۔ سلمان نے کھانے کے لیے کہا تو وہ مزید اصرار کے بغیر آمادہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر بھی وہ رات گئے تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

وہ سلمان کے فلیٹ سے نکلا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

(۲)

نیاز کے قتل کے چند گھنٹے کے بعد ایک پولیس سب انسپکٹر تین کانسٹیبلوں کے ہمراہ کوٹھی پر پہنچا اس نے جائے واردات کا معائنہ کیا۔ نیاز کی لاش ابھی تک خون میں ڈوبی فرش پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف ناک طریقے پر پھٹی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ دیوار کے قریب چت پڑا تھا۔

لاش سے کچھ فاصلے پر سلطانہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نہ وہ رو رہی تھی نہ جسم کو حرکت دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ خانساماں تھا اور خادمہ بھی قریب ہی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ فرش پر، دیواروں پر لال لال خون بکھرا ہوا تھا۔ کمرے کا ماحول بڑا ہیبت ناک تھا۔

سب انسپکٹر کمرے میں تفتیش کے لیے داخل ہوا۔ سلطانہ نے دیکھا نوشا بھی پولیس کے ہم راہ تھا۔ وہ کانسٹیبلوں کی حراست میں سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پڑی تھیں۔ کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ آنکھیں سرخ اور وحشت ناک تھیں۔ سلطانہ لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے نوشا کو دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

فضا پر ہولناک سکوت طاری تھا اور اس سکوت میں سلطانہ کی سسکیاں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔ اچانک کوٹھی کے پچھواڑے درختوں تلے گیدڑوں کی آوازیں ابھریں۔ ڈھلتی رات کا سناٹا ان

جائے واردات: واردات والی جگہ۔ ہیبت ناک / ہولناک: خوفناک۔

خوف ناک آوازوں سے درہم برہم ہو گیا۔ لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں ہر شخص کو گھور رہی تھیں۔

سب انسپکٹر جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ ایک ایک زخم دیکھ رہا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل کو ہدایتیں دیتا جا رہا تھا جو اس کی ہر بات نہایت مستعدی سے قلم بند کر رہا تھا۔ سب انسپکٹر نے تقریباً آدھے گھنٹے میں لاش کے معائنے کی رپورٹ مکمل کی۔ اس کے بعد نیاز کے مردہ جسم کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔

لاش اور جائے واردات کا معائنہ کرنے کے بعد سب انسپکٹر نے سب سے پہلے سلطانہ کا بیان لیا۔ اس نے رک رک کر سسکیاں بھرتے ہوئے بتایا کہ نوشا اس کا چھوٹا بھائی ہے اور کئی سال بعد آیا ہے۔ نیاز کا اور اس کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ جس وقت دونوں کا جھگڑا ہوا وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ نیاز کی چیخیں سن کر وہاں آئی تھی۔ نیاز اس وقت دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم خون میں نہایا ہوا تھا۔ جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے۔

انسپکٹر نے دریافت کیا۔ "جس وقت آپ موقع واردات پر پہنچیں کیا اس وقت ملزم کمرے میں موجود تھا؟"

وہ لمحہ بھر کے لیے جھجکی پھر نہ معلوم کیا سوچ کر صاف جھوٹ بول گئی۔ "نہیں۔ وہ یہاں سے جا چکا تھا۔"

نوشا نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا جو سر جھکائے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ملزم یہاں آیا تھا اور مقتول سے اس کا جھگڑا ہوا تھا؟"

"میں نے پہلی بار اسے آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔"

"اگر ملزم کو یہاں پولیس کی حراست میں نہ دیکھتیں تو آپ کو اس پر شبہ نہ ہوتا؟"

"جی نہیں۔" سلطانہ نے صاف انکار کر دیا۔

"تو پھر آپ نے قتل کی اطلاع اب تک پولیس کو کیوں نہ دی؟"

"میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ اب تک میرے ہوش و حواس درست نہیں۔"

وہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سب انسپکٹر کے ہر سوال کا رک رک کر جواب دے رہی تھی۔ جو کچھ میں آیا کہتی چلی گئی۔ مگر اس کی آواز سے، اس کے چہرے کے اطمینان سے اندازہ ہوتا تھا کہ

وہ خوف اور گھبراہٹ پر قابو پاتی جا رہی ہے۔ اس نے رونا بند کر دیا تھا اور انسپکٹر کے ہر استفسار کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "مقتول سے آپ کی کب شادی ہوئی؟"

سلطانہ اس سوال پر گھبرا گئی۔ اس نے نیاز کے خلاف شدید نفرت محسوس کی۔ وہ انسپکٹر کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ اس وقت وہ سخت اذیت محسوس کر رہی تھی۔

انسپکٹر نے اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا وہ آپ کے شوہر نہیں تھے؟"

سلطانہ نے گردن جھکا کر کہا۔ "وہ رشتے میں میرے سوتیلے باپ تھے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ نیاز کی لاش پر تھوک دے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کمرے میں بیٹھے ہوئے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اچانک برہنہ ہو گئی ہے۔

انسپکٹر نے سلطانہ سے اور بھی بہت سے سوالات کئے۔ مگر وہ اب قوتِ مدافعت کھو چکی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا کیا الٹے سیدھے جوابات دیئے۔

پولیس نے خانساماں اور خادمہ کے بھی بیانات لیے۔

انسپکٹر، کانسٹیبلوں اور نوشا کے ہمراہ کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ دروازہ پر کھڑی نوشا کو جاتے ہوئے دور تک دیکھتی رہی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پڑی تھیں۔ وہ سر جھکائے کانسٹیبلوں کے نرغے میں چپ چاپ چل رہا تھا۔

رات بھر ایک پولیس کانسٹیبل نیاز کی لاش پر پہرہ دیتا رہا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے مردا گاڑی آئی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے گئی۔

سب انسپکٹر کئی بار تفتیش کے سلسلے میں کوٹھی پر آیا اور سلطانہ کے علاوہ خادمہ اور خانساماں سے قتل کے متعلق طرح طرح کی باتیں پوچھتا رہا۔ سلطانہ کو اس کے سوالات سے بڑی وحشت ہوتی۔ مگر اس سے بھی زیادہ وحشت اسے اس کوٹھی سے ہونے لگی تھی جو اب مرگھٹ کی طرح ڈراؤنی معلوم ہوتی۔ کوٹھی پر ہر وقت ہو کا عالم طاری رہتا۔ در و دیوار پر مردنی چھائی رہتی۔ خا

استفسار: سوال۔ قوتِ مدافعت: مراد برداشت کرنے کی طاقت۔ نرغہ: گھیرا۔ مرگھٹ: ہندوؤں کی مردے جلانے کی جگہ۔ ہو کا عالم: انتہائی ویرانی۔

ے بھائیں کرتے۔ تمام دن اکتا دینے والا سناٹا چھایا رہتا۔ شام ہوتے ہی ہر طرف دھندلی ندلی پرچھائیاں رینگتی ہوئی نظر آتیں۔ باہر احاطے میں گھنے درختوں تلے خشک پتے کھڑکھڑاتے۔ دبی آہٹیں ابھرتیں۔

رات کو اکثر سوتے سوتے سلطانہ کی آنکھ کھل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ نیاز خون میں ڈوبا ہوا نے کھڑا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ وہ خونخوار نظروں سے گھورتا۔ سلطانہ گھبرا کر بستر پر کر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں جاگتی رہتی۔

نیاز کا کمرہ عین اس کے کمرے کے سامنے تھا۔ ہر شام وہ اس کمرے میں جا کر خود روشنی کرتی۔ لوبان سلگاتی تا کہ نیاز کی روح خراب ہو کر بھٹکتی نہ پھرے۔ مگر رات گئے جب وہ اس کمرے کی ب دیکھتی تو دھندلی دھندلی روشنی میں کوئی آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا معلوم ہوتا۔ ہوا زور سے چلتی۔ ختوں کے نیچے سوکھے پتے کھڑکھڑاتے اور سنسان رات میں کسی کے تیز تیز بھاگنے کی آہٹیں تیں۔ وہ خوف سے آنکھیں بند کر لیتی۔ تمام رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

مسلسل شب بیداری اور پے بہ پے دکھوں نے اس کی صحت خراب کر دی۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ نکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ ان دنوں اسے شدت سے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ مگر کوئی بھی ہانہ تھا جو اسے ڈھارس دے سکتا۔ غم گساری کر سکتا۔ کوٹھی میں خادمہ کے علاوہ صرف خانساماں دونوں ہر وقت سہمے سہمے رہتے۔ بلکہ خادمہ تو ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ مگر سلطانہ اصرار کر کے اسے روک لیا۔ پھر بھی وہ رات کو کوٹھی میں رہنے کے بجائے اپنی بیٹی کے گھر جا کر تی تھی۔ اسے سلطانہ سے بھی زیادہ خوف معلوم ہوتا۔

❁ ❁ ❁

ایک شام، خان بہادر کوٹھی پر آیا۔ اس کے ہمراہ ایک ادھیڑ آدمی تھا۔ اس کا جسم بھدا تھا۔ لا رنگ، بڑی بڑی بے رونق آنکھیں اور کنپٹی کے پاس زخم کا گہرا نشان وہ وضع قطع سے خاصا صورت اور اول جلول لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی کرختگی دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔ خان بہادر سلطانہ سے اسے یہ کہہ کر ملایا کہ وہ نیاز کا بڑا بھائی ہے۔ راولپنڈی میں رہتا ہے اور نیاز کے مرنے اطلاع پا کر آج ہی آیا ہے۔ حالانکہ نیاز نے سلطانہ سے اس کا کبھی تذکرہ نہیں کیا تھا اور نیاز کی اس

لوبان: خوشبوؤں کے نام۔ ڈھارس: حوصلہ۔ غم گساری: ہمدردی۔ اول جلول: بے ڈھنگا، بیہودہ۔ کرختگی: سختی۔

میں شباہت بھی نہیں تھی۔ تاہم سلطانہ نے اس کے متعلق کسی شک وشبے کا اظہار نہیں کیا۔

خان بہادر فرزند علی کو وہ معزز اور ذمہ دار آدمی سمجھتی تھی۔ لہٰذا اس کی باتوں پر سلطانہ کو فوراً اعتبار آ گیا۔

خان بہادر کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ البتہ وہ شخص کوٹھی ہی میں ٹھہرا رہا۔ اس کا نام فیاض تھا۔ راولپنڈی میں اس کی کپڑے کی دکان تھی۔ نیاز کے قتل کی اطلاع اسے نیاز کے ایک دوست کے خط سے ملی تھی اور وہ خط ملتے ہی چلا آیا تھا۔ اس کے بال بچے ابھی تک راولپنڈی ہی میں تھے۔ اس نے اپنے متعلق سلطانہ کو یہی بتایا تھا۔

مگر نہ تو اس نے نیاز کی موت پر آنسو بہائے اور نہ اس کے چہرے پر کسی گہرے غم کا تاثر تھا۔ سلطانہ سے اس نے بات چیت بھی کم کی اور اس کے بچے کو دیکھ کر نہ کسی التفات کا اظہار کیا نہ شفقت کا۔ رات کا کھانا اس نے وہیں کھایا۔ وہ جبڑے ہلا ہلا کر بدتمیزی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے زور زور سے ڈکاریں لیں جس سے اس کا اجڈپن ظاہر ہوتا تھا۔ یوں بھی اس کا لہجہ بڑا عامیانہ تھا۔ مگر سلطانہ کو اس کے آنے سے کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ کوٹھی پر رات بھر جو ہولناک سناٹا طاری رہتا تھا کچھ کم ہو گیا۔

سلطانہ نے اس کی رہائش کے لیے کوٹھی کے ایک کمرے میں بندوبست کر دیا وہ سرِ شام ہی سونے کے لیے بستر پر چلا گیا۔ اس رات سلطانہ کئی راتوں کے بعد گہری نیند سوئی۔ سویرے اٹھ کر اس نے فیاض کے لیے ناشتا اپنی نگرانی میں تیار کرایا اور اس میں خاصا اہتمام کیا۔ وہ اس کے سامنے جس وقت بھی جاتی، دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھک لیتی۔ بات کرتی تو نظریں نیچی کر کے۔ وہ اس کا احترام بالکل اپنے جیٹھ کی طرح کر رہی تھی۔

فیاض سہ پہر تک اپنے کمرے میں رہا۔ پھر وہ کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ رات کو واپس آیا۔ اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ شام کو باہر رہتا۔ سلطانہ کے ساتھ پہلے ہی دن سے اس کا جو رویّہ تھا وہ برقرار رہا۔ وہ اس سے بہت کم بات چیت کرتا۔ اس کا زیادہ تر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا۔

فیاض کو آئے ہوئے چوتھا یا پانچواں دن تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اچانک شور سن کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سنا فیاض خادمہ کو

شباہت: شکل وصورت کی مشابہت۔ التفات: توجہ، محبت۔ اجڈپن: جہالت۔ سرِ شام: شام ہوتے ہی۔

...ٹ رہا تھا۔ اس کی آواز اونچی تھی۔ وہ گندی گندی گالیاں بک رہا تھا۔ سلطانہ سکتے کے سے عالم میں ...وش بیٹھی تھی۔ اسی اثنا میں خادمہ روتی ہوئی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے کمرے میں داخل ...تے ہی کہا۔

"بیگم صاحبہ! میرا حساب کر دیجیے۔ میں اب آپ کی نوکری نہیں کر سکتی۔"

...طانہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ سخت ناراض معلوم ہوتی تھی۔ منہ بگاڑ کر بولی۔ "میں ...پ کی ٹہل چاکری کرتی ہوں۔ پر اس کا مطلب یہ نہیں میں نے عزت بھی بیچ دی ہے۔ میں اس ...ح گالیاں نہیں سن سکتی۔"

خادمہ برابر بڑبڑا رہی تھی اور سلطانہ اسے سمجھا رہی تھی کہ ملازمت چھوڑ کر نہ جائے۔ اسی ...ا میں سامنے سے فیاض آتا ہوا نظر آیا۔ اس کی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ...شانی پر بل تھے۔ اس کا کرخت چہرہ جھلسا ہوا لگ رہا تھا۔ آتے ہی گرج کر بولا۔

"یہ حرامزادی یہاں بیٹھی کیا فیل مچا رہی ہے؟"

خادمہ نے فوراً کہا۔ "دیکھیے بیگم صاحبہ! پھر انہوں نے گالی دی۔ میں اگر کچھ کہہ سن دوں گی تو ...جھ نہ کہیے گا۔"

فیاض نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "ابھی یہاں سے نکل جا۔ میں ...ی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ سور کی بچی، حرامزادی، کنجری۔"

فیاض گالیاں دینے لگا۔ خادمہ تھی تو ادھیڑ مگر دبنگ عورت تھی۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی ...ب دیا۔ فیاض مارنے کے لیے جھپٹا۔ سلطانہ اگر نہ روکتی تو شاید وہ خادمہ کو مارتا بھی۔ وہ پاگلوں کی ...ح گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

خادمہ روتی پیٹتی گھر سے چلی گئی۔

سلطانہ کو خادمہ کے چلے جانے کا بہت افسوس ہوا۔ وہ کام بھی مستعدی سے کرتی تھی اور اس ...مگسار بھی تھی۔ جب سے نیاز مرا تھا اس وقت سے سلطانہ کے لیے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ...وہ ہر معاملے میں اس سے مشورہ کر لیتی۔ دل گھبراتا تو گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھی ادھر ادھر کی ...یا کرتی۔ اس طرح اس کا دل بہل جاتا تھا۔

...عالم: بے حس وحرکت ہونا۔ ٹہل چاکری کرنا: خدمت کرنا، ملازمت کرنا۔ فیل مچانا: شور شرابہ کرنا۔ قہر آلود: غصے سے بھری ہوئی۔

سلطانہ کو فیاض کا رویہ سخت ناگوار گزرا۔

شام کو خانساماں پر بھی نزلہ گرا۔ فیاض خواہ مخواہ اس پر برسنے لگا۔ اسے بھی اس نے چیخ چیخ کر گالیاں دیں۔ مگر خانساماں ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے زبان سے اف تک نہ کی۔ سر جھکائے خاموشی سے فیاض کی گالیاں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ اس کے پاس گئی۔ اس نے دیکھا خانساماں باورچی خانہ میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بہت افسردہ نظر آرہا تھا۔ سلطانہ نے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ آبدیدہ ہو گیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بیگم صاحبہ! اپنی قسمت ہی میں دربدر کی ٹھوکریں کھانی لکھی ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آپ ہی کے قدموں میں ساری زندگی گزار دوں گا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہاں سے بھی میرا آب و دانہ اٹھ چکا ہے۔"

سلطانہ دیر تک خانساماں کو سمجھاتی رہی۔ جب اسے سمجھا بجھا کر باورچی خانہ سے باہر نکلی تو اس نے فیاض کو اپنے کمرے کے سامنے ٹہلتے ہوئے پایا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ "دیکھو جی! تمہاری یہ عادتیں مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم نے نوکروں کو بہت سر پر چڑھا رکھا ہے۔ سالے ایک نمبر کام چور ہو گئے ہیں۔" سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ننھا ایاز رو رہا تھا۔ وہ اسے گود میں لے کر کمرے کے اندر ٹہلنے لگی۔

فیاض کا رویہ خانساماں کے ساتھ روز بروز خراب ہوتا گیا۔ وہ بات بات پر اس پر برس پڑتا۔ گندی گندی گالیاں دیتا۔ سلطانہ اگر بات رفع دفع کرنے کی غرض سے کچھ کہتی تو وہ آنکھیں نکال کر اس پر بھی غرانے لگتا۔ اب وہ گھر کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے لگا تھا۔ ایک ایک بات کی چھان بین کرتا۔ یہ کیوں ہوا؟ یہ کس لیے کیا گیا؟ وہ کیا ہے؟ اس کی ان حرکتوں نے چند ہی روز میں سلطانہ کو پریشان کر دیا۔

پھر اور بھی نئی نئی باتیں سامنے آئیں۔ فیاض نے ڈرائیور کو علیحدہ کر دیا اور کار گیراج سے نکال کر نہ جانے کہاں لے گیا۔ سلطانہ نے پوچھا تو اس نے بڑی بے رخی سے کہا۔ "مرمت کے لیے گئی ہے۔" حالانکہ کار بالکل ٹھیک چل رہی تھی۔ مگر فیاض نے اس طرح تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے جواب دیا کہ وہ مزید استفسار نہ کر سکی۔

کچھ عرصے بعد وہ اپنی ہی وضع قطع کے ایک اور شخص کو بھی لے آیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا

نوجوان تھا۔ صورت شکل سے اوباش معلوم ہوتا تھا۔ تمام دن ڈرائنگ روم میں پڑا رہتا۔ لہک لہک کر فلمی گیت گاتا۔ گھٹیا قسم کے سگریٹ پیتا اور ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اور سگریٹ کے ٹکڑے کمرے کے اندر بکھیر دیتا۔ صوفوں پر اس نے جگہ جگہ تیل کے داغ دھبے ڈال دیے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردوں سے تولیہ کا کام لیتا۔ دونوں وقت ڈھیر بھر کھانا کھاتا اور چائے کے کئی کئی کپ ایک ہی وقت میں پی جاتا۔ وہ کام کاج کچھ نہیں کرتا تھا۔ بس ہر وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا۔ رات ہوتی تو فیاض کے کمرے میں جا کر سو جاتا۔ کہیں آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ہر وقت کوٹھی میں موجود رہتا۔

سلطانہ جب اس کے سامنے جاتی تو برابر گھورتا رہتا۔ لفنگوں کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا اور گھٹیا فلمی گیت گنگنانا شروع کر دیتا۔ اس کا نام کرم الٰہی تھا۔ مگر وہ چند ہی روز میں سلطانہ کے لیے قہر الٰہی بن گیا۔

سلطانہ ان تبدیلیوں پر غور کر ہی رہی تھی کہ فیاض نے ایک روز بڑی عجیب حرکت کی۔ اس نے نیاز کا سارا سامان اٹھوا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ ہر کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ ہر الماری اور ٹرنک کھول کر دیکھا۔ اس نے سلطانہ کے زیورات اور کپڑے دیکھنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا اور الماریوں کی کنجیاں بھی طلب کیں۔ سلطانہ نے پہلے تو ٹالنا چاہا۔ مگر جب وہ بار بار اصرار کرنے لگا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

وہ بگڑ کر بولا۔ "اگر تم نے کنجیاں نہ دیں تو میں تمہاری ساری الماریاں اور بکسے اٹھوا کر دوسرے کمرے میں بند کر دوں گا۔"

اس دھمکی پر سلطانہ بھی جھنجلا اٹھی۔ "دیکھئے میں آپ کی ہر بات خاموشی سے برداشت کرتی تھی۔ اب آپ حد سے گزرتے جا رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ نہ میں اپنے صندوق اور الماریوں کی آپ کو کنجیاں دوں گی اور نہ ان پر کسی کو ہاتھ لگانے دوں گی۔"

"تو پھر پچھتاؤ گی۔" فیاض نے کھل کر دھمکی دی۔

سلطانہ جل کر بولی۔ "جائیے جو آپ سے کیا جائے کر لیجئے۔"

فیاض آنکھیں نکال کر بولا "میں تم کو کھڑے کھڑے یہاں سے نکال سکتا ہوں۔"

"تم کون ہوتے ہو مجھے یہاں سے نکالنے والے؟"

"اچھا تو تم کو اب تک یہ پتہ نہیں کہ اس گھر کا مالک کون ہے؟"

سلطانہ نے تلملا کر کہا۔ "اس گھر کی مالکہ میں ہوں، میں ہوں۔ کان کھول کر سن لو۔"

فیاض بے ڈھنگے پن سے ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ "کہیں اس گمان میں بھی نہ رہنا۔ جس وقت چاہوں گا ہاتھ پکڑ کر باہر کھڑا کر دوں گا۔ بھیک مانگتی پھرو گی۔"

سلطانہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ذرا نکال کر تو دیکھو۔" وہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔ "نہ جانے کہاں سے آگئے مرنے والے کے بڑے بھائی بن کر۔ اس کی زندگی میں تو کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اب مرنے کے بعد اس کے مال پر کفن کھسوٹوں کی طرح قبضہ کرنے آگئے۔ اگر خان بہادر صاحب نہ کہتے تو میں تم کو یہاں گھسنے بھی نہ دیتی۔"

ابھی وہ غصے میں نہ جانے اور کیا کچھ کہتی کہ فیاض نے چیخ کر کہا۔ "اب تم اپنی زبان بند کر لو، ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

سلطانہ اس کی لال لال آنکھیں دیکھ کر چپ ہو گئی۔ شور سن کر کرم الٰہی اور اس کے پیچھے خانساماں بھی آگیا۔

فیاض خاموش کھڑا قہر آلود نظروں سے سلطانہ کو گھورتا رہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کوٹھی سے باہر چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

رات سے ننھے ایاز کی طبیعت خراب تھی۔ وہ مسلسل رو رہا تھا۔ سلطانہ نے جھنجلا کر بچے کی کمر پر اس زور کا دوہتڑ مارا کہ وہ بلبلا اٹھا۔ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ سلطانہ نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گئی۔ بچہ بلک بلک کر روتا رہا۔ آخر خانساماں اسے اٹھا کر کمرے سے باہر لے گیا۔ چمکار چمکار کر بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔

تمام دن وہ کمرے میں مضمحل پڑی رہی۔ شام کو خان بہادر فرزند علی آیا فیاض اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے سلطانہ کو ڈرائنگ روم میں بلوایا۔ بات چیت کا آغاز کرنے سے قبل اس نے فیاض اور کرم الٰہی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

جب دونوں چلے گئے تو خان بہادر نے بڑے سرپرستانہ انداز میں سلطانہ سے کہا۔ "میں تم کو

کفن کھسوٹ: لوگوں کا مال کھا جانے والا۔ مضمحل: اداس، رنجیدہ۔

ہت سمجھ دار لڑکی سمجھتا تھا۔ مگر تم نے بڑی ناسمجھی کا ثبوت دیا۔ تم کو فیاض سے اس طرح لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "آپ کو کیا خبر کہ وہ کس کس طرح مجھے پریشان کر رہے ہیں۔"

"بھئی فیاض تو مجھے بڑا بھلا مانس لگتا ہے۔" خان بہادر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بہر حال میں اسے سمجھا دوں گا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے تم کو تکلیف پہنچے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں تم سے بھی یہ کہوں گا کہ زیادہ غصہ کرنا چھوڑ دو۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری قانونی پوزیشن بہت نازک ہے۔"

سلطانہ نے چونک کر خان بہادر کی جانب دیکھا۔ مگر خاموش رہی۔

خان بہادر اپنے مخصوص انداز میں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "مصیبت یہ ہے کہ نیاز کے ساتھ تمہارا باقاعدہ نکاح بھی نہیں ہوا۔"

سلطانہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "میں نے تو کئی بار کہا مگر وہ ہمیشہ ٹالتے رہے۔"

"وہ ٹالتا نہیں رہا بلکہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔" خان بہادر نے بتایا۔ "اس نے مجھ سے بھی اس سلسلے میں ذکر کیا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا۔"

"کیوں؟" سلطانہ کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"وہ ایسا ہے کہ تمہاری ماں چونکہ نیاز کی بیوی رہ چکی تھیں لہٰذا شرعی طور پر نیاز کے ساتھ تمہارا نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ فقہی مسئلہ ہے۔ میں نے صحیح صورت حال بتا دی۔ تم چاہو تو کسی عالم دین سے اس کی تصدیق کر سکتی ہو۔" خان بہادر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "برا نہ ماننا سچ پوچھو تو تمہاری حیثیت نیاز کی داشتہ سے زیادہ نہیں۔"

سلطانہ کے دل پر شدید ٹھیس لگی۔ وہ غم و غصے سے تلملا کر رہ گئی۔ خان بہادر اس کے جذبات احساسات سے بے نیاز بولتا رہا۔ "میں تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ فیاض سے نہ بگاڑو۔ جو کہتا ہے مان لو۔" اس نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "بھئی کیا کیا جائے۔ اللہ نے تم پر وقت ہی ایسا ڈالا ہے۔"

سلطانہ نے کہا۔ "انہوں نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب وہ میرے زیورات اور کپڑے لتے بھی ہتیانا چاہتے ہیں۔ آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے۔ پھر میرا بچہ ہے۔ وہ کس کی اولاد ہے؟ کیا باپ کی

بھلا مانس: شریف۔ شرعی طور پر: قانونِ اسلام کے مطابق۔ فقہی مسئلہ: دینی مسئلہ۔ داشتہ: بے نکاحی بیوی۔

جائداد پر اس کا کوئی حق نہیں؟"

"میں نے تم کو مسئلے کی شرعی نوعیت بتادی۔" خان بہادر نرم لہجے میں بولا۔ "اپنی قانونی حیثیت کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو میں یہ کہوں گا تمہارا نیاز کی جائداد پر کوئی حق نہیں بنتا۔" اس نے نظر بھر کر سلطانہ کو دیکھا جو سر جھکائے بجھی بجھی سی بیٹھی تھی۔ "نیاز کو تمہارے باپ کی حیثیت سے دیکھا جائے تب بھی سوتیلی اولاد ہونے کے رشتے سے اس کے ترکے میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بچہ وہ بھی نیاز کی ناجائز اولاد ہے۔ اس کا بھی حق نہیں بنتا۔"

سلطانہ نے خان بہادر کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی۔ "مگر اس کے باپ کی حیثیت سے تو ہر جگہ انہیں کا نام لکھا گیا ہے۔"

خان بہادر مسکرا کر بولا۔ "تم کسی کا بھی نام لکھوا دو۔ مگر قانون تو یہ نہیں تسلیم کرے گا کہ اس بچے کا باپ نیاز ہی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے تو لکھا نہیں کہ یہ میرا بچہ ہے۔"

سلطانہ نے جھٹ کہا۔ "اسپتال کے رجسٹر میں انہوں نے خود دستخط کئے تھے۔ آپ جا کر دریافت کرلیں۔"

"اگر ایسا بھی ہے۔ تب بھی مجھے علم نہیں کہ اس سلسلے میں قانون کیا کہتا ہے۔ مگر میں یہ جانتا ہوں کہ اس کے باوجود بھی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ عدالت میں اور بھی بہت سے ثبوت مہیا کرنے ہوں گے۔ تم چاہو تو کسی وکیل سے مشورہ کرلو۔"

"میں کس وکیل کے پاس جاؤں گی۔" سلطانہ نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ "آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"تم پریشان نہ ہو۔" خان بہادر نے اسے تسلی دی۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ عدالت میں جانے اور مقدمہ بازی کے چکر میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ تم اطمینان سے یہاں رہو۔ میں فیاض کو سمجھا دوں گا۔ اب وہ یہاں کم ہی رہے گا۔ نیاز کے کاروبار کی فی الحال میں دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ مگر میں اسی مہینے عمرہ کرنے مکہ معظمہ جا رہا ہوں۔ لہٰذا جلد ہی سب کچھ فیاض کے سپرد کردوں گا۔ وہ کاروبار کے چکروں میں پھنس جائے گا تو تم سے الجھنے کی اسے فرصت ہی کب ملے گی۔ تم کو گھر کے خرچ کے لیے ہر ماہ جو کچھ ملتا تھا وہ ملتا رہے گا۔ تم کنجیاں اور ضروری کاغذات فیاض کو دے دینا تاکہ

ترکہ: وہ مال و دولت جو کوئی شخص مرنے کے بعد چھوڑ جائے۔ پیچیدگیاں: مشکلات، الجھاؤ۔

بنک میں اور دوسری جگہ جو روپیہ پڑا ہے اسے نکال کر کاروبار چلایا جائے۔"

مگر سلطانہ کنجیاں دینے پر رضامند نہیں ہوئی۔

خان بہادر نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ "تم فیاض سے بہت بدگمان معلوم ہوتی ہو۔ خیر اس کی بات چھوڑو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر دو چار روز غور کرلو۔ پھر اطمینان سے جواب دینا۔"

خان بہادر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر چلا گیا۔

سلطانہ کو خان بہادر کی باتوں سے قدرے اطمینان ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر خان بہادر نے زیادہ اصرار کیا تو وہ تمام کنجیاں اور کاغذات اس کے ہاتھ میں دے دے گی۔ وہ اسے شریف اور معقول آدمی سمجھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جو کچھ کرے گا اس کی بہتری کے لیے کرے گا۔ سلطانہ بہت دیر تک انہیں باتوں پر غور کرتی رہی۔

❁ ❁ ❁

نہ معلوم کتنی رات گزر چکی تھی۔ دفعتہً آہٹ سے سلطانہ کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی اس کھڑکی پر جو باغیچے میں کھلتی تھی ایک سایہ نظر آیا۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد غائب ہو گیا۔ باہر دھندلی دھندلی چاندنی پھیلی تھی۔ ہوا سنکی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے خشک پتوں پر قدموں کی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سلطانہ خوف سے تھرّا کر رہ گئی۔ نیاز کے کمرے میں پھیکی پھیکی روشنی پھیلی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھتی رہی۔

نیند اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ سہمی ہوئی خاموش پڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی کے قریب آہٹ ہوئی۔ سلطانہ نے گھبرا کر دیکھا، کوئی گردن نکالے جھانک رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ کھڑکی پر چڑھ کر دھم سے کمرے کے اندر کودا۔ سلطانہ کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا۔ اسی وقت کسی نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ دھندلی دھندلی چاندنی میں اس نے دیکھا۔ فیاض اس کے سینے پر جھکا ہوا کھڑا ہے۔ اس کی آنکھیں ہوسناکی سے چمک رہی تھیں۔

سلطانہ نے مزاحمت کی تو فیاض نے اس کے منہ پر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ سرگوشی کے انداز

ہوسناک: برا خیال رکھنے والی۔ سنکی ہوئی: صاف ستھری۔ گھگی بندھ جانا: ڈر کے مارے بول نہ سکنا۔

میں آہستہ سے بولا۔ ”چپکی پڑی رہ حرامزادی۔“

اس نے دوسرا تھپڑ مارا۔ فیاض قوی ہیکل آدمی تھا۔ سلطانہ کے منہ پر دو بھرپور ہاتھ پڑے تو اس کی بتیسی ہل گئی۔ فیاض دست درازی کرنے لگا۔ پاگلوں کی طرح اس کا لباس نوچنے لگا۔

سلطانہ برابر مزاحمت کرتی رہی۔ اس نے چیخنے چلانے کی کوشش کی۔ لیکن فیاض نے اس کا منہ اپنے چوڑے چکلے مضبوط ہاتھ سے اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ آواز نہ نکل سکی۔ وہ صرف غیں غیں کرتی رہی۔ ساتھ ہی فیاض بے دردی سے مارتا بھی رہا۔ آخر وہ تھک کر شل ہو گئی۔ اس نے بے بسی سے فیاض کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بلک بلک کر رونے لگی۔ مگر فیاض دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ باز نہ آیا۔

باہر پھیکی پھیکی چاندنی پھیلی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھے پتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیاز کے کمرے میں روشنی مدہم پڑ گئی تھی۔ فیاض کھڑکی سے کود کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کرم الٰہی اسی راستے سے کمرے کے اندر آ گیا۔

سلطانہ نے جل کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ مگر وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا اور رنڈی بازوں کی طرح چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ سلطانہ نے ایک بار کچکچا کے اس کے بازو پر کاٹ لیا۔ وہ پھر بھی ناراض نہ ہوا۔ ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

کرم الٰہی کے جانے کے بعد وہ صبح تک بستر پر بے حال پڑی رہی۔ اس کا جسم مردے کی طرح بے جان ہو گیا تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ گلا خشک پڑ گیا تھا۔ قریب ہی پالنے میں اس کا بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ بچہ کو لمحہ بھر تک جھک کر دیکھتی رہی۔ پھر اسے سینے سے لگا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

باہر صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال درست کئے اور تھکی ہوئی سی بستر پر گر پڑی۔ اس روز اس نے ناشتا بھی کمرے ہی میں کیا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ برآمدے میں فیاض اور کرم الٰہی کے زور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ ان کے سامنے جاتے ہوئے اسے شدید ذہنی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے دونوں کوٹھی سے باہر چلے گئے۔

❁ ❁ ❁

قوی ہیکل: مضبوط جسم۔ شل ہونا: نڈھال ہونا۔ رنڈی باز: عیاش، تماش بین۔

اول شب کو بوڑھا خانساماں گھبرایا ہوا سلطانہ کے پاس آیا۔ وہ بڑا خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ کوٹھی فوراً چھوڑ دیجئے۔ یہ دونوں ننھے کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔“

سلطانہ اس وقت بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے جھٹ سے ننھے ایاز کو سینے سے چمٹا لیا۔ گھبرا کر بولی۔

”یا اللہ کیا ہونے والا ہے۔ تم مجھے خان بہادر صاحب کے پاس لے چلو۔“

وہ بولا۔ ”وہی تو یہ سب کچھ کرا رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں۔“

اس انکشاف پر وہ ششدر رہ گئی۔ یقین نہ آنے کے سے انداز میں بولی۔ ”نہیں خانساماں وہ اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتے۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہیں ہیں۔ کسی اور نے نہیں خود کرم الٰہی نے مجھے بتایا ہے۔ یہ فیاض، نیاز میاں کا بھائی وائی کہاں ہے۔ خان بہادر صاحب نے خواہ مخواہ کا ڈھونگ رچایا ہے۔ یہ تو جائیداد پر قبضہ کرنے کا چکر ہے۔“

وہ بے بسی سے بولی۔ ”تو اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟“ اس کی آواز بھرّا گئی۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

بوڑھا خانساماں ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”میرا چھوٹا بھائی یہیں شہر میں رہتا ہے۔ آپ میرے ساتھ وہاں چلی چلیں۔ مجھے بھی ان لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کرم الٰہی مجھے کئی بار دھمکی دے چکا ہے۔ اس کے خوف سے تو میں آپ کے پاس اب تک آیا نہیں۔ خدا قسم! میں تو کب کا یہاں سے کام چھوڑ کر چلا جاتا۔ مگر آپ کی وجہ سے اب تک پڑا ہوں؟“

دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر یہی طے ہوا کہ فوراً کوٹھی چھوڑ دی جائے۔ یہ منصوبہ بنانے کے بعد سلطانہ نے سوچا کہ وہ اپنے زیورات اور قیمتی کپڑے لے کر فیاض اور کرم الٰہی کی واپسی سے قبل خانساماں کے ہمراہ چلی جائے۔ مگر اس نے جب اس کمرے میں، جس میں سارا قیمتی سامان رکھا تھا، جا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ فیاض نے

ششدر: حیران و پریشان۔ ڈھونگ رچانا: دھوکا دینا۔

راتوں رات سارے ٹرنک اور سوٹ کیس کمرے سے نکال کر غائب کر دیئے تھے۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

وہ دیر تک دروازے کا پٹ پکڑے دل گرفتہ کھڑی رہی۔ خانساماں نے تسلی دی تو وہ کسی قدر سنبھلی۔ اس وقت اس کے پاس کچھ اوپر سو روپے تھے۔ اس نے ایک سوٹ کیس میں ضروری سامان رکھا اور خانساما کو تانگا لانے کے لیے بھیج دیا۔

ذرا دیر بعد تانگا آ گیا۔ سوٹ کیس اور سامان اس میں رکھ دیا گیا۔ سلطانہ کوٹھی سے باہر جانے لگی تو اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ سوچا کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ اس سے تو اچھا یہی ہے کہ کوٹھی میں رہ کر آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرے۔ مگر اسے فوراً ننھا یاز یاد آ گیا۔ اب وہی اس کا سہارا رہ گیا تھا۔ وہ اس کی جان خطرے میں ڈالنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہ تھی۔

اس نے حسرت بھری نظروں سے کوٹھی کے در و دیوار کو دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر سڑک پر آ گئی۔

تانگے میں بیٹھ کر ایک بار پھر اس نے کوٹھی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ تانگا آگے روانہ ہو گیا۔

(۳)

سلمان دفتر سے دیر میں لوٹا۔ اس نے دیکھا فلیٹ کے نیچے سڑک پر جعفری کی کار کھڑی ہے۔ سلمان کو کسی قدر حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ جعفری کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ چھ بجے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اس نے خود ہی تو سلمان سے چھ بجے شام تک دفتر میں کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ اور جب یہ بات تھی تو اس کی غیر حاضری میں وہ یہاں کیوں آیا؟ جعفری کا معمول تھا کہ جب وہ اس کے فلیٹ پر آتا تو ہمیشہ دفتر سے اسے اپنے ہمراہ لے لیتا۔ گزشتہ چار ساڑھے چار ماہ کے عرصے میں، جب سے جعفری کی اس کے گھر میں آمد و رفت شروع ہوئی تھی، صرف ایک بار ایسا ہوا کہ جعفری اکیلا ہی آیا تھا۔ مگر آنے سے قبل اس نے سلمان کو بتا دیا تھا کہ وہ کس وقت اس کے فلیٹ پر

دل گرفتہ: اداس، غمگین۔

نچا سلمان نے نئی جھلکتی ہوئی کار غور سے دیکھی جو سڑک کے کنارے راج ہنس کی طرح پر پھیلائے کھڑی تھی۔

بلڈنگ کے دریچوں سے دو نوجوان عیسائی لڑکیاں جھک جھک کر کار کو دیکھ رہی تھیں۔ سلمان نے سوچا جھلکتی ہوئی شاندار کار دروازے پر کھڑی ہو تو لڑکیوں پر رعب تو خوب پڑتا ہے۔ اس نے ر کیا کہ دونوں لڑکیاں اسے دیکھ کر مسکرائی بھی تھیں۔ سلمان نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی۔ لیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کی اور گردن اونچی کر کے زینے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

کمرے میں جا کر اس نے دیکھا۔ جعفری صوفے کی پشت سے گردن ٹکائے، ٹانگوں کو بے لفی سے پھیلائے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس وقت وہ ہلکا سلیٹی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی رخ رنگ کی تھی۔ قریب ہی دوسرے صوفے پر رخشندہ بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر ابھی تک چائے ے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں فلموں کے بارے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ سلمان یکھتے ہی جعفری نے زوردار نعرہ لگایا۔

"ہیلو سالومن! میرا خیال ہے تمہیں اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔" اس نے کلائی پر بندھی ئی گھڑی دیکھی۔ "میں ۳۷ منٹ ۱۸ سیکنڈ سے بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ سخت بوریت میں مبتلا تا اگر مسز سالومن میری مدد کو نہ آتیں۔ تمہیں میری طرف سے پہلے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

جعفری نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے سلمان چھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔ "تم تھکے ہوئے معلوم ہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں فوراً ایک گرم گرم پیالہ چائے کا پینا چاہیے۔ چائے بہت خوش ذائقہ ہے۔ کیا تم آج کل اورنج پیکو استعمال کر رہے ہو؟ یقیناً وہی ہے۔ اس کی مہک مجھے دھوکا نہیں دے تی۔" وہ بڑی روانی سے بولتا رہا۔

رخشندہ نے چائے بنا کر دی۔

سلمان آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ چائے ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ نہ اس میں اورنج پیکو کی مہک ی اور نہ خوش ذائقہ تھی۔

جعفری پر اس روز باتیں کرنے کا دورہ پڑا تھا۔ وہ بے تکان بول رہا تھا اور بے تکلفی سے زور ہقہے لگا رہا تھا۔

رات کا کھانا بھی اس نے سلمان کے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کلفٹن جانے کا پروگرام بنا۔ رات کے نو بجے تھے۔ روپہلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا تیکھی تھی۔ رخشندہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

وہ بڑی مسرور نظر آرہی تھی۔ بچوں کی طرح ہنس ہنس کر سادگی سے اپنی مسرت کا اظہار کر رہی تھی۔

کھلی گاڑی میں اس وقت بیٹھنا بڑا خوشگوار لگ رہا تھا۔ فریئر گارڈن کے سامنے سے گزر کر جب وہ کلفٹن جانے والی سڑک پر آگئے تو راستہ اور بھی دلفریب ہو گیا۔ سڑک پر حد نگاہ تک دور دور روشنیوں کی قطار چلی گئی تھی۔

وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو فضا اور بھی زیادہ حسین ہو گئی چاندنی دور تک بکھری ہوئی ریت پر افشاں کی طرح جھلملا رہی تھی۔ سمندر کی لہریں شور کرتی ہوئی اٹھتیں اور ساحل پر دور تک بکھر جاتیں۔ تینوں ریت کے ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گئے اور لہروں کا اتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔ ٹھیک اس مقام پر جہاں سمندر اور آسمان کی سرحدیں مل رہی تھیں، چند کشتیاں آبی پرندوں کی طرح اپنے سفید سفید بادبان لہرا رہی تھیں۔ فضا بڑی سہانی تھی اور اس سہانی فضا میں جعفری کی موجودگی پر لطف معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے پھلکے مزیدار لطیفے سنا کر خود بھی ہنس رہا تھا اور ان دونوں کو بھی ہنسا رہا تھا۔

تینوں کلفٹن سے واپس ہوئے تو رات ڈھل چکی تھی۔ سڑکیں شبنم سے بھیگی ہوئی تھیں۔ رخشندہ کا جسم سرد ہوا سے کپکپا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

سلمان کے گھر میں جعفری کی آمد و رفت جاری رہی۔ اب وہ اکثر سلمان کی غیر حاضری میں بھی آجاتا اور گھنٹوں بیٹھا بے تکلفی کے ساتھ رخشندہ سے باتیں کرتا رہتا۔ ایک بار وہ اس کے لیے ایک قیمتی گھڑی لے کر آیا۔ ہنس کر بولا۔ ”لندن سے میرا ایک دوست لایا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ جب گھر میں بیوی موجود نہ ہو تو بھلا لیڈیز واچ کا کیا مصرف ہو سکتا ہے؟“

اس نے خود اپنے ہاتھ سے رخشندہ کی کلائی پر گھڑی باندھ دی۔ گھڑی واقعی خوبصورت تھی

روپہلی: چمکدار۔ چھٹکنا: پھیلنا، بکھرنا۔ افشاں: گوٹے کے باریک کٹے ہوئے ٹکڑے۔ بادبان: وہ کپڑا جو کشتی کی رفتار کو تیز کرنے اور اس کا رخ موڑنے کے لئے لگاتے ہیں۔ مصرف: استعمال۔

رخشندہ کی گوری گوری کلائی پر سج رہی تھی۔ اس کے بعد بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ رخشندہ کے لیے جعفری کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ سلمان نے ایک دفعہ دبی زبان سے منع بھی کیا۔ مگر جعفری نے اس بات قہقہوں میں اڑا دی۔

”اگر میرے پاس ایک عدد بیوی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کوئی خوبصورت چیز نہیں خرید سکتا۔ سالومن! تم مجھ پر اس طرح ظلم نہیں کر سکتے۔ شاپنگ میرا محبوب مشغلہ ہے۔ اور کسی خوبصورت چیز کو خرید کر الماری میں سجانے کا میں قائل نہیں۔ میں اپنا گھر میوزیم بنانا نہیں چاہتا۔ اور اب تو یہ گھر بھی میرے گھر کا ہی ایک حصہ بن گیا ہے۔“

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اب وہ سلمان کے یہاں بڑی بے باکی سے مسکراتا ہوا آتا اور آتے ہی لاابالی پن سے کوٹ اتار کر صوفے پر ڈال دیتا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا اور سلمان کی بیوی سے کہتا۔

”کیا آج رات کے کھانے پر شامی کباب ممکن ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج شامی کباب ضرور کھائے جائیں۔“

وہ اپنی فرمائش بے دھڑک بتا دیتا ذرا بھی تکلف سے کام نہ لیتا۔

سلمان سے اس کے مراسم روز بروز گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ دفتر میں بھی وہ اس سے اسی طرح پیش آتا۔ اس بڑھتے ہوئے ربط ضبط کا اثر یہ ہوا کہ دفتر والوں پر سلمان کا بھی رعب پڑنے لگا۔ اس کی خوب خوب خوشامدیں ہوتیں۔ طرح طرح سے اسے خوش کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر جعفری سے کوئی کام ہوتا تو وہ سفارش کے لیے سلمان کو پکڑتا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی کہ سلمان جعفری سے کسی کی سفارش کر دیتا تو اس کا کام بن جاتا۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود سلمان ان دنوں پریشان رہتا۔ اسے اپنے گھر پر جعفری کا روز آنا جانا پسند نہ تھا۔ جب سے جعفری کی آمد و رفت شروع ہوئی تھی رخشندہ اس سے بے نیازی برتنے لگی تھی۔ اس کی حیثیت جعفری کے مقابلے میں گھٹ کر دوسرے درجے پر آگئی تھی۔ جعفری کی موجودگی میں وہ احساس کمتری میں مبتلا رہتا۔

انہی دنوں ایک سہ پہر کو وہ دفتر سے واپس آیا تو بیوی گھر پر موجود نہیں تھی۔ جنت نے بتایا کہ جعفری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گئی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح جعفری کے ساتھ تنہا

بے پروائی۔ بے دھڑک: بے خوف، بلا جھجک۔ ربط ضبط: تعلقات۔ گھٹ کر: کم ہو کر۔

گئی تھی۔ سلمان کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ جھنجلاہٹ میں اس نے چائے بھی نہ پی۔

شام ہو گئی مگر دونوں واپس نہ آئے۔ سلمان بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اندھیرا گہر ہوتا جا رہا تھا۔ رات ہو گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ پھر نو بجے، دس بجے۔ رات سنسان ہو گئی۔ سناٹا پھیلنے لگا۔ سلمان تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔ گیارہ بجنے کے کچھ دیر بعد دونوں واپس آئے۔ دروازہ سلمان نے ہی نے اٹھ کر کھولا۔

جعفری نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "ارے تم ابھی تک سوئے نہیں۔ تم یقیناً جاگ رہے تھے۔ میں شرط بدنے کو تیار ہوں۔" وہ بے تکلفی سے ہنس رہا تھا۔ رخشندہ البتہ خاموش تھی۔ وہ سلمان کی نظر بچا کر جھٹ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دونوں فلم دیکھ کر آئے تھے۔ جعفری کچھ دیر فلم کی تعریف کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر چلا گیا۔ مگر چلتے چلتے سلمان سے کہتا گیا۔

"سالومن! آر ڈی برانچ سے تمہارے خلاف بڑا سخت نوٹ آیا ہے۔ تم کام سے غفلت برت رہے ہو۔ یہ درست نہیں۔ کل صبح دفتر میں مجھ سے مل لینا۔"

سلمان کا نصف غصہ تو اس اطلاع سے رخصت ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ آر ڈی برانچ والوں۔ اس کے خلاف کیوں شکایت کی؟ ضرور اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی۔ ان دنوں وہ کام کی طرف سے لاپرواہی بھی بہت برت رہا تھا۔ وہ اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ بیوی نے آ کر کہا۔

"آپ نے کھانا کھایا؟"

سلمان نے روکھے پن سے کہا۔ "نہیں۔"

رخشندہ پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے رسان سے کہا۔ "میں ابھی کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔" خادمہ کو جگانے کے بجائے وہ خود ہی جھپاک سے باورچی خانے میں چلی گئی۔ سلمان نے منع بھی کیا مگر وہ باز نہ آئی۔ باورچی خانے میں برابر برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔

ذرا دیر بعد رخشندہ کھانا لے کر آ گئی۔ وہ ابھی ابھی آگ کے سامنے سے اٹھ کر آئی تھی۔ اس کے رخسار شعلوں کی تپش سے تمتما رہے تھے۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ بالوں کی لٹ بکھر کر ماتھے پر آ گئی تھی۔ اس آب و تاب نے اس کی دل کشی اور بڑھا دی تھی۔ وہ اس وقت

شرط بدنا: شرط لگانا۔ آب و تاب: مراد خوبصورتی۔

خوبصورت اور دل ربا نظر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے چھوٹی میز اٹھا کر لائی۔ اس پر کھانا لگایا اور قریب بیٹھ کر انتظار کرنے لگی کہ وہ کھانا شروع کرے۔ مگر سلمان روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلائے خاموش بیٹھا تھا۔

آخر بیوی نے نوالہ بنایا اور اس کے منہ کے قریب لے جا کر بولی۔ "آپ کو میری قسم۔ تھوڑا سا کھا لیجئے۔" لیکن سلمان نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بگڑ کر بولا۔

"ایک بار کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں پھر تم مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو؟ میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رخشندہ دیر تک کھانے کے قریب سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر برتن اٹھا کر باورچی خانے میں گئی۔ رات کے سناٹے میں ذرا دیر تک برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ابھرتی رہی۔ باورچی خانے سے نکل کر وہ سڑک پر کھلنے والی کھڑکی پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگی۔ سلمان بستر پر لیٹا بیوی کی ہر حرکت دیکھتا رہا۔ ہر آواز ہر آہٹ سنتا رہا۔

چند منٹ بعد وہ کمرے میں آئی اور ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے چہرے پر جھکی۔ سلمان نے آنکھیں بند کر لیں اور رخشندہ کی تیز تیز سانسوں کا لمس محسوس کرنے لگا۔

وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ پھر اندر آئی۔ کئی بار وہ کمرے میں آئی اور چند لمحے رک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ اس وقت بڑی بے چین معلوم ہو رہی تھی۔ سلمان نے بستر پر لیٹے لیٹے سوچا۔ اسے اس طرح بیوی کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا تھا۔ اسے اپنی بیوی پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جعفری کے ساتھ پکچر دیکھنے ہی تو گئی تھی۔ کون سا ایسا بڑا جرم ہو گیا جس کی وہ یہ سزا دے رہا ہے۔ اسے رخشندہ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ آخر وہ اس کی شریک حیات ہے۔ اس سے پیار بھی کرتی ہے۔ ورنہ وہ اس قدر بے قرار نہ ہوتی۔ یہ یقیناً اس کے قدامت پسند خاندانی پس منظر کا اثر ہے جو وہ اس طرح شک و شبہ کی نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے باپ میں اور اس کی عمر میں چوتھائی

دل ربا: مراد اچھی۔ قدامت پسند: قدیم رسم و رواج کی پیروی کرنے والا۔

صدی سے بھی زیادہ کا فرق ہے اور اس چوتھائی صدی میں زندگی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اسے زندگی کو اپنے باپ کی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ وہ سخت قدامت پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

سلمان بستر چھوڑ کر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ رخشندہ صوفے پر تھک کر سو گئی تھی۔ تیز روشنی میں اس کا چہرہ بڑا معصوم نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ صوفے کے نیچے جھول رہا تھا۔ کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے اندر آ رہے تھے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ سلمان نے آہستہ سے جھنجھوڑا اور بڑے پیار سے بولا۔

"یہاں کھلی ہوا میں کیوں لیٹی ہو؟ طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

رخشندہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اس کے بازو کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی۔

❁ ❁ ❁

سلمان دفتر سے واپس آیا تو اس روز بھی رخشندہ گھر پر موجود نہ تھی۔ وہ جعفری کے ساتھ سلمان کی غیر حاضری میں باہر چلی گئی تھی۔ اب وہ اکثر اس طرح جعفری کے ساتھ گھومنے چلی جاتی۔ مگر نہ تو سلمان نے کوئی باز پرس کی اور نہ رخشندہ نے کبھی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ موجود بھی ہوتا تو جعفری صرف تکلفاً پوچھتا۔

"کیا تم پکچر دیکھنے کے موڈ میں ہو؟" اور فوراً کہتا۔ "تم یقیناً تھکے ہوئے ہو۔ تم کو آرام کرنا چاہیے۔" وہ گھڑی دیکھ کر اس کی بیوی کو آواز دیتا۔ "تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں رخشی!" اب رخشندہ کو وہ رخشی ہی کہتا تھا۔ ذرا دیر بعد رخشندہ کی آواز ابھرتی "ابھی آئی۔" پھر وہ بن سنور کر اس طرح آتی کہ کمرہ جگمگانے لگتا۔

بعد میں جعفری نے سلمان سے تکلفاً پوچھنا بھی چھوڑ دیا۔ روزانہ شام کو سلمان کے گھر آتا۔ وہ اور رخشندہ مسکراتے ہوئے باہر چلے جاتے۔

سلمان کمرے میں تنہا بیٹھا سوچا کرتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا اسے دونوں کا حد سے بڑھتا ہوا یہ میل جول روک دینا چاہیے؟ وہ الٹرا ماڈرن بننے کی کوشش کے باوجود ماڈرن بھی نہیں بن سکا تھا۔ اسے دونوں کے اس رویے سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔

وہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس کی صحت پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ اس نے بارہا سوچا کہ اسے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ مستقل آزار بن جائے گا۔

ایک روز اس نے سنجیدگی سے طے کیا کہ جعفری کی آمد و رفت بند کر دینا چاہیے۔ لیکن اس طرح جعفری کے ناراض ہو جانے کا خدشہ تھا اور جعفری کی ناراضگی سے ملازمت خطرے میں پڑ جاتی۔ لہٰذا ایسا قدم اٹھانے سے پیشتر دوسری ملازمت تلاش کر لینا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے ملازمت کی تلاش میں دوڑ دھوپ شروع کر دی مگر کئی ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے پانچ سو کے بجائے دو سو روپے کی بھی نوکری نہ ملی۔ چچا سسر اس دنیا میں نہیں رہا تھا جس کی سفارش اور اثر و رسوخ سے نئی ملازمت مل جاتی۔ چچا سسر اس کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔

دوسری ملازمت نہ ملی لہٰذا وہ جعفری کو ناراض کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سلمان نے سوچا کہ اب ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ رخشندہ کو جعفری کے ساتھ تنہا نہ جانے دے۔ خود بھی اس کے ہمراہ جایا کرے۔ اس طرح اس تکلیف سے تو بچ جائے گا جو ان دونوں کے جانے کے بعد محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز جب دونوں باہر جانے لگے تو سلمان بھی ان کے ہمراہ چلا گیا۔

مگر اس روز اور بھی زیادہ اذیت پہنچی۔ شام کی چائے انہوں نے شیزان میں پی۔ وہاں جعفری کے کچھ دوست بھی آ گئے۔ اور جب اس نے سلمان اور رخشندہ کا تعارف مسٹر اور مسز سلمان کہہ کر کرایا تو ہر ایک نے چونک کر اس طرح سلمان کو دیکھا جیسے انہیں جعفری کی بات پر یقین نہیں آیا۔ سلمان نے دل گرفتہ ہو کر سوچا کیا وہ واقعی بدصورت ہو گیا ہے یا اپنی وضع قطع سے اس قابل نہیں لگتا کہ اسے رخشندہ کا شوہر سمجھا جائے۔

جعفری نے اپنے ایک دوست سے اس کا تعارف کرایا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"تو گویا آپ ہیں مسٹر سلمان۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "آپ کی بیگم سے جعفری کے ساتھ اکثر ملاقات ہوئی مگر آپ سے بھی ملنے کا اشتیاق تھا۔ آپ تو جی بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

سلمان نے پوچھا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بہت دلچسپ آدمی ہوں؟"

"کسی روز میرے یہاں آ کر چائے پیجئے تو میں بتاؤں گا کہ آپ کتنے دلچسپ آدمی ہیں۔ تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ بیگم کو اپنے ساتھ ضرور لائیے گا۔" اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر اور گھر کا پتہ بتایا۔ وہ وزارت صنعت و تجارت میں ڈپٹی سیکریٹری تھا۔ "تو آپ دونوں کب آ رہے ہیں؟ ٹیلی فون کر لیجئے گا۔ میں اپنی کار بھیج دوں گا۔"

سلمان اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے جھنجلا کر دل ہی دل میں کہا۔ یہ سالا رشوت کی کمائی پر پلا ہوا مسٹنڈا ایم۔ اے نواز، کیا مجھے بھڑوا سمجھ رہا ہے یا محض الو کا پٹھا جو اس طرح رخشندہ کو اپنی کوٹھی پر لانے کے لیے مجھ سے بیباکی سے بات کر رہا ہے؟ اس کا جی چاہا کہ نواز کے منہ پر کس کے ایسا تھپڑ رسید کرے کہ عقل ٹھکانے آجائے۔

جعفری فوراً بھانپ گیا کہ سلمان کو نواز کی بات ناگوار گزری۔ مسکرا کر بولا۔ "نواز! میرا مشورہ ہے تم ڈیل کارنگی کو ضرور پڑھو۔ میری مراد اس کی کتاب ہاؤ ٹو ون فرینڈز سے ہے۔"

نواز کو بھی سلمان کی خفگی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ ڈیل کارنگی کے بارے میں جعفری سے باتیں کرنے لگا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اس روز کے بعد سلمان پھر ان دونوں کے ہمراہ نہ گیا۔ اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ سلگتا رہا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ رخشندہ بڑی بے باکی سے جعفری کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ اب جعفری کا بیشتر وقت سلمان ہی کے فلیٹ میں گزرتا۔

❀ ❀ ❀

اس روز چھٹی تھی۔ لیکن جعفری نے سلمان کی ڈیوٹی دفتر میں لگا دی۔ وہ خود بھی دفتر آیا۔ مگر زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ کچھ دوستوں کے ساتھ دھابے جی آؤٹنگ کے لیے جارہا ہے۔ جنرل منیجر کا شاید فون آئے تو کہہ دے کہ وہ کسی رشتہ دار کو رخصت کرنے ایئرپورٹ گیا ہے۔

سلمان ۳ بجے تک دفتر میں کام کرتا رہا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ لہٰذا وہ جلد ہی دفتر سے اٹھ گیا۔ واپس گھر آیا۔ دیکھا، جعفری کی کار اس کے فلیٹ کے نیچے کھڑی ہے۔ کار دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

سلمان غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں اس نے بازار میں جاکر چاقو خریدا اور یہ طے کر کے گھر میں گھسا کہ وہ آج جعفری اور رخشندہ دونوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔ اس کے سر پر خون کھیل رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے چاقو کو وہ داہنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ اپنی ذلت کا انتقام لینے کا اس کی سمجھ میں یہی طریقہ آیا۔ روز روز کے چرکوں نے زندگی عذاب بنا دی تھی۔

بھڑوا: عورتوں کی عزت کا سودا کروانے والا، عورتوں کا دلال۔ بیباکی: بے حیائی۔

اس نے تیز تیز قدموں سے زینے کی سیڑھیاں طے کیں۔ غصے میں دروازہ زور سے دھکا دے کر کھولا۔

ڈرائنگ روم خالی تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ سامنے مسہری پر جعفری لیٹا تھا۔ اس کی بیوی سرہانے بیٹھی جعفری کا سر دبا رہی تھی۔

سلمان کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ وہ دہلیز پر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو مضبوطی سے انگلیوں میں بھینچ لیا اور ڈپٹ کر بولا۔ "رخشی!"

بیوی نے گھبرا کر دیکھا اور فوراً اس کے قریب آگئی۔ اس نے سرگوشی کی۔ آہستہ بولئے۔ "جعفری کی طبیعت خراب ہے۔"

سلمان نے خونخوار نظروں سے رخشندہ کو دیکھا۔ اسی وقت جعفری کی آواز ابھری۔

"سالومن! کیا بات ہے؟ میرے پاس آؤ۔"

جعفری اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سلمان کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔ "تم روٹھے ہوئے بچوں کی طرح وہاں کیوں کھڑے ہو؟ یہاں تو آؤ۔ آؤ بھئی۔" اس کا لہجہ سرپرستانہ تھا اور تحکمانہ بھی۔

سلمان آہستہ آہستہ چل کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا تم مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو گے؟" جعفری نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔"

وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ سلمان نے خاموشی سے اس کی پیشانی پر ہاتھ لگایا۔ اس کی پیشانی پسینے سے شرابور تھی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"ارے آپ کو تو بڑا تیز بخار ہے۔"

"بہت خراب ہو رہی ہے طبیعت۔"

"میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

"نہیں میں خود چلوں گا۔"

سلمان نے سہارا دے کر نیچے اتارا اور اسے سنبھالے ہوئے کار تک لے گیا۔ رخشندہ بھی ساتھ تھی۔ کار وہی چلا رہی تھی۔

سلمان کو پہلی بار علم ہوا کہ وہ کار چلانا بھی سیکھ گئی ہے۔

تینوں ڈاکٹر کے کلینک پہنچے۔ واپسی پر وہ جعفری کو چھوڑنے اس کی کوٹھی گیا اور رات گئے تک وہاں رہا۔ رخشندہ بڑی مستعدی سے جعفری کی تیمارداری کرتی رہی۔ سلمان خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ گھر لوٹا تو چاقو اس کی جیب میں پڑا تھا۔ اور جعفری کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے لیے رخشندہ وہیں ٹھہر گئی تھی۔

(۴)

سلطانہ کو بوڑھے خانساماں کے بھائی کے ساتھ رہتے ہوئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ مزاج میں نرمی تھی۔ بڑے بھائی کی طرح کم سخن اور مرنجان مرنج تھا۔ بازار میں اس کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔ وہ صبح کا نکلا رات گئے گھر میں داخل ہوتا۔ تمام دن دکان پر بیٹھا رہتا۔

وہ سلطانہ کی بڑی عزت کرتا تھا اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ مگر اس کی بیوی بڑی سرکش اور منہ پھٹ تھی۔ ذرا سی بات پر آنکھیں نکال کر کھڑی ہو جاتی۔ ہر سال اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تھا۔ اب تک گیارہ کی پلٹن تیار کر چکی تھی۔ درجن کا آخری بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔ وہ دن بھر بچوں کو چیخ چیخ کر کوسنے دیتی۔ ہر وقت اس کی ناک پر غصہ رہتا۔ ذرا کوئی بات مزاج کے خلاف ہوئی اور اس نے دہاڑنا شروع کر دیا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ قد ٹھگنا اور نچلا دھڑ خوب پھیلا ہوا تھا۔ دیکھنے میں اچھی خاصی بھوری بھینس معلوم ہوتی تھی۔

سلطانہ کو پہلے ہی دن سے وہ اچھی نہیں لگی۔ وہ اس سے بہت کم بات چیت کرتی۔ سلطانہ نے کبھی اس سے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ چھوٹا سا گھر تھا جس میں کل دو کمرے تھے۔ کمروں کے آگے برآمدہ بھی تھا۔ مگر سلطانہ کو رہائش کے لیے ایک کمرہ مل گیا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت کمرے کے اندر گزارتی۔

ننھے ایاز کی ان دنوں طبیعت خراب تھی۔ دانت نکل رہے تھے۔ وہ ہر وقت ماں کی گود میں

تیمارداری: بیمار کی عیادت۔ کم سخن: کم بولنے والا۔ مرنجان مرنج: ہر حال میں خوش رہنے والا۔ سرکش: نافرمان۔ منہ پھٹ: زبان دراز، بدزبان۔ ٹھگنا: چھوٹا قد۔

رہتا۔ ماں لمحہ بھر کو جدا ہوتی تو وہ ریں ریں کرنا شروع کر دیتا۔

بوڑھا خانساماں ابھی تک بے روزگار تھا اور ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ سلطانہ اپنے ساتھ جو روپے لائی تھی خرچ ہو چکے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا وہ گھر میں کھاتی تھی۔ البتہ بچے کے دودھ اور دوسری ضروریات پر وہ اپنے پاس سے خرچ کر رہی تھی۔ جب سارے روپے خرچ ہو گئے تو ایک روز اس نے خانساماں کو بلایا اور کانوں میں پڑے ہوئے سونے کے آویزے نکال کر خانساماں کو دیئے کہ ان کو فروخت کر دے۔

خانساماں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”بیگم صاحبہ! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

سلطانہ بولی۔ ”دیکھو بابا تم مجھے بیگم صاحبہ نہ کہا کرو۔ مجھے بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔“ وہ اب خانساماں کے بجائے اسے بابا کہنے لگی تھی۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”تو پھر کیا کہا کروں؟“

”جو آپ کا جی چاہے۔ ویسے آپ میرا نام تو جانتے ہی ہیں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”چلو بھئی اللہ میاں نے مجھے اتنی بڑی پالی پوسی بیٹی دے دی۔“ اس نے سلطانہ کے ر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ”اچھا اب تم یہ بندے پہن لو۔ میرے پاس ابھی کچھ رقم پڑی ہے۔ فی لحال تم اس سے کام چلاؤ۔ جب تک اللہ میرا کام لگا دے گا۔“

سلطانہ نے بہت اصرار کیا مگر وہ آویزے فروخت کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ اسی وقت جا کر ن نے اپنا صندوق کھولا اور پچاس روپے لا کر سلطانہ کو دے دیئے۔

سلطانہ نے رُوپے تو لے لیے مگر اسے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا اس طرح ب تک کام چلے گا؟ کب تک وہ خانساماں سے روپے لیتی رہے گی؟ وہ اسی ادھیڑبن میں دیر تک سر ھکائے بیٹھی رہی۔

❁ ❁ ❁

شاید جمعہ تھا۔ خانساماں کا چھوٹا بھائی دکان سے سرِ شام ہی واپس آ گیا تھا۔ جمعے کو وہ عام طور جلد ہی گھر آ جاتا تھا۔ اس روز وہ بازار سے مٹھائی لایا تھا۔ اس نے سلطانہ کو بھی مٹھائی بھجوانا چاہی تو ی بگڑ کر بولی۔

ویزے: بندے، کانوں کا ایک زیور۔ پالی پوسی: سر او بڑی عمر کی۔ سرِ شام: شام ہوتے ہی۔

"بس رہنے دو بہت ہو چکیں خاطر داریاں۔ اپنے گھر میں کھانے والے کچھ کم ہیں جو تجھے مجھے کھلاتے پھر رہے ہو۔ خواہ مخواہ کے لیے بڑے بھیا نے ایک مصیبت لا کر ہمارے سر پر ڈال دی۔ بیگم ہوں گی ان کے لیے۔ انہوں نے نمک کھایا ہے۔ ہمارے ساتھ کیا کر دیا جو دونوں وقت پلنگ پر بٹھا کر دستر خوان لگائیں۔

وہ بڑی تیز اور طرار عورت تھی۔ ایک زبان میں دس باتیں کہتی تھی۔ تڑاق پڑاق بولتی چلی گئی۔ سلطانہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ درمیان میں دیوار تھی۔ مگر آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اس کے منہ سے ایسی جلی کٹی باتیں کئی بار سن چکی تھی۔ ذرا دیر بعد اس کے شوہر کی آواز ابھری۔

"نیک بخت کیوں ایسی باتیں کر رہی ہے۔ خدا کسی پر برا وقت نہ ڈالے۔ بے چاری مصیبت کی ماری ہوئی ہے۔ ہمارا کیا لیتی ہے۔ دو وقت کا کھانا کھا لیتی ہے تو اس میں کیا جاتا ہے۔ اللہ نہ جانے کس کے نصیب سے دیتا ہے۔"

بیوی اس کے سمجھانے پر اور بھڑک اٹھی۔ چیخ کر بولی۔ "بس بس رہنے دو اپنی خدا ترسی۔ ہم کون سے بڑے دھنا سیٹھ ہیں۔ نہ جانے کس طرح روکھا سوکھا کھا کر گزارہ ہو رہا ہے۔ اوپر سے یہ مصیبت اور سر پر آ گئی۔ یہ بڑے بھیا اچھے خاصے دفان ہو گئے تھے۔ اب آئے ہیں تو اپنے ساتھ یہ دم چھلا لگا کے لے آئے۔ خود بھی ٹھونس رہے ہیں اور اپنے الفتوں کو بھی ٹھنسوا رہے ہیں۔"

وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ سارے گھر میں اس کی آواز گونجنے لگی۔ شوہر نے ٹوکا۔

"آہستہ بولو۔ وہ بے چاری سنے گی تو کیا کہے گی؟"

وہ اور زور سے چیخنے چلاّنے لگی۔ "سن رہی ہے تو سننے دو۔ میں کسی کے لیے اپنے منہ میں قفل نہیں ڈالوں گی۔ میرا گھر ہے جس طرح چاہوں بات کروں۔ دیکھو میں نے تم سے کہہ دیا کہ مجھ سے اب نہیں کھلایا جائے گا۔ تم بڑے بھیا سے صاف صاف کہہ دو کہ اپنی مصیبت اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ سرائے یا ہوٹل نہیں ہے جس کا جی چاہا آ کر ٹھہر گیا۔ واہ واہ یہ بھی خوب رہی۔ خود مزے سے اینڈتے پھرتے ہیں۔" اس نے ہاتھ نچا کر نفرت سے منہ بگاڑا۔ "بھئی نوکری نہیں لگتی۔ اے

خاطر داری: آؤ بھگت، تواضع۔ ایک زبان میں: ایک ہی دفعہ، ایک ساتھ۔ تڑاق پڑاق: جلد جلد، بے باکانہ۔ جلی کٹی باتیں: غصہ والی/تکلیف دہ باتیں۔ دھنا سیٹھ: بہت زیادہ امیر۔ الفتوں: مفت خوروں۔ اینڈتے پھرنا: غرور سے پھرنا، نخرے سے پھرنا۔

نوکری ملے تو کیسے؟ کوئی تلاش بھی کرے۔ اللہ دے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو۔"

شوہر مری ہوئی آواز میں بولا۔ "اچھا اچھا! میں ان سے بات کروں گا۔ اب تو تم چپ ہو جاؤ۔"

مگر وہ باز نہ آئی۔ کہتی رہی۔ "اگر تم نے ان سے نہ کہا تو خدا قسم میں سامان باہر رکھوا دوں گی اور دونوں سے کہوں گی کہ بڑھاؤ اپنا ٹٹو یہاں سے۔ بہت ہو چکی مہمان داری۔"

وہ زچ ہو کر بولا۔ "خدا کے لیے تم اب چپ ہو جاؤ۔ بہت کہہ چکیں۔"

وہ بجائے چپ ہونے کے اور زیادہ زور زور سے چیخنے لگی۔ جو منہ میں آیا، کہتی چلی گئی۔ اس نے رونا بھی شروع کر دیا۔ شوہر سیدھا سادا دبو آدمی تھا۔ ہنگاموں سے جلد گھبرا جانے والا۔ بجائے اس کے کہ وہ بیوی کو ڈانٹتا ڈپٹتا الٹا اس کی خوشامد کرنے لگا۔

سلطانہ دم بخود بیٹھی ایک ایک بات ایک ایک آواز سنتی رہی۔ اس نے سوچا اب اس گھر میں وہ زیادہ عرصے نہیں ٹھہر سکتی۔ وہ رات گئے تک بستر پر پڑی سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کس کے پاس جائے؟ کہاں جائے؟ کئی بار اس نے انتہائی ناامیدی کے عالم میں سوچا کہ اس زندگی سے تو موت بھلی۔ پھر اس رات ایک ایسا لمحہ بھی آیا کہ اس نے سنجیدگی سے خودکشی کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بار ماں نے اسے بتایا تھا کہ محلے کی ایک عورت نے ٹنکچر آیوڈین پلا کر خودکشی کر لی تھی۔ سلطانہ کو تھوڑے سے ٹنکچر آیوڈین کی ضرورت تھی۔ اس نے سوچا جب رات سنسان ہو جائے گی اور گھر میں سب سو جائیں گے تو پہلے وہ ننھے ایاز کو ٹنکچر پلائے گی۔ پھر خود پلا لے گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ صبح کو بستر پر صرف لاشیں ہی ملیں گی۔ رات بھر وہ یہی سوچتی رہی اور چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ بستر سے اٹھنے کے ساتھ ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ترکاری کاٹنے والی چھری سے اپنی پنڈلی چیر ڈالی۔ چھری کند تھی۔ سلطانہ کو زخم لگانے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ بار بار اس کا ہاتھ لرز جاتا۔ مگر پنڈلی کو زخمی کرنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ ٹنکچر آیوڈین کیا کہہ کر منگواتی۔

اللہ دے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو: مراد جسے مفت میں کھانے کو ملے اسے کمانے کی کیا ضرورت ہے۔ بڑھاؤ اپنا ٹٹو: مراد چلے جاؤ۔ زچ ہونا: عاجز آنا، تنگ آنا۔ دبو: دبنے والا، ڈرپوک۔ ترکاری: سبزی۔ کند: جو تیز نہ ہو۔

پنڈلی زخمی کرنے کے بعد وہ ٹنکچر کے لیے خانساماں کا انتظار کرنے لگی۔ وہ سویرے بہت تڑکے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ ہر طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ سلطانہ نڈھال بیٹھی تھی۔ بچہ اس کی گود میں سو رہا تھا۔ اسی اثنا میں صغرا آگئی وہ چھریرے جسم کی زرد رو عورت تھی۔ دو چار مکان چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ اکثر آیا کرتی تھی۔ سلطانہ سے بھی اس کی تھوڑی بہت یاد اللہ ہو گئی تھی۔

صغرا ان دنوں سخت پریشان تھی۔ اس کے شوہر نے ایک طوائف کو گھر میں ڈال لیا تھا اور اب اسی کے ساتھ رہتا تھا۔ شروع شروع میں وہ صغرا اور اس کے بچوں کے اخراجات کے لیے کچھ نہ کچھ دیتا رہا۔ مگر پچھلے کئی ماہ سے خرچ دینا تو ایک طرف وہ اس کی طرف آکر جھانکا تک نہیں۔ صغرا پر کئی کئی وقت کے فاقے پڑ رہے تھے۔ سلطانہ خود مصیبت کی ماری تھی اسی لیے صغرا سے اسے ہمدردی تھی۔

صغرا گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اس کے پاس آئی۔ اس روز خلاف توقع اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

سلطانہ کا اس وقت بات چیت کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تنہائی چاہتی تھی۔ اور اس تنہائی میں بیٹھ کر وہ ان باتوں کو سوچنا چاہتی تھی جو پچھلی رات سے اس کے دماغ میں منڈلا رہی تھیں جن کو دہرانے میں مزا آرہا تھا۔ یہ موت کا ذائقہ تھا۔ مر جانے کی حسرت تھی۔

اس کے چاروں طرف گہری تاریکی کا جال پھیلا تھا اور اس جال میں الجھی ہوئی وہ اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کو محسوس کر رہی تھی۔ ان لمحوں کو دیکھ رہی تھی جب وہ اپنے بچے کو تیز بدبودار تیزابی ٹنکچر پلائے گی۔ بچہ پہلے گھبرا کر روئے گا۔ پھر تڑپے گا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں گی۔ منکا ڈھلک جائے گا۔ وہ مر جائے گا۔ اس کی لاش اٹھا کر وہ سینے سے چمٹا لے گی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پیشانی کو چومے گی۔ دوسرے لمحے آیوڈین کی شیشی اس کے ہاتھ میں ہو گی اور تیزابی مادہ اس کے حلق سے نیچے اتر رہا ہو گا۔ پھر اس کا دل کٹنے لگے گا۔ وہ تڑپنے لگے گی۔ آنکھوں کے سامنے ہر چیز دھندلی پڑتی جائے گی۔ ایک ہچکی۔ دوسری ہچکی اور پھر قصہ ختم۔

صبح بستر پر اس کی لاش پڑی ہو گی۔ اس کے برابر ننھے ایاز کا مردہ ہو گا۔ سب سے پہلے کمرے

تڑکے: صبح سویرے۔ یاد اللہ: سلام دعا، واقفیت۔ آنکھیں ابل پڑنا: تکلیف سے آنکھیں نکل آنا۔ منکا ڈھلکنا: مرتے وقت گردن کا ٹیڑھا ہو جانا۔

میں خانساماں آئے گا۔ اور اس کی لاش دیکھ کر رو پڑے گا۔ وہ ضرور روئے گا۔ اسے ضرور دکھ ہو گا۔ اور اس کی بھاوج ضرور اسے کوسنے دے گی۔ حرامزادی کو یہیں آکر مرنا رہ گیا تھا۔ وہ زور زور سے چیخے گی۔ اس کا زن مرید شوہر اسے چپ کرانے کے لیے منت سماجت کرے گا۔ اور بستر پر لاش سرد پڑ چکی ہو گی۔ اسے کچھ بھی خبر نہ ہو گی۔

ان تمام باتوں کو وہ سوچ چکی تھی، سوچ رہی تھی اور دیر تک سوچنا چاہتی تھی۔ بار بار اس کا دل بھر آتا۔ وہ رو پڑتی۔

رونے سے اسے تسکین مل رہی تھی۔

⊛ ⊛ ⊛

صغرا ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ اس نے خود ہی بات چھیڑی۔ "اللہ میاں نے میری تو سن لی۔" لیکن سلطانہ نے اس کی بات بالکل نہ سنی۔ وہ پتھر کی طرح خاموش تھی۔ صغرا کہتی رہی۔ "نہ اب اس حرامزادے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہے نہ تیرے میرے احسان اٹھانے کی۔ اپنے ہاتھ پاؤں سلامت۔ اب تو دو چار کو بٹھا کر کھلانے کا دم ہے۔"

سلطانہ نے اس کی باتوں پر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔

صغرا لحہ بھر رک کر بولی۔ "اے کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

سلطانہ نے بے نیازی سے کہا۔ "اچھی ہے۔"

"بڑی چپ چپ نظر آرہی ہو۔ بات کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" سلطانہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"میں تو آج کل ٹھاٹھ سے کام پر جا رہی ہوں۔ اسی لیے کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔"

اس دفعہ سلطانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔ "کہاں مل گیا کام؟"

"اے وہ کیا نام ہے اس کا۔ انڈسٹریل ہوم۔ انگریزی میں نام رکھا ہے۔ یاد بھی تو نہیں رہتا۔"

سلطانہ کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ "کیا کام ہوتا ہے وہاں؟"

"فی الحال تو میں سلائی کا کام کرتی ہوں۔ ویسے کام سیکھ بھی رہی ہوں۔ وہاں تو نہ جانے کتنی

کوسنے دینا: برا بھلا کہنا۔ تیرا میرا: اپنے بیگانے کا۔

طرح کے کام ہوتے ہیں۔ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ خدا قسم بڑے اچھے اچھے گھروں کی عورتیں آتی ہیں۔"

"تمہیں تنخواہ ملتی ہے؟"

"جتنا کام کرواتی ہی آمدنی۔ ہفتے کے ہفتے حساب مل جاتا ہے۔"

سلطانہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے بھی وہاں کام مل جائے گا؟" مرنے کی تمنا پر زندہ رہنے کی خواہش حاوی ہوگئی۔ سلطانہ بالکل بھول گئی کہ پچھلی رات سے اب تک وہ کیا کیا سوچتی رہی تھی۔ اس نے کس کس طرح موت کا ارمان کیا تھا اور کس کس طرح خود کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر زندگی پھر زندگی ہے۔ حرکت اور حرارت۔ جدوجہد، جدوجہد، مسلسل جدوجہد۔

صغرا نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا۔ "تم کام کروگی؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"تو پھر کسی دن میرے ساتھ چلو۔"

سلطانہ بولی۔ "آج ہی لے چلو۔"

"میں دس بجے جاؤں گی۔ تیار ہو جاؤ۔ میں آکر تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گی۔"

سلطانہ آمادہ ہوگئی۔

صغرا چلی گئی۔ سلطانہ نے اٹھ کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ نہ پنڈلی کا زخم یاد آیا نہ اس نے توجہ دی۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے ہی صغرا آگئی۔ سلطانہ اس وقت تک تیار ہو چکی تھی۔ اس نے ننھے ایاز کو خانساماں کی بڑی بھتیجی کے سپرد کیا اور صغرا کے ہمراہ گھر سے نکلی۔ صغرا اسے انڈسٹریل ہوم کے بجائے پہلے فلک پیما کے ہیڈکوارٹر لے گئی۔ انڈسٹریل ہوم میں داخلے کی اجازت وہیں سے ملتی تھی۔

دونوں وہاں پہنچیں تو دس بج چکے تھے۔ ہیڈکوارٹر دیکھ کر سلطانہ کو شبہ سا ہوا کہ اس عمارت کو پہلے بھی کبھی دیکھ چکی ہے۔ مگر وہ زیادہ توجہ نہ دے سکی۔ شبہ صرف شبہ کی حد تک رہا۔ اس عمارت کو جب پہلی بار اس نے دیکھا تھا تو اندھیری رات تھی۔ ویسے بھی اس کی زندگی میں اس وقت سے اب تک اتنی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں کہ بہت سی باتوں کی یاد تک دھندلا گئی تھی۔

ہیڈکوارٹر میں اس وقت علی احمد ڈیوٹی پر تھا۔ صغرا نے سلطانہ کو اس سے ملایا۔ وہ سلطانہ کو

ڈسٹریل ہوم میں داخل کرنے پر رضامند ہوگیا۔ اس نے اسی وقت سلطانہ کا نام رجسٹر میں درج کیا ر داخلے کا ٹکٹ بنا کر دے دیا۔ سلطانہ چاہتی تھی کہ انڈسٹریل ہوم ہی میں اس کی رہائش کا بھی روبست ہو جائے۔ مگر علی احمد نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ صاف کہہ دیا۔

"دیکھئے ہم آپ کو رہنے کی جگہ نہ دے سکیں گے۔ اس کا بندوبست تو آپ کو خود ہی کرنا پڑے گا۔"

سلطانہ نے عاجزی سے کہا۔ "میں جہاں رہتی ہوں وہ لوگ مجھے زیادہ عرصے اپنے ساتھ ہرانا نہیں چاہتے۔ میرا یہاں کوئی نہیں ہے جس کے پاس جاکر ٹھہر جاؤں۔"

"کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا۔ میرا مطلب ہے کوئی عزیز کوئی رشتے دار۔"

"اگر اتنا ہی سہارا ہوتا تو میں آپ سے اس طرح کیوں کہتی۔"

علی احمد ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "آپ کل اسی ت آیئے گا تو میں کچھ بتا سکوں گا۔ فی الحال میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

سلطانہ کے لیے اب زیادہ اصرار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ صغرا کے ساتھ واپس گھر آگئی۔

دوسرے روز وہ پھر ہیڈکوارٹر پہنچی۔ علی احمد دفتر میں موجود تھا۔ سلطانہ کو دیکھ کر بولا۔ ڈسٹریل ہوم میں تو ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں۔ وہاں جائیں گی تو آپ کو خود اس کا اندازہ جائے گا۔ سردست یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ہیڈکوارٹر میں ٹھہر جائیں۔ یہاں آپ کو رہنے کے لیے ب کمرہ مل جائے گا۔ مگر یہ آپ کی عارضی رہائش ہوگی۔ اسکائی لارک کوشش کر رہے ہیں کہ بستی ں آپ کے لیے مکان کا بندوبست کر دیا جائے۔"

سلطانہ نے خاموشی سے اس کی بات مان لی۔

وہ اسی روز اپنا سامان لے کر وہاں پہنچ گئی۔ اسکائی لارکوں نے سلطانہ کے لیے کمرہ خالی کر دیا۔ ہ بہت مختصر تھا مگر صاف ستھرا تھا۔

چند روز تو سلطانہ کو ہیڈکوارٹر میں بڑی وحشت معلوم ہوئی وہاں سب مرد ہی مرد تھے۔ وہ ٹریل ہوم سے شام کو لوٹتی اور زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی۔ کبھی کبھار کسی کام سے باہر نکلنا نا تو اسے بڑی شرم معلوم ہوتی۔ لیکن ننھا ایاز بہت جلد اسکائی لارکوں میں مقبول ہوگیا۔ وہ گھنٹوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

❁ ❁ ❁

سلطانہ دس بجے انڈسٹریل ہوم چلی جاتی۔ سینے پرونے کے علاوہ اسے تھوڑی بہت کشید
کاری بھی آتی تھی۔ اسے اسی کام پر لگادیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ زردوزی اور لکڑی کے کھلو
بنانے کا کورس بھی مکمل کر رہی تھی۔ کام میں سب سے بڑی مشکل ننھا ایاز تھا جس نے شروع شرو
میں رو رو کر اسے بہت پریشان کیا۔

انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے والی عورتوں میں بہت کم ایسی تھیں جو ننھے ننھے بچوں کو اپ
ساتھ لاتی تھیں۔ بچوں سے چونکہ کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی تھی اس لیے عام طور پر انڈسٹریل ہو
میں بچوں والی عورتوں کو بہت کم داخلہ ملتا تھا۔ ویسے بچوں کے لیے انڈسٹریل ہوم میں ایک لمبا
دالان تھا جس میں کئی پالنے پڑے تھے۔ جو بچے گھٹنوں چلنے والے تھے ان کے واسطے لکڑی کی باڑھ لگ
کر چھوٹا سا احاطہ بنادیا گیا تھا جہاں وہ کھیلتے رہتے۔

ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا بھی مقرر تھی۔

سلطانہ رفتہ رفتہ ہیڈکوارٹر کے ماحول سے مانوس ہوتی گئی۔

علی احمد سے وہ ایک بار بات چیت کر چکی تھی۔ لہٰذا وہ کبھی کبھار اس سے بات کر لیتی۔ ننھا ایاز
علی احمد سے بہت ہل گیا تھا۔ اس لیے گفتگو کرنے کا روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ نکل ہی آتا۔ ذرا اطمینان
نصیب ہوا تو اسے نوشا کا خیال ستانے لگا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اس
نے آخری بار اسے پولیس کی حراست میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔

وہ نوشا کے بارے میں علی احمد سے بات کرنا چاہتی تھی، مگر ہمت نہ پڑتی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر
اس نے نوشا کے متعلق کچھ کہا تو اسے اور بھی ایسی باتیں بتانا پڑیں گی جن کو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔
ممکن ہے انہیں سن کر علی احمد بدگماں ہو جائے اور اسے ہیڈکوارٹر سے بھی نکلنا پڑے۔

ویسے اسکائی لارکوں کو بھی سلطانہ سے خاصی مدد ملتی تھی۔ وہ ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں کی
مرمت کر دیا کرتی۔ قمیصوں میں بٹن ٹانک دیتی۔ ہفتے کی رات کو فلک پیما کا اجلاس ہوتا تو وہ اسکائی
لارکوں کے لیے چائے تیار کر دیتی۔ سارے اسکائی لارک اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ اس سے
بات کرتے تو نظریں نیچی کر کے۔ کبھی بلاوجہ اس سے بات چیت کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اگر وہ
ان کا چھوٹا موٹا کام کر دیتی تو وہ بار بار اس کا شکریہ ادا کرتے۔

کشیدہ کاری: پھول بوٹے کاڑھنے کا کام۔ زردوزی: سلمے ستارے کا کام۔ ہل جانا: مانوس ہونا۔ بدگمان: برا خیال رکھنے والا۔

سلطانہ کو اسکائی لارک بڑے عجیب و غریب معلوم ہوئے۔ وہ بلا کسی غرض کے سب کی
خدمت کرتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ وہ اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ موٹا جھوٹا کھاتے، موٹا
جھوٹا پہنتے اور بڑے مطمئن نظر آتے۔ بات کرتے وقت ان کا لہجہ نرم ہوتا۔ وہ ننھے ایاز کے ساتھ
الھڑ نوجوانوں کی طرح قہقہے لگا کر کھیلتے تھے۔ اور وہ بھی اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ ہمک ہمک
کر ان کے پاس جاتا اور گھنٹوں ماں کے پاس آنے کا نام نہ لیتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ علی احمد اس کے پاس اپنی قمیص میں رفو کرانے کے لیے آیا۔ اس نے بلا
کسی تمہید کے سلطانہ سے کہا۔ "آپ پڑھائی کیوں نہیں شروع کر دیتیں؟"

سلطانہ فوراً آمادہ ہو گئی۔ "آپ مجھے پڑھا دیا کریں گے؟"

علی احمد ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "میں صرف آدھ گھنٹہ آپ کو دے سکوں گا۔"

اسی وقت پروگرام طے ہو گیا۔ دوسرے روز سورج غروب ہوتے ہی علی احمد پڑھانے آ گیا۔
وہ علی احمد کی توقع سے زیادہ ذہین نکلی۔ پڑھنے سے اسے دلچسپی بھی تھی۔ بچپن میں قرآن پاک کا
ناظرہ بھی کر چکی تھی۔ لہٰذا مقررہ مدت سے پہلے ہی اس نے تعلیم بالغاں کا پہلا کورس ختم کر دیا۔ اس
کی گہری دلچسپی اور لگن دیکھ کر علی احمد نے پڑھائی کے وقت میں پندرہ منٹ کا اضافہ کر دیا۔ وہ وقت کا
بڑا سخت پابند تھا۔ سبق شروع کرنے سے پہلے گھڑی دیکھ لیتا اور جیسے ہی ۴۵ منٹ پورے ہوتے فوراً
اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ پڑھائی کے دوران وہ کبھی غیر متعلق بات نہیں کرتا تھا۔ کئی بار سلطانہ نے سوچا
کہ نوشا کے بارے میں علی احمد سے بات کرے، مگر علی احمد کا سنجیدہ چہرہ اور سوچتی ہوئی آنکھیں دیکھ
کر اس کی ہمت جواب دے جاتی۔

وہ نوشا کے لیے بڑی بے چین تھی۔ آخر ایک روز اس نے ہمت کر کے علی احمد سے کہہ ہی
دیا۔ "میرا چھوٹا بھائی جیل میں ہے۔ اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔"

علی احمد نے چونک کر سلطانہ کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "کس کو قتل کیا تھا اس نے؟"

سلطانہ نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے باپ کو۔"

علی احمد اور زیادہ حیرت زدہ ہو گیا۔ "اپنے بہنوئی کو قتل کر دیا۔ بڑا بے رحم نوجوان ہے۔"

"وہ اتنا برا نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"کیوں؟" علی احمد بدستور حیرت زدہ تھا۔

اس "کیوں" کا وہ کیا جواب دیتی۔ اسی بات کے طشت ازبام ہو جانے سے تو وہ ڈر رہی تھی۔
پھر علی احمد نے خود ہی کہا۔ "میری سمجھ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں آیا۔ ٹھیک ہے کہ وہ تمہارا بھائی ہے اور تمہیں اس سے محبت بھی ہے۔ مگر تمہاری ساری تباہی تو اس کے ہاتھوں ہوئی۔ کم از کم میرا تو یہی اندازہ ہے۔"

سلطانہ نے سوچا اگر علی احمد نے نوشا کے متعلق ایسی ہی رائے قائم کی تو وہ نوشا کی کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ نوشا کو پھانسی ہو جائے گی۔ اس کا بھائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گا۔ اس نے یہی سوچ کر دبی زبان سے رک رک کر علی احمد کو ساری باتیں صاف صاف بتا دیں۔ اور جب وہ سب کچھ بتا چکی تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں واقعی بہت بری ہوں۔ واقعی بہت بری ہوں۔ آپ مجھے جتنا چاہیں ذلیل سمجھ لیں مگر اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

کمرے کی فضا اچانک غمناک ہو گئی۔ باہر رات کی تاریکی تھی اور کمرے میں سلطانہ کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ علی احمد سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا واقعی یہ لڑکی مصیبت زدہ ہے۔ وہ ربڑ کی گیند کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر گر رہی تھی اور ہر جگہ اس پر ٹھوکر لگائی جا رہی تھی۔ یہ عجیب معاشرہ ہے جہاں عورت ربڑ کی گیند اور خوبصورتی چوری کا مال بن جاتی ہے۔

لیمپ کی زرد زرد روشنی میں سلطانہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بجھتی ہوئی موم بتی کی طرح آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بڑی مظلوم نظر آ رہی تھی۔ علی احمد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ میں تمہارے بھائی کی رہائی کے لیے پوری پوری کوشش کروں گا۔"

سلطانہ نے بھیگی ہوئی پلکوں سے علی احمد کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔
"آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا۔ مجھے ایک سہارا مل جائے گا۔ میرا کوئی نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

علی احمد اس کے رونے سے پریشان ہو گیا وہ بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر تک سلطانہ کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے سلطانہ کا سر آہستہ آہستہ تھپ تھپایا۔ "رو دمت

طشت ازبام ہونا: بھید کھل جانا۔ غمناک: افسردہ۔

رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چلو اٹھ کر منہ دھو لو۔ تم بہت دیر تک رو چکی ہو۔"

سلطانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر علی احمد کو دیکھا۔ وہ اس کے عین مقابل کھڑی تھی۔

پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب علی احمد نے بڑے جذباتی انداز سے سوچا۔ سلطانہ واقعی خوبصورت ہے اور بہت مظلوم بھی ہے۔ اس نے گہری سانس بھری اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ سلطانہ کے شانے پر رکھ دیا۔

فصل پانزدہم

(۱)

سنسان رات میں دروازے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ سلمان ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ رخشندہ اور جعفری دروازے پر کھڑے تھے۔ جعفری فوراً واپس چلا گیا۔ سلمان سے اس کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ زینے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔ ذرا دیر بعد کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ جعفری جا چکا تھا۔

سلمان دروازہ بند کر کے لوٹا۔ سامنے صوفے پر اس کی بیوی تھکی ہوئی نیم دراز تھی۔ وہ چپ چاپ دوسرے کمرے میں گیا۔ مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ رخشندہ اسی طرح لیٹی تھی۔ اس کے بال بکھر کر ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک دھندلا گئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل پھیکا پڑ گیا تھا۔ سلمان نے اس کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور اس کے روبرو جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ رخشندہ نے اسے دیکھ کر بڑے ناز سے کہا۔ "افوہ! بھئی آج تو میں بہت تھک گئی۔"

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ روشنی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا، مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ کمرے میں اکتا دینے والی خاموشی چھائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رخشندہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ سلمان نے کہا "بیٹھ جاؤ!" اس کی آواز خلاف معمول بہت

اچٹتی: سرسری۔

بھاری لگ رہی تھی۔

وہ بے نیازی سے بولی۔ "کیوں؟"

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"صبح بات کر لیجئے گا۔ مجھے نیند معلوم ہو رہی ہے۔" وہ بدستور لاپرواہی سے بول رہی تھی۔ اس نے جماہی لینے کے لیے منہ کھولا اور ملحقہ کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ سلمان نے ٹوکا۔ "میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

وہ دھم سے صوفے پر گر پڑی اور تیزی سے بولی۔ "لیجئے بیٹھ گئی۔ کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

سلمان لمحہ بھر تک اس کا چہرہ تکتا رہا۔ پھر بڑے اطمینان سے بولا۔ "مجھے تمہاری یہ حرکتیں قطعی پسند نہیں۔ میں اب زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آپ کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر منوچہر کے پاس چلئے گا۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ چلئے چل کر بستر پر لیٹئے۔ دو خواب آور گولیاں کھا لیجئے اچھی نیند آ جائے گی۔ دراصل بات۔۔۔۔"

وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر سکی تھی کہ سلمان نے اسے جھڑک دیا۔ "رخشی! زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرو۔"

وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ "لیجئے اس میں اسمارٹ بننے کی کون سی بات ہے۔ آپ خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں سوچا کرتے ہیں۔"

وہ تیزی سے بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے الٹی سیدھی باتیں سوچنے کا موقع نہ دو۔ ورنہ۔۔۔" اس نے جھٹ اپنا دایاں ہاتھ نکال کر سامنے کر دیا۔ اور کمانی دار چاقو کڑکڑاتا ہوا کھل گیا۔ روشنی میں اس کا پھل اس طرح جھلملا رہا تھا کہ رخشندہ کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے سلمان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ چہرے پر اس قدر وحشت اور دیوانگی تھی کہ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر رخشندہ کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔ "یہ آج آپ کیا کر

تحکمانہ: حکم چلانے والا۔ بے ساختہ: بلا ارادہ۔

رہے ہیں؟"

"یہ اب تمہارے سوچنے کی بات ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا کرنے والا ہوں۔"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم جعفری سے ملنا جلنا بند کر دو۔"

"مگر یہ تو بہت بری بات ہو گی۔"

سلمان اونچی آواز سے بولا۔ "اگر تم کو اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا تو کچھ عرصے کے لیے اپنے میکے چلی جاؤ۔"

اس دفعہ رخشندہ نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا۔ سلمان کی بات سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ "میکے میں میرا اب کون بیٹھا ہے جس کے پاس چلی جاؤں۔" اس کا لہجہ اور تیکھا ہو گیا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"مگر بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی۔" سلمان اس روز دو ٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ کئی بار یہی بات پہلے اشاروں میں اور پھر نرمی سے کہہ چکا تھا۔

رخشندہ تلملا کر کھڑی ہو گئی۔ "جو آپ چاہتے ہیں وہی ہو گا۔" وہ مڑی اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سلمان ذرا دیر صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ بھی سونے کے لیے اپنے بستر پر چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

شام کو جعفری آیا۔ سلمان اس وقت گھر ہی میں تھا۔ البتہ اس کی بیوی جعفری کی آمد سے پہلے ہی برابر والے فلیٹ میں چلی گئی۔

جعفری سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بڑی بے تکلفی سے پکارنے لگا۔ "رخشی!" کوئی جواب نہ ملا۔

اس دفعہ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ "رخشی! جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔ ایسی خوبصورت شام کو صرف بوڑھے گھر پر رہتے ہیں یا بچوں کی آیائیں۔ مجھے اس وقت کمرے میں زیادہ دیر قید نہ رکھنا۔" وہ تیزی سے بولتا چلا گیا۔

خلاف توقع جب اسے رخشندہ کی آواز نہ سنائی دی تو وہ سامنے والے کمرے میں گھس گیا اور

زور زور سے بولنے لگا۔

"یہاں تو اندھیرا ہے۔ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔"

وہ رخشندہ کو تلاش کرتا رہا۔ پکارتا رہا۔ سلمان خاموش بیٹھا اس کی آواز سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جعفری واپس آیا۔

"سالومن! کیا تم بتا سکتے ہو رخشی اس وقت کہاں ہے؟"

سلمان نے آہستہ سے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

جعفری نے لمحہ بھر رک کر کہا۔ "تمہارے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہو سکتی ہے؟"

"میں جب واپس آیا تو وہ موجود نہیں تھی۔" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

"تو گویا تمہیں اس کے پروگرام کا کوئی پتہ نہیں۔ تم عجیب شوہر ہو یعنی تم کو یہ نہیں معلوم کہ تمہاری بیوی اس وقت کہاں ہو گی؟"

سلمان نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ دل ہی دل میں کہا۔ واقعی میں عجیب شوہر ہوں۔ عجیب نہ ہوتا تو جعفری، تم مجھ سے میری بیوی کے متعلق اس طرح بات نہ کرتے۔ مجھے اتنا الو کا پٹھا اور بے غیرت نہ سمجھتے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر تھپڑ رسید کرے اور دھکے دے کر باہر نکال دے۔ مگر یہ تھپڑ بہت مہنگا پڑتا۔ اس میں پانچ سو روپے ماہانہ کا نقصان تھا اور اتنا بڑا نقصان جھیلنے کے لیے وہ فی الحال آمادہ نہیں تھا۔

جعفری اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ آخر تھکا ہوا سا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑا بے چین نظر آ رہا تھا۔ اس کی بے چینی سے سلمان کو لطف آ رہا تھا۔ گھنٹہ بھر تک وہ اسی بے چینی کے عالم میں رخشندہ کا انتظار کرتا رہا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کے چہرے پر جو تازگی تھی، دھندلا گئی تھی۔ وہ مضمحل اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی عالم میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔

سلمان نے غور کیا کہ جاتے وقت وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ سلمان نے کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا۔ جعفری نے تیزی سے سڑک عبور کی۔ اپنی کار کے پاس پہنچا۔ اچھل کر اگلی نشست پر بیٹھا۔ اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا۔ زور سے کار کا دروازہ بند کیا اور تیز رفتار سے کار دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے

مضمحل: کمزور۔ آن کی آن میں: دیکھتے ہی دیکھتے۔

او جھل ہو گیا۔ یہ تمام حرکتیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ چوٹ کھا کے گیا ہے کم از کم ہفتہ بھر تک نہیں آئے گا۔

مگر سلمان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ نو بجے کے قریب وہ پھر موجود تھا۔ اس کا چہرہ ابھی تک پریشان تھا۔ وہ کمرے میں جس انداز سے داخل ہوا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوشی سے نہیں آیا تھا۔ وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر اس نے سلمان سے پوچھا۔

"رخشی واپس آ گئی؟"

"ہاں۔" سلمان نے مختصر جواب دیا۔

"تم نے پوچھا نہیں وہ کہاں گئی تھی؟"

"نہیں۔" سلمان نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

"کیوں؟" جعفری کے لہجے میں بے قراری نمایاں تھی۔

"وہ کچھ ناراض معلوم ہوتی ہے۔ میری ہمت نہ پڑی۔"

سلمان جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر پہلے اس نے رخشندہ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ذرا دیر ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ اور اب شاید کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔

جعفری نے سلمان کی بات سنی اور بڑی تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم نے اس سے کچھ نہیں پوچھا؟"

سلمان نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں۔"

جعفری نے کوئی بات نہیں کی۔ بے چینی سے اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔ پھر اٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا جس میں رخشندہ موجود تھی۔

وہ بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی۔ اس روشنی میں رخشندہ کا چہرہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جعفری جا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شکوہ کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں شام کو تم کہاں تھیں؟ میں نے تمہارا مکمل ایک گھنٹہ انتظار کیا۔ تم نے

غمازی: ظاہر، اشارہ۔

میری آج کی پوری شام خراب کر دی۔"

وہ خاموش رہی۔ اس نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

جعفری نے اس دفعہ نرمی سے کہا۔ "کیا بات ہے۔ تم کچھ اداس معلوم ہو رہی ہو۔"

وہ بیزاری سے بولی۔ "میرے سر میں درد ہے۔"

"اوہو تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ میں ڈاکٹر کو لے آؤں؟"

وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "جی نہیں شکریہ!" اس نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔ "جعفری صاحب! آپ آئندہ میرے کمرے میں اس طرح بغیر پوچھے نہ آیا کریں۔ یہ میرا بیڈ روم ہے ڈرائنگ روم نہیں ہے۔"

جعفری سناٹے میں آ گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "تم تو بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔"

وہ اسی طرح تیز لہجے میں بولی۔ "بہتر ہو گا کہ آپ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھیں۔"

اس دفعہ جعفری تلملا کر رہ گیا۔ رخشندہ کی یہ ساری باتیں اس کے لیے بالکل انوکھی تھیں۔ ان سے حقارت ٹپک رہی تھی۔ اس نے تیکھی نظروں سے رخشندہ کو دیکھا اور جھنجلایا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سلمان دروازے سے لگا چوروں کی طرح ان کی باتیں سن رہا تھا۔ جعفری کو آتے دیکھ کر وہ مڑا اور صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

جعفری کمرے میں آیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جعفری نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ سیدھا بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔

سلمان بھی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا تو سلمان نے نرمی سے کہا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا وہ بہت ناراض ہے۔"

جعفری نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

سلمان دفتر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد جعفری کا چپراسی اسے بلانے آیا۔ سلمان نے اس کے کمرے

تیوری پر بل ڈال کر: ناگواری سے۔ خشمگیں: غصے سے بھری ہوئی۔ سناٹے میں آنا: حیران ہو جانا۔

میں جا کر دیکھا۔ جعفری خاموش بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا۔ سلمان پر نظر پڑتے ہی اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ تیکھے لہجے میں بولا۔

"مسٹر سالومن! آپ کے خلاف بڑی سخت شکایت آئی ہے۔ آپ بالکل لاپرواہ ہوتے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر اس دفتر کو چھوڑنا پڑے تو آپ کو حیرت نہ ہونا چاہیے۔"

یہی سیدھی سیدھی دھمکی تھی۔ سلمان نے یہ دھمکی خاموشی سے سن لی۔ آئندہ پوری احتیاط برتنے کا وعدہ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اس دھمکی نے اسے پریشان کر دیا۔ تنخواہ سے اس نے اتنا بھی پس انداز نہیں کیا تھا کہ ایک مہینہ بھی بے روزگاری کا گزار سکے اور فوری ملازمت ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔

وہ پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ جعفری نے اسے پھر بلوایا۔ اس دفعہ اس نے کھل کر بات کی۔

"کیا تمہارا رخشی سے جھگڑا ہوا تھا؟"

"نہیں۔" سلمان نے صاف انکار کر دیا۔

"تم مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ضرور ایسی بات ہے۔"

سلمان نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "آپ یقین مانیئے ایسی کوئی بات نہیں۔"

"کیا تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟" جعفری کے دل کا چور بول اٹھا۔ وہ سلمان سے صاف صاف بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر سلمان نے اسے موقع نہ دیا۔ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "آپ سے مجھے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟"

"پھر رخشی کل اس قدر ناراض کیوں تھی؟"

"ناراض تو وہ مجھ سے بھی ہے۔ آج صبح اس نے میرے ساتھ ناشتا بھی نہیں کیا۔ آپ ہی اس سے پوچھئے۔ میری تو بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔" سلمان اس وقت بڑا معصوم اور سادہ لوح معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی اس سادہ لوحی پر جعفری مسکرا دیا۔

"میرا خیال ہے وہ ضرور تمہاری کسی بات سے ناراض ہے۔ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ تم اسے ابھی سمجھ نہیں سکے۔"

وہ دیر تک سرپرستانہ انداز میں باتیں کرتا رہا۔

شام کو وہ سلمان کے گھر پہنچا۔ رخشندہ اس وقت موجود تھی۔ سلمان بھی دفتر سے ذرا دیر پہلے واپس آیا تھا۔ وہ اور جعفری بیرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔ رخشندہ اس کمرے میں آئی۔ نہ تو اس نے جعفری سے بات کی نہ اس کی جانب دیکھا۔ چپ چاپ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ وہ اس وقت عام گھریلو لباس میں تھی جس سے یہ بات واضح تھی کہ وہ پڑوس کے کسی فلیٹ میں گئی ہے۔ کم از کم اس لباس میں وہ بازار نہیں جا سکتی تھی۔

جعفری دیر تک رخشندہ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ آخر شام گہری ہو گئی اور رات شہر میں اتر آئی تو جعفری چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

کئی روز تک یہی ہوتا رہا۔ جعفری آتا۔ رخشندہ یا تو گھر میں موجود ہی نہ ہوتی یا جعفری کے آتے ہی اٹھ کر پڑوس میں چلی جاتی اور جب تک وہ گھر میں رہتا واپس نہ آتی۔ کبھی آمنا سامنا ہوتا اور جعفری زبردستی بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بے رخی سے جواب دیتی۔ جعفری تلملا کر رہ جاتا۔

ان دنوں وہ سخت پریشان تھا۔ دفتر میں بھی کھویا کھویا نظر آتا۔ سلمان کے گھر آتا تو بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہتا۔ گھنٹوں صوفے سے گردن ٹکائے خلا میں گھورا کرتا۔ تھک جاتا تو کار لے کر کہیں چلا جاتا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد پھر واپس آ جاتا۔ اس کا تر و تازہ چہرہ چند ہی روز میں جھلس کر رہ گیا۔ آنکھوں کی چمک دمک بجھ گئی تھی۔ تیز لہجے میں جلدی جلدی بات کرنے کے بجائے وہ اب رک رک کر اور آہستہ آہستہ بات کرنے لگا تھا۔

رخشندہ بھی ان دنوں اجڑی اجڑی نظر آتی۔ اس نے لباس میں اہتمام برتنا چھوڑ دیا تھا۔ میک اپ کی طرف سے بھی لاپرواہ ہو گئی تھی۔ ہر وقت عام گھریلو لباس میں رہتی۔ کئی کئی روز کپڑے نہ بدلتی۔ بال بکھرے ہیں تو شام تک بکھرے رہتے۔ بہت ہوا تو لمبے لمبے بالوں کا بے تکا سا جوڑا باندھ لیا۔ اس کے حسن کی ساری سحر انگیزی اور دل کشی ماند پڑ گئی تھی۔ وہ بالکل معمولی لڑکی معلوم ہوتی۔ اور رخشندہ جو ہر شام قدم قدم پر اپنے حسن کا جادو جگاتی ہوئی گھر سے نکلتی تھی نہ جانے کہاں روپوش ہو گئی تھی۔ اس کی آواز میں جو لوچ اور نغمگی تھی وہ بھی نہ رہی۔ وہ اب چڑچڑی ہو گئی تھی۔ بات بات پر اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ وہ ہر وقت اکھڑی اکھڑی سی رہتی۔

سلمان چپ چاپ دونوں کی یہ حالت دیکھتا رہا۔ ان کی بے چینی سے، ان کی پریشانی سے اسے

اجڑی اجڑی: بیزار۔ سحر انگیزی: جادوگری، مراد خوبصورتی۔ ماند پڑنا: کم ہونا، مدھم ہونا۔ لوچ: نرمی۔ نغمگی: ترنم۔

تسکین ملتی۔ اس تسکین میں اس ذہنی اذیت کے انتقام کا جذبہ بھی شامل تھا جو جعفری اور رخشندہ سے اسے پہنچا تھا اور جس کی تکلیف سے وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔

لیکن اس کا جذبۂ انتقام جلد ہی آسودہ ہو گیا۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان دونوں کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ دونوں بے چین تھے۔ بے قرار تھے۔ خود اپنی آگ میں جل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے تھے مگر مل نہ سکتے تھے۔ اس سارے ڈرامے میں اس کا کردار بالکل ولن کا سا تھا اور جب وہ اس پر غور کرتا تو خود اپنی نظروں میں گر جاتا۔ اسے عجیب سی ذلت کا احساس ہوتا جو خود بڑا اذیت ناک تھا۔

کچھ یہی سوچ کر اس نے ایک روز رخشندہ سے کہا۔ "رخشی! تم کو جعفری کی اس طرح بے عزتی نہیں کرنا چاہیے۔ تم اس سے بات چیت تو کر لیا کرو۔"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ خود ہی تو ان سے ملنے جلنے پر منع کیا۔ اب خود ہی سفارش بھی کر رہے ہیں۔" اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"مگر میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اتنا سخت رویہ اختیار کر لو۔ یہ تو اس بے چارے کے ساتھ بڑی زیادتی ہو گی۔"

اس نے رخشندہ کو سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔

اس شام رخشندہ نے جعفری کے ساتھ چائے پی۔ بات چیت بھی کی۔ پھر تینوں پکچر دیکھنے چلے گئے۔ رخشندہ اور جعفری بہت خوش نظر آرہے تھے۔ رخشندہ نے اس روز ایک عرصے بعد نفاست سے میک اپ کیا تھا۔ بالوں کو ایک خاص انداز سے آراستہ کیا تھا۔ لباس سے بھی خوش ذوقی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر دل کش اور دل آرا نظر آرہی تھی۔ اس کے یہ دلکشی دیکھ کر سلمان کو بھی مسرت ہوئی۔ بہر حال وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ اسے چھو سکتا تھا۔ اسے چوم سکتا تھا۔ اس کی گداز بانہوں پر سر رکھ کر سو سکتا تھا۔

❂ ❂ ❂

رخشندہ اور جعفری شام ہوتے ہی سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتے۔ سلمان گھر میں بیٹھا کڑھتا رہتا۔ رخشندہ رات گئے جعفری کے ساتھ مسکراتی ہوئی آتی۔ اس کی مسکراہٹ سلمان کے ذہن

آسودہ ہونا: مراد ٹھنڈا / ختم ہونا۔ خوش ذوقی: نفاست، سلیقہ۔ گداز: نرم۔

میں زہر بن کر سرایت کر جاتی۔

وہ اس درد سے، اس کرب سے بلبلا اٹھتا۔ آخر اس اذیت سے بچنے کا اس نے یہ طریقہ نکالا کہ اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ صبح دفتر کے لیے گھر سے نکلتا اور آدھی رات کے بعد واپس آتا۔

ایک شام وہ اپنے دفتر کے ایک ساتھی کے ساتھ فلم دیکھنے گیا۔ گیارہ بجے دونوں سینما ہاؤس سے نکلے تو پینے پلانے کا پروگرام بن گیا۔ کچھ عرصے سے اس نے شغل مے نوشی بھی شروع کر دیا تھا۔ اس روز اس کے ہمراہ عنایت تھا۔ اسے تنخواہ معقول ملتی تھی اور ابھی تک کنوارہ تھا۔ بڑی بے فکری سے خرچ کرتا تھا۔ اس کی تحریک پر دونوں شہر کے ایک مشہور ہوٹل میں شراب پینے چلے گئے۔

ہوٹل کا بار خاصا وسیع تھا۔ مگر روشنی بہت کم تھی۔ بار میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ زیادہ تر غیر ملکی نظر آرہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ وہ دھیمی دھیمی روشنی میں شغل بادہ نوشی کر رہے تھے۔ بے تکلفی سے ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ تازگی اور حرارت حاصل کر رہے تھے۔ فضا میں رنگ و بو کی فراوانی تھی۔ یہ جاڑوں کی سرد رات تھی۔ کوئٹہ کی برف پوش وادیوں سے آنے والی خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ لوگ موٹے موٹے اونی لباسوں میں ملبوس تھے۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

دونوں ایک ٹیبل کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

عنایت نے آرڈر دیا۔ ویٹر گلاسوں میں اسکاچ وہسکی لے آیا۔ دونوں آہستہ آہستہ وہسکی کی چسکی لگانے لگے۔ عنایت خاصا باتونی نوجوان تھا۔ وہ اپنا تازہ معاشقہ سنانے لگا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ بڑا اونچا فلرٹ ہے۔ سلمان اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی مضحکہ خیز حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک ایک گوشے میں اس کی نظر گئی۔ وہ دم بخود رہ گیا۔

سامنے جعفری اور رخشندہ بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ اور تنومند آدمی بھی تھا۔ وضع قطع سے غیر ملکی نظر آتا تھا۔ وہ چھچھوری حرکتیں کر رہا تھا۔ اور منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہا تھا۔ غالباً بہت زیادہ پی گیا تھا۔ سلمان نے دیکھا۔ رخشندہ نے جام اٹھایا اور اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ ہاں! وہ

بلبلانا: بے قرار ہونا۔ شغل مے نوشی: شراب پینا۔ فراوانی: کثرت، زیادتی۔ جاڑے: سردی کا موسم۔

شیمپین پی رہی تھی۔ سلمان کا سارا جسم لرز کر رہ گیا۔

وہ اپنی آنکھوں سے رخشندہ کو مے نوشی کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ رک رک کر آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت اور ہر ہر انداز کو وہ بغور دیکھ رہا تھا۔ عنایت نے ایک بار اسے ٹوکا بھی۔

"کہاں کھو گئے تم؟ یہ پیگ تو ختم کرو۔"

سلمان نے خاموشی سے اپنا گلاس اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں غٹاغٹ خالی کر دیا۔ یہ تیسرا پیگ تھا۔ ایک چھوٹا اس نے اور منگوایا۔ اور بظاہر عنایت کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ مگر اس کی پوری توجہ اس گوشے کی جانب تھی جہاں وہ تینوں بیٹھے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد تینوں اٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ رخشندہ کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ تنومند غیر ملکی نے اپنا بازو آگے کر دیا اور رخشندہ اس کے بازو میں جھولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دونوں آگے آگے تھے۔ جعفری ان سے دو قدم پیچھے ہٹ کر چل رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کئی پیکٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اپنی جھکی ہوئی گردن اور چال ڈھال سے بالکل چڑ قناتیا معلوم ہو رہا تھا۔

سلمان خود کو ان کی نظروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور دزدیدہ نگاہوں سے تینوں کو دیکھ بھی رہا تھا۔ عین اس وقت عنایت کی آواز ابھری۔

"اوہو ہو ہو! تم جعفری کو دیکھ رہے ہو۔ یار وہ آج کل اپنے پروموشن کے چکر میں لگا ہے۔"

سلمان نے حیرت سے عنایت کو دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

عنایت جھوم کر بولا۔ "یار بڑی زوردار لونڈیا ایم۔ ڈی کو پیش کی ہے۔ دیکھو تو کیسا چمٹائے ہوئے چل رہا ہے۔ رات تو اس سالے کی گزرے گی۔ ہائے! کیا غضب کا دانا ہے۔"

اس نے رخشندہ کے گداز جسم کے بارے میں ایسی گندی بات کہی کہ سلمان تڑپ کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے عنایت نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا یہی کمپنی کا وہ مینجنگ ڈائریکٹر ہے جو پچھلے ہفتے نیویارک سے آیا ہے؟"

"مسٹر برائٹ کو کیا تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تین سال قبل انہی دنوں دورے پر آیا تھا۔ مگر اس وقت تک تم کمپنی میں ملازم نہیں ہوئے تھے۔ ظالم اس عمر میں بھی بڑا رنگین مزاج ہے۔

چڑ قناتیا: خوشامدی، کمینہ۔ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا: کنکھیوں سے دیکھنا۔ رنگین مزاج: عیاش، عیش پسند۔

جعفری کا پروموشن تو سمجھو پکا ہو گیا۔"

سلمان کو یقین نہ آیا۔ "نہیں پارٹنر! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"شرط بدلو۔ اسی ہفتے تم سن لینا کہ جعفری کو پروموشن مل گیا۔ اتنی بڑی رشوت پر تو سلطنت مل سکتی تھی۔ تم پروموشن کی بات کر رہے ہو۔ استاد ترقی کرنا چاہتے ہو تو یہ ٹیکنک سیکھ لو۔ سب سے آسان نسخہ ہے۔" عنایت نے قہقہہ لگایا۔ "ہندوستانی رجواڑوں اور دیسی ریاستوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں دوشیزائیں ایک زمانے میں سچے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ اگر کوئی نوجوان لڑکی صبح ہی صبح اپنے بھائی سے یہ کہہ دیتی تھی کہ رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ فوج میں کیپٹن بن گیا ہے تو وہ اسی روز کیپٹن بن جاتا تھا۔ سرکاری ہرکارہ خود آرڈر لے کر گھر آتا تھا۔ کیا سمجھے؟" وہ بے تکلفی سے ہنستا رہا۔ "یار والیان ریاست کی بھی کیا بات تھی۔ سب ہی سالے اپنے وقت کے راجہ اندر تھے۔"

وہ نشے کی دھن میں بولتا جا رہا تھا اور سلمان کو اس کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ عنایت کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتا تھا مگر سلمان نے زیادہ اصرار کیا تو وہ بھی چلنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ واپس جاتے ہوئے سلمان نے دیکھا، جعفری اکیلا بیٹھا شغل بادہ نوشی کر رہا تھا۔ سلمان کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ اس نے سوچا۔ کیا عنایت سچ کہہ رہا ہے؟ جعفری، رخشندہ کو برائٹ کے سپرد کر کے چلا آیا؟ مگر اسے یقین نہ آیا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ رخشندہ گھر پر ہو گی۔

مگر جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو رخشندہ وہاں نہیں تھی۔

سلمان بہت دیر تک جاگتا رہا۔ بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر تھک کر سو گیا۔ صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو رخشندہ بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ نہ جانے وہ رات کو کس وقت لوٹی تھی۔ خادمہ نے دروازہ کھولا تھا اور اسی کی زبانی سلمان کو معلوم ہوا کہ رخشندہ جس وقت آئی تھی پڑوس کی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

سلمان نے اپنا شکاری چاقو نکالا۔ اسے کھولا۔ چاقو کمانی زور سے کڑکڑاتی ہوئی چیخی۔ اب تنہائی میں وہ اکثر چاقو کھولتا۔ اس کی کمانی چیختی۔ سلمان اس کی دھار پر انگوٹھا پھیر کر تیزی اور جلا کا

شرط بدلنا: شرط لگانا۔ ہرکارہ: ملازم، ڈاکیہ۔ جلا: چمک، روشنی۔

اندازہ لگاتا۔

اول شب کو رخشندہ جب جعفری کے ساتھ گھر سے باہر چلی جاتی تو سلمان کمرہ بند کرتا۔ چاقو کھولتا اور الماری کے پیچھے سے ڈمی نکال کر بلندی پر رکھ دیتا۔ یہ ڈمی اس نے موٹے اونی کپڑے کے ایک بڑے تھیلے میں روئی بھر کر تیار کی تھی۔ وہ ہونٹوں کو زور سے بھینچ کر ڈمی پر چاقو سے وار پر وار کرتا۔ پھر تھک کر بیٹھ جاتا اور دیر تک ہانپتا رہتا۔ کبھی یہ ڈمی جعفری کا روپ اختیار کر لیتی کبھی رخشندہ بن جاتی۔

سرما کی ٹھٹھرتی سنسان راتوں میں اس نے اپنے ذہن میں نہ جانے کتنی بار جعفری اور رخشندہ کو قتل کیا تھا۔ ان کے خون میں ڈوبے ہوئے جسموں کو پھڑکتے ہوئے دیکھا تھا اور خوف سے بدن میں جھرجھری محسوس کی تھی۔

دونوں کو قتل کرنے کا ہر رات وہ نیا منصوبہ تیار کرتا مگر دوسرے روز اس منصوبے میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آتی۔

ابھی اس کا منصوبہ تیار نہیں ہوا تھا کہ ایک شام جعفری حسب معمول مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت رخشندہ اور سلمان بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جعفری بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ دونوں کے قریب پہنچ کر وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اور بڑے کھلنڈرے انداز میں بولا۔

"آپ دونوں چاہیں تو مجھ سے بڑی شاندار پارٹی لے سکتے ہیں۔ آج اور ابھی۔"

رخشندہ نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "آج تو بڑے جوویل موڈ میں نظر آ رہے ہیں۔ بات کیا ہے؟"

"پہلے تم مجھے ایک گرماگرم مبارک باد دو۔"

رخشندہ بولی۔ "کوئی بہت اونچی خوشخبری معلوم ہوتی ہے جو اس طرح پیشگی مبارک باد کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔" اس کا انداز گفتگو صاف چغلی کھا رہا تھا کہ اسے اس خوش خبری کا پہلے ہی علم تھا۔

وہ گردن کو خم دے کر ایکٹروں کی طرح لمحہ بھر تک اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے سینہ پر ہاتھ رکھا اور کسی قدر گردن جھکا کر کہا۔ "آپ کا یہ خاکسار کمپنی کا برانچ منیجر مقرر ہو گیا ہے۔ دو ہزار تنخواہ ملے گی۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے ٹھاٹھ ہوں گے۔ کیوں ہے نا بہت بڑی خوش خبری؟"

کھلنڈرے انداز میں: لاپروائی سے۔ چغلی کھانا: ظاہر کرنا۔

سلمان کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر تھوک دے۔ سالا بھڑوا! کس ڈھٹائی سے اپنا کارنامہ بیان کر رہا ہے۔ کم از کم رخشندہ کے سامنے تو اسے اپنی اس ترقی کا اس طرح اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ اس عہدے کی بلندی پر پہنچنے کا زینہ تو وہی بنی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے سلمان کو اچانک اپنا خیال آ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ جعفری سے بڑا بھڑوا ہے جس کی بیوی رات رات بھر دوسروں کے پہلو گرم کرتی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ کتنی ذلت کی بات ہے۔ اسے ڈوب مرنا چاہیے۔ نفرت، حقارت، غم و غصے کے ملے جلے احساسات نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔

رخشندہ اور جعفری اٹھ کر باہر چلے گئے۔ رخشندہ نے لباس میں خاص اہتمام کیا تھا۔ میک اپ پر بھی خاصی توجہ صرف کی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی حسین اور طرحدار نظر آ رہی تھی۔ جعفری نے اپنی ترقی کی خوشی میں کچھ دوستوں کو رات کے کھانے پر بوٹ کلب میں بلایا تھا جس کا وہ باقاعدہ ممبر تھا۔ ہر چند کہ مہمانوں کی فہرست میں سلمان کا نام شامل نہ تھا۔ مگر اس نے تکلفاً سلمان کو بھی مدعو کیا اور اس نے حسب معمول ان کے ہمراہ جانے سے گریز کیا۔ سر درد کا بہانا تراش کر گھر ہی پر ٹھہر گیا۔

دونوں کے جانے کے بعد وہ خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر انتہائی جھنجلاہٹ کے عالم میں اس نے طے کیا کہ دونوں کو جس قدر جلد ہو سکے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اپنی تذلیل کا وہ اس طرح بدلہ لے سکتا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایک دوسرے خیال نے ذہن میں سر ابھارا جو بالکل مختلف تھا۔ اس نے سوچا ان دونوں کے لیے وہ کیوں اپنی زندگی داؤ پر لگانا چاہتا ہے؟ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی جنگلی سور کا شکار کرتے ہوئے مارا جائے۔

اس وقت اس نے ایک نیا منصوبہ بنایا اور اس کا آغاز دوسرے دن دفتر میں اس وقت ہوا جب اس نے جعفری کے سامنے اپنا استعفیٰ ڈال دیا۔ جعفری ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تم ملازمت چھوڑ رہے ہو۔ تم کو ہو کیا گیا؟" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں نے تو تمہارے پروموشن کی سفارش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کو جلد ہی پروموشن مل جائے گی۔"

"شکریہ مجھے نہ اب اس ملازمت سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ پروموشن سے۔" سلمان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ابھی میں ایک استعفیٰ اور دینا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔"

لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش رہا۔ اس نے جعفری کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا

فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہر وغیرہ طلب نہ کرے۔"

"تم نے اس کے بارے میں رخشندہ سے گفتگو کی؟ میرے خیال میں تمہیں پہلے اس سے بات کرنی چاہیے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ میری جانب سے یہ تمام باتیں آپ طے کر لیں؟"

جعفری ذرا دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سلمان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "میرا مشورہ ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ رخشندہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اسے چھوڑتے ہوئے تمہیں دکھ نہیں ہوگا؟"

سلمان نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "آج آپ رخشندہ سے اس سلسلے میں بات کریں گے؟"

جعفری کو اس معاملے میں سلمان سے قطعی ہمدردی نہیں تھی۔ مگر وہ خواہ مخواہ ہمدرد بننے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں رخشندہ سے بات تو کر لوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

سلمان نے جل کر کہا۔ "جعفری صاحب آپ کیوں مجھے خواہ مخواہ مشورہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دو ہزار روپے تنخواہ پانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی سمجھ بھی مجھ سے چار گنا قیمتی ہے۔"

جعفری ناراض ہونے کے بجائے نرم پڑ گیا۔ اس نے سوچا اس وقت سلمان کا پارا چڑھا ہوا ہے۔ مزید کچھ کہا تو وہ برس پڑے گا۔ آہستہ سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں رخشندہ سے آج ہی بات کروں گا۔"

سلمان خاموشی سے چلا گیا۔

اس نے دفتر میں بھی بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ شام تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو جعفری موجود تھا۔ رخشندہ بھی قریب ہی بیٹھی تھی۔ سلمان نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ ایک صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ رخشندہ کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ کسی قدر

حق مہر: وہ رقم جو نکاح کے وقت مرد اپنی بیوی کو دینے کا عہد کرتا ہے۔ توقف: وقفہ۔ پارا چڑھنا: غصہ آنا۔

پریشان نظر آ رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔

تینوں چپ بیٹھے تھے اور اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔ دسمبر کی یہ سرد شام بڑی اداس تھی۔ کمرے کے کرب ناک سکوت سے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہاں کوئی مر گیا ہے اور وہ تینوں لاش کے سرہانے بیٹھے سوگ منا رہے ہیں۔

بہت دیر بعد جعفری کی آواز ابھری۔ "میں نے تمہارے آنے سے ذرا دیر پہلے رخشندہ سے بات کی تھی۔ اسے تمہارے فیصلے سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں کہ تم بہت غلط قدم اٹھا رہے ہو۔"

جعفری کی بات سن کر رخشندہ کی گردن جھک گئی۔ اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ منڈلانے لگا۔ لیکن سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ چاقو نکالا اور فوراً واپس آ گیا۔ اور ان دونوں کے درمیان ٹانگیں پھیلا کر اس طرح سینہ تان کر کھڑا ہو گیا کہ وہ اس کے سامنے بہت حقیر معلوم ہونے لگے۔

سلمان نے قہر آلود نظروں سے جعفری کو دیکھا۔ "ہاں تو مسٹر جعفری! تم کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے ایک جھٹکے سے چاقو کھولا۔ اس کی کمانی کڑکڑاتی ہوئی زور سے چیخی۔ جعفری اور رخشندہ کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ دونوں سہمی ہوئی نظروں سے سلمان کو دیکھنے لگے۔ سلمان نے اونچی آواز سے کہا۔

"میرے فیصلے سے اس عورت کو دکھ ہوا ہے۔ یہ عورت جو اتفاق سے میری بیوی ہے اور جسے بیوی کہتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔" لمحہ بھر کے لیے وہ رکا اور تیکھے لہجے میں بولنے لگا۔ "میرا پہلا فیصلہ یہ تھا کہ تم دونوں کے سینے میں یہ چاقو پیوست کر دوں۔ مجھے اسی طرح تسکین مل سکتی تھی۔ تم دونوں نے مل کر میرے سکون کو میری خوشیوں کو لوٹا ہے۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی۔ تم نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں اب بالکل قلاش ہوں۔ ایک ہارا ہوا جواری۔ تم

کرب ناک: تکلیف دہ۔ قلاش: غریب، کنگال۔

دونوں نے مجھے پاگل بنادیا۔ مجھے کتے سے زیادہ ذلیل کر دیا۔"

سلمان کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

جعفری اور رخشندہ سراسیمگی کے عالم میں دم بخود بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہروں پر دہشت چھائی تھی۔ سلمان نے تامل کے بعد کہا۔ "ڈرو مت۔ میں تم کو قتل نہیں کروں گا۔ میری زندگی اتنی ناکارہ نہیں ہے کہ تم دونوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر پھانسی کے پھندے پر لٹک جاؤں۔ میرے لیے یہ کوڑھی ہو کر مرنے سے زیادہ گھناؤنی موت ہوگی۔" ذرا دیر کے لیے وہ رکا۔ "جعفری! تم رنڈی کے بھڑوے ہو، میں بھی بھڑوا ہوں اور یہ سامنے وہ رنڈی بیٹھی ہے۔"

اس نے رخشندہ کی جانب انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ "مگر اب میں اس رنڈی کا بھڑوا بننا نہیں چاہتا۔ تم اپنی یہ امانت اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ورنہ سچ کہتا ہوں مجھے وہ ذلیل موت اختیار کرنا پڑے گی جو میں کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتا۔ بولو کیا کہتے ہو؟ میرے سر پر اس وقت خون کھیل رہا ہے۔ میں ساری باتیں ابھی اور اسی وقت طے کرنا چاہتا ہوں۔"

جعفری نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے تمہاری تجویز منظور ہے۔ میں رخشندہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔

سلمان نے خود اپنے ہاتھوں سے رخشندہ کا سارا سامان اٹھا اٹھا کر جعفری کی کار میں بھرا۔ خادمہ کو بھی رخشندہ کے ساتھ رخصت کیا۔ اور جب وہ چلے گئے تو نڈھال ہو کر دھم سے صوفے پر گر پڑا۔ وہ دیر تک لمبی لمبی سانسیں بھرتا رہا۔

❀ ❀ ❀

سلمان اور رخشندہ نے عدالت میں علاقہ مجسٹریٹ کے روبرو طلاق نامے پر دستخط کر دیے۔ رخشندہ نے مہر معاف کر دیا تھا۔ جعفری گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا۔ دوسرا گواہ ان کا وکیل تھا جس نے طلاق نامے کی دستاویزات تیار کی تھیں۔

عدالت سے باہر نکلتے وقت رخشندہ رو رہی تھی۔

جعفری اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلمان نے دونوں کو دیکھا اور تیزی سے ان کے

سراسیمگی: ڈر، خوف۔ رنڈی کا بھڑوا: رنڈی کا سودا کروانے والے۔

قریب سے گزر گیا۔

سلمان شام تک کمرے میں مردے کی طرح خاموش پڑا رہا۔ اس روز نہ اس نے کھانا کھایا اور نہ سہ پہر کی چائے پی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا اس کا اسے بھی دکھ تھا۔

رخشندہ کے ساتھ اس نے اس گھر میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ ہر چیز سے اس کی یاد وابستہ تھی۔ در و دیوار سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ ہر طرف اس کا سایہ منڈلا رہا تھا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب ایک رات رخشندہ دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ حجلہ عروسی میں شرابیوں کی طرح جھومتا ہوا داخل ہوا تھا۔ سامنے پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسہری پر وہ سرخ لباس میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس کا جسم خوش رنگ پھولوں کی مانند مہک رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ پھر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے رخشندہ کا مہندی سے رچا ہوا گورا گورا نازک ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ "ہاتھ تو بہت خوبصورت ہے۔" وہ سمٹ کر دوہری ہو گئی تھی۔ سلمان نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا تھا۔ "میری شہزادی!" وہ شرم سے سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ "بولو میری شہزادی!" اس نے بڑے پیار سے اصرار کیا تھا۔ "جی۔" بڑا مختصر جواب ملا تھا۔ اور اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر دلہن کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ دلہن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا سلمان نے اس کا کنول کی طرح دل آویز چہرہ دیکھ کر دل میں کہا تھا۔ یہ تو بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اور پھر اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ مل جل کر اس نے خوبصورت زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ پر سکون دنیا بسانے کا تہیہ کیا تھا۔ اور آج وہ خوبصورت خواب بکھر گئے تھے۔ پر سکون دنیا جہنم بن کر اجڑ گئی تھی۔

سلمان کو ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ ان کو یاد کرتے کرتے وہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

جب رونے سے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہو گیا تو اس نے سوچا اب کیا کرنا چاہیے۔ اچانک اسے علی احمد یاد آ گیا۔ پھر فلک پیما اور اس کے اسکائی لارک یاد آ گئے۔ اب علی احمد ہی اسے سہارا دے سکتا تھا اور فلک پیما کے ساتھ ہی اس کی اجڑی ہوئی بے رونق زندگی میں حرارت اور نمو پیدا ہو سکتی تھی۔

اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کیے اور گھر سے باہر چلا گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا۔ رات کے شو میں فلم دیکھی اور واپس آ کر اطمینان سے سو گیا۔

چند ہی روز میں اس نے گھر کا سارا سامان فروخت کر دیا۔ دفتر سے تنخواہ لی۔ فلیٹ اس نے

حجلہ عروسی: دلہن کا چھپر کھٹ۔

ساڑھے چار ہزار روپے لے کر پگڑی پر دے دیا۔

دسمبر کی ایک سرد رات کو وہ ایک سوٹ کیس اور بستر لے کر سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچ گیا۔

(۲)

گمٹی کی گنجان آبادی کے چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں کے درمیان فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر کی سفید دیواروں والی عمارت منارۂ روشن کی مانند سر اونچا کئے کھڑی تھی۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ جاڑوں کی ہلکی ہلکی بسنتی دھوپ در و بام پر پھیلی تھی۔ گلی کوچوں میں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے، شور مچا رہے تھے، عورتیں اونچی آوازوں سے بول رہی تھیں۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔

سلمان صدر دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ہیڈ کوارٹر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ کوئی اسکائی لارک نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ادھر ادھر جھانکتا ہوا لائبریری کی طرف مڑ گیا۔ قریب پہنچا مگر جھجک کر دروازے پر رک گیا۔

لائبریری کی لمبی میز پر ایک عورت جھکی ہوئی نہایت انہماک سے اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا۔ پیٹھ سلمان کی جانب تھی۔

عورت نے دروازے پر چاپ سن کر گردن موڑی۔

سلمان ششدر رہ گیا۔ وہ سلطانہ تھی۔ لمحہ بھر تک وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے تعجب سے کہا۔

"سلطانہ؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "جی!"

سلطانہ بھی حیرت زدہ نظر آرہی تھی۔ اس نے سوچا سلمان یہاں کیسے آگیا اور یہی بات وہ سلطانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"تم یہاں کس طرح آئیں؟" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

ننگ دھڑنگ: بالکل بے لباس۔ چہل پہل اور گہما گہمی: رونق۔

سلطانہ نے جواب دیا۔ "میں یہیں رہتی ہوں۔"

"یعنی تم ہیڈ کوارٹر میں رہتی ہو؟"

"جی ہاں پچھلے ہی مہینے مجھے رکنیت ملی ہے۔"

سلمان نے غور کیا کہ سلطانہ کے چہرے پر ابھی تک وہی مانوس معصومیت تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کئے شرما شرما کر بول رہی تھی۔ وہی سادگی، وہی بڑی بڑی روشن آنکھوں پر جھکی ہوئی گھنی پلکوں کے سائے، وہی گردن کا ہلکا سا خم۔ سلطانہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہ ابھی تک ویسی ہی خوبصورت اور دل آویز تھی۔

وہ زندگی کا ایک طویل سفر طے کر کے واپس آیا تھا۔ راستہ ناہموار تھا۔ اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی تھیں، دکھ جھیلے تھے۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اسے خوشی ہوئی کہ سلطانہ اس طرح اچانک مل گئی۔ وہ بھی اس قدر قریب کہ دونوں ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کے دوش بدوش چل سکتے تھے۔ اب تو سلطانہ اس کی راہ میں حائل بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں کی ایک ہی راہ تھی، ایک ہی مقصد تھا اور ایک ہی منزل تھی۔

یہ سوچتے سوچتے معاً نیاز یاد آگیا۔ اور اس کا خیال آتے ہی سلمان کو ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی کوئی اس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سلطانہ سے پوچھا۔

"نیاز کہاں ہے؟"

سلطانہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ "کئی مہینے ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔"

سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ عین اسی وقت علی احمد لائبریری میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ سرخ سرخ گالوں والا ایک تندرست بچہ تھا۔ یہ ایاز تھا۔ علی احمد نے حیرت سے سلمان کو دیکھا اور خوشی سے چیخ پڑا۔

"سلمان تم آگئے؟"

دونوں بانہیں پھیلا کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ علی احمد اس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولا۔

"مجھے یقین تھا سلمان ایک روز تم ضرور واپس آؤ گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آگئے۔ مجھے بہت

دوش بدوش: کندھے سے کندھا ملا کر، متحد ہو کر۔

خوشی ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔"

سلمان معذرت کرنے لگا۔ "طرح طرح کی پریشانیوں میں ایسا گھرا رہا کہ آپ کو خط بھی نہ لکھ سکا۔ فرصت سے بتاؤں گا مجھ پر اس عرصے میں کیا کیا بیت گئی؟"

علی احمد نے زور سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ مسکرا کر بولا۔ "تم زندگی کی اس چمک دمک پر ریجھ گئے جو دور سے بہت خوبصورت اور بڑی دلکش نظر آتی ہے۔ مگر سونے کا یہ جگمگ جگمگ کرتا پہاڑ صرف دیکھنے کے لیے ہے۔ جتنا اس کے قریب جانے کی کوشش کرو اتنا ہی دور ہٹتا جاتا ہے۔ یہ عجیب گورکھ دھندا ہے۔ ایک تار سلجھاؤ دس الجھتے ہیں۔ ساری عمر تانا بانا ہی سلجھاتے گزار دو۔ سرا کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔"

علی احمد پر فلسفیانہ موڈ طاری تھا۔ وہ ابھی نہ جانے کتنی دیر زندگی کے اسرار و رموز پر گفتگو کرتا۔ اسی اثنا میں ننھا ایاز اس کے کرتے کا دامن پکڑ کر زور زور سے رونے لگا۔

علی احمد نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اس کے رخساروں کا بوسہ لیا۔ ہنس کر بولا۔ "سلمان! یہ سب سے چھوٹا اسکائی لارک، ایاز ہے۔"

سلمان نے بچے کے گول مٹول سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ "کس کا بچہ ہے؟"

علی احمد نے مسکرا کر کہا۔ "فی الحال تو یہ میرا ہی بچہ ہے۔" مگر بچے کو شاید اس کی بات ناگوار گزری۔ وہ منہ پھاڑ کر رونے لگا۔ پیچھے سے سلطانہ کی آواز آئی۔

"لائیے اسے مجھے دے دیجئے۔"

علی احمد نے گھوم کر سلطانہ کو دیکھا اور سلمان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "سلطانہ! تم ان سے نہیں ملیں۔ یہ فلک پیما کے بہت سینئر اسکائی لارک ہیں سلمان۔"

سلطانہ نے نظریں اٹھائیں۔

سلمان نے دیکھا۔ وہی جھلکتی ہوئی شفاف آنکھیں، وہی سینے میں اتر جانے والی نظریں، وہی گھبرایا گھبرایا سا معصوم چہرہ۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ سلطانہ! میں مر کر بھی تم کو نہیں بھول سکتا۔ یہ آنکھیں، یہ عارض، یہ لب۔ سلمان لمحہ بھر کے لیے بالکل بھول گیا کہ سلطانہ اور اس کے علاوہ وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔

ریجھنا: مائل ہونا، عاشق ہونا۔ گورکھ دھندہ: الجھاؤ۔ اسرار و رموز: راز، پوشیدہ باتیں۔

یہ علی احمد تھا۔ اس نے کھنکار کر سلمان کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "سلمان! یہ سلطانہ ہے، میری بیوی۔"

اڑاڑا دھم! در و دیوار تک لرز اٹھے۔ سلمان لڑکھڑا کر رہ گیا۔ پل بھر کے لیے اس کے دل کی حرکت رک گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے علی احمد کو دیکھا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ علی احمد کسی قدر شرما کر بولا۔

"ہاں بھئی میں نے شادی کر لی۔"

یہ کہتے کہتے علی احمد کی نظریں جھک گئیں۔ اس کی کشادہ پیشانی دمک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرانے لگی تھی۔

ہمیشہ سنجیدہ رہنے والا علی احمد بہت معصوم اور بھولا بھالا نظر آ رہا تھا۔

سلمان پر لمحے بھر تک سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ پھر اس نے چونک کر کہا۔ "مبارک ہو۔" اس سے زیادہ وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ اس کی آواز میں دبی دبی تھرتھراہٹ تھی۔

علی احمد نے کہا۔ "تم سفر سے تھکے ہارے آ رہے ہو۔ کسی کمرے میں جا کر آرام کرو۔ رات کو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ اس وقت مجھے ایک مقدمے کے سلسلے میں کورٹ جانا ہے۔"

سلمان نے پوچھا۔ "کیا اس رات کے ہنگامے والا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے؟"

"نہیں، وہ تو کب کا ختم ہو گیا۔ اس مقدمے میں جان ہی کب تھی۔ وہ تو دھاندلی سے الیکشن جیتنے کے لیے اسکائی لارکوں کے خلاف پولیس نے بنایا تھا۔ یہ دوسرا ہی مقدمہ ہے۔"

علی احمد نے سلطانہ کو مخاطب کیا۔ "سلطانہ! تم بھی کورٹ چلو گی؟"

"جی ہاں۔ میں تو بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

علی احمد معذرت کرنے لگا۔ "بھئی معاف کرنا سلطانہ مجھے دیر ہو گئی۔"

سلطانہ بولی۔ "آپ تھکے ہوئے ہیں۔ ذرا آرام تو کر لیجئے۔ کہئے تو چائے بنا دوں۔" اس نے ذرا توقف کیا۔ "مگر آپ زیادہ چائے پینا بند کر دیں۔ بہت چائے پینے لگے ہیں۔"

علی احمد مسکرا کر بولا۔ "اچھا بھئی اب چائے کم پیا کروں گا۔ تمہارا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

دونوں بڑے گھریلو انداز سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے لب و لہجے میں ایک دوسرے کے لیے خلوص تھا، پیار تھا، اپنائیت تھی۔

سلمان سے یہ سب دیکھا نہ گیا۔ ان کی ایک ایک بات اسے ناگن کی طرح ڈس رہی تھی۔ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا عذاب ہو گیا۔

"میں آپ سے شام کو ملوں گا۔"

علی احمد بولا۔ "تم اسکائی لارک افضل کے کمرے میں ٹھہر جاؤ۔ اس کا کمرہ سب سے آخر میں ہے۔"

سلمان نے خاموشی سے اپنا بستر بند اور سوٹ کیس اٹھایا اور باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب بڑھا۔

"سلمان میں تمہاری کچھ مدد کروں؟"

"جی نہیں شکریہ! ان دونوں کا وزن زیادہ نہیں ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

افضل کے کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا بستر بند کھولا اور سگریٹ سلگا کر تھکا ہوا سا لیٹ گیا اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ ذہن پر برف کی تہیں جمتی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار سوچتا یہ کیا ہو گیا؟ اسی سلطانہ کے باعث ایک بار اس نے فلک پیا چھوڑا تھا اور گھر جا کر طرح طرح کے جھمیلوں میں پھنس گیا تھا۔ کیا وہ پھر اس کے لیے فلک پیا چھوڑ دے؟ یہاں رہ کر وہ اسے علی احمد سے اس طرح ہنستے بولتے، پیار اور محبت سے ملتے جلتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اس کے لیے مستقل آزار بن جائے گا۔

انتہائی بے بسی کے عالم میں سلمان نے سوچا۔ خدایا! وہ اب کیا کرے۔ زندگی ہے کہ اس سے روٹھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ حالات ہیں کہ بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ جینے کی ہر آس ہر امید اسے ٹھکرا کر آگے نکل جاتی ہے۔ وہ یہاں آیا تھا کہ زندگی کے دکھ بھرے سفر میں علی احمد اس کی رہنمائی کرے گا۔ اسے سہارا دے گا۔ مگر علی احمد نے ملتے ہی سینے میں خنجر اتار دیا۔ کیا وہ یہاں سے چلا جائے؟

ابھی اس کے پاس پانچ ہزار روپے موجود تھے جس سے وہ سال بھر تک گزارہ کر سکتا تھا۔ اور اس عرصے میں کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کر لینا ایسا مشکل نہیں تھا۔ پھر وہی ملازمت۔ وہی گھر اور اس گھر کو آباد کرنے کے لیے ایک عدد بیوی کی ضرورت۔ پھر وہی پرانا چکر۔ وہی شب و روز اور ان شب و روز کو خوشگوار بنانے کے لیے وہی باسی ہنگامے جن کا ذائقہ وہ چکھ چکا تھا، جن کا اسے بہت تلخ تجربہ تھا۔

آزار: تکلیف، دکھ۔ تلخ تجربہ: ناگوار تجربہ۔

اچانک اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ کوئی اس کے وجود میں چیخا۔ نہیں، نہیں۔ یہ فرار ہے۔ خودکشی ہے۔ وہ زندہ رہے گا اور ایک اسکائی لارک کی طرح زندہ رہے گا۔ اس زندگی میں، اس جدوجہد میں حرکت تھی، حرارت تھی، مسرت تھی اور یہ مسرت بڑی مقدس اور پاکیزہ تھی۔ پہلے پورے معاشرے کو خوبصورت بناؤ۔ اس کے چہرے سے غلاظت اور گندگی صاف کرو۔ پھر خوب صورت چیزوں کی تمنا کرو۔ زندگی، حسین عورت کا ایک تبسم، شراب کا ایک جام نہیں ہے۔ زندگی عمل اور حرکت کا نام ہے۔ انقلاب اور تغیر کا نام ہے۔ اس تغیر سے تم منہ نہیں موڑ سکتے۔ تمہارے ذہن میں وہ کانٹا چبھ گیا ہے جو تمہارے شعور کو کبھی خودکشی کرنے نہ دے گا۔

سلمان نے فلک پیا چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ آنکھیں بند کیے سہ پہر تک کمرے میں پڑا گہری نیند سوتا رہا۔

❁ ❁ ❁

شام کو سلمان لائبریری میں گیا۔ تمام اسکائی لارک وہاں موجود تھے۔

نئے اسکائی لارکوں سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ سب نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ وہ ایک ایک سے گلے ملا۔ خوب زور زور سے قہقہے لگائے۔

اس کی آمد کی خوشی میں اسکائی لارکوں نے ایک چھوٹی سی پارٹی دی۔ اس میں چائے تھی، پھل تھے، اور گرم گرم سموسے تھے جو سلطانہ نے تیار کیے تھے۔ چائے کی میز پر اس نے خوب باتیں کیں۔ طرح طرح کے لطیفے سنا کر سب کو خوب ہنسایا۔

بہت عرصے بعد اس کی ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز شام گزری۔

مگر وہ اب فلک پیا کا رکن نہیں رہا تھا۔ طویل غیر حاضری کے باعث اس کی رکنیت منسوخ کر دی گئی تھی۔ وہ دوبارہ رکنیت حاصل کرنے کا متمنی ضرور تھا اور اپنی اس خواہش کا علی احمد اور تنظیم کے دوسرے ارکان سے اظہار کر چکا تھا۔

چند روز بعد فلک پیا کا اجلاس ہوا۔

ڈاکٹر زیدی نے اجلاس کی صدارت کی۔ اب وہی فلک پیا کا صدر بھی تھا۔ علی احمد بدستور سکرٹری جنرل تھا۔

مقدس: قابل احترام۔ تغیر: تبدیلی۔ ولولہ انگیز: جوش کو بڑھانے والی، جوش پیدا کرنے والی۔ متمنی: خواہش مند۔

اس نے سلمان کی رکنیت بحال کرنے کی تجویز اجلاس میں پیش کی۔

تجویز پر مختصر بحث ہوئی اور اسے اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ ساتھ ہی سلمان کو سخت تنبیہہ بھی کی گئی کہ وہ آئندہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرے۔

سلمان اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔ اسے بلایا گیا اور اجلاس کے فیصلے سے آگاہ کر دیا گیا۔ رکنیت بحال ہونے پر ارکان نے اسے مبارک باد دی۔ اسے اجلاس کی کاروائی میں شرکت کرنے کی بھی اجازت مل گئی۔

سلمان کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے اجلاس سے خطاب بھی کیا۔ صدر اور دوسرے ارکان کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں یقین دلایا کہ وہ نہ صرف محتاط رہے گا بلکہ پوری پوری کوشش کرے گا کہ اس سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو۔ ساتھ ہی اس نے پشیمانی کا اظہار کیا اور اپنے غیر ذمہ دارانہ رویے کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔

ایجنڈے کی اہم شق، امجد خاں کی رپورٹ تھی۔

امجد خاں پچھلے سالانہ انتخابات میں فلک پیا کا خازن منتخب ہوا تھا۔ رپورٹ میں مالی مشکلات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ فلک پیا کا کام اپنے ہمدردوں کے چندے اور انڈسٹریل ہوم کی آمدنی سے چل رہا ہے۔ مگر فنڈ کی کمی کے باعث تنظیم کی سرگرمیوں کا آگے بڑھنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈسپنسری کا ذکر خاص طور پر کیا گیا جو مالی مشکلات کے باعث غیر اطمینان بخش حالت میں تھی۔

سلمان نے صدر سے اجازت لی۔ اپنے کمرے میں گیا۔ سوٹ کیس کھولا۔ پانچ ہزار روپے نکالے۔ اجلاس میں واپس گیا۔ صدر کے سامنے نوٹوں کی گڈی رکھتے ہوئے نہایت انکسار سے کہا۔

"فلک پیا کے فنڈ کے لیے یہ میری حقیر پیشکش ہے۔"

اسکائی لارکوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر سلمان کے خلوص کو سراہا۔ انہوں نے اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا کہ ذرا دیر کے لیے اجلاس کی سنجیدہ فضا درہم برہم ہو گئی۔ سلمان کا سینہ فخر سے تن گیا۔

زندگی میں اتنی زبردست خوشی اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

تنبیہہ: ہدایت۔ اعادہ: دہرانا، بار بار کرنا۔ پشیمانی: شرمندگی۔ ایجنڈا: کاروائی نامہ۔ شق: حصہ۔ حقیر: کم تر، جس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔

⊛ ⊛ ⊛

ریاض پچھلے مہینے جیل سے رہا ہو کر آیا تھا اور فلک پیا کا باقاعدہ رکن بن چکا تھا۔ وہ بھی اجلاس میں شریک تھا اور دیر سے خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

وہ صدر کی اجازت سے تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو خاموشی چھا گئی۔ اس نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میں اسکائی لارک سلمان کے جذبۂ ایثار کی قدر کرتا ہوں۔ یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ انہیں فلک پیا سے کس قدر گہرا لگاؤ ہے۔ فلک پیا ایک جماعت ہے، ایک تنظیم ہے۔ اور کوئی تنظیم محض تنظیم نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اغراض و مقاصد سے، یعنی اپنے سماجی اور اقتصادی پروگرام سے پہچانی جاتی ہے۔ فلک پیا کا بھی ایک سماجی اور اقتصادی پروگرام ہے۔ اسے عملی جامہ پہنانے اور کامیاب بنانے کے لیے ہم کو ان طبقات، سماجی تنظیموں اور جماعتوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنا چاہیے جنہیں اس کے اغراض و مقاصد سے پوری طرح اتفاق ہے۔"

افضل نے مداخلت کی۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اسکائی لارک ریاض یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں عملی سیاست میں سرگرمی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔"

"میں نے اپنی بات ابھی ختم نہیں کی ہے۔" ریاض نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن اسکائی لارک افضل اگر دلوں کا حال پڑھ لیتے ہیں اور ذہنوں کے بھید معلوم کر لینے کا گر جانتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ ان کا قیاس درست ہے۔ میں یہی کہنا چاہتا تھا۔"

اس دفعہ افضل کے بجائے ساجد نے اٹھ کر کہا۔ "میں اسکائی لارک ریاض پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فلک پیا نے پہلے بھی عملی سیاست میں حصہ لیا تھا۔ میری مراد میونسپلٹی کے الیکشن سے ہے۔ یہ ہمارے لیے بڑا تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ ہمیں اس کے نتیجے میں بہت بڑی قربانی دینی پڑی" اس نے دیوار پر آویزاں صفدر بشیر کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تصویر آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ فلک پیا کے بانی اور ہمارے نہایت محترم رہنما کی تصویر ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی المناک موت کیوں، کیسے اور کن حالات میں واقع ہوئی۔"

"ایسی قربانیاں تو ہمیں آئندہ بھی دینی پڑیں گی اور ذہنی طور پر اس کے لیے خود کو تیار کرنا

اقتصادی: مالی، معاشی۔ قیاس: خیال۔

پڑے گا۔" ریاض نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "آپ نے یہ بھی سوچا کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں، وہ کیا ہے؟ سیاست صرف کاروبار حکومت میں حصہ لینے کا نام نہیں۔ یہ بنیادی طور پر معاشرے میں اقتصادی رشتوں کا اظہار ہے۔ اسے اس طرح سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ کارخانے دار بھی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے اور مزدور بھی۔ دونوں ہی انسان ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ مگر جب کارخانے دار کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگاتا ہے تو اسے مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے یہ ایک طرح کا اقتصادی معاہدہ ہوتا ہے۔ مزدور، جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے اپنی محنت بیچتا ہے اور کارخانہ دار اسے خریدتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر جب مزدور اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لیے ٹریڈ یونین بناتے ہیں تو اسی وقت سے اقتصادی رشتوں کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دونوں ہی اپنے اپنے مفادات کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ یہی جدوجہد، یہی سماجی اور اقتصادی رشتوں کی تبدیلی سیاست ہے۔

اسی طرح جب آپ غربت، پس ماندگی اور سماجی اور اقتصادی عدم توازن ختم کر کے مساوات قائم کرنے اور معاشرے کو صحت مند اور خوب صورت بنانے کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم کرتے ہیں تو یہ جدوجہد ان طبقات اور سماجی گروہوں کے خلاف ہوتی ہے جو محنت کش عوام کی غربت اور پس ماندگی کا باعث ہیں۔ جو ان کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد سیاست ہے۔ فرق صرف سیاست کی نوعیت کا ہے۔ ایک استحصال کرنے والے طبقات کی سیاست ہوتی ہے، ایک استحصال زدہ غریب طبقات کی سیاست ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے۔"

مگر علی احمد نے ریاض کو مزید کہنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے اسکائی لارک ریاض کے موقف سے قطعی اتفاق ہے۔ مگر بحث کے لیے جو بلاشبہ ایک صحت مند رجحان ہے مناسب جگہ یہ اجلاس نہیں اسٹڈی سرکل ہے۔ میں گزارش کروں گا کہ اسکائی لارک ریاض کے ذہن میں اس اجلاس کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی تجویز ہے تو اسے سامنے لائیں تاکہ اس پر غور کیا جائے۔"

ریاض نے علی احمد کی بات مان لی۔ اس نے ایک تجویز کی صورت میں فلک پیا کی سرگرمیوں کا

لازم و ملزوم: دو ایسی چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے کے لئے ضروری ہو۔ عدم توازن: ناہمواری، ظلم۔ مساوات: برابری۔ استحصال زدہ: جس کا حق چھینا گیا ہو، مظلوم۔ صحت مند رجحان: اچھی روایت۔

دائرہ کار وسیع کرنے اور تقسیم کار کی اہمیت پر زور دیا۔ تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔ مختصر طور پر بتایا کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے۔

اس کی تجویز پر زیادہ بحث نہیں ہوئی۔ اسے منظور کر لیا گیا۔

اسی اجلاس میں اتفاق رائے سے سلطانہ کو انڈسٹریل ہوم کا انچارج، علی احمد کو تعلیم بالغاں کا انچارج، ڈاکٹر زیدی کو طبی امداد کے کاموں کا انچارج اور ریاض کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا انچارج منتخب کیا گیا۔ سعید احمد کو، جو ہنوز طالب علم تھا، طلبا میں کام کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔

ریاض کی دوسری تجویز یہ تھی کہ فلک پیا اور اسکائی لارک، چونکہ عوام کے لیے نامانوس نام ہیں، لہٰذا تنظیم کا نام ایسا رکھا جائے جو ہمارے معاشرے کی روایات اور اقدار سے مطابقت رکھتا ہو۔

اس تجویز پر طویل بحث شروع ہو گئی۔

رات لگ بھگ آدھی ہو چکی تھی اور اسکائی لارکوں کو صبح تڑکے اٹھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ صدر نے بحث ملتوی کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ تجویز پر آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے۔ اجلاس ختم ہو گیا۔

سلمان کو اس کی خواہش پر ریاض کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ وہ پہلے بھی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا تھا۔ مزدوروں میں کام کرنے کا اسے بخوبی تجربہ تھا۔

صبح ہوئی تو وہ ریاض کے ہمراہ ٹریڈ یونین کے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

سلمان ایک بار پھر پورے جوش و خروش اور لگن کے ساتھ فلک پیا کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔

اب وہ عمداً خود کو بے حد مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تاکہ سلطانہ کے بارے میں سوچنے کا موقع نہ ملے۔ اس طرح جانفشانی اور مستعدی سے کام کرنے میں اسے مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ ذہنی آسودگی مل رہی تھی۔

وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے سلسلے میں اکثر رات گئے واپس آتا۔ اس کا بیشتر وقت مزدوروں کے ساتھ گزرتا۔ وہ ان کے مسائل میں گہری دلچسپی لیتا۔

ریاض کی نگرانی میں اس کی ذہنی تربیت ہو رہی تھی۔ اس کا سیاسی شعور زیادہ سے زیادہ بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ ذہن میں نئے دریچے کھل رہے تھے۔ وہ معروضی حالات سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ان کا

عمداً: جان بوجھ کر۔ جانفشانی: محنت۔ مستعدی: ہوشیاری۔ آسودگی: سکون۔ معروضی حالات: آس پاس کے مخصوص حالات۔

تجزیہ کرتا اور اس تجزیے کی روشنی میں مزدوروں کی جدوجہد کے لیے حکمت عملی وضع کرتا۔

ہیڈ کوارٹر میں واپس آتے ہی سلمان کھانا کھاتا اور لائبریری میں چلا جاتا۔ گھنٹوں مطالعہ میں غرق رہتا۔ اسٹیڈی سرکل کے مباحثوں کے لیے نوٹ تیار کرتا اور آدھی رات کو تھکا ہارا اس طرح بستر پر جاکر سوتا کہ صبح ہونے سے پہلے اس کی آنکھ نہ کھلتی۔

یہ اس کی زندگی کے بڑے طوفانی روز و شب تھے۔ کام، کام اور کام۔ ان دنوں اس پر یہی دھن سوار تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو روز بروز بڑھاتا جا رہا تھا۔ کبھی اس کے خلاف غیر ذمہ داری یا کام سے غفلت کا الزام نہ لگا۔ جب تک ہیڈ کوارٹر میں رہتا مطالعہ کرتا یا اپنی ڈائری بار بار دیکھتا کہ کس وقت اسے کہاں پہنچنا ہے اور کیا کام کرنا ہے۔

کبھی کبھی سلطانہ سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی تو وہ صرف یہ سوچ کر رہ جاتا۔ یہ سلطانہ تھی۔ ہاں سلطانہ ہی تھی۔ وہی ہوگی۔ علی احمد کی بیوی۔ ننھے ایاز کی ماں۔ اب وہ اسے سلطانہ سے زیادہ علی احمد کی شریک حیات اور ننھے ایاز کی ماں کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش کرتا۔ اس کوشش میں وہ اس سلطانہ کو بھولتا جا رہا تھا جو دلکش خدوخال والی ایک خوبصورت لڑکی تھی اور جس سے اسے محبت بھی تھی۔

سلمان کے شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ مصروف دن مصروف راتیں۔ مویشیوں کی سی زندگی بسر کرنے والے پس ماندہ اور مظلوم عوام کو انسان بنانے کی جدوجہد۔ ان کے لیے علم کی روشنی، شعور کی بالیدگی، ترقی اور خوشحالی کی تمنا۔ اس جدوجہد کی کوئی سرحد نہیں۔ یہ رواں دواں اور ہر آن آگے بڑھنے کا عمل ہے۔ یہ معاشرے کی تبدیلی کا ایسا مسلسل سفر ہے جس میں زندگی نت نئی منزلوں کی جانب جادہ پیا ہے۔ اس سفر میں انسانی جدوجہد اپنی جسمانی اور ذہنی محنت کے کس بل پر، دریاؤں کا رخ موڑتی، سمندروں کا سینہ روندتی، چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہے۔ فطرت کے سربستہ اسرار و رموز افشا کر رہی ہے۔ کائنات کی تسخیر کر رہی ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ارتقائی عمل ہے۔

(۳)

نوشا جیل میں تھا۔ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کا انتظار کر رہا تھا۔

حکمت عملی وضع کرنا: تدبیر کرنا، پالیسی بنانا۔ مڈبھیڑ: آمنا سامنا۔ خدوخال: چہرے کے نقوش۔ بالیدگی: نکھار۔ رواں دواں: جاری رہنے والا۔ ہر آن: ہر وقت۔ جادہ پیا: جاری و ساری۔ سربستہ: پوشیدہ۔ تسخیر: تابع کرنا، قابو میں لانا۔

وہ اقبال جرم کر چکا تھا۔

نیاز کے قتل کے الزام میں اس پر مقدمہ چلا۔ نہ اس کا کوئی گواہ تھا نہ ہمدرد اور نہ ہی کسی نے اس کے مقدمے کی پیروی کی۔ لہٰذا تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت مجسٹریٹ کی عدالت سے اسے سیشن سپرد کر دیا گیا۔

شامی اکثر جیل میں اس سے ملنے آتا۔ وہی اس بھری دنیا میں اس کا تنہا ہمدرد و غمگسار تھا۔ پھر اس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

ملاقات کے دن نوشا اس کا بے چینی سے انتظار کرتا۔

مگر شامی کو تپ دق ہو گئی تھی۔ وہ خون تھوکنے لگا۔ ہر وقت بخار میں بھنتا رہتا۔ تپ دق کے موذی مرض نے اس کے محنتی جسم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ کچھ عرصہ خیراتی اسپتال میں رہا۔ اب اپنے گھر کے ایک گوشے میں پڑا زندگی کے دن گن رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

علی احمد نے جب نوشا کے مقدمے کی پیروی کی تو عالم یہ تھا کہ نوشا کے سر پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ وہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ دوسری طرف استغاثہ کے گواہ بھی پیدا ہو گئے تھے۔ پولیس کو یہ شہادتیں خان بہادر فرزند علی نے مہیا کی تھیں۔

وہ نوشا کے مقدمے میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ نوشا کو قتل عمد کے جرم میں سزائے موت دلوانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ پولیس کا مقدمہ بہت مضبوط تھا۔

علی احمد نے نوشا کے مقدمے کے لیے جس وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں وہ نیاز کے قتل میں خان بہادر فرزند علی اور اس کے منیجر کو بھی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ نیاز کو قتل سے پہلے زہر دیا جا چکا تھا۔ اپنے اس موقف کی تائید میں اس نے یہ دلیل ثبوت کے ساتھ پیش کی تھی کہ قتل کی رات خان بہادر اپنے منیجر نذر محمد کے ہمراہ نیاز کے پاس آیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد نیاز نے اپنے پیٹ میں شدید درد محسوس کیا تھا۔ اسے خون کی قے بھی ہوئی تھی۔ اس واقعے کی عینی گواہ سلطانہ اور اس کی خادمہ تھی۔ ان کے علاوہ بوڑھا

تپ دق: ایک مرض۔ استغاثہ: دعویٰ کرنے والا۔ قتل عمد: جان بوجھ کر قتل کرنا۔

خانساماں تھا۔ لیکن دو مہینے پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

دوسری ہی پیشی پر خادمہ اپنے بیان سے منحرف ہو گئی۔ خان بہادر نے ایک ہزار روپے دے کر اسے توڑ لیا تھا۔

اب صرف سلطانہ واحد گواہ رہ گئی تھی۔

اس مرحلے پر نوشا کے وکیل نے عدالت کے روبرو ایک درخواست پیش کی جس میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ نیاز کی لاش ایک مجسٹریٹ کی نگرانی میں قبر سے نکالی جائے۔ اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ لیکن عدالت نے سلطانہ کی گواہی اس لیے قابلِ اعتنا قرار نہ دی کہ وہ نوشا کی حقیقی بہن تھی۔ لہٰذا درخواست مسترد کر دی گئی۔

عدالت کے اس فیصلے میں بھی خان بہادر فرزند علی کے اثر و رسوخ اور دولت کو بہت بڑا دخل تھا۔

سلمان بھی نوشا کے مقدمے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ دوبارہ ملاقات کے دن نوشا سے ملنے جیل گیا۔ اس کے لیے پھل اور مٹھائی بھی لے گیا۔ اس نے نوشا کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھا تو تڑپ اٹھا۔ اس کا چہرہ بجھ گیا اور دل بیٹھنے لگا۔

علی احمد بڑی تندہی سے نوشا کے مقدمے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ وہ وکیل سے ملتا۔ مقدمے کے سلسلے میں تبادلہ خیالات کرتا۔ ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہتا۔

❁ ❁ ❁

مقدمہ کی سماعت جاری رہی۔

ایک روز عدالت سے واپسی پر علی احمد نے دکھ بھرے لہجے میں سلمان کو بتایا کہ نوشا کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور سیشن جج کے اس فیصلے کے خلاف وکیل نے ہائی کورٹ میں اپیل بھی دائر کر دی ہے۔

اب نوشا کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہائیکورٹ کے ہاتھ میں تھا۔

اس عرصے میں سلمان کو اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ یہی کہ ننھا ایاز دراصل نیاز کا بچہ ہے جسے علی احمد اپنی اولاد کی طرح پال رہا ہے۔ نیاز کے قتل کے بعد خان بہادر فرزند علی نے اپنے

منحرف ہونا: پھر جانا، مکر جانا۔ قابلِ اعتنا: توجہ کے لائق۔ تندہی: محنت، مستقل مزاجی۔

گر گے فیاض کے ذریعے سلطانہ کو کوٹھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور ایک جعلی دستاویز کی بنیاد پر نیاز کی تمام جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا۔

خان بہادر میونسپلٹی کا چیئرمین تھا۔ کئی کارخانوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس سندھ اور پنجاب میں زرعی املاک اور جاگیر تھی۔ اب وہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اور ممبر منتخب ہونے سے پہلے ہی وزیر بننے کے لیے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔

وزراء اور اعلیٰ حکام سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے تعلقات اور اثر و رسوخ کا دائرہ ملک سے نکل کر بیرونِ ملک تک پھیل چکا تھا۔

اس کا ایک بیٹا کولمبو پلان کے تحت لندن میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ دوسرا فورڈ فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر کولمبیا یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔

خان بہادر فرزند علی، جواب الحاج خان بہادر فرزند علی بن چکا تھا، اسلام کی سربلندی کا علم بردار تھا۔ نورانی مسجد کے پرشکوہ مینار اس کے جذبہ ایمانی کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ وہ ملک اور قوم کا بہی خواہ اور محبِ وطن تھا۔ اسکائی لارکوں کو وطن دشمن اور تخریب کار قرار دیتا تھا۔ انہیں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل میں بند کرنے کی کھلم کھلا دھمکیاں دیتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے پاکستان میں متروکہ جائیداد کی طرح اسلام اور حب الوطنی کے جملہ حقوق بھی اپنے نام الاٹ کرا لیے ہیں۔

نوشا جیل میں تھا اور پھانسی کے پھندے کے سائے میں کھڑا تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزندِ ارجمند بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اپنے مستقبل کی روشن صبح کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہ خواص اور عوام کی قسمت کا فرق ہے۔ خواص، خان بہادر فرزند علی پیدا کرتے ہیں اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور اتو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں کوئی قتل کر کے جیل جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی رکشا کھینچتا ہے اور تپِ دق میں مبتلا ہو کر خون تھوکتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ تالیاں پٹخار کر کولہے مٹکاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

نوشا کا مقدمہ ہائی کورٹ میں زیرِ سماعت تھا۔ اسے کراچی سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

بہی خواہ: بہتری چاہنے والا۔ کھلم کھلا: سرعام۔ متروکہ جائیداد: ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد۔

مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب اس کی اپیل پر عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔

علی احمد چند روز پہلے ہی کراچی پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہمراہ وکیل تھا، سلطانہ تھی، سلمان تھا، دو اور اسکائی لارک بھی تھے۔

اس روز صبح ہی سے سلطانہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔

وہ رات بھر بے چین رہی۔ پل بھر کے لیے بھی نہ سو سکی۔ وہ کھوئی کھوئی سی ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ نہ بول رہی تھی نہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ فیصلہ سننے کی غرض سے جب سب عدالت میں پہنچے تو سلطانہ کی بے قراری اور بڑھ گئی۔

نوشا ملزموں کے کٹہرے میں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ ڈاڑھی کے بھورے بھورے سنہری بالوں میں اس کا چہرہ، بحریہ کے نو عمر ملاحوں کی طرح خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی ماں سے روٹھا ہوا کھڑا ہے۔

عدالت میں موت کی سی گہری خاموشی چھائی تھی۔ پھر اس خاموشی میں ایک بھاری بھر کم آواز ابھری۔ یہ جج کی آواز تھی۔ وہ فیصلہ سنا رہا تھا۔

نوشا قاتل تھا۔ قانون کا یہی فیصلہ تھا۔

استغاثہ نے نوشا کے خلاف شہادتوں کے ساتھ پورا پورا ثبوت بھی مہیا کر دیا تھا۔ اسے موت کی سزا دی جا چکی تھی۔ ہائی کورٹ نے عدالت ماتحت کے فیصلے سے اتفاق رائے کیا تھا۔ اسے برقرار رکھا تھا۔ البتہ نابالغ ہونے کے باعث عدالت نے سزائے موت کے بجائے نوشا کے لیے چودہ سال قید بامشقت کی سزا کا فیصلہ دیا۔

انصاف نے اپنا تقاضا پورا کر دیا۔

نوشا کو ملزموں کے کٹہرے سے نکالا گیا اور جن ہاتھوں کو قلم کی ضرورت تھی، ان میں ہتھ کڑیاں ڈال دی گئیں۔ ہتھ کڑیاں پہن کر نوشا پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"مجھے پھانسی دے دو۔"

"مجھے گولی مار دو"

"میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

"میں اب جینا نہیں چاہتا۔"

"خدا کے لیے مجھے پھانسی دے دو!"

"جج صاحب! اللہ کے لیے مجھے پھانسی دے دو!"

نوشا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ پہلی بار جیل گیا تو واپسی پر جیب کترا بن گیا۔ تب وہ صرف سال بھر کے لیے جیل گیا تھا۔ اب اسے چودہ سال کی سزا ملی تھی۔ چودہ سال کی طویل مدت میں وہ زیادہ بڑا اور زیادہ خطرناک جرائم پیشہ بن سکتا تھا۔ مگر وہ جرائم پیشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس زندگی سے موت بہتر تھی۔

وہ موت چاہتا تھا۔ وہ بلک بلک کر پھانسی کی درخواست کر رہا تھا۔ مگر عدالت اسے پھانسی دینے کے حق میں نہیں تھی۔ انصاف کا یہی تقاضا تھا۔

کانسٹیبل اسے گھسیٹ کر عدالت سے باہر لے گئے۔

نوشا نے ایک بار بے قرار ہو کر ہاتھ بلند کئے اور آہنی ہتھ کڑیوں سے دیوانہ وار اپنا سر ٹکرانے لگا۔

آن کی آن میں اس کی پیشانی پر سرخ سرخ لوتھڑے ابھرنے لگے۔ چہرہ لہولہان ہو گیا۔

کانسٹیبلوں نے جھپٹ کر اس کی مشکیں کس لیں۔

سلطانہ چیخ مار کر اس کی جانب لپکی۔

"نوشا! میرا بھیا! خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جا!"

"نہ جا۔ نوشا نہ جا۔ میں مر جاؤں گی۔"

"نوشا، نوشا!"

علی احمد نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ سلطانہ اس کے سینے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

علی احمد پیار سے اس کی پیٹھ تھپک کر تسلی دینے لگا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ

مشکیں کسنا: دونوں بازو باندھنا۔

پڑ گیا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

سلمان لمحہ بھر تک، دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اچانک اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ آنسوؤں کے گرم گرم قطرے پلکوں سے ڈھلک کر ٹپ ٹپ فرش پر گرنے لگے۔ سلمان نے منہ پھیر کر آنسو پونچھے اور چپ چاپ عدالت سے باہر چلا گیا۔

کراچی،

اکتوبر ۱۹۵۷ء

ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا: غور سے مسلسل دیکھنا۔